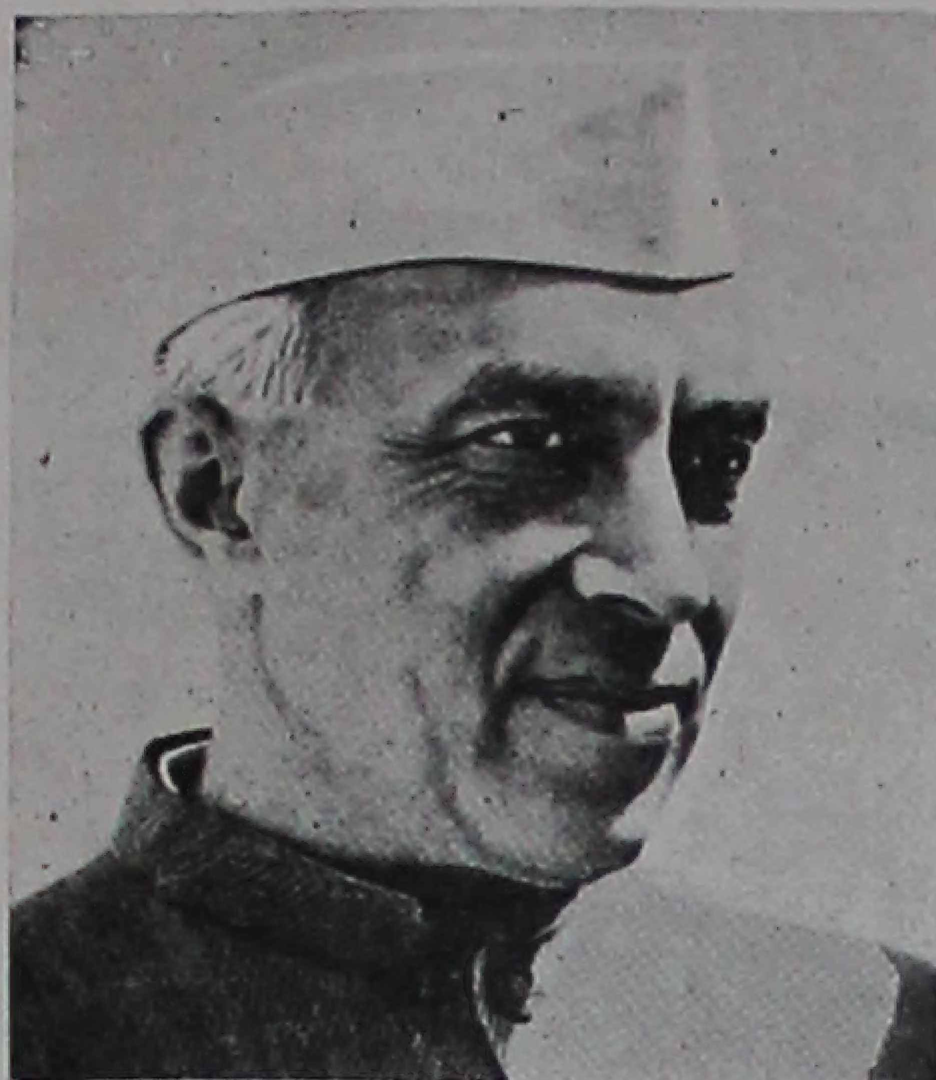
آجکل

ابوالکلام نمبر



اگست ۱۹۵۸ء
شراون - بھادوں شک سمت ۱۸۸۰

ایک روپیہ



"ابوالکلام نمبر" کے لئے

وزیراعظم کا پیغام

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا ہے! اس کی تھوڑی سی جھلک اس دن دہلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشوونما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جدوجہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک اہم جزو تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جیّد عالم اور انفرادیت پسند رہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انبوہِ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر اور مالا مال کیا ہے۔

بعض اعتبار سے اُن کی طرزِ فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور وہ اُس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پُرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اُسے واپس نہیں لا سکتے لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں۔

نئی دہلی
۵ جولائی ۱۹۵۸ء

جواہرلال نہرو

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل دہلی

(سالنامہ)

ابوالکلام نمبر

مجلسِ ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور — حیدرآباد
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
رحمان راہی — سری نگر
یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی۔ نخباناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو سیکرٹری
(مدیر مسؤل)

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ منظر شاہ

سرورق:- مولانا ابوالکلام آزاد رح کی روغنی تصویر
(ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے ذخیرۂ تصاویر سے۔ بہ تشکریہ بیگم زہرہ انصاری)

جلد ۱۷ — اگست ۱۹۵۸ء
نمبر ا — شراون بھادوں شک سمت ۱۸۸۰

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

تعارف

ڈاکٹر سید محمود	مولانا آزاد مرحوم کے پرانے رفیق کار، مشہور قومی رہنما، ممبر پارلیمنٹ
جناب بخشی غلام محمد	پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر۔
جناب حافظ محمد ابراہیم	وزیر آبپاشی و بجلی، حکومت ہند
مسز ارونا آصف علی	مشہور قومی لیڈر اور دلی کارپوریشن کی میئر
جناب ہادی القادری	استاذ ادبیات عربی و اردو نظام کالج، حیدرآباد
جناب فضا ابن فیضی	خوش گفتار مقبول شاعر۔ (مئو ناتھ بھنجن۔ یوپی)
حضرت ذائق بنگلوری	جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر
ڈاکٹر ذاکر حسین	صاحب فکر و نظر، مشہور ماہر تعلیم، بہار کے گورنر
پروفیسر ہمایوں کبیر	وزیر سائنٹفک تحقیقات و امور ثقافت حکومت ہند۔ مولانا آزادؒ سے آپ کا قریبی تعلق رہا
جناب منظور علی تمنا فاروقی	بجنور (یوپی) کے ایک پرانے شاعر
مولانا نیاز فتحپوری	مشہور انشاپرداز، مدیر نگار (لکھنؤ۔
علامہ جمیل مظہری	کامل فن اور مخلص شاعر۔ پٹنہ کالج (پٹنہ)
مولانا محمد اجمل خاں	مولانا آزاد مرحوم کے معتمد خصوصی علم و ادب کے شیدائی۔ مذہبیات پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔
جناب خواجہ غلام السیدین	سیکرٹری وزارت تعلیم حکومت ہند۔ ممتاز ماہر تعلیم۔
جناب سید سرفراز حسین رضوی خبیرؔ	محلہ نخاس لکھنؤ۔
جناب ظفر حسین خاں	فلسفی اور مصنف، بنگلہ نمبر سی ۹۸۵-۹۸۶، جہانگر، لکھنؤ۔
جناب بسمل سعیدی ٹونکی	زبان داں اور پختہ کار شاعر۔ فکر و فن میں ممتاز
پروفیسر محمد مجیب	وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ماہر تعلیم اور تاریخ داں، رکنِ ادارہ
جناب محمد شفیع الرحمٰن	شعبۂ امورِ عامہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)
جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی	کہنہ مشق ادیب و شاعر۔ دہلی پبلک ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین۔ رکنِ ادارہ
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	مشہور صحافی، عربی زبان و ادب کے عالم۔ مولانا آزادؒ کے دیرینہ رفیق
جناب یحییٰ اعظمی	دارالمصنفین اعظم گڑھ، مشاق اور خوش گفتار شاعر
مولانا غلام رسول مہر	ممتاز صحافی اور بہترین ادیب، مولانا آزاد کے قدیم دوست۔ ماہرِ غالبیات
جناب روحی الہ آبادی	حلیم انٹر کالج، چمن گنج، کان پور
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	پرنسپل کلکتہ مدرسہ (کلکتہ) عربی اور فارسی کے فاضل، اسلامی علوم کے ماہر اور مصنف
جناب روش صدیقی	صاحبِ فکر، پختہ کار شاعر۔ پروڈیوسر (اردو) آل انڈیا ریڈیو۔
جناب حافظ علی بہادر خاں	ایڈیٹر ’دورِ جدید‘ (دہلی)، کہنہ مشق صحافی۔ جدوجہدِ آزادی کے مخلص کارکن۔
جناب شمیم کرہانی	کوچہ میر عاشق۔ دہلی۔ خوش مذاق اور نغز گفتار شاعر
جناب محمد یونس خالدی	ابوالکلام اکادمی، عرب ہاؤس، مولوی گنج لکھنؤ، مولانا آزاد کے پرانے ارادت مند اور ادیب
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	ریڈر (اردو) دہلی یونیورسٹی۔ صاحبِ فکر ادیب اور نقاد۔ رکنِ ادارہ
جناب اعجاز صدیقی	خوش فکر شاعر۔ ایڈیٹر ”شاعر“ قصر الادب، بمبئی
جناب ریاض الرحمٰن شروانی	حبیب منزل علی گڑھ۔ مولانا آزادؒ کے حبیبِ لبیب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے پوتے، نوجوان ادیب
محترمہ حمیدہ سلطان	مشہور ادیبہ۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل سیکرٹری
جناب غلام احمد فرقت	مشہور مزاح نگار۔ معلم اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول۔ دہلی

ملاحظات

بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی کش مکش اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کی تیاری نے دنیا میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی ہے اور ہر لحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی معمولی سا حادثہ عالم گیر جنگ کا بہانہ نہ بن جائے - ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ایٹمی تجربات نے نسل انسانی کو زبردست خطرے میں ڈال دیا ہے - آج بھی ان کے جو مضر اثرات فضائے بسیط پر پڑ رہے ہیں وہ کچھ کم نہیں - اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ متحدہ اقوام کی پندرہ قومی سائنٹفک کمیٹی کی رپورٹ سے ہو سکتا ہے جن کے بعض اقتباسات غیر سرکاری طور پر شائع کر دئے گئے ہیں - اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی دھماکے ۱۹۵۰ء کے بعد جاری رہے تو ان کی وجہ سے ہر سال کوئی سوا تین لاکھ اشخاص مہلک امراض میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور ان امراض کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا - یہی نہیں بلکہ سابقہ دھماکوں کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑتے رہیں گے - اس رپورٹ سے ایٹمی دھماکوں کو روکنے کی ضرورت بالکل واضح ہو گئی ہے اور عام انسانی آبادی کی بقاء اور تحفظ کا تقاضا یہی ہے کہ ان تجربات کو فوراً بند کر دیا جائے - روس نے از خود ایٹمی دھماکے روک دئے ہیں - امریکہ اور برطانیہ کا اصرار ہے کہ پہلے اس امتناع کی پابندی کا انتظام کیا جائے - چنانچہ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مغربی اور کمیونسٹ ملکوں کے سائنس دانوں کی گفتگو شروع ہو گئی ہے کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی نگرانی کے ذرائع تلاش کئے جائیں - اگر نیت صاف ہے تو ذرائع کی تلاش اور سمجھوتے کی صورت کچھ مشکل نہیں -

لبنان کی خانہ جنگی اور عراق کے حالیہ انقلاب کی وجہ سے مغربی ایشیا میں صورت حال انتہائی نازک ہو گئی ہے - اگرچہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے لبنان کے بارے میں واضح طور پر مشورہ دیا تھا کہ لبنان کا معاملہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور اسے وہیں کے لوگوں کو سلجھانا ہے مگر صدر شمعون نے فوجی امداد کی درخواست کی اور امریکی فوجیں لبنان میں پہنچ گئی ہیں - دوسری طرف شاہ حسین کی درخواست پر برطانوی فوجیں اردن میں اتار دی گئیں - روس نے اس طرح فوجیں بھیجنے کو جارحانہ کارروائی اور بیرونی مداخلت قرار دیا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کیا ہے - انہوں نے اپنے سرحدی علاقوں میں فوجی مشقیں شروع کر دی ہیں - ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب قومیت کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے اور اس میں بیرونی مداخلت نہ صرف مغربی ایشیا کو میدانِ کارزار بنا دے گی بلکہ امنِ عالم بھی خطرے میں پڑ جائے گا -

ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں اور یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں بشرطیکہ انھیں قابو میں کر کے ان کے پانی سے کام لیا جائے - چنانچہ ملک بھر میں جگہ جگہ ان دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھے جا رہے ہیں تاکہ ان کے پانی سے زمینوں کو گلزار بنایا جائے اور بجلی پیدا کر کے کارخانوں کا جال بچھا دیا جائے - ان میں سے ایک بہت بڑا بند بھاکڑا بند ہے جہاں دریائے ستلج کو روک کر ایک برج بنایا گیا ہے - پانی کا یہ ذخیرہ ۶۴ مربع میل جھیل کی شکل میں ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے جس سے نہریں نکالی جائیں گی - یہ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے - چنانچہ یکم جولائی کو وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کے ہاتھوں ستلج برج کے سرہند فیڈر کا افتتاح ہوا - اس فیڈر کی مجموعی لمبائی ۹۲ میل ہو گی جس سے پنجاب میں دس لاکھ ایکڑ اراضی اور راجستھان میں سات لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے میں مدد ملے گی -

'ابوالکلام نمبر' ناظرین کے ہاتھوں میں ہے - اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی گئی ہے - ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ نمبر اس عظیم شخصیت کے شایان شان ہو - ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نامور انشاپردازوں اور مولانا آزاد کے رفیقوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی اور مولانا کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قابل قدر مضامین عنایت فرمائے - مولانا جس ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس کے تمام تر پہلوؤں کا ایک شمارے میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا - پھر بھی زیر نظر مضامین مولانا کی زندگی، ان کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات اور افکار و خیالات کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں - امید ہے کہ ناظرین اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیں گے -

اس سال ہم نے سالنامہ کے علاوہ تین خصوصی نمبر نکالے - جن میں موضوعاتی مضامین ہی شامل کئے گئے اور دیگر مضامین جمع ہوتے گئے - چنانچہ ہمارے پاس منظور شدہ مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں - اس لئے مضمون نگار حضرات ابھی کچھ دنوں مضامین بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں -

اظہارِ عقیدت

ڈاکٹر سیّد محمود ایم پی

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ ماہ نامہ "آج کل" کا آزاد نمبر نکال رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات با صفات اور شخصیت بابرکت کا تذکرہ اب ہماری قومی اور ملی زندگی کا انمول اثاثہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس سے ہزار پہلو اور بصد رنگ ہم حوصلہ پائیں گے، روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آیندہ کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تاثیر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تاقیامت جتنے "آج" ہوتے رہیں گے اور "کل" آتے رہیں گے۔ اُن میں اُن کی زندگی کے نقوش ہمیشہ اُبھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش کو سنوارتے رہیں اور بہر پہلو و بہر حال سنواریں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اُس کے احساس کی چبھن کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدّت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ اُن کی ذات سے جو مجھے شغف رہا اور باون ۵۲ سال تک جو اُن سے نیاز خصوصی حاصل رہا۔ اُس کی ایک الگ داستان مرتب کرنے کے لئے اگر فرصت لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے جزو پورے کرنے کی ہمّت بھی ہو جائے تو بھی مستعدئ دل و دماغ کہاں سے لاؤں گا؟ اس تمام عرصہ میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور اُن سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی واقفیت اور اپنے تجربہ کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل اجل، ذہین، طباع اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدّین افغانی اور مفتی عبدہ، مولانا مرحوم ان دونوں کے نچوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔

اب ان کے گذرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات میں شدّت سے احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

کم لذّتم و قیمتم افزوں زشمار است
گوئی ثمر پیشتر از باغِ وجودم

گنگنایا کرتے تھے وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی اور اپنی ہی بات کو زیرِ لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا۔ کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمتِ اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبداللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اُس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اُس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش و ہر انداز سے ٹپکتی نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے جیتے جاگتے شاہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرزِ گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا۔ جو خطیبانہ مگر تیز رو تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور اُن کے درمیان حماسہ متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اُن کے حافظے کا

کمال یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرہنگ میں احمد نگر جیل ہماری فرصتوں کا آماجگاہ بنا تو انھوں نے اُس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا موضوع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دہرائیں، کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھیں اُن کو ہمیشہ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب جیسے ۱۹۰۸ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر حضرات کے ہمراہ میرے گھر پر تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول گیا تھا۔ لیکن ان کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فنِ خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ دو تین موقعے ایسے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے انھیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کہ جنگ بلقان کی گرماگرمی تھی۔ لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا کہ مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اُس وقت الہلال کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آئے تو جلسے میں لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے لئے تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت کے اشارے پر یونیورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا آزاد تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونیورسٹی منظور نہ کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر تھے کہ انھوں نے کبھی وقت و جگہ کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والئ رام پور فرما رہے تھے۔ جلسہ کا مقصد ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "الہلال، الہلال" کہہ کر چلا اٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی بیچارے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے بتدریج پختہ تر ہوتے ہو گئے اور میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ اُن کی غیور اور خوددار فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انھیں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو اُن کو گورنمنٹ سے نظربندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و عسرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف نہ آنے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منت و سماجت اور اصرار کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ لفظ وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ضبط کا یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انھیں غصہ آیا ہو۔ ہر مسئلہ پر بے حد ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی بُرائی کرنے والوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی اُن کے سامنے بُرائی کرتا تو وہ اُس کی کوئی اچھائی بیان کرتے یا تعریف کر دیتے تھے۔ صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت سے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات و لیڈران نے اُن کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اُس نیک دل نے نہ اُس وقت کسی پبلک اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ وہ اُن کے بارے میں کبھی کوئی خاص لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریئے کی ہلاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کر کے بدلہ چکانے کی سوچی بلکہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے تو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس کے لیڈروں کی پولیں کھولیں گے اور اُن کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے۔" کون تھا جو اس بلند اخلاق اور حسن کردار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مضرت رساں سیاست کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ "اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"

اگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے لئے اتنے الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی لیکن فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ صفحۂ ہستی

پر ثبت رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما۔

بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی تعلیمات ہماری عظیم قومی ثقافتی اور ادبی میراث ہے۔ اس لئے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی اور ادبی فریضہ ہے اس سلسلے میں آج کل کا "ابوالکلام نمبر" ایک مبارک قدم ہے۔ امید ہے کہ رسالہ مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور چھپے ہوئے گوشوں کو اُجاگر کرکے تشنہ کاموں کی تشنگی کو دُور کر سکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ رشتۂ اخلاص و محبت صرف ان کے ذوقِ جمال کا ہی رہینِ منت نہ تھا۔ دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقائد و اعمال سے زیادہ تر متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت بھائی چارہ، تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری عوام کا بھی یہی محبوب منزلِ مقصود رہا ہے باشندگانِ ریاست اس دشوار گزار، کٹھن مگر قومی فلاح کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان میں اسی طرح ایک زبردست عزم غیر متزلزل یقین اور پورے اعتقاد کے ساتھ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا نے اپنی ساری زندگانی میں زمانے کی ہولناک چیرہ دستیوں، چرخِ کہن کی کج روی اور ستم رانیوں کے درمیان انسانیت کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے فرقہ پرستی، تعصب، جہالت، حرص و آز کی، باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، محکم ایمان اور بے پناہ جوشِ عمل کے ساتھ لڑتے رہے یہ اُن ہی اصولوں اور آدرشوں کی یکسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے۔ کہ آج کشمیر ہند کے رشتۂ اشتراک میں ایسے بندھا ہے کہ توڑنے سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری عوام ہند کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعمیر، امن اور فلاح عامہ کے لئے سرزمینِ ہند پر ایک تاریخی اور یادگار جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات اور اصول ہمیں پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُبھار رہے ہیں۔ جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

الغرض مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ کے ایک ہیرو ہی نہ تھے۔ آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک اولوالعزم قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، جادو بیان خطیب بھی تھے۔ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، جیّد عالمِ دین بھی تھے، اور منجھے و سلجھے ہوئے مدبّر اور ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ قصہ کوتاہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بیک وقت کئی زندگیاں جمع ہوگئی تھیں۔ متضاد اور بٹی ہوئی حیثیتوں کی یہ جامع زندگی ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا ایک حسین اور دل نواز امتزاج تھی۔ جو ہماری قومی سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ قدر ورثہ ہے۔ وہ ورثہ جسے ہم سینے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پود کی زندگیوں کو خوش آئندہ اور تابناک مستقبل کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں سے مالامال کر سکتے ہیں۔

میں اس پیغام کی وساطت سے ہند کے قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی برفیلی پیشانی۔ کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی کے لئے دُعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیر آبپاشی و بجلی

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز علمیت تھی۔ ان کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں، کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا۔ اور زمانہ مدتوں اب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کر سکے گا۔ نہ معلوم دُنیا کو کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دُنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محبِ وطن اور بہت بڑے درجہ کے محبِ وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہوں گی۔ جس کو پڑھ کر ہماری آیندہ نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک علو اور بلند حوصلگی پیدا ہوگی۔ باوجود وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

مولانا ابوالکلام زندہ باد

مسز ارونا آصف علی میئر دلی کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کا چند لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ جس کسی کو انھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا اس کے لئے یہ ایک بھرپور تجربہ ثابت ہوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیاں وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی صبر و شکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور تر و تازہ کیا۔

ان کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انھیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک اردو کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مؤرخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تین شخصیتیں ہندوستانیوں کی دو نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوت تاثیر اس بات میں مضمر ہے کہ یہ عقل و کردار کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ برابر آیندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

تواریخ انتقال ابوالکلام آزاد از ہادی

ہادی القادری

۱۹۵۸ء

ہوئے جو حضرتِ آزاد زیست سے آزاد — بپا ہے قصرِ حکومت میں نالہ و فریاد
وہ جن کو فکر ہو تاریخِ سالِ رحلت کی — انھیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعرِ ہادی یاد

وزیرِ دانش و دانش ور و ادیبِ شہیر
۱۶۸۳

مجاہدِ وطن، آزاد، ابوالکلام آزاد
۲۷۵ + ۱۶۸۳ = ۱۹۵۸

وفورِ جذبۂ دل اور شدتِ احساس — بیاں کر نہیں سکتا ہے نطقِ انسانی
کوئی بتاؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی — زبانِ کلکِ جگر بار اشک افشانی
یہ کون اُٹھ کے گیا ہے کہ بزمِ اُردو میں — ہوئی ہے رنج و غم و درد کی فراوانی

ملی ہے خوب یہ تاریخِ سالِ فصلی بھی
ابو الکلام خطیب و ادیب لاثانی
۱۳ ت ۶۷

وہ جسے سب ابوالکلام کہیں — ایسے اچھے خطیب سے رخصت
عقل کرتی تھی جس سے استہلال[۱] — ہند کے اس لبیب سے رخصت
دوستوں کے قلوب جانتے ہیں — ہے قیامت حبیب سے رخصت

کوئی پوچھے اگر سنہ ہجری
کہئے ہادی "ادیب سے رخصت"
۱۳۷۷ھ

[۱] الہلال سے عقلوں نے روشنی حاصل کی ہے

فضا ابن فیضی

فردوسِ گُم شدہ

بہ یادِ آزاد

لُٹی لُٹی سی ہے ہر جنّتِ نگاہ کہ تو / تمام دل کشیٔ کائنات لے کے گیا
خیال و فکر کی نزہت، دل و جگر کا سکوں / نظر کی تازگی، لطفِ حیات لے کے گیا
جو صبح سے بھی حسیں تھی بہ یادِ روئے حبیب / تو اپنے ساتھ وہ پُر کیف رات لے کے گیا
کنارِ چشمۂ حیواں ہے خضر تشنہ بلب / تو اپنے جام میں آبِ حیات لے کے گیا
یہ کس مقام پہ ہے تو کہ جستجو میں تری / جنوں مجھے بہ حدِ ممکنات لے کے گیا

مجھے نہ بھولے گی تیرے جنوں کی وضعِ جمیل / کہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھا تو
بجھا کبھی نہ تری شوخیٔ ہنر کا چراغ / سحر کی اوس پہ ہنستی ہوئی کرن تھا تو
ملی تھی خلعتِ شادابیٔ بہار تجھے / چمن میں لالۂ رنگیں کا پیرہن تھا تو
خمارِ کم نگہی تھا تری شراب سے دُور / نمودِ نشۂ مینائے علم و فن تھا تو
ہزار صبحوں کا پیکر تھی ایک رات تری / جمالِ شامِ تمدّن کا بانکپن تھا تو

بکھر کے رہ گئی کاغذ پہ روحِ عصرِ رواں / اُٹھا لیا جو حیات آشنا قلم تو نے
حریمِ قوم و وطن کے اداس طاقوں پر / سجا دئے "ادب و شعر" کے صنم تو نے
سنور گیا مری راتوں کا بانکپن کچھ اور / دئے "ہلال" کو وہ دلبری کے خم تو نے
جبینِ "تاج و ہمالہ" پہ کلکِ ہمت سے / کیا فسانۂ انسانیت رقم تو نے
رموزِ دیں کو کیا فاش اس سلیقے سے / عرب کو کر دیا آوارۂ عجم تو نے

ہوا بھی تیرے چراغوں کا رُخ نہ موڑ سکی
خدا گواہ بڑا مستقل مزاج تھا تو
تری حیات تھی "سیف و قلم" کا گہوارہ
کہ شعر و دین و سیاست کا امتزاج تھا تو
کسے نصیب ہوئی تیرے فکر کی معراج
سرِ تدبر و خود آگہی کا تاج تھا تو
عجیب تھا وہ تری طبعِ سخت گیر کا لوچ
سمجھ سکا نہ میں پتھر تھا یا زجاج تھا تو
تو آنسوؤں کا وہ نم تھا جو میری آنکھ میں ہے
ملا جو مملکتِ دل سے وہ خراج تھا تو

کرن تراش لی تو نے غبارِ خاطر سے
شبوں کے روپ میں نورِ سحر ملا تھا تجھے
تضادِ "شعر و شریعت" کو کر دیا ہم رنگ
بلند کتنا مذاقِ نظر ملا تھا تجھے
ملی تھی آنکھوں کو تیری نظر غزالی کی
ضمیرِ پاک و دلِ خود نگر ملا تھا تجھے
شرابِ حافظِ شیراز تھی سبو میں ترے
بہ قدرِ شوق، سرودِ ہنر ملا تھا تجھے
وہ بے پناہ لطافت تری ظرافت کی
مزاجِ خندۂ گلہائے تر ملا تھا تجھے

سدا بہار تھی تیرے قلم کی رعنائی
تو چشمِ علم و ہنر میں خمار بن کے رہا
خوشا علومِ حدیث و کتاب کی تابش
تو اپنے سوزِ دروں کا نکھار بن کے رہا
بڑا غیور تھا عشقِ نیاز مند ترا
حضورِ حُسن بھی تو وضعدار بن کے رہا
لہو تھا کتنی بہاروں کا تیری نبضوں میں
نفس نفس ترا اک لالہ زار بن کے رہا
فضائے قلعۂ احمد نگر ہو یا دہلی
جہاں جہاں بھی رہا تو بہار بن کے رہا

وہ تیری آہِ سحر تھی کہ موجِ بادِ نسیم
قفس میں ڈال دی جس نے بنائے گُل ریزی
تھی تیری چائے کی پیالی ادا شناسِ سبو
بڑا حسین تھا یہ اسلوبِ کیف انگیزی
فغاں! کہ رندِ سحر خیز اب وہ تیرے بعد
رہی نہ آبروئے شیوۂ سحر خیزی
کرن بھی ڈوب گئی اپنے آفتاب کے ساتھ
کہاں وہ صبحِ تمنا کی اب دل آویزی
"کسے کہ زود گسل نیست دیر پیوند است"
زہے نصیب تری خوئے دیر آمیزی

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخنِ ہوش — جنوں ملا تھا بڑا عہد آفریں تجھ کو
تری نگاہ سے اسرارِ شوق کب چھپتے — عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ بیں تجھ کو
ہوائے منزلِ جاناں کب آئی راس تجھے — قرار مل نہ سکا ایک پل کہیں بس تجھ کو
بلند تر تھی ترے ذوق و کیف کی دنیا — کہ جامِ زہر بھی تھا جامِ انگبیں تجھ کو
بچھڑ رہا تھا کئی صدیوں کی شخصیت تیری — بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

نہ رہ سکا قفسِ رنگ و بو میں قید کہ تو — ازل سے فطرتِ آزاد لے کے آیا تھا
اُتر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند — وہ موجِ نکہتِ برباد لے کے آیا تھا
کسے خبر تھی تو ہنستی ہوئی نگاہوں میں — فسانۂ دلِ ناشاد لے کے آیا تھا
غزل سرا رہا ہر دور میں جنوں تیرا — غلط کہ تو لبِ فریاد لے کے آیا تھا
ترے لبوں پہ دمِ واپسیں تھا کس کا نام — تو دل میں کس کی حسیں یاد لے کے آیا تھا

ذائق بنگلوری

قطعۂ تاریخ بر وفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالمِ جیّد، فقیدالمثل، دانائے علوم — زیں سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمود ہاے
سرفروشِ ملک و ملّت شہسوارِ حرّیت — بست رختِ زیست راہِ آخرت پیمود ہائے
روزِ شنبہ بود بست و دو دیں از فروری — طائرِ جانش پرِ پرواز را بکشود ہاے
زادبومش بود مکّہ شصت و نہ سالہ حیات — در کنارِ خاکِ دہلی آخرش آسود ہاے

سالِ ترحیلش، مکرر گفت ذائق عیسوی
مشرقستاں از امام الہند خالی بود ہاے

٥٨ ء ١٩

ڈاکٹر ذاکر حسین

ابوالکلام آزاد ـ ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دلی کے اس تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی جو صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زیرِ صدارت ۲۳ ـ فروری ۱۹۵۸ء کو منعقد ہوا تھا ـــــ

راشٹرپتی جی، بھائیو اور بہنو! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں جمع ہیں ـ اب تک آپ کے سامنے جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کے ساتھیوں کی عقیدت کا اظہار تھا ـ میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں ـ میں ان کے ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں ـ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی کو بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے ـ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیئے کو سلگانا چاہتا تھا ـ اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتیاں بنائی تھیں ـ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں ـ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیئے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی ـ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا اس وقت اس بتی میں آگ لگی تھی ـ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی ـ لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انھیں سے لی تھی ـ میں ان سے دور دور رہتا تھا اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں ـ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا کبھی کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا ـ ابھی سال بھر سے کم عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان سے کچھ کھچا ـ اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کھچاوٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کوہِ وقار نے، بجائے اس کے کہ اسے میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بھرمار کی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے اُبلے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا ـ مولانا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے ـ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے عالم تھے ادب کے، ادب پر لٹریچر پر بڑی نظر رکھتے تھے ـ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے ـ کتابوں پہ عاشق تھے اور کوئی سیاست دان یہ نہ سمجھے کہ انھوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہو وہ آخر لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے ـ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک بار بھی بن سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ بن سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے ـ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے ـ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے ـ انھوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن اُن کے دل میں لگی رہی ـ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا ـ ابھی آخری مرتبہ دسمبر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے ـ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا ـ افسوس کہ

اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ کانگریس میں گئے اور نہ اس لئے بیٹھے گئے لیکن اُن کی یہ لگن آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انھوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس مفکر، اس مردِ مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمان بھائی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دُکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی ایک لفظ بھی کسی کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انھوں نے شکایت کی ہو یا بُرا مانا ہو۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے تھے اور وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے، مشورہ ہمیشہ صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کی جا رہی ہے وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مردِ مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ راشٹرپتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں، جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو روشن بھی کرتی تھی۔ وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بنانے کا کام کوئی کھیل نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے۔ اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام کھپ جائیں گے، کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیئے۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کسی کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے۔ جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایک ساتھ آ جاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آ گئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ پروا کر کے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے، یہ حق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رُخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں، عمل کی طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے، جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب چھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا، پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

بہار و خزاں

اور امید و بیم

"...اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجیے گا۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تجزیہ کے آخری عناصر یہی دو چیزیں امید و حسرت نظر آئیں گی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے یا رفتہ پر حسرت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجیے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اور اپنی اپنی آمد کے متضاد و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید و حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض ہیں جو اب صرف یاس و حسرت کے خزاں ہی کے لئے رہ گئی ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوشِ حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دورِ امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشتِ امید بن جاتی ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروسِ امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم نا دیدہ ہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کا میوہ ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاقِ مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر بادِ صرصرِ نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجیے کہ دنیا کا یہ تمام نظامِ منوّر آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے۔"

('الہلال' ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

ہمایوں کبیر

عہد آفریں شخصیّت

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان میں علم و ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے، لیکن آج تک ان کے ہم وطن جن میں ان کے مدّاح اور ناقد دونوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا بہ حیثیت سیاست دان۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ و ارفع عینیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ 'الہلال' کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوبِ نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے نوجوانوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرسیّد احمدؔ نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر کوشش کی کہ فاتحوں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دُور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت بن کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بُری پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے مدِّ مقابل تھی۔ جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لینے لگے تھے۔ سرسیّد کی ہندوؤں سے دوستی اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسیّد کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحّاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُر زور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکّا لگا اور پھر سرکردہ مسلم سیاستدانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ "الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے اُبھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقّی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ

مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لئے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے- لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی- یہ بات انھیں لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے ہیں- اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا- چناں چہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہو گئے- یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا-

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہو سکیں- ایک عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست داں عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے- مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے- ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں- یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حسّاس واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا- کسی شخص کے بارے میں ان کی پسند یا ناپسند ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی- انھوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے- اس مزاجی توازن اور سنجیدگی کی وجہ سے اُن کا مشاہدہ بہت صاف تھا- جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے- اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی- سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جب کہ توازن پر تعصب غالب آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم زیر نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے- مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی غیر ذاتی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں تلخ ترین مباحثوں میں بھی اُن کے منھ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انھوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا جنھوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا- مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں گھبرائے- اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہو گئے تھے- مولانا کی ہمّت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا-

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشاں بھی تھی اور کم آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی- حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی، البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محض ایک سیّاح کی حیثیت سے جامعہ ازہر گئے تھے- ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کر لی تھی- ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی- پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کر کے بعض مسائل طے کر لئے جائیں چنانچہ جب نوجوان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ کے باپ کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا؟ ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انھیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں-

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے- کسی کو جسمانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت- قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے، ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے انعامات ایک ہی شخص کو ملیں- مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے- لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا، جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے- وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انھیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسان کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی- چناں چہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف

اس قدر غلطیوں فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بے چین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا۔ جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلگ تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طبعِ خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انھیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ بنیادی طور پر وہ عقلیت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

منظور علی تمنّا فاروقی بجنوری

قطعہ تاریخ باہیں وفاتِ آزاد

١٩٥٨ء

ہزار حیف یکایک ز گلشنِ ایجاد — برفت سوئے جناں مثلِ بوئے گل آزاد

نرفت پیکرِ آزاد، رفت روحِ کبیر — چہ شد کہ حیف جدا شد ز خانہ خانہ زاد

دریغ، رہبرِ مخلص بہ وقتِ نامسعود — برفت و کرد دلِ دوستاں ز غم ناشاد

زعیم عالی ہمم، نیک رائے، خوش تدبیر — کشادہ قلب و نظر، دوربین و دور افتاد

ادیب، نکتہ رس و اہلِ علم و صاحبِ فن — کہ بود جنبشِ چشمش پیامِ علم و رشاد

ہزار عقدۂ مشکل، ز ناخنِ تدبیر — بہ صد خلوص بہ فکرِ رسا گرفت و کشاد

ہمیں کہ قوم و وطن را ز پنجۂ افرنگ — بہ نسبتے کہ او آزاد بود، کرد آزاد

بہ قولِ فیصلِ خود مطمئن بہ استقلال — بہ عزمِ کوہِ گراں یار، ہر چہ بادا باد

کسے نہ بود بہ ایواں، محال بر گشتن — زباں بہ گفت و بگوشش آمدہ "بجا ارشاد"

دراں زماں کہ باین ظلمت احتیاجش بود — ضیائے شمعِ ہدایت، دریغ رفت بہ باد

تمنّا، با دلِ غمگین، چشم اشک فشاں — سرِ تلاش چو بر آستانِ فکر نہاد

برائے سالِ وفاتش ندا ز غیب آمد

کہ حیف رفت بہ جنّت ابوالکلام آزاد

١٣٧٧ھ

نیاز فتحپوری

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہار خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بدایع کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظرانداز کر دینا جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصوّر، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصایص کا احصار کر سکتے ہیں، نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لارڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ "صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "سب کچھ اور کچھ نہیں یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔" لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دلکش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کُل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علٰحدہ علٰحدہ رکھ دیئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علٰحدہ علٰحدہ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیازِ رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیین و صراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچہ میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبّی و بدیع الزّماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علومِ حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر

دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوّف و اصلاحِ اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے تو اس کے تبحر علمی کا بھی ایک لطیفہ سُن لیجئے۔ یہ پیدائشی تو تلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں۔ رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ" وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا" تو کیا کہو گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے۔" رکب علی فرسہٖ وجرّ رُمحہٗ" اس میں چار جگہ رے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استویٰ علی جوادہٖ وسحب عاملہ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً" آ گیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانہ نے یا خود اُن کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال و البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ اترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے مُصنّف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالاتِ زندگی اور ان کے امیال و عواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت لذیذ دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے نوادر کامہٴ بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت، قدرت کا ایک سربستہ راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آ گئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ ان کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے۔ جنھوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقعہ نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلّفی میں بھی وہ اپنی "شانِ گرانمایگی" ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دورِ صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے اجرا سے ہوتی ہے۔ جسے انھوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں وہ زیادہ کھُل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے کسی معلمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا اڈیٹر المنار ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جا رہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اُردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر "تیر قبیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار" مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آ جاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں مدعیانِ فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں جنھوں نے مولانا کو ندوہ و اہلِ ندوہ سے بے زار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی سازشوں سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لیے انھوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انھوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چناں چہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مذہب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعۂ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حرارت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر الہلال کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ ارستقراطیت و استعماریت اپنے بقا و تحفظ کے لئے ناخن و چنگال کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوئے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا خطرہ ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصّوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان اور طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سر سیّد کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا۔ انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریکِ آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان چند نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرونِ ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابلِ ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ، زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرونِ ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انھیں سر سیّد تحریک سے دلچسپی ہونا چاہیئے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملّت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک و معاون ضرور تھا

لیکن انھیں خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اس کی برہمی نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا ساتھا جو روٹھتا ہے صرف منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دُنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکُبریٰ" میں صدرِ اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گزر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتداء عہدِ اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علٰحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں، البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا۔ لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور فرنگی تسلّط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرطِ اوّل قدم آن ست کہ مجنوں باشی" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملّت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصولِ مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آیندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عملِ تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج مج خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قایم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قایم کئے جائیں۔

یہی وہ اصولِ کار تھا جس کے پیشِ نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیازِ ملّت و مذہب، بلا امتیازِ نسل و رنگ کسی ایک غرض مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کریں اور اس راہ میں سب سے زیادہ پتھر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذباتِ نیاز کیش ہی کو حصولِ مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ مولانا نے کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں یہ زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت ذہنی خلجان کا دور تھا اور مولانا کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظرانداز کر دیتے جن سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی مجاہدانہ گفتگو کی، ترکی کی اندرونی کشاکش، اور اس کے خونچکاں انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کان پور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ پھر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دُکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحۂ عمل مرتب کرے۔ چناں چہ الہلال کا اوّلین دور اسی سعی و کوشش کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا ابنائے ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چناں چہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست کی تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے زیادہ قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا مُستقرا انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ بھی۔

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے صاحبزادہ جمیل میاں کی تقریبِ شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوتِ حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکماءِ اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حیّ بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دل چسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آ جاتے ہیں۔ عُرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایۂ و عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بزورِ بازوئے نفعِ کاسیانِ ضعیف
بہ چینِ ابروئے بے وجہہِ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دورِ ملوکیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے یہ سنکر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آ گیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آ گئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی

پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قسمیہ اشعار اس طرح سنانا شروع کئے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراج کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوبِ تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوبِ تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریقِ ابلاغ کچھ مختلف تھا یو رہی تھے لیکن رُخ دوسرا تھا، اندازِ قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا:

"شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ"

اور البلاغ کا: "جلوہ بر خود کن و خود را بہ نگاہے دریاب"

الہلال۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن، البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوتیت شکن۔

الہلال۔ عرفی کی زبان میں نویدِ سر فروشی تھا کہ

برو پیالۂ خونیں بخر ز قصاباں
مشو گدائے شبانان کہ شیر می دوشند

اور البلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا۔ "تو نے بہ جگر جمع کن و بروں آ" کا

الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بے باکانہ اعلان کہ

نازک دلانِ باغِ تو چوں شبنم سحر
مے بر زدند برگِ گل شکن۔ آبگینہ ما

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دلِ گم گشتہ سراغ زتِ زکیفیتِ شوق
نشۂ بالا اگر از دست رود شیشۂ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتوِ ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستہ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدر اول کا میگزین بھی جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات الغرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوقِ انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تا کہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کر کے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماوراء دیر و حرم "ہر جا کنیم بداں آستاں رسد" کا مبلغ ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دَور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اوّل خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے جس میں منطقی چوں و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و فدایانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سر عسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کہ انھوں کا سا وزن و وقار، جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

جمیل مظہری

ماتمِ آزاد

آہ اے آزاد، اے بھارت کے لعلِ شب چراغ — آہ اے آزاد، اے قومی سیاست کے دماغ
لہلہایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا باغ — تجھ کو تربت میں مبارک آج لمحاتِ فراغ

کارواں جائے کدھر اب رہبری کے واسطے
ذہن بھٹکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا — کچھ دنوں تک سب جسے دیکھا کئے وہ خواب تھا
سینۂ ہندوستاں کا شعلۂ شاداب تھا — زینتِ کرسی و زیبِ منبر و محراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چمن، اک بزمِ رندانہ کہیں
اک ادارہ اک دبستاں اک کتب خانہ کہیں

تیرا ہر نقشِ ادب اک نقشِ پائے اعتبار — سرمۂ چشمِ بصیرت تیری خاطر کا غبار
تیرا آہنگِ خطابت جوشِ قلزم در کنار — کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبضِ ملّت میں دھک تیرے لبِ گفتار سے
دھڑکنیں دل کی معیّن وقت کی رفتار سے

فلسفے کی روح گھل کر جانِ میخانہ بنی — شوخیٔ تحریر سے تاریخ افسانہ بنی
خامشی محفل میں کیف و کم کا پیمانہ بنی — سینہ چاکی گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابی حرم سے تا بہ بتخانہ ہے آج
سوزِ دل تیرا متاعِ شمع و پروانہ ہے آج

مرحبا اے ساقیِ کیف و نشاطِ حُرّیت — ذہنِ مستقبل میں تجھ سے انبساطِ حُرّیت
مرحبا اے مجلس آرائے بساطِ حُرّیت — کس قدر باریک و نازک تھی صراطِ حُرّیت

پائے ہمّت کو ترے دی اک خلش ہر خار نے
چُن لئے کانٹے بیاباں سے تری رفتار نے

آستانوں سے اٹھائی تو نے تہذیبِ سجود   سربلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود
کیوں مؤرخ پہ نہ گم ہوں تیری آیاتِ شہود   تو نے خود مقصد پہ قرباں کر دیا حبِّ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی امر کہ ہیں روس میں
شمع تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخ آہنگِ خرام   جوش کو سنجیدگی، جذبات کو اک انتظام
ہند کو روحِ عمل اُردو کو اک زورِ کلام   راکھ کو چنگاریاں شعلے کو اک رقصِ دوام

سوز کو اک نغمگی دی ساز کو نغما دیا
اب بھی کیا تاریخ پوچھے گی کہ تو نے کیا دیا

ہوگا جب تیرا کمالِ باغبانی بے نقاب   کھیت سے تاروں کے جب اُگنے لگیں گے آفتاب
تب وفا اس دل کے زخموں کا لگائے گی حساب   جس کے خوں کا ہر قطرہ تھا تخمِ انقلاب

جس کے چھینٹوں سے ہری کشتِ چمن ہے آج بھی
جس کی سُرخی غازۂ روئے وطن ہے آج بھی

ناخدا کو بھی سُلا سکتے ہیں جھونکے خواب کے   جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے
دھمکیاں ساحل کو دیں اب حوصلے سیلاب کے   اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے

تیرگی سی ہے دماغوں میں مناظر کی طرح
صبح کا چہرہ بھی اترا ہے جواہر کی طرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ زندہ ہے وفا   سن رہے ہیں موت کا ہم فاتحانہ قہقہا
کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اڑائیں مضحکا   نعرۂ "آزاد زندہ باد" سے گونجے فضا

ہے طبیعت پر جو مایوسی کا زنگ اڑنے لگے
سُن کے نعرے موت کے چہرے کا رنگ اڑنے لگے

اے جلوسِ آخری تیرا نگاہوں کا سلام   گرم اشکوں کا سلام اور سرد آہوں کا سلام
رہبروں کا، رہروں کا، شاہراہوں کا سلام   عالموں کا، شاعروں کا، کج کلاہوں کا سلام

آج وہ دن ہے کہ بھارت کا علَم سجدے میں ہے
مظہری سجدے میں ہے اس کا قلم سجدے میں ہے

محمد اجمل خاں

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے راتوں رات ہندوستان میں کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" والا رزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگرس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابی (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے، اس لئے کہ وہ بحیثیت صدر کانگرس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی پر رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں کہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا، کسی کا پتہ نہ چلا۔ ریفریشمنٹ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ لہٰذا گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ حاضری لی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر والنیٹروں اور والنیٹریوں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا رزولوشن سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضا کاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے۔ ہم (ارونا جی اور میں) وہاں پہنچے۔ ارونا جی نے جھنڈا لہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے دخانی توپوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ ننھے ننھے رضا کار بچوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گولہ باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" ختم کیا۔ اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نہتے راہ گیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی مع کچھ اور لوگوں کے پہنچ گئیں۔ بیہوش لڑکیوں کو اسپتال بھیجے کا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لئے

. . . . . .

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔ آخر وہ قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں:

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھئے کہ اپنے دل بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔ مخاطب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے۔ خطوط سیاسی نہ تھے۔ یعنی نہ اُن میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نتیجے نکالے گئے تھے، نہ قربانی کے فلسفے پر لکچر تھے۔ اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا

سکتا تھا - نہ یہ لوگ اس طرح گے تھے کہ خفیہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے - وہ سب مہاتما جی کے بنائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی "مقصد کے ساتھ ساتھ ذرائعِ مقصد بھی پاکیزہ و مناسب یا جائز ہوں۔ نوجوان طبقہ اس اصول کو مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جن اصولوں کو ہمارے بڑے بوڑھے (یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبر) ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اگرچہ عام حالات میں ناجائز سمجھے جائیں مگر مقصد کی پاکیزگی انھیں بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا بُرا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس ہاتھ کی بدولت سوسائٹی کا مسلسل نقصان ہوتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نامناسب سمجھا جائے گا یا اگر خود اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا ڈاکٹر کی رائے نہ مانی جائے گی۔ بہرحال یہ لوگ خفیہ کارگزاری کے خلاف تھی - اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

مجبوراً مولانا نے خطوط لکھنے شروع کئے۔ جواہر لال جی نے "ہندوستان کی تلاش" شروع کردی - اور جب میں نے مولانا کے ان خطوط کو شائع کیا تو بہت سے ادب نوازوں نے تو یہاں تک مجھے لکھنا شروع کیا کہ کاش یہ لوگ سیاست میں نہ پڑتے اور عمر بھر قید و بند میں رہتے، تاکہ ایسے ایسے تاریخی و ادبی شاہکار تیار ہوتے رہتے۔ دیکھا آپ نے ان خود غرضوں کو! یہ لوگ تو جیل سے باہر رہ کر دماغی عیش کرتے اور لیڈر بیچارے دیوارِ زنداں سے سر پھوڑا کرتے۔
خود ان کی قید ایک پیغام تھی، جس نے پورے ملک کو یہ دعوت دی تھی کہ

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

"الہلال" و "البلاغ" نے مسلسل یہی دعوت دی تھی - "ہری جن" کا یہی پیغام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کی صبح کو جو ہفتہ وار "ہری جن" نکلا تھا وہ پانچ پانچ روپے میں بک گیا، اور پھر ڈھونڈے نہ ملا۔ اس میں پیامِ عمل تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزاروں نوجوانوں نے سینے پر گولیاں کھائیں - اور آخرکار حکومتِ برطانیہ مجبور ہوئی کہ اپنا بستر سنبھالے۔ Quit India زندہ باد!

مولانا نے اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے ہزاروں خط لکھے اور لکھوائے ہوں گے۔ ان خطوں کی الگ الگ نوعیتیں کی جا سکتی ہیں۔ مولانا شاعر نہیں کہے جا سکتے، لیکن آپ کے ادبی خطوط کی نثر میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں انھوں نے جو خط بحیثیت ادیب کے نہیں لکھے، ان میں ہر صنف کا خط ظاہر کرتا ہے کہ کاتب مدبر ہے، مصلح ہے، فقیہ ہے، دوست ہے، بزرگ ہے، یا کیا ہے!

حسرت موہانی نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں جس کلام میں آمد ہی آمد ہو وہ عاشقانہ، عارفانہ یا فاسقانہ ہوگا۔ جس میں آورد ہی آورد ہو وہ ماہرانہ، ناقدانہ یا ضاحکانہ ہوگا۔ جس میں آمد و آورد مخلوط ہو وہ شاعرانہ، واعظانہ یا باغیانہ ہو سکتا ہے۔ ضاحکانہ کلام میں اگر ابتذال ہو تو وہ سوقیانہ ہو جائے - اور فاسقانہ کلام میں جذبات ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر حملہ ہو اور سوسائٹی کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے۔

اگر ہم نثرِ مرصع، و عاری و عریاں وغیرہ کی صوری صنعت گری سے قطع نظر کر لیں تو معنوی حیثیت سے حسرت کی تبویب نثر پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حاکمانہ (جابرانہ، ظالمانہ یا عادلانہ)، عالمانہ (مورخانہ، ناقدانہ، فلسفیانہ)، احمقانہ یا مجنونانہ (مثلاً
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی) - غاویانہ (مجرمانہ لا اُمانہ، الشعراء یتبعھم الغاوون) - ناصحانہ (مشفقانہ، دوستانہ) بے بسانہ (فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے) - اسی کی ایک قسم بڑبڑانا بھی ہو سکتی ہے۔ خامشانہ (یعنی وہ کلام جس کا جواب خاموشی ہو) خاموشی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں - ایک تو یہ سوال ہی لغلانہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جواب کے لئے سائل کی بصیرت و علم اونچے درجے کی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ جواب نہ دینے میں کوئی مصلحت ہو۔ چوتھے یہ کہ جواب دینے سے فتنہ پڑ جانے کا اندیشہ ہو اسی لئے ایک محاورہ بن گیا ہے کہ گفتار کی گالی ہنس کے ٹالی - بہرحال

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

ذیل میں ہم چند خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں جو دوسروں نے مولانا کو لکھے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں۔ بعض کے دو حرفی ہیں - اور بعض کے متعلق خموشی ہی جواب ہے۔ ان خطوط میں آپ کو "غبارِ خاطر" کے خطوں کا لطف تو شاید نہ آئے، اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں اور بالارادہ 'غبارِ خاطر' کو ادبیات کے خم میں غرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں جن میں مولانا کے فیصلے نہ صرف ناطق ہیں بلکہ محترم ہیں۔ یہ خط انھیں پیش کئے گئے اور پیش کرتے ہی ان کے جواب برجستہ اور بے تکان دئے گئے۔ جواب دینے میں ایک لمحے کا تامل نہیں

ہوا۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور مشتے نمونہ از خروارے ہیں جنہیں موقع ملنے پر شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کر دیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (حال ایم۔ پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوڑا بھیج دیئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کر دیئے گئے تھے۔

رام نواس

بانکوڑا

۱۵۔ جون ۴۵ء

صدیق العزیز جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ آج صبح مجھے رہا کر دیا گیا میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار ایکسپریس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آ جائیں امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہو گئے ہوں گے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں افسوس ہے کہ با اطمینان گفتگو کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) کابل میں تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں دو انقلابیوں یعنی مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم پرائم منسٹر تھے جنھوں نے ۱۹۲۷ء میں کیلیفورنیہ میں وفات پائی)۔ مولوی محمد بشیر صاحب امیر مجاہدین سرحد وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور یونیورسٹی میں فرنچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلے وزیر خارجہ تھے (جو برلن میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آج کل رکن پارلمان ہند ہیں) حکومت کابل آدیانہ اور انقلابیان ہند کے روح رواں تھے۔ اقبال شیدائی صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں:

یہاں علم تنجیم یا جوتش کا خیال آ گیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر، ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر۔ ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور)۔ پروفیسر اقبال علی شاہ (میرٹھی۔ مصنف) اقبال شیدائی صاحب انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائی کورٹ) اقبال سنگھ (کرکٹ)۔ ۔ ۔ ۔

بسمہ اللہ تعالےٰ

۱۲ جون ۵۸ء

سیدی و مولائی - السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

یہ غالباً تیسرا مکتوب ہے جو خدمت عالی میں ارسال کر رہا ہوں اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو اب تاریخی واقعہ ہو چکا ہے ارسال خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے باعث دلچسپی ہوں۔ ایک اور صحیفہ بھی ہے جو مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم و مغفور نے ہٹلر مرحوم اور سینیر موسولینی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی دوسرے وقت میں ارسال کروں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

حضور کے جواب کا ایک مدت سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قاہرہ - ۳ر اکتوبر ۵۵ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ - سلام مسنون - مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے میرے عریضہ کا جواب دیا - کہ حضور میرے لئے دست بدعا ہیں کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو - شکریہ - مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے - بہرحال مایوسی گناہ ہے -

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا - ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں چلا جاؤں - وہاں پرانے دوست بھی ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں - آخر دن کٹی کرنا ہے - فی الحال مدِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں - یعنی سیاسی - خدا کرے کچھ تجارتی کام چل نکلے - دعا فرمائیے گا -

یہاں مسٹر ڈیسائی ہائی کمشنر اتفاق سے مل گئے - ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمتِ عالی میں بھیج دیا - استادِ مرحوم کا مرید ہوں یعنی ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں -

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

یہ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصدِ حیات ہی حرکت و ہیجان ہے - جس نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جیلروں تک کو انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا - وہ ایک کوہِ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے - شمعِ حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے ! مولانا کے بعد

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں !

محترم المقام سلام مسنون -

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے - کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے - اصلاً یہ ایک اعتراف ہوگا - ان علمی - ادبی - تفسیری - دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں -

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایان اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں - اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہلِ قلم اور اہلِ سیاست سے رجوع کیا ہے - جو مولانا سے قریب رہے - یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں -

نیازکار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

بھائی اجمل

سلام مسنون، آج ہی ایک خط، حضرت مولانا مدظلہٗ کو بھی لکھا ہے، کبھی تو اُن کی نگہِ التفات کو آمادہ کیجئے - ع

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

اس دفعہ سال نامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصہ نقشہ جمایا ہے، دو سو صفحے، کئی تصویریں - سہ رنگی و یک رنگی، پریس اپنا ہے، آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے - اپنے قلم کو بھی حرکت میں لائیے - مولانا مدظلہٗ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھئے -

یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں دردمندانہ خواہش بھی ہے، ایک بات ضرور پیشِ نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں - آپ کا بھی اور مولانا کا بھی - فرمائیے اُن سے کیسے التماس ہو،

جواب کا منتظر

المخلص

شورش کاشمیری

9-11-55

جواب - کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آکر مل لیں -

ایک ہندو سنیاسی کا خط

۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء

مخدوم مکرم جناب پیر و مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ اک عرصے سے آرزوئے خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر موقعہ محل و نیز دیگر مجبوریاں تھیں۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں اُمید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی عنایت کریں گے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کیوں جواب دینے لگا مگر بلند خیالی و پاک دامنی کا سہرہ لوح دنیا پر ہر سو پھیلا ہوا ہے اس لئے امید ہے۔

آج میں نے ہندی کی سخن و شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تصانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص ماننے کو تیار ہے۔ مگر مذکور کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا۔ بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ غرض کتنے ہی الفاظ بے تکے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سیاست سے نکال کر مجھے دو الفاظ میں صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدائے تواریخ پر چند حروف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط و نیز دیگر غلطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ شعر نامعلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے تو ہیں خدا کے بتوں میں پتھر ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش

سوامی۔ برھم دتہ ہنس

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفیہ یونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلا سوف بنا ہے۔ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

رانی کھیت ضلع الموڑہ

۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہٗ

آداب۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف کریما سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمۂ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہلِ ہند کو مستفیض کرے۔ شرط طلب یہ ہندی کتاب بسر و چشم ارسال خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا خاکم بدہن اسیر تھے تو ایک چڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعثِ تکلیف ہوتی تھی آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جدوجہد میں پھر حالاتِ ماضی رونما ہو جائیں یہ تجویز پیشِ خدمت ہے کہ آئندہ آپ کے بستۂ وزارت میں ایک ربر کا گیند بھی اضافہ کر دیا جائے جو بوقتِ ضرورت ایسے مُدخلین کے تدارک و اندفاع میں تیر و تفنگ تو کیا بم اور بومرینگ (Boomrang) سے بھی زیادہ مؤثر ہوگی۔

چونکہ میں مہاجر اور مزدور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستدعی ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ وہو ہذا۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیا و در کشتیٔ چشم نشیں و سیرِ دریا کن

۲۔ منم آں شمعِ تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

نیز مغلیہ بادشاہوں کے مشہورِ عالم باغ موسومہ شالامار کے صحیح نام اور وجہ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائع نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصلی نام شعلۂ ماہ باغ تھا۔ براہ کرم اس کی تدقیق و

تصدیق فرمائیں۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعاگو و محتاجِ دعا

نیاز اساس

مری کرشن واس، یاس خراب آبادی

جواب:۔ پہلا مصرعہ آتشی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلی میں بھی تھا اور نگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا۔ لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

. . . .

مکرم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سابق اڈیٹر انقلاب لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدردان۔ کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی زلزلوں نے اس رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استواری بخشی۔ لاہور میں اُن سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم ہند کے بعد مہر صاحب کا دلی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوں پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی باہمی محبت و خلوص کے لئے شاہد عدل ہیں:۔

باسمہ سبحانہ

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۷ء

برادر محترم۔ میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد آ رہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی۔ لیکن دفعتاً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ چند ضروری باتیں پیش نظر ہیں، ستمبر میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے اس سفر میں چار پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیش نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں ضمناً لکھے یا دوسرے اصحاب نے مستقل کتابیں تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہ عنایت میرا یہ عریضہ مولانا کو سنا کر جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سالِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے۔ لیکن مہینے، تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲۔ "لسان الصدق" کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۰۳ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ "الندوہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ مولانا "وکیل" میں کب سے کب تک رہے

۵۔ مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بسلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد ۱۸۵۷ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے؛ اس لئے کہ بمبئی، بنگال، برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے ۱۸۹۰ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؟ میں نے ۱۹۴۲ء میں ان کی قبروں کی زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھ لی تھیں، لیکن اب وہ تحریر کہیں کاغذوں میں گم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی

۱۰۔ رانچی میں مدتِ قیام کو "نظربندی" سے تعبیر کرنا درست ہوگا یا "اسیری" سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "اسیری" میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے یہ سطریں لکھی ہیں لطفاً یہ بھی لکھئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت

سنبھل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں۔ سید صاحب کی سیرت کی جلد اول کے پروف بھی دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پروفوں کا انتظار ہے۔ کتاب انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

نیاز مند

مہر

جواب۔ بہتر یہ ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہ سبحانہ

۶۔ مئی ۱۹۵۴ء

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل عریضہ خان صاحب کی وساطت سے خدمتِ گرامی میں بھیج چکا ہوں۔ آج دوپہر کو لیٹا تو معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے "غبارِ خاطر" میں کسی قدر بدل کر چھاپا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ غور و فکر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی۔

شعر یوں ہے :۔

من ازیں دردِ گراں مایہ چہ لذت یابم
کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

لیکن غبارِ خاطر میں "دردِ گرانمایہ" کی جگہ "رنجِ گراں بار" چھپا ہے

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کس وجہ سے تبصرہ لکھا تھا؟ آیا اس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس تبصرہ کا کوئی ٹکڑا آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہلی دوبارہ آؤں تو پوچھوں۔

والسلام علیکم

نیاز مند

مہر

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے دیوانِ عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں۔

شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں

و قوعہ گوئی کے طرز کی بنیاد ڈالی۔ وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس معنی میں اردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے، موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین خاں کی معرکۃ الآرا کتاب 'لوازمِ فلسفہ' چھپ گئی ہے مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتنا وقیع ہے!

"لوازمِ فلسفہ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے معلولات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے۔ Emergent کے لئے آپ نے خارجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا میں نے الہلال کے زمانے میں اس کے لئے ظہورِ فجی کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر میں نے اس کے لئے زیادہ موزوں عربی فلتات پایا جو فلتہ کی جمع ہے۔

Atom کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن عربی کی پرانی اصطلاح جوہرِ فرد ہے۔

آپ نے Dilectic کے لئے کلامیات و جدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات اس کے لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism ۔ کے لئے آپ نے اختیاریت استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیئے

آپ نے Mass اور Quantity کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ماس کے لئے صحیح لفظ جرم ہے نہ کہ کمیت۔ الہلال کے مضامین میں میں نے ماس کے لئے جرم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ اعیان کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے۔

Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردِّ عمل دو لفظ لئے ہیں۔ ردِّ عمل Reaction ہے Response کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے آپ نے ذات اور نفس دو لفظ لکھے ہیں۔ ذات استعمال کیجئے، نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں گے تو Nous کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں Noetic کے لئے نفسِ ناطقہ استعمال کیا گیا ہے

Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ لیا ہے۔ پھر آپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برق مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل المخارج ہوں بجنسہٖ اختیار کر لینے چاہئیں۔ اردو میں Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں

Pluralism کے لئے آپ نے کثرتیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہبِ کثرت کر دیجئے۔

. . . .

شری دیانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترم مولانا صاحب

معاصر 'امروز' لاہور نے آپ کا مضمون 'اسوۂ حسین' ماخوذ از 'داستانِ کربلا' بشکریہ 'نفیس اکیڈیمی' اپنے مورخہ ۱۴۔ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانا ئے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقعہ پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔

خادم

دیانند شرما

جواب:۔ جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری اور بھائی چارہ "پر عام طور سے اس میں زور دیا گیا ہے اُو

اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

مساواتِ انسانی کا یہ تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے۔ رہ گئی اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرتِ صحیحہ اُسے راستہ دکھا چکی ہے اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد

۲۳۔ اگست ۱۹۵۶ء

معظمی و محترمی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔ اگست کا بے حد مشکور ہوں۔

حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالےٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخِ ثقافتِ عالم میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی سچی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالمِ تحقیقات کو مکرر دستیاب ہو جائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے پروف مکرر ملفوف ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۴۔ جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمائیے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

منتظرِ کرم

محمد نظام الدین

جواب:۔ کتاب الہند کی طباعت و اشاعت یقیناً ایک علمی و ثقافتی کارنامہ ہے دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد کے پولیس ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرونِ ہند سے اس ادارہ کی سلامتی کے متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ - ۴ ستمبر ۱۹۵۵ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں - چند ایک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے اُلجھن بنے ہوئے ہیں - آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمینِ پاکستان و ہند میں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا - لہٰذا آپ ہی کو تکلیف دے رہا ہوں - میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں - لیکن ایسے کیا کیا جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا -

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے مسئلۂ توحید اور اس کے بعد محض عمل صالحہ پر زور - یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابلِ قبول - لیکن اس کا کیا جواب کہ تاریخ کے اعتبار سے (قرونِ اولیٰ کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں - کم از کم بارھویں صدی عیسوی یا خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دروازہ ایسا مسدود ہُوا کہ پھر نہ کھُلا - اور آج تک پیروانِ اسلام ذلّت و ادبار میں مبتلا ہیں - میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروانِ اسلام دو مختلف چیزیں ہیں - اور دونوں کو خلط نہیں کیا جا سکتا - لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں - تہذیب و تمدن، اقتصادی مرفہ الحالی، خدمتِ علم و سائنس، وراثت فی الارض، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص انفرادی اور اجتماعی، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور پھر بظاہر کوئی صورتِ اصلاحِ حال کی دکھائی نہیں دیتی - مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں - اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں - خدمتِ خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا عیسائی اقوام کے اندر اس قدر دور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے - علم و فن کے ہر گوشے میں وہ ہم سے پیش پیش ہیں -

اس سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ جن جن تہذیبوں نے اس دنیا میں آج تک سر اُٹھایا مثلاً بابل و کلدانیوں کی تہذیب ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب، مصریوں کا عروج و ترقی، یونانی اور رومن تہذیبیں - یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ اُبھریں - تو کیا فطرت کا یہ ازلی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے - اور پھر وہ نہیں اُبھرتی - بجنسہٖ یہیں اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہُوا - ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا - لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب آنا چاہیئے - لیکن ایسا نہیں ہو رہا -

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں - وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں - حالی مرحوم جس قدر بُرائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں - آج کے مقابلہ میں شاید وہ دور بہتر تھا - شرافت، دیانت، تحمل، وسعتِ قلبی، ایثار، رحم، سچائی، عدل و انصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دُور کا بھی تعلق نہیں - نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلایئے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاحِ حال کی امید ہے -

جو میرے ظنون و شبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالمِ اسلام میں یہ حالت کیوں ہے - مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن نہیں - لیکن آخر امید کی کرن کب روشن ہوگی - ان امور کا جواب دیجئے اور ضرور وقت نکالیئے - میں پُرانا نیاز مند ہوں اور تسکینِ قلب کی تلاش میں ہوں -

آپ کا ادنیٰ نیاز مند

نور حسین

جواب :- اسلام دینِ فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے - باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی

لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اب لوگوں کے بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفسار

رانچی چرچ روڈ
۴۔ اگست

ذوالمجد والکرم حضرۃ مولانا محترم! ادام اللہ بقائک۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں۔

آپ نے اپنے "ترجمان القرآن" میں "ما ملکت ایمانکم" کے لئے نکاح ضروری قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی ناجائز ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورۂ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ "قرآن کے نزدیک اتحاد تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔" حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے ملک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شاہد ہے' فانکحوھن باذن اھلھن' اور دوسری آیت وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں "الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم" سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانھم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقد مناکحت کے بعد ملک یمین بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملک یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد حرہ بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری و عزیزی و قاضیخان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملک یمین سے بدون نکاح وطی جائز ہے اور اس دور حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابن سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی سے بغیر نکاح وطی جائز ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن و حدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

راقم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنا لئے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدا میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے شدائد کو کم کیا اور پھر سورۂ محمد کی آیت فاما منا اما فداء نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آ چکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورۂ مومنون میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سرمد شہید کے متعلق استفسار

۴۸۶

لاہور

گرامی قدر جناب!

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاسِ عالم پر ابھریں گے جو اوراقِ پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، صفات اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خونِ شہادت کے قطرے" نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہِ کرم مجھے وہ کتب اور رسائل تجویز فرمائیے جن کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوب تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیر اندیش
کرم الٰہی بدر

جواب۔ فارسی شعراء کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ ہندوستان کے تذکروں میں مرآۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستانِ مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی میں ہوا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں؟ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی سخت گیر کسوٹی پر ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی پابندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؟ اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کی عمر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول اور نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں نسلوں زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے اور اس کا اٹوٹ سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گزشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علوم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ ان کی خلّاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن مُلّا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا:-

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ان کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند، جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام

نہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اُترے، بلکہ محبت اور سمجھداری کے ساتھ انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب کبھی وہ راستے سے بھٹکے اور مولانا کی طرف سے انھوں نے بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور معلمی اور ہدایت کے فرض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑایا لیکن یہ مردِ مجاہد، یہ کوہ وقار مومن اپنی جگہ پر، اپنے اصولوں پر، اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا اس شان کے ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، نہ مخالفوں اور بدباطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ "یہ کیسے عافیت ناشناس ہیں!" یعنی نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ اُن کے دل میں کینہ کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو اُن کے قلبِ صافی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے:

شد آستینہ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُن کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور بُرائی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق اور صداقت کی رسی ہے، جو ہدایت کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو، اس مضبوط رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں "اپنوں" کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں "غیروں" سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے "اپنے" وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور "غیر" وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے کاموں میں تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں اُلجھے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی بُرائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ فلاں "چھوٹے دل و دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی!

انھوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند کی مصیبتوں اور قربانی اور ایثار کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا لیکن جب آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقف کر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشمکش انصاف اور دیانتداری پر غالب آجائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو "قوم کے ضمیر" کا خطاب دیا تھا۔ یعنی اس میدان میں انھوں نے اس فرض کے بار کو اُٹھایا تھا جو گاندھی جی انجام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہوگئے ہیں۔ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگرس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہِ عمل معین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک اب وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلّی والوں کی، بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، صبر اور ضبط کے بندھن توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲۔ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سُنا "ارے تمھیں کیا معلوم ہے آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت"! ایک معنی میں یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور

ڈھالنے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیشِ نظر اس بوڑھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا۔ فقر اقبال کی اصطلاح میں یعنی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اسی وجہ سے اس کے ہاں قصرو شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اٹھتا تھا

نہ تخت و تاج ہیں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال نہ دولت، نہ جائداد نہ سرمایہ۔ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درسگاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دفعہ کے سوا کسی یونی ورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخِ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں!

مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور اندازِ فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور گداز تھا جس کے افسانے زبانِ خلق مدتوں تک سنائے گی۔ لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انھوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے، میں رانچی میں نظر بند تھا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے۔"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرے پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے! اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلبِ صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مردِ مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہتِ ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منوّر کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں

دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکرِ حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے —— یہ تھے مولانا آزاد — ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا ؟ بقول حالی

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں — اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیر ینی — ڈھونڈتے کیا ہو سیبِ لُبناں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش — گوشِ گُل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

آخر میں ایک قطعہ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری سطر میں امید کا وہ پیغام ہے جو دکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد!
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فغاں بن کر
دل پہ آج ہجومِ یاس تیرے غم میں ہے آزاد!

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھا اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روحِ فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!

یہ تو تھی جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے۔

گفتی: نیست کہ بر غالبِ ناشاد چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت!

سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

ہُوا غروب وہ مہرِ کمالِ علم و ادب — قمر "ہلال" کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
بلند جس نے کیا تھا نشانِ آزادی — عمل میں گاندھی و نہرو کے تھا جو دوش بدوش
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد — جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحبِ ہوش
بساطِ علم و فراست پہ اہلِ ہیت و کشاد — تھے اُس کے سامنے شاگردِ دین کے حلقہ بگوش
نہاں تھے لاکھ تکلّم سکوت میں اس کے — بتائے مشک کی خوشبو نہ جیسے مشک فروش
وہ سو رہا ہے بظاہر فنا کے دامن میں — پر اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آغوش
زبان موجۂ سیلاب تھی دمِ تقریر — کہ جس طرح ہو سمندر میں وقتِ طوفاں جوش
جہانِ علم و ادب میں جو چھایا سنّاٹا — تو آئی غیب کی جانب سے یہ ندائے سروش

خبیر مصرعِ "تاریخ" لکھو ہجری میں
اُداس اُداس ہے مجمع ابوالکلام خموش

۱۳۷۷ھ

ظفر حسین خاں

ابوالکلام بہ حیثیت انشا پرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک بڑے مقرر بھی تھے اور انشا پرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن غور کیجئے تو اُن کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی اُن کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کی سیاسی تقریریں، اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ اُن کے فلسفیانہ افکار صاف اور ستھرے ادبی پیرایۂ بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کے آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا، اسے ادبی اعجاز نہیں تو کیا کہئے ؟ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازہ سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے۔ جنھوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت، اُن کی انشا پردازی کی رہینِ منت ہے۔ اور یہی کہنا چاہئے اُن کا اصلی جوہر ہے۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار ۱۹۱۰ء میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں کی چاشنی سے زبان آشنا تھی۔ اُن سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ سنا مولانا لکھنؤ آئے ہیں اور سول ملٹری ہوٹل میں قیام ہے۔ سول ملٹری ہوٹل، اس زمانہ میں لکھنؤ کا بہترین فیشنبل ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یوروپین منتظم کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ مولانا اور سول ملٹری ہوٹل! یہ ایک اجتماعِ نقیضین سا معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میرے ہم مکتب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ چناں چہ میں نے انھیں کو اپنے تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اُس کمرہ کے برآمدہ میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرہ کے اندر سے میں نے ایک "کلین شیو" نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم و بیش ہم لوگوں کے ہم عمر ہی تھے اور ابھی ڈاڑھی مونچھ ان کے چہرے پر برآمد ہی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چاء کے ساتھ اپنے حسنِ تقریر سے جو ہم لوگوں کی ضیافت کی اُس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر خیال کے اظہار کے لئے، بہتر سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ مناسب حال اشعار کا استعمال! غرضیکہ وہ کالج کے دو نوجوانوں کے ساتھ معمولی بات چیت نہ تھی بلکہ ادبیات عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس قدر بے پناہ قوتِ بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا

مشہور عالم اطالوی فلسفی کروچے نے اپنے "جمالیات" میں ماہرِ فن کے کمال کا پیمانہ قوتِ اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیانِ فن کے حواس اس وقت درست ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے "کمال" کے اظہار پر مجبور ہوتے ہیں، چنانچہ کروچے کا کہنا ہے کہ "کسی مدعی فن کے امتحان کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا اس گیت کے دو بول تو گا دیجئے یا یہ پنسل حاضر ہے اس سے کوئی نقش کھینچ کر اپنے واردات قلب کا ذرا اظہار تو فرما دیجئے۔" قوتِ اظہار کی اس جانچ سے ذرا کی ذرا میں اُن کے کمال کی پول کھل جائے گی۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے کتنے پانی میں ہیں۔

قوتِ گویائی

مولانا کی قوتِ اظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں ہر قدم قدم پر بغیر کسی تجسس کے ملتے ہیں چنانچہ "تذکرہ" کے چند ورق الٹتے ہی مولانا کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے:

"وہی دنیا جس کے میکدہ فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرمِ گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بارہا اُترنا پڑتا کہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضاءِ آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہوجائے، سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چلمن ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکائتیں بھری تھیں، سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لئے دراز تھے، بادل کو پکڑا تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بُلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشکارا نکلی، ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کردیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا ...... غرضیکہ ہمّتِ خوابیدہ جاگ اٹھی اور دلِ رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آگیا۔ عالمِ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے اُن میں سے کوئی نہ تھا جس کے ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا، سب کی سطریں اُبھری ہوئی تھیں، نہ کوئی لب بند رہا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش سے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکے۔

سخن عشق بدل در نہ و لب را مکشا
سرا ایں شیشہ فرو بند کہ بادے نہ خورد" (صفحہ ۳۰۱)

یا پھر کمالِ ایجاز کے ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند لفظوں میں سُن لیجئے:۔

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اُس کے احساسات کا بھی کچھ عجب حال ہے۔ تیس برس کی مدّت ہو یا تیس دن کی۔ مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدّت کیوں کر کٹے گی؟ گزرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔"

(غبارِ خاطر صفحہ ۲۹)

زبان دانی

جرمنی کے مشہور عالم شاعر و ادیب گوئٹے کا قول ہے کہ اگر انسان دوسری زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقہ سے استعمال نہیں کرسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کی اس حیرت انگیز قوتِ گویائی کا باعث اُن کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو اُن کو عبور حاصل تھا ہی۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسکی کتابیں اکثر اُن کے زیرِ مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ پھر قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ مولانا کو عربی، فارسی، اُردو کے ہزاروں شعر از بر تھے۔ غبارِ خاطر میں فرماتے ہیں:۔

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی۔ جیسے اُسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح اُبھر آئیں گے کہ معلوم ہو گا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعیین کہ مضمون ابتدائی سطروں

ہیں تھا، یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحہ کا رخ کردہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی حسبِ معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا۔

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی ثمر پیشرس از باغ وجودم

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے۔ جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا اور آفتاب عالم تاب میں نظر سے گذرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے۔ پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اُسے کھولا ہو۔" (صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۰)

اسالیب بیان

اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل اُن کے ذہن میں محفوظ تھے جن پر مخصوص صحبتوں میں پُر لطف محاکمہ کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ، سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ اُن کی "ابوالکلامی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا اسلوب بیان فی الجملہ بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائیوں میں اُن کا اسلوب بالعموم صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں میں شاذ و نادر شعر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا اُن کی ذہنی تعمیر میں ادیبانہ صورت ہمیشہ مضمر پائی جاتی ہے۔ جو ذرا سے غور کرنے سے نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ خالص ادبی تحریرات میں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ فلسفیانہ تحریروں میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیلی ہوتی ہے استقرائی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیلی استدلال سے مشکل سے مشکل مباحث اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ باید و شاید، استقرا اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے سامنے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یہی حال رہا جو باوجود پیہم لطمات ابتلا و تنبیہ کے آج نظر آ رہا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ مسلمان مسجد کا دروازہ کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کا روزہ رکھنے کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضا کے منتظر رہا کریں گے اور جمعہ کے دن خطیب منبر کے سامنے ہمہ تن انتظار ہو کر کھڑا رہے گا کہ شملہ سے تار آجائے تو خطبہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو....."

(الہلال ۷، نومبر ۱۹۱۴ء)

مولانا کی انشا پردازی کے اجزاء ترکیبی۔ استعارہ، تشبیہ، تضاد

مولانا کے کمال انشا پردازی کا اصلی میدان ادب لطیف ہے۔ جس کے جوہر تازہ استعاروں، بولتی ہوئی تشبیہوں کے ساتھ چبھتے ہوئے تضادات بھی ہیں۔ جو ان کی نوشتہ جات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تضاد کی مثال ملاحظہ فرمائیے! استعارات و تشبیہات تو انھیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے:۔

"ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے۔ ان کے پاؤں کو دیکھئے تو یورپ کی نافہمانہ و کورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیریں پڑی نظر آتی ہیں۔ مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان کو ادعاء اجتہاد سے فرصت نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں جمع اضداد کا اور کون سا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے اور عین اس وقت جب کہ اُس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں۔ اجتہاد فکر اور حریت رائے پر بے تکان لکچر دینا شروع کر دے" (الہلال ۷، ستمبر ۱۹۱۳ء)

ٹھیٹ ہندی کے الفاظ

چست فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک خاص لطف دیتے ہیں۔ مثلاً

"گو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اس کا اڑکاؤ بھی اٹکاؤ ہے؟"

"جس کو کیسی کیسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں بچائے رکھا تھا کہ کہیں ناسور بننے کی جگہ مندمل ہو جائے۔"

"الغرض توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔"

"دل کی ٹیس اور ٹپک" وغیرہ وغیرہ۔

مآخذ و موثرات

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر "شعر منثور" کہا جائے تو

بے جا نہ ہوگا۔ شاعری کا کونسا کمال ہے جو ان کی نثر میں جلوہ افروز نہ ہو۔ کون سی صفت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے عاری ہے۔ اس لئے آپ اسے نثر کہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر جس پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ مولانا کی انشاپردازی اگرچہ اپنے مخصوص رنگ میں یکتا ہے لیکن غور کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد، ظہوری، عرفی، غالب، متنبی کی معنی آفرینوں اور ادیبانہ تراش خراش کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد ہر تقلید سے آزاد تھے۔ اور جا بجا انھوں نے اپنی آزاد روی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔

ظرافت

مولانا کی ظرافت اور عام ظرافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقانی کے بے تکا ٹھٹھہ مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مسکرانے میں ہوتا ہے۔ مولانا کی ظرافت مہذب، سنجیدہ اور شان دار ہوتی ہے۔ جو عالموں کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی سوقیانہ یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے آشکارا ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں جو جلسے لکھنؤ میں ہوئے تھے ان کے متعلق ہیں۔ راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا۔

"اتنے میں خبر آئی کہ (ہر آنر) کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی ترسیے ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این
الفراق اے ہوش و تقوےٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبا ئے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدہ میں قرو کش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدہ سے۔"

(الہلال، نشہ نیم شبی کا صبح خمار ۵، فروری ۱۹۱۳ء)

"جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں، اور پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرار نہیں، منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا اگر (سر ہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پر جوش نوجوانوں کی ایک کمپنی تو فوراً اپنے ساتھ لے جاتا۔"

(الہلال – ۱۳، مارچ ۱۹۱۳ء "نشہ نیم شبی کا صبح خمار")

چند تذکرات

مولانا کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ الہلال صرف اُن کی سیاسیات ہی کا آرگن نہ تھا۔ بلکہ کالج کے نوجوانوں کے اندر ادبی ذوق و بیداری پیدا کرنے کا بھی ایک موثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اردو پڑھنے لکھنے کا شوق الہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر الہلال ہی میں "ابوالاثر بہزاد" کے نام سے مضامین لکھنا شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تصحیح کے بعد الہلال میں شائع ہوتے رہے۔

ایک بات کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ الہلال جب اپنے اشاعت کے شباب پر تھا۔ مولانا نے مجھے اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مگر اپنی ناتجربہ کاری سے میں نے تکمیلِ تعلیم کو ترجیح دی اور نہ گیا حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہئے تھی۔ اُسی زمانہ میں، مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی بُلایا تھا۔ سید صاحب الہلال کے ادارہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب

دادد ی ۔ الہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے رشحاتِ قلم سمجھتے ہیں ۔ مگر دراصل وہ نقوشِ سلیمانی ہیں ۔ مثلاً کان پور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سید صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے ۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں ۔ مولانا کا اسلوبِ تحریر بلا شبہ ناقابلِ نقل ہے ۔ لیکن الہلال کی بعض تحریریں جیّد سے جیّد ناقدِ فن کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سید صاحب کی ہے تو بتانا مشکل ہوگا ۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہیئے جو سید صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے ۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد جب مولانا پہلی بار پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے رام پور سے کھڑے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا ۔ الہلال سے سطحی ربط ایسا نہ تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو ۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا نہایت گرمجوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دو ڈیڑھ مہینہ کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا ۔ عرض نہیں کر سکتا کہ صحبت کے چند دن کس لطف سے کٹے ۔ اور الہلال کے دفتر میں شامل نہ ہونے کی حماقت پر میں نے اپنے تئیں کتنی نفرین کی ۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہم ذوق وہم نوا نہیں کہ جس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی بات کی جا سکے ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ سیاسی ہنگاموں بجلی کے تیز قمقموں اور شہرت پسندی سے نفور تھے ۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لئے گوشۂ تنہائی کے طالب تھے ۔ لیکن ان شورشوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُن کی ساری زندگی انہیں ہنگاموں میں کٹی ۔ مگر جیسا عرض کیا گیا اُن کی ہنگامہ انگیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب کا بے نظیر نمونہ ہیں ۔ مولانا ہر رنگ میں ادیب ہی ہیں ۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

مولانا کی شخصیت کی نفسیاتی تعبیر کی بنیاد تخیّل پر ہے ۔ تخیل ہی نے اُن کے ادب میں ایک بے مثال رمزیت Symbolism پیدا کر دی ہے تخیل ہی اُن کے تر و تازہ استعاروں کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی اُن کے فلسفیانہ مباحث میں تمثیلی استدلال کے بھیس میں ظاہر ہوتی ہے ۔ حقیقت میں اُن کی جگہ ادبیاتِ عالیہ ہی کا میدان ہے ۔ دیگر میدانوں میں اُن کا ورود "علے پر ورشی" کا مصداق ہے ۔

تصنیفات

مولانا کے مضامین سے رسالہ الندوہ ، الہلال اور البلاغ مالا مال ہیں اور اُن کے جمع کرنے اور سلیقہ سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے ۔ اُن کی بڑے تصنیفات مثلاً ترجمان القرآن ، تذکرہ ، غبارِ خاطر وغیرہ کے علاوہ اُن کے بعض مقالے مثلاً "خونِ شہادت کے دو قطرہ" از سرِ نو مستقل طور پر طبع ہونے کے مستحق ہیں ۔

موعظۃ و ذکریٰ

" ... اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چیک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے ۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کر سکتی تھی و مزدوروں نے ہل جوتا ، کاشتکار نے بیج ڈالا ، نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی اور ان میں سے ہر فریق دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو ۔ اگر قدرتِ الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ تو ایک بیج بارآور ہوتا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا ... "

(الہلال ۳ فروری ۱۹۱۳ء)

بسمل سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد

کم ہُوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار — زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار
زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں — موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار
زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس — موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہم کنار
جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی — آبِ جُوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار
ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پہ اس کا دوام — موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو اُستوار
زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رُخ — موت ہی پہ منحصر ہے زندگی کا اعتبار
اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی — موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار
زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ — موت کا بھی ایک وضعِ زندگی پر ہے مدار
زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت — موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار
بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی — ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار

الفراق اے منزلت پایندۂ مرگ و حیات
موت کے راس ایضاً عنت از زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و ذلیت وہ حلقے ہیں اک زنجیر کے — سلسلہ کردار کا تیرے ہے جس کو ہمار
تھا اُسی کا مُقتضی تیرا عمل آغاز سے — زندگی جس موت پر مُنتج ہوئی پایانِ کار
ماتمِ انسانیت کرنے کو تیری موت پر — آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار
سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا خیر القروں — چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار
موج اندر موج تھا اک قُلزُمِ زخّارِ فہم — عِلم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار
ماکدر تھا رد ترا اور ماصفا تیرا قبول — نہیٔ وامرِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار
در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق — تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مُستشار
تیرے ہی نقشِ قدم پہ پڑتے ہیں سب کے قدم — کس قدر رونِدی ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار

دیکھ کر اندازِ تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دُنیوی تجھ کو ابد نے مُستعار

بر بنائے پختگیٔ فکر تیری زندگی
اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار

ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مفتخر دورِ جہاں
ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیمِ روزگار

تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم "الہلال"
تھی تری صبحِ نخستیں رُو کشِ نصف النہار

کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکبار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری افتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار

پیش پا افتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کجکلاہی سے تری، شانِ کُلاہِ تاجدار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قربان تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار

اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
خُلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار

جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ روئے نگارش تیری خاطر کا غبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار

تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادیٔ ہند
عہدِ افرنگی کا دورِ قید و بند و گیر و دار

ہاں پریشاں کُن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار

تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی
ماسوائے ملک، ملّت کا بھی تھا تو ذمہ دار

منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جہاں تابِ فضیلت تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سربرِ افلاک اس زمیں کو کر گئی کشش کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار

سر بہ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اُس کے ذمے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا
اب ترے ذمے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مُہرِ توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تُربت، فلک رفعت مزار

لہ پنڈت جواہر لال نہرو

محمد مجیب

انگریزی سے ترجمہ
مترجم۔ محمد شفیع الرحمٰن

تذکرہ

"ان اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا۔" مولانا آزاد نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے "اب وہ مُصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے اُن کا اصل مقصد یہی تھا۔" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک اشاریہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوتِ نطق، ایک بڑے دل کا گریۂ نیم شبی، ایک المیہ کا محزون نغمہ اور ایک فتح کا مسرّت انگیز زمزمہ، وہ ایسی خودنوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصوّر کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصوّر جو فطرتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔ اُن کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ صریحاً ایسے مشاہیر پرست معلوم ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۲ء میں واقفیت ہوئی۔ اُس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقا کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے 'الہلال' شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسخر کر لیا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پر اثر شخصیت کے مداحوں کو اُن کے حالات سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ لیکن مولانا آزاد نے اُن کی خودنوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق بنا کر ٹال دیا۔

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ اُن کو نظرانداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن یہ بات قابلِ شکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاج کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ" ملتا رہے گا۔ جو کچھ اُن کو ہر ہفتہ ملتا رہا اُس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خودنوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے ہٹنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ اُن کو روکیں اور فرمائش کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کر کے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کے تمام تفصیلات آ جاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالترتیب جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزیّن پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی جسم بنا لیا اور اُن کی مادّی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوعِ کلام سے خارج ہو گئی۔ مرزا فضل الدین

کہ یہ اندازہ ہوا کہ وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی سوانح عمری لکھی ہے ایسی نہ لکھی جائے تو کس قدر غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے۔

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا مقالہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب بہ مشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا کہ تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مُصنّف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظرِ ثانی نہ کر سکے، حوالوں کی جانچ نہ کر سکے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ چکی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا: "لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیِ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمد ہی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُر جوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے۔ وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لئے تبحّرِ علم و فضل اور الفاظ پر پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کار فرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وضاحت ہے۔ اُن کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی "سوانح عمری" لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف اُن کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ اُن کا زورِ بیان، روانی، اُن کی اشاریت، اُن کی اُردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اُس تجلّی کا نتیجہ ہے جو اس دُنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اُس ہی کیفیتِ مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیئے۔

"یہ غریب الدیار عہد، و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورہ تمنّا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا۔ اور تہمتِ حیات سے متہم، الناس نیام، اذا ماتو فانتبھوا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا: جواں بخت و جواں طالع، جواں باد! لیکن اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے ادم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا تھا اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کار فرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دُور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامان کا بنا پیدا، وقت جا چکا اور ہمراہان و محمل کاروان مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چُستی واپس بھی مل جائے۔ پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لُٹ چکی؟ اور قافلۂ اُمید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر   یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو اُس آنے والے دن آزمائش میں پورا اُترے لکل امرئ منہم یومئذ شان یغنیہ۔ اگر وہاں روح و ریحان و جنت النعیم

اور فوزِ عظیم کی فیروزی کامرانی ہاتھ آئی تو پھر بخت بخت ارجمند ہے۔ لیکن اگر وجوہ یومئیذ علیہا ترہقہا قترۃ اور لا بشریٰ یومئیذ للمجرمین کی رُسوائی اور محرومی ملی تو پھر نہ اُس حرمان نصیبی کے لئے اُمید ہے۔ نہ اس ماتم حسرت کے لئے خاتمہ، بخت اسکندری اور تختِ جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لے کر کیا کیجئے۔

گر بدانم کہ وصال تو بدیں دست دہد — دل و دین را ہمہ در بازم و توفیر کنم۔"

ان خیالات میں منہمک ہونے کے بعد مولانا آزاد واقعات اور تاریخوں کی طرف منعطف ہوتے ہیں۔

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے، سلامٌ علی نجد و من حل بالنجد مگر مادری سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرت سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذارانِ عشق و کعبہ نیاز مندانِ شوق، علی صاحبہا الصلوٰۃ و التحیۃ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نما میخوانمش — رو سوئے ابروئیش کند ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیئے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافرانِ ہستی ایک ہی قافلہ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن در پیش البتہ کسی کے لئے ساءت مستقرا و مقاما میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے حسنت مستقرا و مقاما ...

"مولد و منشاءِ طفولیت" وادی غیر ذی زرع عند بیت المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفہا و کرامہ، محلہ قدوہ متصل باب السلام ....

"اس وقت کہ ۱۳۳۵ ہجری قریب الاختتام ہے، قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا ہے۔

یقولون ہل بعد الثلاثین ملعبا" — فقلت وہل قبل الثلاثین ملعبا؟

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید مرا از منزل آخر خبرے — صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

جتنی زندگی گزر چکی ہے۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں۔ اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگذشت اور روداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرا دئے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چُن چُن کر تنکے جمع کئے، خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانہ اُمید اور نصف ماتم یاس۔

عاشق نہ شدی، محنت الفت نہ کشیدی — کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

پہلے مجسم اُمید تھا۔ اب سر تا سر حسرت ہوں۔

مختصر حال چشم و دل یہ ہے — اس کو آرام اُس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستاں سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگذشت سُن لیجئے۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے صرف ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے۔

ہمسایہ شنید نالہ ام، گفت — خاقانی را دگر شب آمد

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی۔ ایک عید سے کہ در ایام بہار آمد و رفت، ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو اُمید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا۔

بُجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا — چراغ جلتا نہیں کہیں کا

یا اُمید و حسرت کے دو دن، ایک ہوس تعمیر میں بسر ہوا۔ ایک ماتم تخریب میں ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر جی بھر کے آنسو بہا ئے۔

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است — زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

ابو طالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی۔

بد نامی حیات دو روزے نہ بود بیش — آنہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت
یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں — روزے دگر بکندن دل زیں و آں گذشت

"اور در اصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے۔ لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاہا۔ اور قالو لبثنا یوما او بعض یوم کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔

و منتی بما عدنا الوصال، و دہرنا — یومان، یوم نوی و یوم صدود

عہد طفلی ایک خواب عیش تھا۔ حیف صد حیف کہ ماند و د جز داد شدیم آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی۔ اور خواہشوں اور ولولوں کی

شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دُنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ اُمیدی و ناکامی کی شام یہ سارا شہرستانِ اُمید اور نگارخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لئے بنا ہے۔ اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرّہ ذرّہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سُنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی۔ یا تو گرفتارانِ طلسمِ شباب کی ہوش رُبائیوں کے لئے سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی۔

شہریست پرز خوبان، وز ہر طرف نگارے   یاران صلائے عام ست گو می کنید کارے

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا۔ سرمستی و سرگردانی نے جام بھرے جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ یہ ہے تو یہی ہے اور وقت ہے تو اسی کا، ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہاست..... جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش رُبا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

واے بر صیدے کہ یک باشد و صیادے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی وہ برابر بڑھتی ہی گئی

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فسردہ پائے   کار از دوا گذشتہ و افسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی اور سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار اور خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسو اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہیں کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کے وجد کیا۔ تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے۔ لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی۔ اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ....

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے.....

" البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفس لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے اور پہنچتی ہے تو خود ہماری ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ اُن کے شور و غل میں یہ سرگوشئ ملامت کب کام دے سکتی ہے.....

" لیکن دُنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا عجب حال ہے۔ کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد۔ ہر چند راہ ایک ہی ہے۔ لیکن کرشمے بے شمار ہیں اور گو ہوش سب کھوتے ہیں۔ مگر ایک ہی جلوہ سے نہیں

اے تما با ہر دے رانسبے دگر   ہر گدا را بر درت نازے دگر۔ کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ علّتِ سعی سے انکار نہیں۔ لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے.....

" ناگہاں جاذبہ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو ناگہاں نمودار ہوئی۔ چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا.....

اصل میں تین ہی منزلیں ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست ۔ خام بدم، پختہ شدم، سوختم، اور یہاں

عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں ورنہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں   ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہوگے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں ہوشیاریاں اس پر سے نچھاور ہو، گر طمع خواہد زمن سلطان دین، خاک بر فرق قناعت بعد ازیں۔ اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جُڑنے کے لئے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول لئے تھے۔

در قبولِ نظرِ عشق ہزاراں شرط ست   اوّل از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

. . . .

"تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوائے اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کا انتظار۔ ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ میکنی   از یک نگاہ کشت، جوابِ دگر نداد

. . . .

"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے؟ کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے تو وہ ہی منزل بُت ہے اور رہرو اُس کا پرستار، تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو....

"چناں چہ الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوٹا......

"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش....

"اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برا ہونا مشکل ہے

عریاں تنی خوش ست، و بے زیب پیکر ست   داماں چاک چاک و گریباں دریدہ را

. . . .

اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ زاری کی ہو تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک ایک لمحہ ایسا گذر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر چھنکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر چلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ ہی میں طوفان اٹھاتے رہے.....

"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا۔ لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی کامیابی میں پوشیدہ تھی....

"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بارہا اُترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ

ے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اُتار دیئے، سارے پردے چلمنی ہو گئے، سب کی ابرؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکائتیں بھری تھیں ۔۔۔۔۔

"حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے۔ جن تک بتدریج رسائی میسّر آئی، قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جتنے نمایاں ملیں صرف اُسی مُرشد فیض و ہادی طریق سے ملیں ۔۔۔۔

"علم کا دروازہ اُسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اُسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اُس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اُس کے دستِ کرم میں تھے شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے۔ سنتہ کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی۔ دل اُس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اُس سے حل نہ ہوئی۔ کون سا اُلجھاؤ تھا جو اُس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اُس کے دارالشفا سے نہ مل سکی؟ ۔۔۔۔۔

"ہاں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین اکیس بائیس برس کی عمر میں کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولولوں، اُمنگوں، اُمیدوں، تمنّاؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے، جب کہیں جاکر اس کوچہ میں دم لے سکے۔ جہاں آج اپنے آپ کو پارہے ہیں ۔۔۔۔۔

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارنمایاں ہے کہ پابندئ مذہب اور تصوّف میں مطابقت کردی۔ اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطور ریا داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوشِ ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کردی، خدا کی نگاہ میں منفعل گنہ گار کو، اُس محتاط متبع شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندئ مذہب کی، اُن لوگوں کی پابندئ مذہب کی جنھوں نے حق اور کلمتہ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طریقۂ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے، ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندئ مذہب، رحمت سے راسخ العقیدگی ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے۔

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں۔ اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دینوی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ اُن کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی ردّ کردیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز اور مباہات کی بات ہے۔ اُس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (و۔ ۱۵۸۱) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبۂ خلافت و امامت کا ادّعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اُس وقت شدید مذہبی فساد برپا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت، جو لا فرقیت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ تہذیب، جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے۔ سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے۔

لیکن اس صورت حالات میں بھی جو لوگ ایقان کا آلۂ کار بنے اور مذہبی وجوہ سے اُن علماء کے مقابلہ میں جو اُس زمانہ کے حالات کو قایم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے - اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا - مولانا آزاد جس خاص واقعہ کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اُس میں حملہ کے بانی، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حامئ حق سید محمد جون پوری تھے - سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے - یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے - مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت اور اُن کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا - ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعوی کی تھی - مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصد مخالفت سید محمد کے تجدیدی رحجان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا -

سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں - اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالی نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں - اور جس آزادئ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو ملنی چاہیئے - یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے - اللہ والے لوگ اُس فضل سے پہچانے جاتے ہیں جو اُن پر اللہ تعالی نے فرمایا ہے - اُس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ اُن کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں - بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اُس کو اخذ کریں -

مولانا آزاد کے نزدیک پابندئ مذہب پر فخر و مباہات اور اعمال سے غفلت قابل نفرت ہے - وہ اپنی تمام انشاپردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علو مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (و - ۱۵۵۰) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین جنھوں نے کلمۂ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کُن حکمت عملی کی مخالفت کی -

یہ دونوں علماء اُس طبقہ کے تھے - جس نے شریعت اسلامی میں، غیر واقعی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا - مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار، اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں - جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے - جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں. اور اُس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ہے - وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں - بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے - شیخ سلامی (و - ۱۵۴۷) شیخ داؤد (و - ۱۵۷۴) شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی -

ایقان کے ولولہ کی تمام زندگی عمل صالح کے لیے وقف کرنے کی بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے - تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے - اور یہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیر پختہ منزلہ ہے - جس میں اُن کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالم گیریت کم ظاہر ہوتی ہے - اِن دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے - یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا - اُس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہو - مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصورِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ ترمیدان کا شامل ہونا، روحانی ضرورت ہے - اور اس تخیل نے اُن کا تصورِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو -

لیکن واقعات ایک دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں - مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے - تذکرہ سے اُس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے - جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت متاثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ، ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں اُن کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے - جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ، تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغ عقیدہ کو، اپنے خطیبانہ طرز بیان میں پیش کر کے، عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے -

رکھے اور احساس نہ ہونے دے کہ فقر و فاقہ چھایا ہوا ہے۔ میں تو سب کچھ جانتا بوجھتا تھا مگر انجان بنا رہتا تھا تاکہ مولانا کو تکلیف نہ ہو۔ خود مولانا بھی جانتے تھے کہ صورتِ حال سے باخبر ہوں۔ مگر مجھ سے کچھ فرماتے نہیں تھے۔ میں مہمان تھا اور میرا میزبان فاقوں پر تھا۔ عجب گو مگو کا معاملہ تھا۔ مگر میرے لئے کھانے سے کہیں زیادہ مولانا کی تقریریں لذیذ تھیں، اور ان دنوں میں دعائیں کیا کرتا تھا کہ فقر و فاقہ پھیلتا چلا جائے اور میں مولانا کی زبان سے بکھرے ہوئے پھول چنتا چلا جاؤں۔

مصیبت کے انھیں دنوں میں مولانا محمدؐ علی، شوکت علی اور ان کے ساتھ مولانا آزاد سبحانی کلکتے آئے اور مولانا کے مہمان بن گئے۔ سبحانی صاحب کو مولانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اکیلے مولانا ہی نہیں ہر آدمی مرحوم سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ لائق آدمی تھے، بہترین مقرر بھی تھے، مگر کوئی ایسی بات بھی تھی کہ تمام قابلیتوں کے باوجود مقبول نہ ہو سکے اور افسوس ناک طریقے پر زندگی بسر کی۔

ان دنوں مولانا سبحانی گاندھی جی کے "پکے چیلے" بنے ہوئے تھے۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک لنگوٹی مَر پر بندھی ہوئی، کھچڑی داڑھی، سر کے کھچڑی بال۔ بڑی مضحک صورت تھی۔

مولانا آزاد کی نفیس طبیعت دیکھتے ہی منقبض ہو گئی۔ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ بار بار میری طرف بے بسی سے نگاہیں اُٹھاتے تھے۔ بے شک بے بس تھے۔ مہمان کو کہتے تو کیا کہتے۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا اور بعد میں مولانا نے خود بھی ظاہر کر دیا کہ مولانا سبحانی کے نازل ہو جانے سے ان کے دل و دماغ کو جو تکلیف پہنچی رانچی کی پوری نظر بندی میں بھی اس کے عشر عشیر سے بھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

لیکن یہ شخص کوہِ وقار و حلم بھی تھا، فوراً سنبھل گیا اور بڑی خندہ پیشانی سے پہلے علی بھائیوں سے پوچھا کیا کھاؤ گے؟ آپس میں سخت چشمک تھی۔ انتہائی رقابت تھی بلکہ دشمنی کہنا بھی شاید خلافِ واقعہ نہ ہو۔ لیکن جب مل جاتے تھے تو بڑی پُر لطف صحبتیں رہتی تھیں۔ ایسی ایسی بے تکلفیاں برتی جاتی تھیں کہ بیان میں نہیں آسکتیں۔ شوکت علی مرحوم تو بس "بڑے بھائی" تھے اور بے تکلفی کی صحبتوں میں کہا کرتے تھے۔ "سگ باش برادرِ بزرگ مباش" محمدؐ علی محمدؐ علی تھے۔ ان کی ذہانت، فطانت، حاضر دماغی، حاضر جوابی کا ملک بھر میں جواب نہ تھا۔ لیکن ہاں ابوالکلام بھی ابوالکلام تھا اور محمدؐ علی مرحوم پر آخر بھاری ہو ہی جایا کرتا تھا۔

بہر حال مولانا نے بے تکلفی سے، ایسی بے تکلفی سے جیسی "لنگوٹیا یاروں میں ہوتی ہے۔" علی بھائیوں سے پوچھا۔ کیا کھاؤ گے بلکہ "کیا زہر مار کرو گے؟" دونوں بھائی بہت ہنسے۔ خوب خوب چوٹیں چلیں۔ آخر پلاؤ، زردہ، قورمہ اور نہ جانے کیا کیا کھانے طے پا گئے۔

پھر مولانا، آزاد سبحانی مرحوم سے مخاطب ہوئے۔ "مولانا آپ اپنی پسند کا کھانا تجویز کریں۔" مرحوم نے کئی پہلو بدلنے کے بعد فرمایا۔ "مولانا میں تو دنیا ہی کو چھوڑ چکا ہوں۔ اناج سے اور اناج کے ہر پکوان سے یک لخت اجتناب ہے۔ مہاتما سے عہد ہو چکا ہے۔"

میں نے دیکھا مولانا کا چہرہ تمتما اُٹھا ہے۔ مگر پھر سنبھل گئے اور ہنس کر فرمایا "مگر مولانا آپ ہوا کھا کر تو زندہ نہیں رہتے۔" اشارہ تھا کہ آپ اوسر سانڈے تو نہیں ہیں۔ مولانا سبحانی خفیف ہوئے۔ پھر فرمایا۔ "مولانا اس فقیری کی زندگی میں ممکن ہوتا ہے تو صرف دو ہی چیزیں کھاتا ہوں — کباب اور رس گلّے۔"

اس پر علی بھائیوں کے جو قہقہے بلند ہوئے کاش ریکارڈ کر لئے جاتے۔ مگر مولانا سبحانی ٹس سے مس نہ ہوئے اور کباب اور رس گلّے اتنے کھائے کہ سیر ہو گئے ماشاءاللہ غذا اچھی خاصی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بڑی پلیٹ شامی کبابوں سے بھری تھی اور رس گلّے تو مجھے یاد ہیں خود میں نے منگائے تھے۔ پورے دو سیر، بہترین بنگالی دکان بھیم ناگ سے۔

لیکن اس فقر و فاقے میں یہ آفت مولانا نے کیسے جھیلی!

روپیہ قرض منگایا گیا۔ حاجی فقیر محمدؐ پشاوری مرحوم یا حاجی اللہ بخش پشاوری مرحوم سے میں ہی جاکر ۲۰۰ روپے لایا تھا۔

فقر و فاقہ کے اس زمانے میں مولانا گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مجبوراً جانا ہی پڑتا تو کلکتے میں ٹیکسی پر اور کلکتے کے باہر ریل کے فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں۔ یہ سب کچھ بھی قرض سے ہی ہُوا کرتا تھا۔

لیکن ایک دفعہ مولانا کو ٹریم گاڑی پر بھی بیٹھنا پڑا۔

بات یہ ہوئی کہ مولانا کے اور میرے ایک عرب دوست سید محمدؐ عمری مرحوم تھے۔ لکھ پتی تھے۔ سگریٹ کے کارخانے کے مالک تھے۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ تمام دولت غائب ہو گئی اور پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے۔ لیکن موٹر ابھی تک باقی تھی اور مولانا کی کوٹھی میں کھڑی ہوتی تھی۔ عمری مرحوم حیدر آباد گئے ہوئے

تھے۔ نہ جانے کیوں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنڈ ہاربر چلا جائے اور سمندر کی سیر کی جائے۔ اسکیم طے پا گئی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں، قاضی نورالانام اور ڈپٹی نجم الدین بیٹھ گئے۔ موٹر چل پڑی۔ ڈائمنڈ ہاربر کلکتے سے ۳۵-۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر اُڑی چلی جا رہی تھی، دفعتاً رُک گئی۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کلکتے سے بہت دُور ایک اُجاڑ جگہ پر تھے۔ ۱۵-۲۰ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کے ایسے بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور لطائف و ظرائف کے نہ ختم ہونے والے خزانے کھُل جاتے تھے

مگر ہم ایک کوردہ مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے سابقہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ سمندر پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سمندر سے دُور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان ممکن نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم بہت بھوکے تھے۔ ڈپٹی نجم الدین کی عمر ۸۰-۹۰ سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا یہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر ظاہر کیسے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مایوسی سے دوچار تھے۔ دفعتاً ایک لڑکا نمودار ہُوا سر پر ٹوکری اُٹھائے۔ ہم سب اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے۔ صرف مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹوکری اُتروائی تو بالکل کچّے امرود نکلے۔ ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اُٹھے۔ پوری ٹوکری خریدلی گئی۔ میں نے عرض کیا لیکن یہ کچّے امرود آپ کھائیں گے کیسے دانت کہاں ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ چبائے بغیر ہی نگلتے چلے جائیں گے۔ مولانا اس نظارے سے پورا لطف اُٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی امرودوں پر وہ ہاتھ مارے کہ آج تک یاد ہے۔ امرود چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہو گئی۔ مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گرمی سخت تھی اور ہم پسینے سے شرابور۔ مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ چٹکلوں پر چٹکلیں کرتے چلے جاتے تھے اور جب سنجیدہ ہوتے تو مناسب موقع کوئی تاریخی واقعہ سنانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موتی لٹانے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس زمانے میں مولانا کی زندہ دلی اور دقائق دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوتِ برداشت ہے، خدا پر کیسا بے حساب بھروسہ ہے۔ آدمی مصیبت میں ہی پہچانا جاتا ہے اور مولانا ہر مصیبت میں خواہ کتنی ہی بڑی رہی ہو، سرفراز ہی رہے۔

لیکن ابھی ایک مضحکہ خیز واقعہ اس داستان کی تکمیل کے لئے باقی ہے۔ اُکتا ڈالنے والے کئی گھنٹوں کے بعد خدا خدا کر کے ریل گاڑی آئی اور ہم سوار ہو گئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات خضر پور میں اُتار دیا۔ ہرچند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی مجبوراً ٹریم گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا ٹریم کی بنچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے گویا جست لگانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں بس یوں سمجھئے کہ بنچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ بالکل گم سُم تھے۔ ایک اسٹینڈ آیا اور ٹریم ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے۔ ٹریم ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے نعرہ مارا "السلام علیکم مولانا!" ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے تپ دق کا کوئی بیمار آخری مرحلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں نیچی، کسی قدر تلخ لہجے میں اس آفت ناگہانی معتقد سے فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مزاج آشنا تھا ہی، اُٹھ کھڑا ہُوا اور ٹریم کی رسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹریم رک گئی۔ ہم سب اُتر پڑے اور مولانا نے فرمایا۔ "سخت کوفت اُٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس داستان کا چرچا مولانا نے مہینوں اپنی خاص وضع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کیونکر بیان کروں۔



مولانا آزاد مہاتما گاندھی کی چِتا پر

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء



صدرِ کانگریس مولانا آزاد شملہ کے سیسل ہوٹل میں (۲۴ جون ۱۹۴۵ء بوقت شب)

(بہ شکریہ محمد اجمل خاں صاحب)



مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن

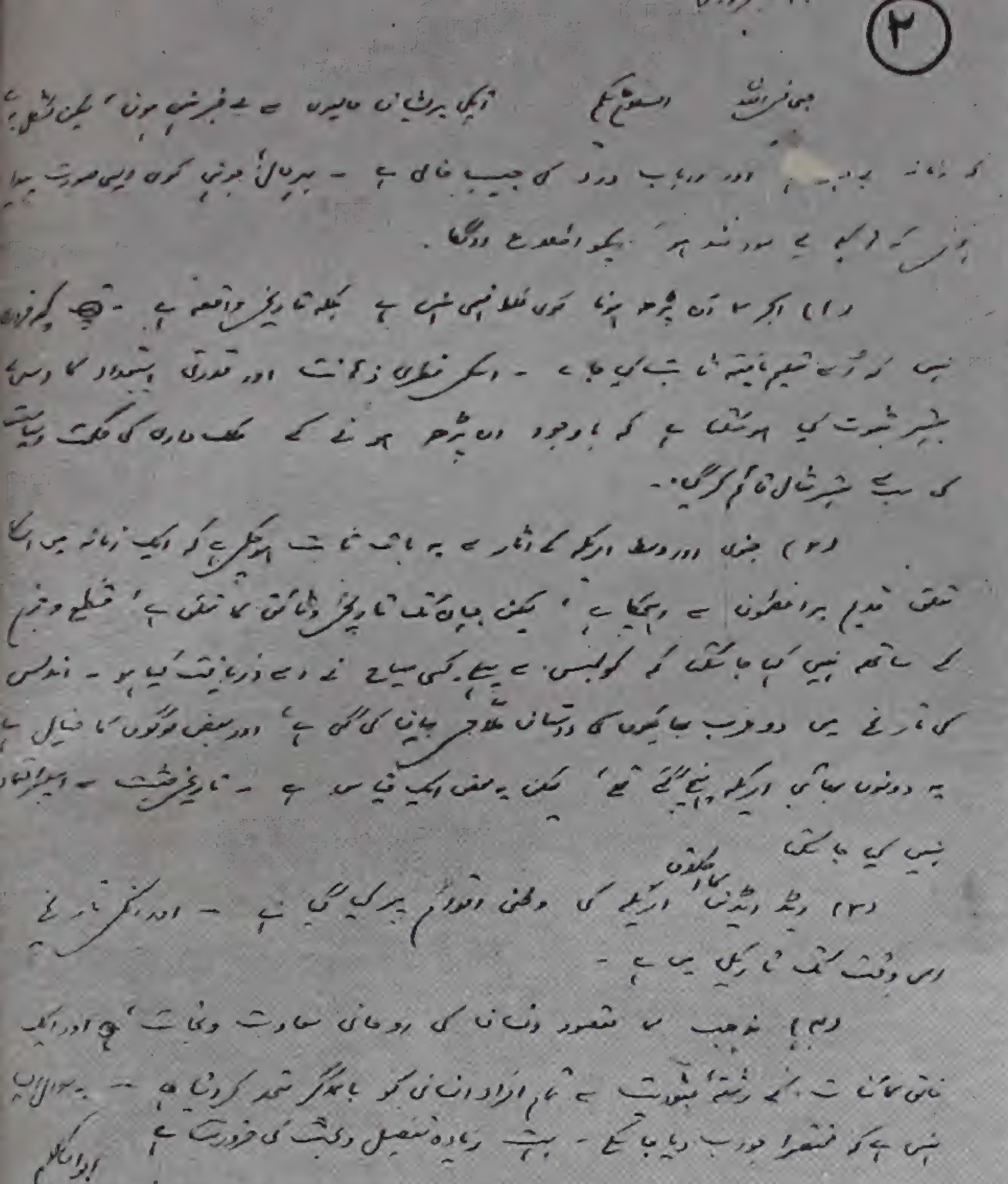
(اگست ۱۹۴۷ء)

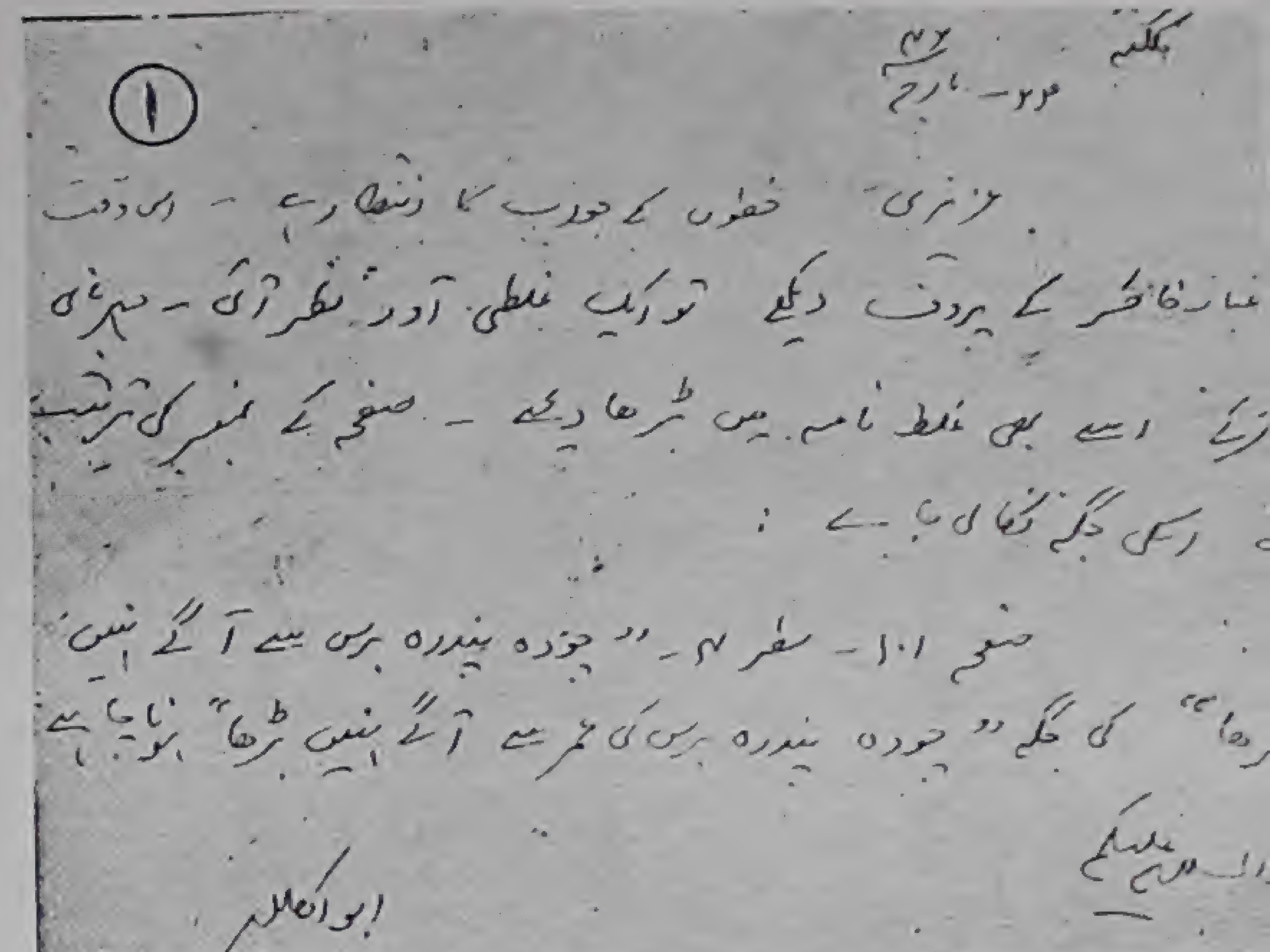


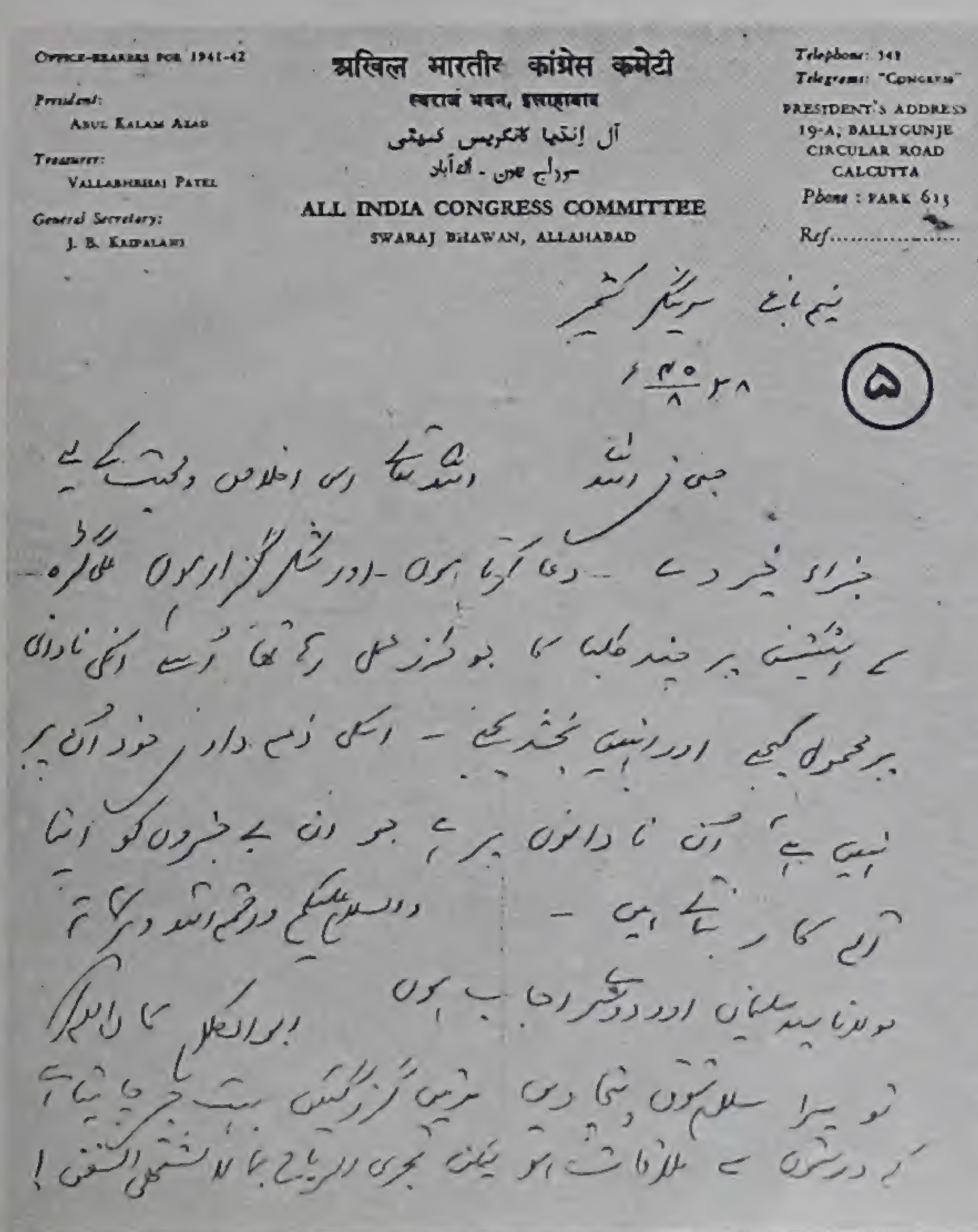
مولانا آزاد جے پور کانگریس میں

(دسمبر ۱۹۴۸ء)

مولانا آزاد کے چند خطوط



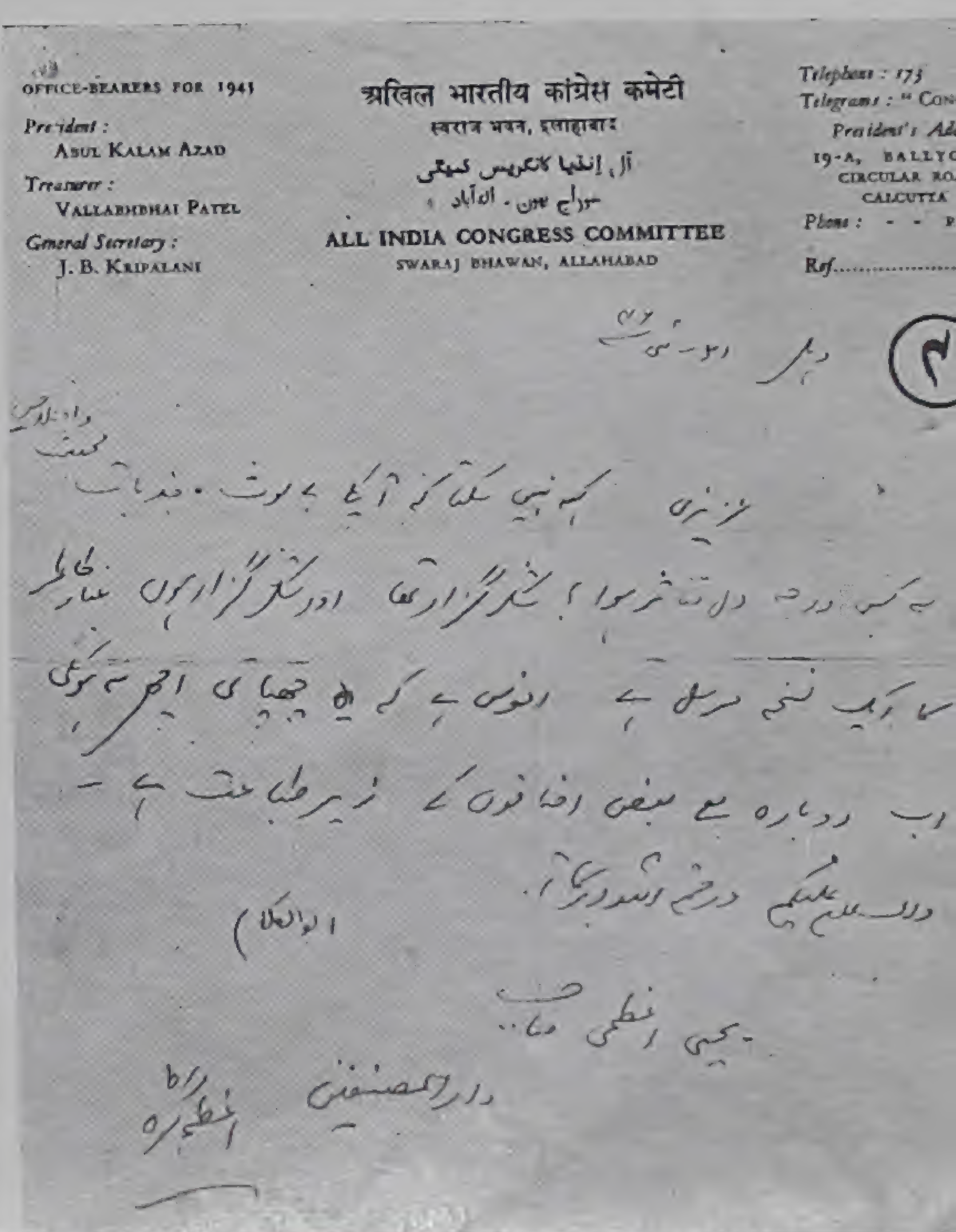




OFFICE-BEARERS FOR 1941-42
President: ABUL KALAM AZAD
Treasurer: VALLABHBHAI PATEL
General Secretary: J. B. KRIPALANI

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद
آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون - الہ آباد
ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ BHAWAN, ALLAHABAD

Telephone: 341
Telegrams: "CONGRESS"
PRESIDENT'S ADDRESS
19-A, BALLYGUNJE CIRCULAR ROAD CALCUTTA
Phone: PARK 613
Ref.........



OFFICE-BEARERS FOR 1945
President: ABUL KALAM AZAD
Treasurer: VALLABHBHAI PATEL
General Secretary: J. B. KRIPALANI

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद
آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون - الہ آباد
ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ BHAWAN, ALLAHABAD

Telephone: 173
Telegrams: "CON...
President's Ad...
19-A, BALLYG...
CIRCULAR RO...
CALCUTTA
Phone: - - P...
Ref.........

مولانا آزاد کا ایک خط

قلعہ احمد نگر

۱۱-اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از فکر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بر آں ہم ساختیم!

صدیقِ مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں۔ یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہرِ بتاں
چگونہ حرف زنم دل کجا دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزر رہا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے درپیش است

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا

جائے گا۔[1] یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے ہیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۰۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہو گا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹا لی گئی تو ۷۔ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵۔ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳۔ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر

---

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کرکے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیئے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۱۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایماء سے کی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دستِ رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن بعد میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی بیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔

اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹- اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فانّ مّا تحذرین، قد وقع!

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ و لے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبورِ علی البکا   رفیقی لتذرافِ الدموعِ السوافکِ

فقال "اتبکی کل قبرٍ رأیتہٗ   لقبرٍ ثوی بین اللّوی فالدکادکِ"

فقلت لہٗ "انّ الشجا یبعث الشجا   فدعنی، فھذا کلہٗ قبر مالکِ"

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبارِ خاطر سے)

فاتحۃ السنۃ الثالثہ

"جو ربّ الارباب انسان کی غذاءِ جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔ یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت وسعادت انسانی کی دعوتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روحِ انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسمِ حیوانی مدتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روحِ انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیا اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیاتِ جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خوانِ کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دستِ مخفی غذائے روحانی کا بیج بوتا ہے اور اپنی نشو و نمائی سے اسے یکایک سربلند و بالا قامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس بخشش کی دعوت سے ارضِ الٰہی گونج اٹھتی ہے۔"

(الہلال ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء)

یحییٰ اعظمی

آہ! مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زباں کا حرف حرف نغمۂ جاں نوائے راز　　دفترِ علم و آگہی نوکِ قلم سے جس کے باز
شانِ حیات جس کی تھی اوجِ شرف سے سرفراز　　عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقامِ امتیاز

نشأۃ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام
بامِ حریمِ قدس تھا جس کی حیات کا مقام

پیکرِ عزت و شرف، مظہرِ عظمت و جلال　　پیشِ نظر منظر فروز ایک مرقعِ جمال
خازنِ فضل و علم و فن، خاتمِ دانش و کمال　　قاسمِ بادۂ کہن، ساقیِ دورِ الہلال

اُٹھ گیا وہ تو بے فروغ مصطبۂ یقیں ہے آج
پیرِ مغاں کے ہجر میں بزمِ مغاں حزیں ہے آج

حیف خموش ہو گیا باغِ ادب کا عندلیب　　اٹھ گیا ہند کا امام سو گیا قوم کا خطیب
اب نہ اُٹھے گا حشر تک ایسا مفکر و ادیب　　حق کا مجاہدِ جلیل، دیں کا منادی و نقیب

فکرِ جدید و طرزِ نو کا وہ محققِ کتاب
جس کے صحیفۂ کلام کا نہیں دہر میں جواب

ایک حریمِ راز تھی اس کی کتابِ زندگی　　فکر و نظر سے تھی بلند اس کی جنابِ زندگی
آج کہاں ہے دہر میں اس کا جوابِ زندگی　　آہ برس کے تھم گیا اب وہ سحابِ زندگی

بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ کمال
اس کے مآثرِ ہنر، اس کے مظاہرِ کمال

اس کا قلم جب اُٹھ گیا لالہ و گل کھلا دیا　　شعر و ادب کے پھول سے صحنِ ورق سجا دیا
شاہدِ فکر و راز کے رُخ سے حجاب اُٹھا دیا　　جلوۂ رنگ رنگ سے گل کدہ جگمگا دیا

عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن
فیض سے جس کے تازہ تھا دانش و فکر کا چمن

آہ وہ کلکِ خوش نگار، لالہ طراز و لالہ کار　　جس کا نوشتہ حسیں ایک صحیفۂ بہار
جس کی نگارشِ جمیل شعر و ادب کا شاہکار　　ایک حدیقۂ کمال جس کا ہر اک خطِ غبار

اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" سے خطاب
نامۂ شوق کی زبور، نغمہ و شعر کی کتاب

علم و ہنر کا تاجدار، خسروِ کشورِ قلم　　بدرِ معانی و علوم، صدرِ معارف و حکم
نوکِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم　　جس کا کمالِ معتبر جس کا کلام محترم

قوم کو جس پہ ناز تھا ہاں وہ زعیمِ ممتحن
ایک حکیمِ دیدہ ور ایک کلیمِ طورِ فن

سجنِ فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ ضمیر　　جس کے ثباتِ عزم کی ملتی نہیں کوئی نظیر
طبعِ بلند کا فقیر، فکر و دماغ کا امیر　　تھا جو وطن میں کل تلک ناظمِ امور کا مشیر

کنجِ لحد میں گوشہ گیر ہو گیا آہ اب وہی
اس کے الم میں سرنگوں کیوں نہ ہو پرچمِ شہی

اسوۂ یوسفی کی نذر جس کی حیات تھی تمام   حق کے لئے غم و محن جس کا تھا منصب و مقام

شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شعار تھا مدام   دار و رسن سے سرفراز، قیدِ محن سے شادکام

صبرِ جمیل کی ادا جس کی تھی شانِ امتیاز

عفو و کرم سے دل نواز، جور و ستم سے بے نیاز

آہ کہاں ہے آج اس شانِ فہیم کی مثال   طبعِ کریم کی مثال، خلقِ عظیم کی مثال

اب نہ اُٹھے گی ہند میں ایسے زعیم کی مثال   ایسے فریسِ دیدہ ور، ایسے حکیم کی مثال

آج ہے بے فروغ فیض بزمِ وطن ترے بغیر

بزمِ وطن ہے محفلِ حزن و محن ترے بغیر

اس کی حیات کو تھا آہ ملتِ حق سے یہ گلہ   بے خبرِ مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ

فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و حوصلہ   رزمِ حیات سے فرار آہ ہے جس کا مشغلہ

جہلِ خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب

سوءِ کلام سے دیا حُسنِ کلام کا جواب

جس نے کیں تازہ سنتیں سرکشیٔ عناد کی   حق کے خلاف بے پناہ معرکۂ جہاد کی

آہ وہ گرم جوشیاں ملتِ کم سواد کی   آہ وہ شانِ صبر و شکر بندۂ حق نہاد کی

گالیاں سن کے بھی مدام لب پہ دعائے خیر تھی

عفو و کرم کی کل متاع یعنی نثارِ غیر تھی

اب نہ اُٹھے گا عارفِ دینِ حجاز پھر کبھی   آہ ابوالکلام سا واقفِ راز پھر کبھی

ہوگا نہ عندلیبِ فن نغمہ طراز پھر کبھی   دفترِ علم و معرفت ہوگا نہ باز پھر کبھی

آہ نہ جانی اس کی قدر، ملتِ کم شناس نے

مسلمِ کم سواد نے، اُمتِ ناسپاس نے

غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادرِ روزگار شخصیت

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است۔ بایں قصہ اش دراز کنید

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی ہیں، جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ دور دورہ جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا، تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا، چنانکہ توئی، ہر کسے کجا داند
بہ قدرِ طاقتِ خود مے کند ادراک

انسانوں کے درجے

عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج ہیں۔ جو اس بناء پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی، بعض افراد خاص اسباب کی بناء پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقام شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت و احترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے چنداں پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاک دان تیرہ و تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے۔ جو زمان و مکان کے لوحِ قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں۔ لیل و نہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواجہ سنائی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:۔

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نادرِ روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا شمار مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل حقائقِ دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی؟ عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کمیاب ذخیرہ ہوا

جو ان کی نظر سے نہ گزر چکا تھا اور اس ذخیرے کی ہر مستحق اعتناء شے ان کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ مطالب ذہن میں بٹھا لئے جو انھیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجہ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُننے گئے۔ حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انھوں نے کیوں کر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہر حال ان کی مادری زبان تھی اور حیاتِ مستعار کے ابتدائی دس سال انھوں نے مکۂ معظمہ میں گزارے تھے۔ لہٰذا اسے اہلِ زبان کی طرح بولنے پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وارد ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے۔ مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے۔ یہی ایک مرتبہ مولانا کو ایک ترک مہمان سے فارسی میں باتیں کرتے سُنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہلِ زبان کی سی روانی کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لب و لہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری

پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے اور انھیں میں وہ درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے مناسبت تھی۔ دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، علم الالسنہ، آثار قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرۂ علم و فن میں وہ یگانگی کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گذر جاتی تھی۔ اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو شعرا کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابل توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جن اُردو شعرا کے محض نام سن رکھے تھے اور اُن کا کلام کبھی نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولانا کی تصانیف میں ان کے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں یہ تمام ذخیرے دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور ہزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے اتنی فرصت کیوں کر میسّر آ گئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزار لیا۔ جن کے وجود تک سے اہلِ علم بے خبر ہیں۔ پنجابی زبان کی ایک کتاب "پکّی روٹی" ہے جس میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیامِ امرت سر کے دوران میں انھوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھے۔ بے تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے، دماغ کے مختلف خانوں میں حسنِ ترتیب سے چُنتے جاتے تھے۔ ہر خانۂ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اُٹھا لیتے۔ "تذکرہ" انھوں نے صرف حافظے کی بناء پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرما لیں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظر بند ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل" کے ایڈیٹر تھے۔ طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب میں انھوں نے سادہ اوراق لگوا لئے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہو گیا۔

خدا کی خاص نعمت

"غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محبس احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی (صاحبِ "ماثرِ رحیمی") اور صمصام الدولہ (صاحبِ "ماثر الامرا") نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ

کی فوجیں بھی آ گئیں، اور خان خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی. اگر حادثہ رو دہد، جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابیم"، خان خاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہ"

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ "فتح آسمانی" اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں "فتح آساں نے" (فتح آساں نہیں) ہو۔ میری گزارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا:۔

" دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے لیکن اس میں "فتح آسمانی" ہی ہے۔ یعنی حالت ایسی ہے کہ سر و سامان کی بنا پر فتح کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو "آساں نے" ہرگز نہیں ہو سکتا۔ . . . اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہوا برسوں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "مآثر الامر" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔"

کون اس حافظے کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑیئے اور یہ دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں۔ جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہو سکتا۔

"الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الا ماشاء اللہ) امراء و رؤسا سے اعانتی رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امراء و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجۂ امتیاز میں کوئی خلل نہ آ ئے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحبِ ریاست نے خاص رقم کا چیک مولاناؒ کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھیئے اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے شکریے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا:۔

" ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسائے قوم کے جود و سخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سُن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

" ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں

" پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھانس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔ . . . ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادبِ واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے، کوہ نور اور تخت طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجئے۔ تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اُردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمت و خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچایا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلب ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولاناؒ نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے درپے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا۔ "ابتدائے عشق" ساتھ ہی فرماتے ہیں:-

> "انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بس اس کو چاہیئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنےٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکامِ وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۲۲ ہی کو داخل کر دی گئی۔

> "ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن "الہلال پریس" کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے...... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیٔ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوتی تو آیندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

قولِ فیصل

ایسی بے شمار قدریں مولاناؒ نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بسلسلہ ترکِ موالات گرفتار ہوئے تھے۔ اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انھوں نے بھی دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیان "قولِ فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجاہدینِ آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائد آزادی رابرٹ ایمٹ کا بیان بہت پرزور اور پرتاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن 'قولِ فیصل' کے مقابلے میں بھی وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جدوجہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیّر نہیں ہوا۔ لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے

مقامِ دعوت کے تقاضے

"الہلال" کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے "الہلال" کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولاناؒ کے مقامِ دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ "الہلال" اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ خواہ ان کا مسلک و مشرب راہ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعیِ حق کی حیثیت میں صورتِ حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں

نے نفع و سود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہلِ ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل باریوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھی۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پہلے نمبر کے افتتاحیے میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے موسمِ سرما میں ان کی چشمِ بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشۂ عمل کے اجزا ۱۹۱۲ء میں آئے یعنی جو پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال گزر گئے، سینکڑوں اکابر کی رائیں بدلیں۔ ان کے مسالک و مشارب میں تغیّر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے یہاں اس رائے پر بحث کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاعِ عزیز انہیں جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی۔ جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر حاصلِ حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے لیڈروں کے روبرو پیش ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے مسلک کی استقامت کے سلسلے میں بے دریغ لٹا دی۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر اس بے نظیر حوصلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری سلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں، انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُر تاثیر خطابات تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی۔ جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی۔ اس پر اونچے سے اونچے کا عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اُٹھتے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد و ارادہ بہت لمبا ہو گیا۔ سچ ہے:۔

ہمیں عشق است بر خود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کسے از معنیِ یک حرف صد دفتر نمی سازد

استغنا اور بے نیازی

تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا یہ اُن کی شانِ بے نیازی تھی۔ "الہلال" کے دورِ اول ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیاز مندوں کی التجاؤں کو شرفِ پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر سکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا۔ جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود اُن کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغنا،

یہ بے نیازی تمام نیازمندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے گا اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا۔

نذرِ حقیر

میں اپنے علم و نظر کی بے مائیگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات تھے، جو بے اختیار زبانِ قلم پر آگئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں۔ جنھیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہ عظمت و جلال میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذرِ حقیر شرفِ قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہند را رندِ سخن پیشہ گمنامے بود
اندریں دیر کہن مے کدہ آشامے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدارِ سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھیئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم جیرہ ذوقی کے جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ مولانا کے پایے کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شے فنا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

روحی الہ آبادی

یَغفِرُکَ اللّٰہُ
۱۳۷۷ھ

قطعۂ تاریخ وفاتِ حسرت آیات امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہٗ

اُٹھ گیا آزاد ذی فضل و کمال — ہوگئی سنسان بزمِ سوز و ساز
چشمِ ناکام تماشائے جمال — گوش محرومِ صدائے دل نواز
چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب — آگئی شامِ بلا محشر طراز
جنگِ آزادی کا وہ مردِ جری — سرزمینِ ہند کو تھا جس پہ ناز
تھا غریبوں کا انیس و غم گسار — دردمندانِ وطن کا چارہ ساز
تھا سراپا درد وہ عالی تبار — پیکرِ اخلاق تھا وہ پاک باز
اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات — دوربیں تھی اس کی چشمِ امتیاز
رحلتِ آزاد کی صبحِ ملال — لے کے آئی ہے شبِ ہجرِ دراز
اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں خوں چکاں — ہے زباں پر یہ دعائے دل گداز
وقفِ عیشِ جاوداں ہو اس کی روح — دے اسے جنت خدائے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخِ وفات
زیرِ تربت اب ہے محوِ خوابِ ناز
۱۹۵۸ء

سعید احمد اکبر آبادی

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسن انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں، یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعت نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن اُن کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارباب علم ان سے استفادہ کر لیں تو کر لیں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے۔ اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اُن سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیبِ بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب متعین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی رہی قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ و حکمت علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر، جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اُس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اُس فطریت اور سادگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

جو قرآن کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اُس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثارِ قدیمہ اکتشافاتِ جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اُس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفے و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ اُن میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے اُن پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا۔ یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدتِ ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور اُن کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آئی ہیں اُن پر سرسری طور سے گذر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اُبھارا اور اُجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کام کیا ہے اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شرعیت و منہاج کا فرق، دین اور شرعیت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب، اُن کے بانیوں اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبرِ اسلام کی عام دعوت اور انسانیتِ عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم کمالِ بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اُس پروردگارِ عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں :-

> "اس نے (قرآن نے) دین کے لئے الاسلام کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے . . . . . وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔"
>
> (ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۰۸-۲۰۹)

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گذرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ :-

> "جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا

سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:۔

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ (قرآن) انہیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات وعوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالم اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقاء بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سرسید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سرسید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہار مطلب کر رہے ہیں۔

متوسلین میں مولانا، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے طرزِ بیان وانشا اور قدرت و بلاغتِ کلام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو۔ لیکن اس کو اس بسط وتفصیل سے اور مدلل و مبرہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی۔ جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہادِ فکر سے محروم ہو کر تقلیدِ محض اور جمودِ ذہنی کی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہدِ فکر کا پیدا ہو جانا اُن کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اس طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ وکلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتبِ خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ اُن سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے۔ اُن کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہئے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے اُن کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:۔

"پہلے اُس کی تفسیر صحابہ وتابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔ پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو صاف نظر آئے گا کہ صحابہ وسلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ وسلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سُن لیجیے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی اُلجھن باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اوّل سے آخر تک تعقّل و تفکّر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔ دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلح شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے، ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اسی بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلاف توقع اور محلِ تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سُن لیجئے:-

یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں۔ مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اُردو میں پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمہ قرآن میں دلّی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقافت مجروح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور اس کی ثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے۔ جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور نہ جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد لکھے ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ہے یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔ اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی۔ تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق صاعقہ فگن۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرزِ ادا، یہ اسلوبِ بیاں اُن کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک خاص ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اسی لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

روشن صدیقی

امام الہند کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا
نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا

ہائے کس وقت بجھی شمعِ نہاں خانۂ عشق
شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا

کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت، لیکن
اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا

ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل
بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا

عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے
کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا

تا فلک، سلسلۂ حزن والم طاری ہے
جس طرف آنکھ اُٹھی درد اُدھر سے اُٹھا

سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال
حشر، خود اشک بداماں ترے در سے اُٹھا

علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجابِ اکبر
ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا

مہر و خورشید نے آنکھوں سے لگایا اُس کو
کوئی ذرّہ جو تری راہ گزر سے اُٹھا

تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی
ایک الزامِ کہن، عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اِک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

حافظ علی بہادر خاں

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

تحریکِ خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ جیل کی زندگی میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہنے کا موقع ملا اور بار ہا اُن سے بحث و گفتگو کا بھی فخر حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا "حیات بعد الممات" کے فلسفہ کے قائل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے "درحقیقت یہ ایک قانون حیات بعد الممات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے۔" وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ یخرج الحیّ من المیت و یخرج المیت من الحیّ (وہ موت سے زیست اور زیست سے موت پیدا کرتا ہے)۔

اس فلسفہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ عموماً یہ آیت بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ الحمد للّٰہ الذی احیا نا بعد اماتنا (سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی بعد اس کے کہ ہم مر چکے تھے)

اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر میں اس طرح پیش ہوتے رہیں جو قوم میں نئی رُوح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور خدمتِ خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے ہیں اور فلسفیانہ انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند واقعات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اُن کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جیل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُن کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد نینی سنٹرل جیل الٰہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں تھے جس میں صرف چار کوٹھریاں اور ایک ورانڈا تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور بقیہ تین میں ڈاکٹر کاٹجو، کیشو دیو مالویہ اور راقم الحروف رکھے گئے تھے۔ جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا انٹرویو اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا وہ ہم سے بار بار کہتے تھے "میرے بھائی! یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔" پھر فرماتے تھے کہ "کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" مجھے مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو وہ رہ رہ کر زبان پر لاتے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اُس نے برطانیہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے یہ ضروری نہیں کہ جاپانیوں کے مقابلہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ موثر سمجھا جائے۔ اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک منتقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا ورانڈے میں غم و غصّہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری

میں داخل ہوئے تو میں اپنی کوٹھری سے اُن کے اضطراب کا دل چسپ نظارہ کر سکتا تھا۔ وہ کوٹھری میں نہایت بے قرار تھے اور بار بار یہی کہتے کہ گاندھی جی نے یہ بالکل غلط بات کہہ دی " ایک بار اپنی کوٹھری سے مجھے مخاطب کرکے تو "گاندھی جی کی بھی عجیب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی ہماری مشکلات کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ایک تحریر جیل سے باہر بھجوائیں جو صرف خلافِ قانون طریقوں سے جا سکتی تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن ایک وکیل اور ایک اسکول ٹیچر اس لئے سزا پا چکے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خطوط پہنچانے کی کوشش کی تھی اور مشہور یہ تھا کہ یہ لیڈر بھی مولانا آزاد ہی تھے۔ یہ مسئلہ اُس زمانہ کے کانگریسی کارکنوں میں مختلف فیہ تھا کہ جیل میں جانے کے بعد جیل کے قانون اور ڈسپلن کی پابندی کی جا سکے یا نہیں۔ مولانا آزاد اُسی گروپ میں تھے جن کے نزدیک خفیہ خطوط کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہو تو جائز ہے۔ چنانچہ جب میں رہا ہونے لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے باہر لے جانے کا حکم ہوا تھا مگر پھر مولانا کو اور کوئی آسان ذریعہ مل گیا اور میں اس خطرناک خدمت سے محروم رہا۔

بہرکیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیام پہنچائیں اور اُن کی غلطی پر متنبہ کریں کہ خبر ملی کہ گاندھی جی الہ آباد تشریف لا رہے ہیں جہاں کملا میموریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے نیز مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ہوئی تھی جہاں ہم میں سے کوئی موجود نہ تھا مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک انٹرویو اخبارات کو دیا جس میں بتایا کہ پہلے انٹرویو میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد کا حربہ استعمال کرنے کا جو خیال میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کا فیصلہ نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ کا اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی کا یہ بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ نیا بیان دلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں میں نے اُن کو توجہ دلائی تھی اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کتنا غلط تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے پاسنگ ڈون کے "شو بوائے" ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کانگریس میں خاص اقتدار حاصل تھا اور وہ کانگریس کے منصب وقار اور روایات کے زبردست محافظ تھے۔

نینی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند لکچر بھی ہماری درخواست پر دیئے تھے۔ دوسرے بارکوں سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہونے کے لئے آجاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان لکچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے " اسلامی کلچر" کا جملہ استعمال کیا۔ بین السطور میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا "بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو۔" اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو یہ پایا کہ اُن کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا نعرہ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے۔

نینی جیل میں یہ عجیب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ صرف صبح کے چار بجے ترجمان القرآن کا فائل لے کر بیٹھتے اور اُس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے مطالعہ میں والٹیر، روسو، مِلٹن، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن سے صرف بی۔ اے ایم۔ اے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُن کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے اُن سے معلوم ہوا کہ نہ صرف انہوں نے وہ کتابیں پڑھی اور سمجھی ہیں بلکہ اُن مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فہم مضامین کے اعتبار سے اُن کی قابلیت ایم۔ اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں

کر سکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالباً ڈپٹی کمشنر تھا) آ گیا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تھا تو مولانا سمجھ تو لیتے تھے مگر جواب اُردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر نہ اس قدر کہ بے تکان بات چیت کر سکیں میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریزی بولنے میں صرف اس لئے تکلف تھا کہ تحریر و تقریر میں جو بلند معیار اُن کے پیشِ نظر رہتا تھا اُسے گفتگو میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی لئے مولانا نے شاعری ترک کر دی تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جو نہایت اچھے بھی ہوتے تھے لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار انھوں نے قائم کیا تھا اُس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جتنی فرصت درکار تھی وہ انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً انھوں نے شعر گوئی کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آ گیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں، مولانا کی آنکھیں آشوب کر آئیں جس کے باعث اُن کا مطالعہ بند ہو گیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ صبح چار بجے اُٹھتے مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پینے کے لئے مجھے ضرور بلاتے۔ دو دو کپ چائے پی کر ہم الگ ہو جاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے لیکن جب آنکھیں دُکھنے لگیں تو کبھی تو صبح تک باتوں میں گزر جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا تنہا کچھ سوچتے یا عموماً اشعار پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آ کر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں، اور میرؔ کی غزل کا یہ شعر ہلکی آواز سے مزے لے لے کر گاتے جاتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اوپر بتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں مستقل در کھلا ہوا تھا اور مولانا کی ایکٹنگ کے لئے میں تماشائی تھا۔ مولانا کو جو ترنگ میں میرؔ کی غزل پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کر سکیں لہذا میں پلنگ پر لیٹ گیا گویا کہ سو رہا ہوں۔ مگر تقریباً ایک گھنٹہ تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا لہرا لہرا کر غزل کے اشعار پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پر آتے تو خوب اُس کی رٹ لگاتے اور وجد میں آ جاتے۔ مقطع کو بھی بار بار دہراتے ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مولانا کی آنکھیں کیا دُکھنے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا کیونکہ صبح کا مطالعہ تو بند ہو گیا تھا مگر چائے کا دَور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا اُس کے بعد اکثر مولانا کی گل افشانیاں صبح تک جاری رہتی تھیں۔ اگرچہ اُردو زبان میں گل افشانی کا محاورہ کبھی بُرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ بلا مبالغہ پھول جھڑتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعتِ داماں بھی بخشتا۔ خیر! جتنا بھی مل گیا اُس کے لئے شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس گفتگوئے صبحگاہی کے مختلف پہلو لکھنے لگوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔

۴ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جیل کی زندگی میں مولانا کے تبصرے، لطیفے اور پند و نصائح سُننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتہ کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر۔ علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکتے تھے تو اُس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر ورانڈے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شطرنج جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یارڈوں سے بھی آ جاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر مجھے مات دینے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرے مقابلہ پر تو ڈاکٹر کاٹجو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتانے میں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہو گئی کہ ڈاکٹر کاٹجو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے بساط الٹ دی اور فرمایا کہ بس اب حافظ جی کو مات ہو گیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یارڈوں میں بھی شاطروں کو خبر بھجوا دی کہ "حافظ جی کو مات ہو گیا" جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند الفاظ اُس بارک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی رات کی معیت نصیب ہو گئی تھی یعنی منزل

جیل الہ آباد کے مضافات میں بہت وسیع جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ بارک بنائی ہے جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی "کُتا بارک" کہتے ہیں اس لئے کہ اس میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پیٹنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ان کوٹھریوں میں بند کر کے جب ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کتنا بھی چیخنے اور چاہے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بارکوں تک آواز نہ پہنچتی تھی اس لئے بارک کا نام "کُتا بارک" پڑ گیا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہی چار کوٹھریاں رہنے کو دی گئیں تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور اُن پر سیاسی اثرات نہ پڑنے پائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے لئے انگریزی حکومت نے ایک ورانڈا اور بنوا دیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں تین سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کیشو دیو مالویہ، دوسرے بالکرشن شرما "نوین" اور تیسرے مسٹر پالیوال، یہ تینوں اُتر پردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بمبئی کا تھا مگر الہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بمبئی سے گرفتار کرا لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹجو، آر۔ ایس پنڈت (وجے لکشمی کے سورگباشی شوہر) مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر باری باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال کر کے اُن کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بطور غسل خانہ استعمال کرنے لگے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اُس کے ڈرائنگ روم میں نینی جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں۔ اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا ہم سب اے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اُس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے (غالباً وجے لکشمی پنڈت کی طرف سے) کوئی کھانے کی چیز آ جاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی اسیری کے دوران نیز اپنی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنٹرل جیل میں لپٹن یا بروک بانڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی چائے کے وقت اگر رات کا دودھ خراب ہو گیا یا بلّی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیٹ نکالتے تھے۔

بمبئی میں آغا حشر کشمیری مشہور ڈراماسٹ سے جو مولانا کے ساتھ تھے مجملہ اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سُنے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ نینی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار اُن کے ہی ہیں اور آغا حشر کی سند پیش کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے کہ "عہد جاہلیت کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

وعدۂ وصل ابھی اک طرفہ تماشہ کی ہے بات — میں تو بھولوں نہ کبھی اُن کو کبھی یاد نہ ہو
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ — پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا کبھی کبھی بمبئی بھی رہے ہیں مگر اُن کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بمبئی میں پریل روڈ پر اُن کے والد کے نام سے ابھی تک مسجد خیر الدین موجود ہے۔ ایک بار تحریک خلافت کے زمانہ میں منبر پر کھڑے ہو کر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمٰن فیت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس مصرعہ سے شروع کیا کرتے تھے۔

۴۔ سب کا خدا خدا ہے میرا خدا محمدؐ

اس مصرعہ میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اُس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اُس کا نقشہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں نہایت دلچسپ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں یہ بعد المشرقین بہت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا آزاد بالکل "وہابی" ہو گئے تھے۔ اُن کی وسیع الخیالی کا تجربہ مجھے کئی اہم مواقع پر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اُس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ اُن کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ "الہلال" میں شروع کر چکے تھے میں نے اُن سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا۔ مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ مخالفین کو سمجھا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیئے جو تیر بہدف ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پہلے نظام سمرنا اور قائدین ترکی کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آگے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ "خلافت" میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اُن کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلیفہ کو جلا وطن کر کے جمہوریت قایئم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قایئم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی جلاوطنی پر آپ کے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوشگوار مناقشہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔

مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اُسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل شرف الدین مع اپنی ہمشیرہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو اُن کی ہمشیرہ کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا منشا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا۔ وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے۔ حال میں کتاب "آزاد کی کہانی" کے بعض ابواب سے، شیعہ فرقہ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا اُن کے خلاف تھے لیکن نینی جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دُور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو لکھنؤ میں مدح صحابہ کا قضیہ چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ "ہلال" میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے اس مقالہ میں دلچسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔ پی میں وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹجو کو یہ موقع اُس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خود مختاری کے دَور میں وزارتیں بنائی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمعیۃ علماء اور مجلس احرار دونوں سے اُن کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹجو نے روزنامہ "ہلال" کا وہ پرچہ مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمہارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں تو بمبئی سے اتنی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہلال" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف مولانا نے مجھ سے ایک خط بمبئی لکھوا دیا جس میں ادارۂ "ہلال" کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا۔ وہ ہر معاملہ پر اُس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلا خوف لومۃ لائم اُس پر قایئم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی شمولیت کانگریس سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ ۱۹۱۲ء میں پیش آیا جب کہ وہ یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ "الہلال" میں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلۂ مضامین "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے لکھا۔ جواب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں محاذ قایئم کیا۔ بدقسمتی سے چار برس روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کیمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا مگر بڑی حد تک اُن کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے "پنجاب پارٹی" بنائی۔ دراصل مجلس احرار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا مگر مجلس احرار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ نینی جیل میں پنجاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس جیل انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس احرار سے علٰحدگی کا اعلان کیا مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس احرار کو نینی جیل کی انٹرویو کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس احرار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہرکیف علی برادران اور اُن کے ساتھی علانیہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا

آزاد نے "پنجابی ٹولی" کو ہم سے بھڑا دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اس پنجابی ٹولی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی کشمکش کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی اُن تقریروں سے دنیا محروم ہو گئی جو "الہلال" والی اُردو میں ہوتی تھیں اور جنھوں نے اُن کو "ابوالکلام" بنایا تھا۔ کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم پر انھوں نے سادہ اُردو بلکہ ہندوستانی میں اظہارِ خیالات شروع کر دیا جس میں مغز ضرور ہوتا تھا مگر وہ جادو کہاں جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور اُن کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۲۶۔ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیمِ بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی، باغی، بے وفائے قوم، مفسد اور اسی طرح بعض بعض اصطلاحاتِ خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔"

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ "کانگریسی" کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی تحریر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے اُن کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے لئے گیا تو موقع پاکر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انھوں نے دیا مگر ادھورا کیونکہ دوسرے لوگ آ گئے۔ سوال اس بارے میں تھا کہ جناب غلام رسول مہر نے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اُس میں غالب کے گھر کو قمار خانہ اور غالب کا جواریوں سے نال وصول کرنا ثابت کرنے کے لئے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے۔ اور مولانا آزاد نے نواب لوہارو کی شہادت پر بھروسہ کر کے غلام رسول مہر کو اس بارے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لوہارو کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ Tainted (مجروح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لوہارو نے ایک مبینہ جواری کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالاں کہ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس اعلانِ بیزاری کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اُس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آغاز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے انھوں نے اپنے گھر شہر کے جواریوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قایم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لوہارو کے ایک ذمہ دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ خصوصاً جب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔ ابھی مولانا سمجھا ہی رہے تھے کہ چند آدمی آ گئے۔ اور تھوڑے انتظار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشفی نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ میں نے بمبئی کے متعلقہ حضرات مثلاً عبدالحکیم صاحب (مالک شرف الدین الکتبی۔ ادارہ) کو یہ خوشخبری بھی پہنچا دی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدامات کئے۔

مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک مقالہ میں نہیں سما سکتے اس لئے یہاں بس کرتا ہوں ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ بخود می گویم گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

شمیم کرہانی

خضرِ حیات

ٹوٹا ہے آج خاکِ وطن پر دہ کوہِ غم
پربت کا دل اداس ہے گنگا کی آنکھ نم
یکجا ہیں سوگوار صنم خانہ و حرم
غم سے جبینِ پرچمِ ہندوستاں ہے خم
مشرق کی صبحِ نو کا اُجالا چلا گیا
فرزندِ ارجمندِ ہمالا چلا گیا

وہ اُٹھ گیا، وطن کو ملا جس سے آپنے رنگ
جس نے حیاتِ عصر کو بخشی نئی امنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھا، خوں جس کا موجِ گنگ
دانش نے جس کی توڑ دیئے جادوئے فرنگ
خضرِ حیات و رہبرِ بیدار چل دیا
ہندوستاں کا قافلہ سالار چل دیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے خرد کا کام کیا وہ ابوالکلام
مغرب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہر نا امید دل کو جو اُمید دے گیا
شامِ وطن کے ہاتھ میں خورشید دے گیا

دانش میں طاق، فن میں یگانہ تھی جس کی ذات
اک روزگارِ نو کا ترانہ تھی جس کی ذات
عہدِ آفریں جنوں کا دِلانہ تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
بے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

پرسانِ حال، شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، جہانِ حبیباں کے واسطے
افسوں طراز، بزمِ خطیباں کے واسطے
سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے

یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہرِ منیر
ظلمت میں پھینکتا تھا تخیّل کرن کے تیر
حُسنِ سخن کمال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے اُبلتی تھی جوئے شیر

فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیتھوونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہدِ باطل شکار بھی
دُنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسّر، حکمت شعار بھی
نقّاد بھی، مصنّفِ جادو نگار بھی

اتنے تضاد اور اک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لئے ہوئے
آنکھوں میں دردِ عشق کی شبنم لئے ہوئے
ہمراہ انقلاب کا عالم لئے ہوئے
ہاتھوں میں استقلال کا پرچم لئے ہوئے

جس رُخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن شیر و قند تھا
رُتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا

دیتا نہ تھا گماں کو برائی یقین پر
تاروں پہ تھی نگاہ قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی
دشتِ جنوں کے شہپرِ جُنباں کی نغمگی

وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ مستِ خرام تھا

آواز تھی کہ گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی کیا بانکپن کی دھج
پہنی تھی منچلے کی جبیں پہ کلاہ کج

مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

بے شمع و چراغ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضوفشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چھاتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات

نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح گامزن تھی نئی ضو لئے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہرخند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو اُس کی ہمدم و دمساز ہوگئی
اک سرخمیدہ قوم سرافراز ہوگئی

کیا دورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن، حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب، تیشہ زنی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہو شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو وجہِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لمحہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلاخیز ہوگئی
کچھ اور بھی چراغ کی لَو تیز ہوگئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصور حوصلوں" کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خوان و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُرخطر ملے
کم ایسے روزگار میں شوریدہ سر ملے

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو نشانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز مسلماں ہے سربلند
"نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی، جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
صحنِ فضائے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

محمد یونس خالدی

امام الہند مولانا آزادؒ ۔۔۔ سفر اور مقصدِ سفر

"۱۹۱۱ء میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا مجھے معلوم تھا کہ اپنی آیندہ زندگی کے لئے ایک "مذہبِ عمل" قرار دے لوں، خدمتِ ملک و ملت دشتِ ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصولِ عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رُخ؛ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب)

پھر یہ بھی یاد رہے کہ

"سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں، جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر منزلِ مقصود تک پہنچ گیا، اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؛ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے؛ اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پا لیا۔ اس نے اپنا کام پورا کر دیا؛ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں؛ ایک ہی ہے۔"

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

باقی رہا مقصد کا سفر، تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔"

(تازہ مضامین)

جب یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں مذہبِ عمل کا تعین کس طرح کیا جائے اور کیا کیا جائے؛ لیکن جس کی زبان قلم سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا "مذہبِ عمل" "ملک کی آزادی یا موت ہے۔" اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

یہ آواز ہندوستان میں پہلی آواز تھی، اس لئے حیرت و استعجاب کے ساتھ سُنی گئی، ہر سننے والے نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ جو "مذہبِ عمل" متعین کیا گیا ہے۔ اور اشخاص کے سفر کی جو منزل بتلائی جا رہی ہے کیا واقعی کسی شخص واحد کا یہ مذہب ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس راہ پر چل سکتا ہے؟

مگر جواب دے تو کون دے!

آخر کار وہی انسان آگے بڑھتا ہے اور پورے جلال کے ساتھ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں" (مسئلہ خلافت)

. . . . .

"ملک کی آزادی یا موت" یہ راگنی بے وقت کی راگنی

ہے، ملک اس کے لئے تیار نہیں۔"

یہ آواز کسی ایک فرد کی آواز نہ تھی، ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔ عوام سے شکوہ کیا جائے تو کس طرح کیا جائے مدبرین عصر کی زبانوں پر یہی کلمات تھے۔ ان حالات میں "مردکار" آگے بڑھتا ہے، اور مدبرین زمانہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"ہمارے زمانے کے اکثر مدبر اس امر کو ایک مسلم الثبوت مسئلے کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لئے اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں، جب تک وہ اپنی "حریت" کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے۔

یہ مقولہ اس احمق کی زبان سے زیادہ موزوں معلوم ہوگا جو پرانی روایت کے مطابق تیرنا سیکھے بغیر پانی میں قدم نہیں رکھنا چاہتا، پس اگر قوم حریت (آزادی) کے لئے اتنے دنوں تک انتظار کرے کہ پہلے حالت غلامی ہی میں پوری عاقل اور ذی ہوش بن جائے، تو اس کو تا ابد صرف انتظار ہی کھینچنا پڑے گا، وہ دریا میں اترنے کے لئے تیرنے کے سیکھنے کا انتظار کرے گی اور تیرنا دریا میں اترے بغیر تا قیامت نہ آئے گی۔"

(انتخاب الہلال ص ۱۵)

لیکن مدبرین زمانہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک آزادی کی جنگ کے نتائج آج تک بھگت رہے ہیں، اب جو جنگ لڑی جائے گی وہ ہم کو کہیں کا نہیں رکھے گی۔ ہم کسی نئے انقلاب کے لئے تیار نہیں یہ غلامی ایک نعمت ہے اس میں ہم کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ دنیا میں جو انقلاب آتا ہے وہ تباہیوں اور بربادیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ آوازیں اس کے کانوں تک پہنچیں۔ ایک اضطراب کی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے کہا:-

"گو اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کر لے وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی" (انتخاب الہلال ص ۱۳)

اس کی یہ دلیل ایک معقول دلیل تھی۔ مخالفت کرنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، شاید بہت جلد وہ وقت آ جاتا کہ پورا ملک اس کا ہمنوا بن جاتا کہ ملک کے قلب نے کہا کہ اس دور میں آزادی کا نام لینا اپنے کو مجرم بنوانا ہے۔ ہندوستان طاقت ور ظالمانہ اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ مجرم بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

لیکن "آزادی یا موت" کا متوالا جو شخصی سفر اور "مذہب عمل" کی حقیقت انسانی دماغوں سے منوانے کے لئے بے چین تھا، وہ بول اٹھا۔

"ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب اس کا ہر فرد حکومت کے نزدیک مجرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے جرم سے توبہ کرتی ہے اور حق و آزادی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قوم کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ غیروں کی حکومت کا خاتمہ ہو، پس ظاہر ہے کہ اجنبی حکمرانوں کے نزدیک جرم اور بغاوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

ہندوستان بھی آزادی کے لئے بے قرار ہے اس لئے کب کا مجرم ہو چکا ہے۔" (تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

مگر اس کی باتوں پر جس طرح دھیان دینا چاہئے تھا۔ اس طرح دھیان نہیں دیا گیا، اور سُنی، ان سُنی کو برابر کر کے "کامریڈ نما ہمدردوں" نے کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی برکات کا مقابلہ دُنیا کے آزاد ملکوں سے کرو، اور دیکھو کہ یہاں کی غلامی دُنیا کی آزادی سے کس قدر بلند ہے۔ تعلیمی، سماجی، اصلاحی ادارے قایم کرنے کا ہم کو اختیار حاصل ہے۔ مندر، مسجد، گرجے، اگردوارے آزاد ہیں۔ حکومت ہر گوشۂ حیات میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تقریر بڑی خوش نما تقریر تھی اور دلائل بھی نا قابل تردید دلائل تھے۔ لیکن جس طبیب حاذق نے نبض پر ہاتھ رکھنے سے پہلے چہرے سے مرض کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے سامنے ان دلائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نے کہا کہ:-

"ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے۔ اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے۔ اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔ اس کی اخلاقی حالت برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل یکسر قلم سرچشمہ فساد ہے۔

لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں، اور اسی کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی ہوں۔

پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے، اس کو مفسد قرار دیتی ہے۔" (مضامین البلاغ)

لیکن

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی، کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی، اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں"

(قول فیصل" بیان عدالت)

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کی جنگ لڑے تو کون لڑے اس ملک میں متعدد قومیں ہیں، لیکن یہاں کے عوام دو اکثریتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک کا نام ہندو ہے اور ایک کا نام مسلمان، دونوں کی تہذیب دونوں کی معاشرت میں شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہر گوشۂ حیات میں ظاہر ہے۔ اس لئے دونوں مل کر آزادی کی جد و جہد میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں؟

یہ سوال ایک ایسا سوال تھا، کہ جس نے اس پیکرِ عزیمت کو ایک لمحہ کے لئے غور و فکر میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی رہنمائی کا ہاتھ جس رہنما کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اس کی تعلیم نے رہنمائی کی۔ تفصیلی جواب سے قبل اس نے پرجوش لب و لہجہ میں کہا کہ:۔

"ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے۔ صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اُن کی یک جہتی ضروری ہے۔" (خطبہ صدارت آگرہ)

اس اجمالی جواب نے مخالفین میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی۔ اور اس جھنجھلاہٹ کے نتیجہ میں ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، کہ یہ نعرہ مذہب کے خلاف ہے، کفر و اسلام کا اتحاد قیامت تک ناممکن ہے۔ اور دنیا کا کوئی بڑا سے بڑا انسان مذہبی تعلیم کی روشنی میں اس کو ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ آواز صرف بیبلک پلیٹ فارم کی آواز نہ تھی، بلکہ کچھ خانقاہوں سے بھی اسی قسم کی صدائیں بلند ہوئیں، سروں، خان بہادروں، رائے بہادروں نے آواز میں آواز ملائی۔ کتابچے شائع ہونے شروع ہوئے، اور مخالفین کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا جواب ناممکن ہے۔ لیکن وہ پیکرِ حریت و آزادی آگے بڑھا، اور ہندوستان کے ۲۹ کروڑ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ:۔

"ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔

آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا بجنسہ یہ اس کے الفاظ ہیں کہ

"ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں، ایک قوم بننا چاہتے ہیں" (خطبہ صدارت آگرہ)

پھر اس سلسلے میں دلائل کا ایک انبار سامنے آیا۔ اُس نے مخالفین کو ایک زبردست شکست دی۔ مگر نوجوانوں میں" آزادی" کے جذبات پرورش پاتے دکھلائی دیئے۔ یہ بات ہندوستانی روایات کے خلاف تھی۔ اس لئے اس نے کہا کہ میری ۱۹۱۰ء کی بات کو یاد کرو، اور اس کو اس معرکۂ آزادی میں اصل الاصول کی حیثیت دے لو۔ میں نے کہا تھا کہ

"ہر طاقت ور ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لئے ہے جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کر لے۔" (الندوہ لکھنؤ اپریل ۱۹۱۰ء)

یہ بات بظاہر بڑی خوش آیند بات تھی مگر جس فصیح انداز میں کہی گئی تھی۔ عوام اس کے متحمل نہ تھے، مردِ آزاد نے اُن کے چہروں کو پڑھا اور کہنا شروع کیا کہ:۔

ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کے ابتدائی مدارج
طے کر کے عملی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے۔ اس لئے قدرتی بات
ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہو
اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی
ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اور یہ حقیقت بھی تھی لوگ عمل کے لئے بے چین تھے۔ پہلا عملی پروگرام "ترکِ موالات" اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کے نام سے سامنے آیا۔ مگر ترکِ موالات (نان کواپریشن) ایک ایسا مسئلہ تھا جو مدبرینِ زمانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ترکِ موالات سے ملک آزاد ہو سکتا ہے کیا اس طرح غلامی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی ملک نے نان کواپریشن سے نجات حاصل کی ہے؟ بظاہر یہ باتیں ایسی تھیں جو عوام کو متاثر کرنے والی تھیں، حالانکہ اعتراض کرنے والوں کے دل جانتے تھے۔ اور ان کو اس کے دور رس نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ پھر بھی ان زبانوں پر مہرِ سکوت لگانا ضروری تھا۔ اس لئے معلمِ آزادی نے صاحبانِ فہم و فراست کی زبان میں فرمایا کہ:

"قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے
جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے۔ بلکہ متفقہ عمل ہے یہ
بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادہ
حقوق کواپریشن کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکتی۔ ہر قوم نے اپنے
حقوق جدوجہد کر کے حاصل کئے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور
کشمکش ہے۔ کواپریشن نہیں۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اب مسئلہ کی صحیح صورت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ اور ملک کے ہندو مسلمانوں نے مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ عام تعاون (نان کواپریشن) اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شباب پر آئی، برطانوی سامراج کے قدم ڈگمگانے لگے۔ مذہب سے بےگانہ مذہبی ٹھیکیداروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ ملک میں کچھ خانقاہیں اور آشرم پہلے سے موجود ہی تھے۔ جو موقعے کے منتظر تھے۔ بریلی سے ایک نیا گل کھلا، جس نے سرے سے اس تحریک کو عمل باطل قرار دیا۔ ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج حائل کرنا اور شُدھی، سنگٹھن کے نام سے ملک میں تصادم کرانا اصول قرار پایا جس کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ بہروپئے نئے نئے بہروپ بھرنے لگے، اور وہ آزادی کی جنگ جو کامیابی سے ہم کنار ہونے والی تھی، وہ بظاہر رکتے نظر آئی۔ لیکن یہ بات ملک کے لئے اور اہلِ ملک کے لئے بڑی شرمناک بات تھی۔ اس لئے اس نے ہندوستان کے ہر باشندے کو اس کا کیا ہوا عہد یاد دلایا، اور اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:۔

"چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک
بڑے سے بڑا اعلان کیا، اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا
انتظار کرے لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان
سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی
اور اپنے مجنونانہ کشت و خون کی اس کے لئے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ صورت
یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اس کی مدافعت اور
سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اسی حالت میں

"ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے
بچاؤ، دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں
کے حملے سے حفاظت کرو، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی
پکار بلند ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ بدنصیب ہندوستان کا وجود
کب قائم رہ سکتا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، انگریزی سامراج کا منشا پورا ہوتے نظر آیا۔ علاحدگی پسندی کے خیالات کی پورے ملک میں اشاعت ہونے لگی مسلمان جن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی، اور جو تعلیم اور دولت میں ان سے بہت پیچھے تھے، خود کو ٹوٹے اور خسارے میں سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے دریافت کیا کہ کہئے اب کیا رائے ہے۔ اس نے کہا کہ:۔

"کسی قوم کے آزاد ہونے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ
آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کر دے۔ جس وقت
ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی، اور عرب کی آزادی محفوظ
رہنی چاہیئے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خود آزادی
سے محروم نہیں رہ سکتا۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

یہ تو مسلمانوں کے لئے درسِ حقیقت تھا۔ اور ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا تھا مگر ساتھ ہی ہندوستان کی ۲۲ کروڑ آبادی سے بھی خطاب

کرتے ہوئے، اس مردِ حق بیں کو کہنا پڑا، کہ

"میں نے ۱۹۱۳ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی۔ اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگٹھن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ

"آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگٹھن کی ضرورت ہے اور نہ مسلم سنگٹھن کی، ہمیں صرف ایک سنگٹھن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔"

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

ابھی یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قیامت آگئی، مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کا سامان پہلے فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب ہندو بھی برگشتہ ہونے شروع ہوگئے۔ مسلمان کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کھائے جا رہا تھا، اور ہندو خلافت کی تحریک سے پیدا ہونے والے اثرات سے پریشان تھے۔ ان کو یہ خیال تھا کہ انگریز اگر اس وقت چلا گیا تو ملک کی باگ ڈور پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ بساطِ سیاست کے شاطر کھلاڑیوں نے دو قوموں کے دلوں میں دو الگ الگ قسم کے شبہات پیدا کر دیئے تھے ہندوؤں سے جس حد تک بات کہنی چاہیئے تھی، اس حد تک کہی گئی، رہا مسلمانوں کا سوال تو وہ اس کے ہم قوم تھے، ان سے اس بطلِ حریت اور مجاہدِ جلیل کے تخاطب کا انداز دوسرا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کوئی نیا نہیں تھا۔ جب اس نے ۱۹۱۳ء میں ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم یکجہتی بھائی چارہ اور اتحاد کا درس دیا تھا، اس وقت بھی ہندو اکثریت کا سوال اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے رکھا گیا، مگر اس کی نگاہیں ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ:-

"میں تو سمجھتا تھا کہ اب یہ بن نکل گیا، مگر آپ تیس برس کا پڑھا سبق ابھی بھولے نہیں، بہتر مسلمانوں کی تعداد کم ہے، سیلف گورنمنٹ، ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی، ہندو مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ غلام اور مملوک بن کر رہنا چاہیئے اگر یہ فلسفہ اب تک باقی ہے تو یاد رہے، تم کو غلامی مرغوب ہے تو انشاء اللہ خدا ہمیشہ غلام بنا کر رکھے گا۔"

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ دوم، ایک مراسلت کا جواب)

مسلمانوں کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ہندوستان کو آزاد ہونا ہے وہ آزاد ہو کر رہے گا مورخین عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادی ہند کا مورخ ہوگا۔ خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادیٔ ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اُسے اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر مرہونِ منت نہیں ہے، جس قدر پیروانِ اسلام کا"

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

اور جس وقت یہ باتیں کہی گئیں اس وقت کچھ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کا اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینا قرین قیاس تھا۔ کہ انگریز اگر گیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ انگریزی سامراج کے ایجنٹوں نے اس شک کو یقین کا درجہ دینے کے لئے مسلمانوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کی اور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں مصالحت کی پیش کش کا خیر مقدم کرنا چاہا۔ مگر جس کی نظر بساطِ عالم پر تھی اور جو یہ شہ اور یہ مات کہنے کے لئے تیاریاں کر رہا تھا اس نے کہا کہ:-

"جس وقت تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر، نصف حصہ یہ کہ جتنے حصے میں عراق کے گرد و غبار کا ایک ذرہ آسکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہاتھ باقی رہے۔ مسلمان کے لئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کرلیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں وہاں درندوں کے ساتھ صلح کرلیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں" (خطبۂ صدارت جمعیت علماء لاہور ۱۹۲۱ء)

مگر جب یہ مردِ باوقار نے دیکھا کہ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو تھوڑی سی تفصیل میں جاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ :۔

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے، اور ہو جانا چاہیئے کہ جب تک انگریزی گورمنٹ، برٹش گورمنٹ اپنے اس ایلیبانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے معاملات شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے۔ جب تک ایشیاء کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے اس وقت تک برٹش گورمنٹ فریق محارب ہے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے، وہ تمھارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرلے بچھوؤں کے ساتھ صلح کرلے، مگر انگریزی گورمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔" (خطبۂ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۲۱ء)

لیکن جو تخم فسادِ فرقہ واریت کے نام سے بویا جاچکا تھا۔ اور جس کی آبیاری کے لئے دونوں کے خون بہائے جا چکے تھے۔ اب ایک تناور درخت بنتے ہوئے نظر آیا، دوسری طرف ملک کے بعض گوشوں سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ ہندو مسلم اتحاد کا راگ گانے والے آزادی کی راہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہندوستان اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائے تو کل اس کو آزادی مل سکتی ہے۔ داعیٔ امن و اتحاد نے بھی ان بھولی بھالی پرفریب باتوں کو سنا، اور پھر اس وقت کے ۲۹ کروڑ ہندوستانی باشندوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹہ کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے۔

تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

لیکن بات جو ہونے والی تھی وہ ہو کر رہی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا، فسادات کی لہریں تیزی کے ساتھ بڑھیں، اور ملک پھر غلام کا غلام رہا، مگر اس کے اٹھے ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ سکے۔ یہاں تک کہ تاریخ نے ۱۷ برس اور گذار دیئے یہ زمانہ خاموشی کے ساتھ نہ گوارا جا سکا۔ جون ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۲۳ء تک وہی پوری داستان دہرائی گئی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک عدم تعاون، بائی کاٹ کی جنگ، بہادری کے ساتھ لڑی گئی۔ آئینی تبدیلی کے آثار ۱۹۳۵ء سے آنے شروع ہوئے۔ اور اب ہندوستان کے بوڑھی سیاست کے ماہرین نے بھی سمجھ لیا کہ حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس مبصرِ اعظم کو ایک بار پھر پورے ہندوستان کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

"اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں، ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گذرتے، ہم ہر منزل پر ٹھہرے، مگر رُکے کہیں نہیں، ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں، ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی، دُنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گذرا، ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا، ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقت ور رکاوٹیں کھڑی تھیں، ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن آج نظر اٹھایئے اور سامنے کی طرف دیکھئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں۔" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

مگر جہاں تک اندرونی مسائل کا تھا، تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح الجھے ہوئے تھے، سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی علاحدہ پسندی

کا مسئلہ تھا۔ اور مسلمان اپنے کو اقلیت میں سمجھنے لگا تھا۔ اقلیت کو جن خدشات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ سارے خدشات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آچکے تھے۔ اور ۱۹۴۰ء میں اس کے بعض پرخود غلط قائدین نے اپنی علاحدہ پسندی کا عام طور پر اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ جس نے ہندوستان کو متحدہ قومیت کا درس دیا ہو، اور جو باہمی اختلاف کو عالمِ انسانیت کا نقصان سمجھتا ہو، اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہی ہوا کہ ان حادثات سے اس کا سکونِ دل ہل گیا، اور ایک بار حکیمانہ انداز میں پورے ہندوستان کو اکثریت اور اقلیت کی حقیقت سمجھاتے ہوئے مسلمانوں کے دلی خدشات کو دُور کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور اسی جذبہ کے پیشِ نظر حکیمِ ملّت، امام الہند نے سب سے پہلے ایک سوال کیا کہ

"کیا ہندوستان میں مسلمان کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟"

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا، جب اس نے دیکھا کہ سب کی زبانوں پر مہرِ سکوت لگ چکی ہے، جواب دینا درکنار، سوال کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نظر نہیں آتی تو وہ خود آگے بڑھا اور کہنا شروع کیا:

"ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی۔ جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دُنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالکِ مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے، اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصوّر کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ نوعیت کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیئے کہ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے، دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا، اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔"

(خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کا مریض بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی نعشوں پر کھڑے ہو کر اپنی لیڈری کی عمارت تعمیر کرنے والوں نے اس مرد حق آگاہ سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھے، اور یہ یقین دلانا شروع کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے علاحدہ پسندی کی پالیسی صحیح پالیسی ہے، برطانوی سامراج کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا اس سے اچھا کیا وقت تھا۔ اس لئے اس نے بھی ۱۹۴۶ء میں "انڈیا پلان" کا اعلان کیا

"انڈیا پلان" کی تفصیل ایک طولانی تفصیل ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوا، تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے اس کا تصور بھی اندوہ ناک تصور ہے۔ اس وقت یہ یقین ہوا کہ

"سوراج ملنے کی تاخیر سے ہندوستان کا نقصان تھا۔ لیکن اتحاد کے رخصت ہو جانے سے عالم انسانیت کا نقصان نظر آرہا ہے۔

اور یقین نے اعتماد کی شکل ۱۹۴۷ء میں اختیار کر لی تھی اور حال یہ تھا کہ ایک طرف ہندو چیخ رہا تھا کہ ہمارا وجود خطرے میں ہے، تو ہندوستان میں مسلمانوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ برطانوی سامراج کے ایجنٹ اس وحشت و بربریت کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اب سنبھالا نہیں لے سکتا۔ اور یہ یقین اُن کا غلط بھی تھا۔ مگر انھیں کیا خبر تھی کہ ابھی وہ مسیحا موجود ہے کہ جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت میں آزادی کی روح پھونکی تھی وہ مسیحا نفسی کا پھر ثبوت دے گا۔

آخر کار یہی ہوا سب سے پہلے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور انھیں بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔"

پھر یہی بات ایک دوسرا انداز اختیار کر کے سامنے آئی کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے کہ جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں، واہمہ ہے حقیقت یہ ہے کہ بُری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔"

لیکن یہ باتیں ساری تمہیدی باتیں تھیں، اصل سوال اکھڑے ہوئے قدموں کا جمانا تھا اور ان کے دلوں سے اس خوف و ہراس کو نکالنا تھا کہ جس نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اس کے لئے فرمایا کہ:-

"مسلمان اور بُزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہے تو اس کو اپنے اس خدا کا جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا کہ "جو ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" ہوائیں آتی اور گذر جاتی ہیں اور یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔"

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام، تقریر جامع مسجد دہلی ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہی باتیں اس سے مختلف انداز میں لکھنؤ میں دہرائی گئیں مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے قدم جمنے لگے، اور دیکھتی آنکھوں نے یہ منظر دیکھنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسلمان موجود ہوں اور آج کسی کو کسی قسم کا کوئی خوف پریشان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب سوال ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا تھا، اس پر ہندوستان گامزن ہو چکا ہے۔

"لیکن سفر وہیں ایک اشخاص کا اور ایک مقصد کا"

مقصد کے سفر کی ایک کڑی ۱۹۴۷ء میں پوری ہو جاتی ہے۔ اور دوسری کڑی اس وقت پوری ہوگی جب پوری انسانیت آزاد ہو جائے گی۔

مگر جس کا اندیشہ برسوں سے لگا ہوا تھا وہ وقوع میں آچکا اور ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو شخصی سفر کا خاتمہ ہوگیا اور اس مسافر آخرت نے منزل کو جا لیا، اور دنیا کو کہنا پڑا کہ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

آج پورے ملک کے دلوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آج سب کی روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔

لیکن کیا کوئی ہے، جو اس کی زبان سمجھتا ہو، اور اس کا آشنا سا ہو، کیا کسی کو اس کا نام معلوم ہے۔ کیا کسی نے اسکے کاموں کا اندازہ لگایا ہے؟

یہ سوالات بے تکے سوالات ہیں، مگر یہی بات وہی ہے جو اس کی زبان سے اضطراب کی چیخ بن کر نکلی تھی۔

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں، جو میرا آشنا ہو، میں سچ، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب)

اگر اس کی اس بات کو ہندوستان غلط ثابت کرنا چاہتا ہے، تو پھر اس کا عملی ثبوت پیش کرے اور جس مقصد کو لے کر اس کے شخصی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ اس کو پورا کرے۔ اس کا اہم مقصد ملک کی آزادی کے ساتھ باہمی اتحاد اور فرقہ واریت کا خاتمہ تھا اور آج بھی ہندوستان کی راجدھانی میں کسی اور کی زمین پر نہیں بلکہ اگر دہلی کے قدیم نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اپنی زمین پر کھڑے ہوکر وہ یہی پیغام دے رہا ہے۔

"ہماری ساری کامیابیوں کا دار و مدار قدرت پر اعتماد، باہمی اتحاد، اور ڈسپلن پر ہے، اور اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔"







اُوپر:- ہندوستان کی عبوری حکومت کے ممبر تعلیمات کی حیثیت سے مولانا آزاد پہلی پریس کانفرنس میں (۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء)

درمیان دائیں:- مولانا ابو الکلام آزاد جرمنی کی فیڈرل ری پبلک کے صدر کے ساتھ۔ (جولائی ۱۹۵۵ء)

درمیان بائیں:- مولانا آزاد آثارِ قدیمہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے چھٹے اجلاس میں تقریر فرما رہے ہیں۔

نیچے:- مولانا آزاد نئی دلّی میں شاہِ افغانستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔









اُوپر دائیں :۔ مولانا آزاد مشرقِ قریب اور یورپی ممالک کے خیر سگالی
دَورے پر روانگی کے وقت۔
اُوپر بائیں :۔ مولانا آزاد دلّی کے پالم ہوائی اڈّے پر شاہ سعود کے ساتھ
سامنے :۔ مولانا آزاد استنبول میں۔

مولانا آزاد کشمیر کے مقام ڈاچی گام میں (بشکریہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)





خواجہ احمد فاروقی

مردِ آزاد

دہلی، کے ڈیلری لین
۲۲ - فروری ۱۹۵۸ء

صدیقی - کیا لکھوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے وہ منحوس گھڑی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، بالآخر آ پہنچی اور حضرت مولانا رات کے دو بجے ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آقا سے جا ملے۔ رنج، صدمہ، اس قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں - اور دیدہ و دل کی اُس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک اُن پر گزر چکی ہے - کل پرسشِ حال کے لئے درِ دولت پر حاضر ہوا تھا - مجمع سا مجمع تھا - اجمل خاں صاحب ٹیلی فون لئے بیٹھے تھے - یلا مبالغہ ہر منٹ پر گھنٹی بجتی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا:

"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب ملتا: "وہی حال ہے - کوئی افاقہ نہیں - دعا فرمایئے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گھنٹی جلد جلد بجنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے ہوتے بس یہ رہ گئے:

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی، بدستور" ـــــ پھر خاموشی چھاگئی - اتھاہ خاموشی - لاکھوں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی - ہر شخص کا رُخ ہم کنگ ایڈورڈ روڈ کی طرف تھا - سارا شہر اُمڈ پڑا تھا - مضافات کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے - میرٹھ اور علی گڑھ تو خیر دلّی کی انگنائی ہیں وہاں سے عقیدت مندوں کا آنا تعجب خیز نہیں لیکن مدراس، بھوپال، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ، جے پور، سری نگر تک سے لوگ ہوائی جہازوں میں آگئے تھے - تا حدِ نظر آدمی ہی آدمی تھے - ہر شخص مغموم، ہر آدمی رنجیدہ -

میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت کو مہندیوں میں دفن کیا جاتا جہاں چند ایسے بزرگوں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں: حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ محمد اسحاقؒ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ انکو لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے میدان میں دفن کیا جائے - سب سے الگ - خاص الخاص جگہ - یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ مولانا منفرد لوگوں میں سے تھے - با ہمہ و بے ہمہ - فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے - ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہی رہا - زندگی بھی لائقِ رشک اور موت بھی لائقِ رشک،

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

اُن کی زندگی، وفاداری و استواری کا کامل نمونہ - پر افشانی نور کی عجیب و غریب مثال - اُن کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا درجہ بھی بلند تھا - اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے - اس راستے میں کس کس طرح کی ذلتیں برداشت کیں، کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں، کیا کیا سختیاں جھیلیں، نہ پوچھئے

گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

وہ واقعی بے پناہ تھے - قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی

ہیں لیکن موتی بننے کے بعد وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ دریا کا طوفان اسے منتشر نہیں کر سکتا۔ اس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ اور میں تو کہوں گا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی نورافشانی جاری رہتی ہے۔ وہ ہستیاں جو اپنے آپ کو ایک بڑے مقصد کے لئے تج دیں، جو سچائی اور آزادی کی راہ میں مٹ جائیں، ان کے لئے مرنے کے بعد بھی موت نہیں ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

قلعۂ معلّٰی کے لاہوری دروازے سے نکل کر ایک وسیع میدان پڑتا ہے۔ یاد ہے آپ کو؟ جو شمال میں چاندنی چوک تک، جنوب میں فیض بازار تک اور مغرب میں جامع مسجد تک چلا گیا ہے۔ یہ بڑی مبارک جگہ ہے۔ شاہ جہاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام بادشاہوں کی سواری یہیں سے گزری ہے اس طرح کہ امراء پاپیادہ جلو میں اور ماہی مراتب کے ہاتھی ہمراہ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شاہ کلیم اللہ رحمنے یہیں بوریائے فقر پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ یہیں ان کے شیدائیوں نے ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگایا ہے، یہیں ان کا مشہور مدرسہ تھا، جہاں انھوں نے انسانیت کی بہترین قدروں کا درس دیا ہے یہیں مغلوں کے زمانے میں بڑے بڑے باغ، بازار، مسجدیں اور مدرسے تھے۔ یہیں گلابی باغ اور خانم کا بازار تھا۔ انگریزوں کے تسلّط کے بعد اس حصّے کو کھود کے پھینک دیا گیا تھا۔ آثارِ دہلی سب مٹا دئے گئے۔ غالب نے لکھا ہے: "شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی — اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔"

آج اسی تاریخی میدان میں، جس کے ایک طرف قلعہ کی خوبصورت عمارت ہے اور دوسری طرف جامع مسجد کے سربلند مینار، ایسا مجمع تھا کہ باید و شاید۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اپنے محبوب رہنما کو جی بھر کے دیکھ لے اور اسے عقیدت کا آخری نذرانہ پیش کر سکے۔ ڈیڑھ دو لاکھ آدمی ہوں گے جنھوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی لیکن ماتمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے بعد ان کے جسمِ اطہر کو بڑے ادب اور قاعدے اور پورے فوجی اعزاز و اکرام کے ساتھ خاک کے سپرد کر دیا گیا:

اے خاکِ تیرہ خاطرِ مہمان نگہہ دار
ایں نورِ چشمِ ماست کہ در بر کشیدۂ

صدیقی - یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک روشنی تھی جو گل ہو گئی۔ ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی تھی جو ٹوٹ گئی۔ علم و فضل کے صحیفہ کا ایک ورق تھا جو گم ہو گیا:

اَرَاَیتَ من حَمَلوا عَلیٰ الاعوادِ
اَرَاَیتَ کیفَ خَبَا ضیا النّادِی

[کیا (تم) نے دیکھا کہ لوگ کس کو تابوت میں اٹھا کر لے گئے اور
ہاں کیا (تم) نے دیکھا کہ ہماری محفل کی روشنی کیسی گل ہو گئی]

اس وقت عجیب عالم ہے "دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب"۔ جو صحبتیں ان کے ساتھ گزری ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے چشمِ باطن کے سامنے آ گئی ہیں جذبات کی پوری شدّت اور حشر سامانیوں کے ساتھ لیکن بیان کی ہمّت کسے ہے اور ہو بھی تو — بپایاں کہ رساند؟ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا:

"احمدؐ صاحب (مولانا ہمیشہ احمدؐ صاحب کہہ کر پکارتے تھے) آپ کا وطن کہاں ہے؟" میں نے عرض کیا "بھیراؤں" ذرا حیرت سے "بھیراؤں! بھیراؤں تو میرے بھائی ہم بھی گئے ہیں — خواجہ غلام الثقلینؒ ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں انگریزی تمدّن کا نفوذ قصبات تک کہاں ہوا تھا — وہاں ایک صاحب نے جو علی گڑھ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے، ہمارے اعزاز میں امروہہ سے (جو اس کے قریب واقع ہے) Menu چھپوا کر منگوائے تھے اور کھانے کی میز پر رکھے تھے!! (ذرا سکوت کے بعد) اور آپ اپنے ہم وطن زبدۃ الموحدین مفتی محمدؐ نور اللہ کی تصانیف سے بھی واقف ہیں؟"

مجھے حضرت مولانا کی پابوسی کا شرف پہلی دفعہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب وہ احمد نگر جیل سے رہا ہو چکے تھے اور غبارِ خاطر نئی نئی چھپی تھی۔ کاظمی صاحب قبلہ ساتھ تھے وہ مچل گئے کہ "یاسمن سفید" پیئیں گے لیکن وہ ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ڈبہ کو جھاڑ کے بنائی گئی اور سب کو بطور تبرک اس دردِ تہِ جام کا ایک ایک فنجان پیش کیا گیا۔ میں نے غبارِ خاطر کا ذکر چھیڑنا چاہا تو فرمایا "وہ تو غبارِ خاطر ہی ہے اور بس"۔

غبارِ خاطر کے متعلق آپ کے نعیم صاحب ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دار و رسن کی آزمائش میں لکھی گئی ہے اور اس امتحان کی بعض منزلیں "غزل خواں" ہی طے کی جا سکتی ہیں۔ غبارِ خاطر کا انداز کچھ اس طرح کا ہے:

وہ اک نگہہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

انھوں نے بساطِ دلبری پر ادائے لطف کو عام نہیں کیا، لیکن آخر آپ ایک

ع

مصنف سے یہ کیوں توقع رکھیں کہ وہ اپنی خلوت کے سب دریچے آپ کو دکھلا دے۔ کوئی شخص اپنے متعلق پوری سچائی بیان بھی تو نہیں کرسکتا اور اگر بیان بھی کردے تو بقول ایلیٹ اس کی تاب کون لاسکتا ہے؟ کیا روسو نے پوری سچائی بیان کی ہے سامرسٹ ماہم تو یہاں تک کہتا ہے کہ "اعترافات" میں بھی اس کی تصویر ناقص ہی ہے!

مولانا نے یہ خطوط احتیاط کی چھلنی میں چھانے ہیں "سراین شیشہ فروبند" پر زور دیا ہے اور بڑے خاص حالات میں لکھے ہیں:

خواہم از بندِ یہ زندان سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خونِ ناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

پھر بھی جا بجا التفات و تغافل کی عشوہ گری ہے اور کیا وہ بذاتِ خود دلچسپ نہیں ہے؟ مولانا نے ذوقِ حضوری کے لئے یادِ بتاں پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بادِ حیات ہی کو ہلکا نہیں کیا۔ ہمارے احساسات میں بھی بالیدگی پیدا کی اور زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے۔ وہ اپنے لمحات کو جاوداں بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور من و تو کی دنیا سے نکل کر بے کراں فضا میں پہنچ سکتے ہیں اور یہی ادبِ عالیہ کی شرطِ اوّل ہے۔

غبارِ خاطر کو پڑھ کر وادیٔ کشمیر کے ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفیدار کے سیدھے سیدھے اور خوش نما درخت ہوں، لیکن الہلال اور البلاغ کی تحریریں اُس تُند رو دریا کی یاد دلاتی ہیں۔ جو پہاڑوں کو چیرتا، کاٹتا اور میدانوں کو طے کرتا موج در موج سمندر میں گرتا ہے King James کی بائبل کی طرح لوگوں نے الہلال اور البلاغ کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور اس کی نثر پہ سر دُھنا۔ یہ ٹھیٹ مشرقی نثر ہے جس میں عربوں کی سی خطیبانہ بلند آہنگی اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں کی سی مرصع کاری ہم آمیز ہو گئی ہے۔ اس نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے۔ الفاظ میں نقارہ و دُہل کا سا شور و ہنگامہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں۔ خون کے قطرے ہیں اور ہر قطرہ پہ کاوشِ مژگان کے ظلم و ستم کی مہریں ہیں۔

مولانا نے لکھنا ایسے سیکھا تھا جیسے مچھلی تیرنا سیکھتی ہے۔ انشا کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزیں تھے جیسے فولاد میں جوہر۔ لیکن اگر تاریخ وار ان تحریروں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقا ہوا ہے۔ یہ شان دار اور پُر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی جو صحافت سہی لیکن اس نے تخلیقی سرحدوں کو چھو لیا ہے۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثراتِ خارجی کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں ادب کی جو گل کاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں۔ خطبات میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے اور یونانی اور عربی اصولوں کی پوری پابندی جو انھوں نے منبر پر نہیں، دار پہ برتی ہے لیکن ترجمان القرآن کے مقدمے میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں۔

مجھے بی بی سی کی وہ بحث یاد ہے جب آپ نے نثر کا سخن گسترانہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ درحقیقت ہماری نثر ایک بچّے کی طرح ہے جو نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو۔ وہ کئی دفعہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور کئی دفعہ گری ہے۔ نظم کے برابر اس نے مدارج طے نہیں کئے۔ غالب نے محمد شاہی روشوں کو ترک کیا اور اس کے اصلی جوہر کو چمکایا لیکن رجب علی بیگ سرور نے آئینہ خانہ میں رنگینیاں قید کیں۔ وہ "بے ناپ تول" لکھنے کے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی انشاء فارسی کے حسنِ مستعار سے چمکی۔ ایسا نظر سوز حسن جس میں اس کے اصلی خط و خال ہی چھپ گئے۔ حالی کے یہاں آب و رنگ غیر ضروری تھا اسی لئے رات کا غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بڑے اہتمام سے دھو ڈالا گیا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے پھر ادبی مرصع کاری کا آغاز کیا — یہ اسی قسم کی کوشش تھی جیسی (بلا تشبیہ) ڈرائیڈن کے زمانے میں جانسن نے یا ہیزلٹ کے زمانے میں کارلائل اور ڈی کوئنسی نے کی تھی۔ یہ گویا، خوشیہ باجی کی زبان میں بھاری بھاری "تلوان اور ٹکن کے جوڑے ہیں یا سونے کے جڑاؤ اور سچے موتیوں کے گہنے"۔ لیکن مولانا آزاد کے یہاں یہ بھاری مصالحہ بے وجہ صرف نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ سیاسی مقصد تھا جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اگر یہ سلمہ ستارے کا کام یوں ہی دکھلاوے کے لئے ہوتا تو اردو کی پرکار اُلٹی گھوم جاتی لیکن اس کے ساتھ اچھی قدریں وابستہ تھیں اس لئے یہ نثر بھی آگے بڑھی اور اس کے ذریعہ ہماری زندگی بھی — اس روشنی میں دیکھا جائے تو آزاد اپنے طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ نہ وہ جانشین

ہیں، نہ ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قدرِ دلکش کے ساتھ گلزار میں داخل ہوئے کہ سرو و شمشاد شرما گئے۔ وہ جہاں ہیں، تنہا ہیں۔

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں۔ لیکن جو چیز مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسنِ تناسب اور اس کی دل کش ہمواری ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آن جہانی تصور میں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں۔ اور دنیا کی طرف توجہ کی تو بس اسی کے ہو گئے۔ Pascal کو حیرت تھی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کیسے شاہد و شعر یا مے و رامش و رنگ و بو میں محو ہو جاتے ہیں۔ (They) Dance and Play the Lute and Sing and Make Verses

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گرد و پیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت ضائع کر سکیں لیکن مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش تھی اور بڑے صحیح تناسب کے ساتھ انھوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے انسانیت اور رواداری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزوست" کے سلسلہ میں ایک چینی مقولہ پیش کرنے لگے کہ اگر تمھیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ، اگر دس سال کا، تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے۔ لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجازِ عمل سے تاریخ کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتبِ عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویند پس از ہزار سال از عالم   روشن جانے ز آسمان زیر آید
خاقانی ازاں جنس درین دہر مجو   بر رہ منشیں کہ کاروان دیر آید

آپ کا

خواجہ احمد فاروقی

حاصلِ گذارش

"... ہم کو اپنے سفر میں نکلے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دوپہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اسے دیکھ رہی تھی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے اور اگر جمود و غفلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے وا ماندہ رہ گئے ہیں تو ہمت کا تزلزل اور قدم کی لغزش بھی برسر بازار ہے۔ متاع بالکل نئی تھی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی تھی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی ـــ

لب خشک رفت و دامنِ پرہیز تر نہ کرد   زاں چشمہ کہ خضر و سکندر وضو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے نفاذ کا کام ایک ایسا دشوار گذار سفر ہے کہ اگر قوموں کی بادیہ پیمائی اور تگ و دو کے بعد سلامتی کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انگیز اور اس کی فتح مندی جشن و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو معتقدات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں۔ اور صرف کسی دیوار اور محراب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سرِ نو بنانے کے آرزو مند ہوں...." (الہلال، جون ۱۹۱۴ء)

اعجاز صدیقی

تیرے بعد!

بہ یادِ ابوالکلام آزادؒ

تھا عجب سلسلۂ لطف و عنایت تجھ سے
تلخیوں کو بھی ملا رنگِ حلاوت تجھ سے
کسی دلدار نے کی جب بھی شکایت تجھ سے
مل گئی چہرۂ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذّتِ بے حرف و حکایت تجھ سے
اسے کہ باقی تھی تب و تابِ محبّت تجھ سے
"شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا" تیرے بعد

وضعداری وہ تری، وہ تری گفتار کا ڈھنگ
وہ خموشی تری اور وہ لبِ اظہار کا ڈھنگ
کجکلاہی وہ تری، وہ تری رفتار کا ڈھنگ
خلوتِ شب میں وہ تیرے دلِ بیدار کا ڈھنگ
صبح کے کیف میں وہ فکرِ فسوں کار کا ڈھنگ
"چائے" کی بھاپ سے اُٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ
"ہوئی معزولیِ انداز و ادا" تیرے بعد

جیسے یکبارگی خضرِ رہِ منزل کھو جائے
کوئی زحمت کشِ ہر جادۂ مشکل کھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل کھو جائے
بھیڑ میں جلووں کی تابِ نگہ و دل کھو جائے
شبِ تاریک میں جیسے مہِ کامل کھو جائے
سخت طوفان ہو اور دامنِ ساحل کھو جائے
راستہ بھول گئے راہنما تیرے بعد

موم ہو کر تری مٹھی میں رہا آہنِ وقت
ایک تھی، گردنِ مینا ہو کہ ہو گردنِ وقت
مستیِ راہبراں جب بھی بنی رہزنِ وقت
ہوشیاری نے سنبھالا تری اک توسنِ وقت
تو کہ تھا مے کدۂ وقت میں تر دامنِ وقت
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ" وقت
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا "تیرے بعد"

تیرے خاموش تدبّر کے اشارات کہاں
سب میں وہ قوّتِ تجزیۂ حالات کہاں
تھا یہ معلوم تجھی کو ـــ کہ گھنی رات کہاں
دن کے اُجیاروں سے کھا جاتی ہے خود مات کہاں
ختم ہو سکتی ہے ہر شورشِ آفات کہاں
بن کے خورشید، چمک سکتے ہیں ذرّات کہاں
سرد آتش کدۂ فکر ہوا تیرے بعد

گو ترے طرزِ تکلّم کا وہ جادو نہ رہا
نگراں اب وہ ترا دیدۂ ہر سو نہ رہا
نفسِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھول بن جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا
دل کی تسکین کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامۂ محفل ہے مگر تو نہ رہا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا" تیرے بعد

ہیں غلط سمت خیالات کے دھارے اب بھی
ضد پہ ہیں، کہنہ روایات کے مارے اب بھی
ہیں پسِ پردۂ انفاس شرارے اب بھی
آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو سہارے اب بھی
شر پہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
ہیں وہی برقِ سیاست کے نظارے اب بھی
"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا" تیرے بعد

لوگ کہتے تھے ترا خلوتیِ راز جنھیں
اور تو نے ہی دیا شعلۂ آواز جنھیں
سوز دیتی رہی تیری نگہِ ناز جنھیں
تو نے بخشی تھی نئی قوتِ پرواز جنھیں
وہ کہ تھا ہوشِ رُبا تیرا ہر انداز جنھیں
تھا ترے رنگِ طبیعت سے بڑا ساز جنھیں
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا" تیرے بعد

یوں تو دیکھے گئے شاملِ ترے ماتم میں سبھی
چند دِن کا تھا مگر مشغلۂ جامہ دری!
اب نہ وہ آہوں کی شدت ہے، نہ وہ نوحہ گری
قوم نے لٹے تری موت کی وہ قدر نہ کی!
تیرے اخلاص کی، دیبے کی طرح داد نہ دی
"غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی"
"کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیچیدہ سے پیچیدہ سوال
حدِ امکاں کے قریب آ گیا ہر امرِ محال
فیصلوں کو ترے ٹھکرائے، یہ تھی کس کی مجال
سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال
اللہ اللہ تری فکر کا وہ اوج و کمال
جنھیں گمراہیِ منزل سے ہو بچنے کا خیال
چُوم لیں وہ ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

ہمہ دانوں میں مسلّم ہمہ دانی تیری
بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری
لے کہ تحریر ہر اک گنجِ معانی تیری
اے کہ تصنیف نہیں کوئی بھی فانی تیری
بے نشانی سے بھی پیدا ہے نشانی تیری
وقت دُہرائے گا تا حشر کہانی تیری
تذکرہ ہوگا بہر حال ترا تیرے بعد

تیرا کردار مثالی وطنیت کے لئے!
تو نے نفرت کے سہے دار، محبت کے لئے!
تو شریعت کے لئے تھا کہ امامت کے لئے؟
تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے؟
یہ سمجھنا ہے کٹھن چشمِ حقیقت کے لئے!
تیرا ہوتا تھا کسی سخت ضرورت کے لئے؟
رازِ قوم اور وطن پر یہ کھلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
یہ چمن، تیرا چمن، میرا چمن، سب کا چمن
یہ ہمالہ کی زمیں، رقص گہِ گنگ و جمن
منبعِ علم و ادب، مرکزِ تہذیب و فن
جس میں پیوست تری فکرِ رسا سوزِ سخن
ٹانکنے والا ہے تا بہ دل کو سرِ پیراہن
پوچھ مجھ سے۔ کہ یہ ہو جائے گا کیا، تیرے بعد

رياض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی شخصیت

"آثارِ ابوالکلام آزاد" کی روشنی میں

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اُس اعتبار سے اُن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اُس میں بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اُس نے اُن کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہادیو ڈیسائی کی کتاب اور اُردو میں قاضی عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام آزاد" شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اُترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اُردو ادب کے طالب علم بہ حیثیت ایک انشا پرداز، صحافی، طنز نگار اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطعِ نظر سوانح نگار کی حیثیت سے "آثارِ جمال الدین افغانی" کی ترتیب کے بعد اُن کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں خاصہ بلند تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قُرب بھی زیادہ حاصل رہا اور اس لیے اُن کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں کہ ہمیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھا سکیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ اپنے دل سے دُور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک "بہت مشکل اِنسان" سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کا قاری اُن سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سُننے کا متوقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود اُن کے ذہن میں تردّد اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر اُن کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی "انفرادیت" ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:- "جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ اُن کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔" مولانا کی اس "انفرادیت" میں سب سے زیادہ حصّہ اُن کی محیّر العقول "جینیس" کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے "جب مولانا دُنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم و فضل اور تقدّس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت ور "جینیس" کی بے پناہ قوتِ اجتہاد بھی لے کر آئے جس نے انھیں آبا و اجداد کے حلقۂ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دُنیا کو ایک ایسی زبردست "انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اِس ملک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی "جینیس" نے اُن کی "انفرادیت" کو جنم دیا اور اُن کی انفرادیت نے ایک طرف اُن کی شخصیت

ہیں وہ حسن اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف اُن کے قلم سے ایسے جواہر ریزے نکلوائے جنھوں نے اُردو زبان کو امر کر دیا۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو اُن کے ادب میں جا بجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اُس کا سراغ پایا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں کھُل کھیلے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنا اور اپنے "حبیبِ لبیب" اور "صدیقِ مکرم" سے "ہم کلامی" اور "مخاطبت" کی خوش وقتی حاصل کرنا تھا۔ چناں چہ قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد "غبارِ خاطر" ہی سے لی ہے۔

اس میں شُبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا کی انفرادیت نے اُن کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی شُبہ نہیں ہے کہ اسی "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہنما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انھیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور جواہر لال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں: "اُن کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی اُسے عام پیمانے سے ناپ تول نہیں سکتا۔۔۔۔ مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت، جس کا خود انھوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اُونچی دیوار بن گئی ہے۔" کون جانتا ہے کہ اگر یہ "اُونچی دیوار" نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوئی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی توجیہ "غمگین احساس" سے کی ہے۔ اس معاملے میں اُنھیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمل خاں (جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمل" شائع ہو چکی ہے) نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انھیں "حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا" اور اس لئے انھوں نے "ایک ایسی معنوی کیفیت کو پہچاننے کے کچھ اشارے پائے تھے۔" لیکن وہ "مولانا کے اس قدر قریب کبھی نہیں" پہنچ سکے اور" اس لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا ضروری ہو گیا۔ غالباً اُس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کی شخصیت اتنی "مشکل" نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی۔

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "غمگین احساس" پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں اور ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "غمگینی" کا اصلی سبب کیا ہے۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی "آثار" کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عجوبۂ روزگار تھی۔ اُسی طرح اُن کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر چشمِ بینا کے لئے بڑا سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش ایک خالص مشرقی بلکہ مولویانہ گھرانے میں ہوتی ہے۔ انھیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی چوں کہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلّق رکھتے ہیں اس لئے اُن کے گرد عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کا ایسا ہجوم رہتا ہے جو اُن کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور اُن کی طرف پیٹھ کر کے چلنا عذابِ الٰہی کا موجب سمجھتا ہے۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں اُنھیں جو کچھ بننا چاہئے تھا اُس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ابتدائی دَور ہی سے وسیع النظری اور خدمتِ خلق کے مسلک کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر استخلاصِ وطن کی تحریک میں تن من سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انھیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آزادیٔ ہند کی جدّوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں لیکن مسلمان من حیثیت القوم اُس سے الگ ہیں اور سرسیّد اور اُن کے جانشینوں کے بنائے ہوئے راستے ہی پر چلنا باعثِ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اُس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں۔ اُس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں بھی شکن آلود ہو جاتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کے اشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور الزام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُس کی ذرا پروا نہیں کرتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن کے لئے وہ وقت البتہ بہت سخت ہوتا ہے جب اس ملک میں بسنے والے دو بڑے فرقے (ہندو اور مسلمان) اپنی سادہ لوحی کے سبب خود غرض رہنماؤں اور غیر ملکی حکمرانوں

بیل آنر وکا دین کر یا ہم دیگر دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا جو نقشہ انھوں نے اپنے ذوقِ عمل اور جراتِ کردار سے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتی بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کے دلوں میں اُن کے خلاف بے سر و پا شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت اور رہنمائی کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی افتیں برداشت کی تھیں اور قسم قسم کے الزامات اٹھائے تھے اُن سے واقعی بدظن ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہر قول اور ہر فعل کو شُبے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں گستاخی اور بدزبانی سے باز نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے کہ اپنے مخالفوں پر کیچڑ اچھالیں اور اُن کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دیں اس لئے کہ یہ اُن کی شانِ استغناء اور شخصی عظمت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ "ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے!) اپنے وجودِ معنوی کو بند" کر لیتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں سے اتنے دُور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لئے سوائے اس کے چارۂ کار نہیں رہتا کہ "اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش" کرنے کی کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تحریروں پر بھی پڑتا ہے اور اُن کی فطرت کا "غمگین احساس" جسے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرزِ عمل سے بہت تقویت پہنچتی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گداز پیدا کر دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" کے اوراق میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشان دہی فرما دی ہے، وہ "انانیتی ادب" کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نام زد فرماتے ہیں۔ مولانا نے "انانیتی ادب" کے سلسلے میں دنیا کے مختلف نامور ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا نام بھی کافی اُونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اُردو ادب میں تو بقول "قاضی عبدالغفار" کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں"۔ دوسری زبانوں کے "انانیتی ادب" کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا ہی کی تحریروں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "انانیتی ادب" کے "اخص الخواص ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا ادب عام تماشہ میں تو لایا نہیں جا سکتا اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کُلیّات پکڑ نہیں سکتے .... اس اشارے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے"

مولانا کے ادب کی اس شاخ کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت کا نقش اُبھرتا ہے اُس کے سب سے نُمایاں اجزائے ترکیبی قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساسِ برتری" ہیں۔ "جو عقلیت اور Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔"

یہ "خودداری اور کم آمیزی" مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے اُس کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس "خودداری اور کم آمیزی" کی بدولت ہم نے کھویا کیا اور پایا کیا؟ اس میں شُبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اوّل درجے کی "جینیس" میسّر آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دُور نکل گئے۔" لیکن ساتھ ہی ہم نے ایک ایسا عظیم سیاسی رہنما کھو دیا جو اگر اس درجہ "خوددار اور کم آمیز" نہ ہوتا تو اُس کا مقام کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے اس پہلو سے قاضی عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی بار بار آتا ہے اور وہ ہے اُن کے مخالفوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کے مخالفوں نے انھیں عوام کی نظر سے گرانے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے اور طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی زبان یا قلم کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جتنا بڑا کام کیا ہے اُس میں اُن کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی ہی کا لیا جا سکتا ہے۔ اس عارفانہ یک سوئی کے مظاہرے میں اُن کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں "رائے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے کو انھوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر منافی سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصوّرات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فضل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔" مولانا آزاد کی طرح قاضی عبدالغفار بھی فردیت کے بہت

بڑے دشمن ہیں اور اسی لیے جہاں کہیں اُن کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نقش آرائی کرتا ہے وہاں اُس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل بوٹے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اُس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ تعمیر ایک دفعہ پھر مسمار ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری تعصبات کی آگ روشن کر دی...... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے، لیکن مولانا خود اپنی "قوم" کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ اُن کے وجودِ معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا۔ جتنے زخم خود اُن کی گمراہ "قوم" نے اُن کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر انھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک حرف بھی زباں پر لائے بغیر گوارا کر لیا... ... مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی نفسیاتی کیفیت کو بھی تھا۔ اپنی نفسیاتی خلوت میں انھوں نے اپنے سے کم درجے کی مخلوق سے شکوہ شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا...... اُس احساسِ خودی اور علم و فضل کی اُس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد تھے اُن کو ہمیشہ راہ و رسمِ عام سے علاحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک تمکین وغیور، خاموشی تن تنہا اُن یورشوں کا مقابلہ کر سکی جو سال ہا سال ہر قدم پر اُن کا راستہ روکتی تھیں...... مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد پر رہے جو لیگ "سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کیے جاتے تھے... جب کانگریس کی تحریکِ آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کے نام لے کر مسلم لیگ کے نظریات کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض اور ناعاقبت اندیش قیادت نے جہلا کے جذبات کو اتنا گرم کر دیا کہ عقل و فہم کے تمام راستے بند ہو گئے تو اُس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔ "قائد اعظم" نے انھیں "شو بوائے" کا خطاب عطا فرمایا... جتنی گالیاں انھیں دی گئیں شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں... اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گزر گئے۔" اس سلسلے میں میں نے اتنے طویل اقتباسات اس لیے دیے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح میرا بھی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اُس کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے

سب سے اہم اُن کی زندگی کے اُسی پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں اُن کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ غیروں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کھا کر بھی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو اپنوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے۔ آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُن کے بھڑکانے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اوّل تو غیر ملکی حکومت کی کاسہ لیسی میں گزری ہے ورنہ کم از کم ذاتی عافیت کوشی کی خاطر قومی زندگی کی ہماہمی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی نہ گزر جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا اور دوسری طرف اپنے زبان و قلم کو مخالفت کی آلودگی سے ملوث نہ ہونے دینا اتنا بڑا کام ہے جس کی مثالیں تاریخ میں ڈھونڈنے سے دو چار ہی مل سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی انفرادیت نے اُسے عام سطح سے بہت بلند یا لا مقام پر متمکن کر دیا ہو۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے، اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور با مقصد ہوتی ہے اتنی ہی اُس کی راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ اِن رکاوٹوں سے کامران گزرنے کے لیے انسان کو جو جد و جہد کرنی پڑتی ہے وہ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اُجاگر کر دیتی ہے جنھیں تضاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد اُس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسا "انسانی رنگ" Human Touch دے دیتا ہے۔ جس سے وہ بصورتِ دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" کے ایک خط میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یہ "لوہے اور پتھر کا انسان" جب ایک حسین اور بے باک رقاصہ سے متصادم ہوا تو اُس کا اس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین و ایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب تک اورنگ زیب کو ایک سادگی پسند اور باوقار بادشاہ، بہادر اور ہوشیار سپہ سالار اور سخت گیر اور بے لچک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لیے جب ہماری نظر کے سامنے اُس کی زندگی کا یہ "تضاد" آتا ہے تو ہمیں حیرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لیے اُس کی شخصیت میں ایک ایسی کشش اور دلربائی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ

کیا ہے اور بتایا ہے کہ "متضاد عناصر کے تصادم" نے اُسے کس طرح متحرک Dynamic بنا دیا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان متصادم عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں: "مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں بار بار بیان فرماتے ہیں "غبارِ خاطر" کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے بیراکی کے شوق کو . . . . . سامنے لاتے ہیں۔" آگے چل کر وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے ان تضادات کی وضاحت کیوں ضروری خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ" مولانا کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس سے یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رُخ کیوں کر ممکن ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے۔" مولانا کی شخصیت کے اس "تضاد" پر بھی اُن کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں:- "زندگی کے حقائق کو وہ بار بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک نقطہ اُن کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے . . . مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازنِ ذہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت کو باقی نہیں رکھ پاتا لیکن مولانا آزاد اس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب گزرتے ہیں۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں انھیں اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومت برطانیہ سے درخواست کریں تو انھیں بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے لئے رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خودداری انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور باوجودے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر غیر ملکی حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قلب و جگر پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے ہیں کہ روزمرّہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے، یہاں تک کہ جیل کے ساتھیوں کو بھی (جن میں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سیّد محمود)، حقیقی واردات قلب سے آشنا کرنا پسند نہیں فرماتے، البتہ ایک "غائب از نظر، ہم نشین دل" کے نام ان واردات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور مُرتسم کرتے جاتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ انھیں ان مکتوبات کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا پورا یقین نہیں ہے۔ اُس زمانے میں مولانا کے محسوسات کتنے شدید تھے اور انھیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے . . . . . قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہر حال جو وقت آنا تھا آکر رہا خیر بدسُن کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اُن کی انفرادیت اس جاں گسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اُس کا حال سُنئے: "سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں اُن میں فرق نہ آنے پائے . . . . چوں کہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے پابند ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا . . . . یہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔" یہاں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت میں آمد Spontaneity باقی نہیں رہی، بلکہ اُسے قائم رکھنے اور بروئے کار لانے کے لئے انھیں خاص طور پر جدّ و جہد کرنی پڑی اور اسی کا دوسرا نام تصنّع اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی عبد الغفار نے بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "ضبط و تحمّل بھی اِسی انفرادیت کے سرفرازانہ وقار کی گویا

ایک بناوٹ ہے ۔۔۔۔ اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر اپنے ظاہر کو باطن سے متاثر نہ ہونے دیا۔" اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کے تصنّع اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کرنا ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہ و مہ اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انھیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اس لئے مذہب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انھیں مذہب کا جو تصوّر ملا تھا وہ بہت جامد اور بے روح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے! زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اُن کے دل میں شک کا کانٹا چُبھا اور اُس کی خلش اتنی بڑھی کہ اُس نے انھیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا، مگر مولانا قدرت سے طبعِ سلیم اور فکرِ رسا لے کر آئے تھے اِس لئے اُن کے قدم یہاں رُک نہیں گئے بلکہ جلدی ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصود ہے۔ جس عمر میں دوسرے لوگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اُس عمر میں مولانا سفر کی تکان دُور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خاصی طویل بحث کی ہے لیکن چوں کہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اُس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مولانا کی انفرادیت ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کو عورتوں کی ترقّی، موسیقی کے ذوق، جہادِ حرّیت، متّحدہ قوم کی تشکیل اور غیر مُسلم موحّدین کی نجات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے اِن عقائد کے اظہار میں انھیں ایک طرف جُبّے اور عمامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑا۔

کسی شخص کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے اُس کے ہم عصروں سے اُس کا مقابلہ و موازنہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے ماحول میں رہ کر ایک جیسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا تو ہمیں اُن کی قدر و قیمت متعیّن کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کا مقابلہ و موازنہ اُن کے دو جلیل القدر ہم عصروں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہی دو بزرگ ایسے ہو سکتے تھے۔ جن سے مولانا آزاد کا موازنہ کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں یہی تین شخصیتیں ایسی میسّر آئیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح متّصف تھیں اور جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے جان دار اور صالح روایتیں قائم کیں۔

مولانا محمد علی ایک عملی انسان تھے اور اُن کا "عشق" انھیں آتشِ نمرود میں کود جانے کے لئے آمادہ رکھتا تھا لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر متمکّن نہیں تھے اور اس لئے اُن میں ضبط و تحمل اور استقلال و استقامت کے وہ بلند پایہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے جو مولانا آزاد کی انفرادیت کے سب سے روشن مینارے ہیں۔ اسے قاضی عبدالغفار اِس طرح لکھتے ہیں:۔ "مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے اور ایک عمومی لیڈر کی طرح اپنے بادبانوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا (آزاد) اِس مفہوم اور انداز کی عمومیّت سے تقریباً بے گانہ رہے ۔۔۔۔ کبھی ان دونوں کے طرزِ فکر میں کوئی نقطۂ اِتصال پیدا ہی نہ ہو سکا ۔۔۔۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پُل نہیں باندھا جا سکتا ۔۔۔۔ مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقّاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت اُن کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا (آزاد) بعض اوقات دوسروں پر اس لئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کم تری نہیں بلکہ ایک بہت ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔"

ڈاکٹر اقبال عملی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکّر تھے اور اس لئے اُن کا موازنہ مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دُنیا ہی میں کیا جا سکتا ہے ان دونوں کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک ہے وہ رمزِ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں:۔ "اقبال رمزِ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفۂ حیات اقبال کے تصوّرات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے

زیادہ "مذہبی" ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتیٰ کہ ہر جان دار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں..... اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوتِ عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اُس قوتِ نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے.... اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصور سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے..... اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا، انسان کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے"

مولانا آزاد کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی عبدالغفار نے اُن کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اِس کوشش میں انھوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "غبارِ خاطر" سے لی ہے۔ لیکن انھیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمو دی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دُشوار گزار ہو گئی ہے اور مغالطے سنگِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شعریت نے ایک چادر بن کر اُن کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نُقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی!" کچھ اِسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی عبدالغفار سے بھی ہے۔ جو کسر مولانا کی شعریت سے باقی رہ گئی تھی اُسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور "تنقید اور تبصرے کی راہ" اور بھی دشوار گذار ہو گئی۔ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ "آثارِ ابوالکلام آزاد" مجموعی طور پر ایک عظیم اور "مشکل شخصیت" کو سمجھنے اور اُس کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کی خاصی کامیاب کوشش ہے، اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر عقیدت کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا جاتا اور "مشکل شخصیت" کا تاثر پہلے ہی سے ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

حیاتِ امید و موتِ قنوط

"مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لئے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی فیاضی کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری کے بیڑے چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسنگوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بسترِ مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے اور ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جبکہ قوتیں جواب دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشے سے صدائے ہمت نہیں آتی اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہے، اپنے پیروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایے میں سے کہ قوت و طاقت، ہمت و مستعدی، چستی و چالاکی کی ایک روحِ تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے!

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے، مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر عفریت بھی سامنے آکھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید اس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے۔ جب تک اس کا دوران دل سے اُٹھ کر دیا بصطلاحِ حال دماغ سے نکل کر، جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے، اس کی قوتِ حس زندہ، اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تکاپو ہیں۔ لیکن جہاں یہ روحِ حیات دل سے نکلی پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔"

("الہلال" ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

حمیدہ سلطان

زلیخا

نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھوئیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلآویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساری بے پروائی سے پہنے، مشرقی حیاآمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے - یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں "یوسفِ ہندی" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں -

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلّی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی - ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دو تو بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں - ان دونوں کے علم و فضل اور ادیبانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی - چوں کہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں اسی لئے ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا - اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی - پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہو گئے - یہ دونو اپنے مکرم بھائی سے ملنے بھوپال سے آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں - پھر اپنی چہیتی بھاوج بیگم زلیخا آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملوایا - مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے - والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ والی بیوی تھیں - مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے ان کو کھینچا، ادھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ بلا ناغہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتہ وہ یہاں آتیں - ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں -

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف. مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی - سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں - چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے نند بھاوج کے رشتے کو لے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا -

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے گا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا - میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔ وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں - دو چمچے اُبلے ہوئے چاول، تھوڑی دال، سبزی یا گوشت اور دہی - چونکہ صبح بہت سویرے اُٹھ جاتے ہیں اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کر کے نماز پڑھتے ہیں - اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارا کر کے یہ بولیں مگر "بھاوج معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں"

وہ جس انداز سے لجا کر بولیں "اے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے"۔ وہ انداز حجاب آج بھی مجھے یاد ہے - کیسی باحیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں - یہ اس دن ان پر

تقلید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارا کر کے کہا "اے توبہ! ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "آخر ہیں نا آپ بھی نند! بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آیندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔"

دوسرے ہفتہ جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکن کا خوبصورت بیل لگا بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساڑی زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے۔ اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دل ربا کر دیا تھا۔ یہ ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں۔ "اے ہے کہیں بری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاءاللہ چشم بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ حسب عادت لجا کر بولیں۔ "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے شرم آتی ہے۔" "اے ہے لو اور سنو حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمھاری عمر کون سی ایسی ہے سہاگنیں تو بڑھاپے میں بھی رنگا رنگ پہنتی ہیں۔" انھوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر زنانے میں ہی تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیویاں باتوں میں لگ گئیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان سفید کرتے پاجامے میں ننگے سر کتابوں کے ارد گرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی، اس کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "کیوں کتابیں نہیں ہیں؟" میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لیے واپس آگئی۔"

"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے۔ اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمھارے تو ماموں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو ملوا دوں۔" انھوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا۔ "آؤ بھئی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بہت ہی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب، خطابت، مذہب و سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی عظمت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔"

وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے۔ باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی کے غم میں مولانا پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانح حیات جب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا تھا۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ اُن کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں من موہنی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے

ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا فریفتہ ہو گیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو انھوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کو ان کا حساس دل نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انھیں پس ماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعلہ نفسی اور آتش بیانی قلم و زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی رفیقِ حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جدائی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گر گئی تھی مگر یہ ستی ستونتی اپنی دُھن میں مگن رہی۔ اپنی خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بنی ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے گھریلو آرام وہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکرِ صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فن کار غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی اچھی نہیں گذری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورتِ حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ اُن کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کئے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں۔ "بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اُٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۹ ۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جسدِ بے جان تو سپردِ خاک کر دیا گیا اور روح شاید قیدِ جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہو گی۔

مولانا صاحب 'غبارِ خاطر' میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

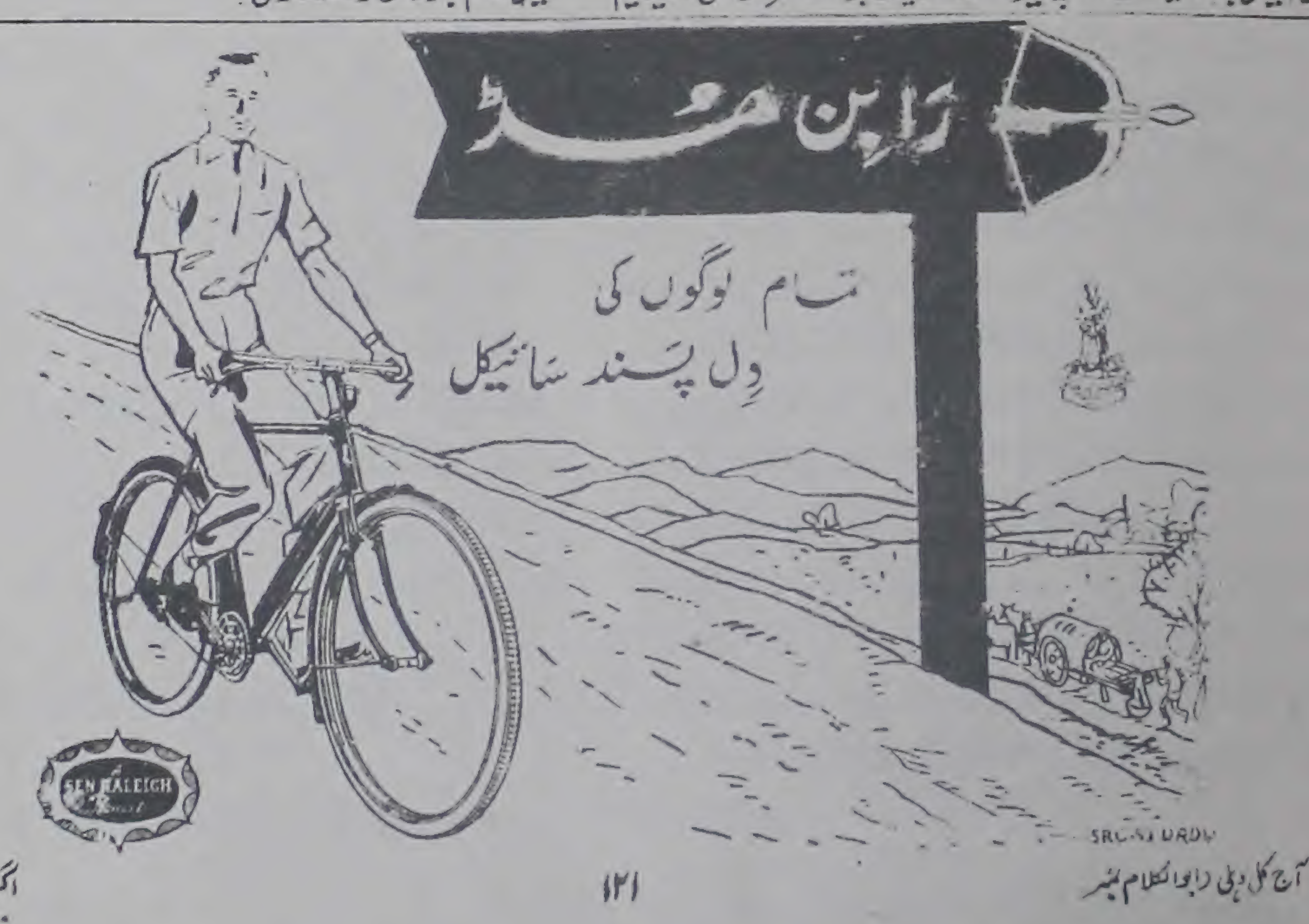
"گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار شمع صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن اُن کا دل ہل گیا۔ وجود معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جاں گداز غم کے زیرِ اثر انھوں نے غبارِ خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاخِ بریدہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسمِ بہار کی جاں نواز ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غم زدہ دل کو مقام کر کے بے اختیار فرماتے ہیں:۔

شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ان کا دلی حزن اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی زلیخا کی آخری آرام گاہ پر گئے، تو باوجود اس بے انتہا ضبط و تحمّل کے جو اُن کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ دفورِ رقّت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ بذلہ سنجیاں جو اُن کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں اُن کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود اُن کو بھی دلی لگاؤ ہے۔ لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اسی خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پہ میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دنیائے آب و گِل کی رہنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگیٔ خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اُٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا۔ اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی۔ جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایکدم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا۔ وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی ..... آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالمِ جاوداں کو سدھار گئی۔



غلام احمد فرقت کاکوروی

نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح

ابتدائے آفرینش سے اب تک شاید ہی کوئی ہستی ایسی گذری ہو جس کی زندگی میں وہ لطیف اور پُر مسرت لمحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا ہنسنے ہنسانے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چہلیں کرکے اپنے لئے لُطف و مسرّت کا سرمایہ فراہم کرتا ہے اس میں ثقہ اور غیر ثقہ، مہذّب اور غیر مہذّب سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ جو بظاہر بے حد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا بُعد ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں سے تھا جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی اُن کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے، بلکہ ضلع جگت اور رعایتِ لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی:

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں پھیلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اُسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

اُردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نوعمر اور نوخیز زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس تھوڑے سے سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ پختگی ہے کہ پڑھنے والا اس کی عمر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور ظرافت دونوں میدانوں میں ایک چھپے رستم اور مردِ مجاہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے ممتاز طنز نگاروں میں کھڑے کر دئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں اُن پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشاپردازوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار اور انشاپرداز کے یہاں نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک جداگانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اُسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی تمام ادیبوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز، اُن کی زبان اُن کے لہجے، ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے لکھتے آخر میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترنّم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری نثر اس طرح جگمگا اُٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک برجستگی اور بے ساختہ پن ہے۔ "غبارِ خاطر" میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور چینی چائے پر لوگوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

" دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اُسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کامیاب ارزاں ہو بے سمجھے بوجھے اس پہ ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پہ اجتماع کر لیا اب آپ سر پیٹیئے سنتا کون ہے؛

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر
کہیں پُرسشِ داد خواہاں نہیں "

مولانا کی بلند ترین مزاح نگاری اور بذلہ سنجی کی مثال ان کے ۱۷ اور ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۳ء کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے ہیں۔ ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں :-

" چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اُٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا ؎

خیالِ قدِ بلند تو می کند دل من
تو دست کوتہِ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اسے اُٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھئے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اُٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے ؎

بہ خنجر زمیں را نیستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا ؎

بیک تاختن تا بجیحوں تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم "

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص اندازِ بیان ہے اُسی طرح ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے اندازِ تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت، ان کی تقریر کا انداز اور اپنے ما فی الضمیر ادا کرنے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی سب سے جداگانہ ہے تو غلط نہ ہو گا۔ اردو مزاح میں ایک چیز رعایتِ لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مشّاق مزاح نگار بڑا ہی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس کرتا ہے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چٹخارے بھی لیتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ چیتہ خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا تھا) اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ چنانچہ ایک باورچی کا شہر کے کلکٹر نے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اُس قلعے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو :

" دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخ (باورچی) موعود یہی ہے ؎

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

مگر نہیں معلوم اس غریب پہ کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن کچھ

ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔"

ایک مصیبت اس بدنصیب باورچی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اُسے قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس باورچی کو رکھا کہاں جائے۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت لفظی سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بے وقوفی کہ اُسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قید خانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قید خانے کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قید خانے میں جو اُسے رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اُس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی تیار ہو گیا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی اور صداقت کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں بلکہ دوامی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً طنز کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کا طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اُسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پورے طور پر اُس جذبے کی اپنے دل میں پرورش کر لیتے ہیں تب اس کو اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی انشا پردازی الفاظ کا گھروندا نہیں ہوتی۔ وہ ایک سیلاب، ایک طوفانِ بلاخیز کا دھارا اور ایک شمشیرِ آبدار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کی نفیس صیقل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلوان سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ابوالکلام کی مثال اُس پہلوان کی ہے جو وسطِ میدانِ جنگ میں مبارز طلب ہو اور مردوں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

جیل میں ڈاکٹر محمود کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ طشتری میں دانہ لئے پرندوں کو آ آ کرکے بلاتے مگر اُن آہوانِ ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمود اپنی اس ناکامی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ مولانا اُن سے کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمود کہنے لگے۔

"سید محمود کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اُتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانے کی پیش کش بھی ایک جرم ہوئی

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اُٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کے تغافل کیشوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیازِ عشق کے دعوؤں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔" . . . .

جب ڈاکٹر سید محمود میناؤں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف ملتفت نہیں کر سکے تو مولانا لکھتے ہیں:۔

"شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا ہے۔ میں نے کوؤں کو دریوزہ گرانِ ہرجائی اس لئے کہا کہ کبھی اُنھیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ ہر دروازے پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چل دئے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمود کو رفتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے میناؤں کے دوسرے پرندے اور جانور اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا تناور درخت ہے اُس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دستر خوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں

یاران صلائے عام است گر می کنید کارے

پھر فوراً گردنیں اُٹھا لیتیں، اکڑا جاتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے

بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو دادِ ضیافت دیتے ہوئے بطریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں!

ڈاکٹر سید محمود کی سخاوت سے متاثر ہو کر جب قلعۂ احمد نگر پہ کوؤں کی یورشیں شروع ہو گئیں تو اُن سے کہا گیا کہ حضت اگر ممکن ہو تو فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :۔

" ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمر و متین گدھ بھی تشریف لے آئے ہیں۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم   توقیر کی صورتِ مجسم

اور گردن اُٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں۔

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی "

پھر جب وہ لنگر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پر مولانا لکھتے ہیں :۔

" اُن کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر تو ان کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آگیا

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہُوا دیر خراب

قصد کعبہ کا نہ کیجیے گا بہ ایں یمنِ قدوم "

اب تک مولانا کے طنز و مزاح کے جو نمونے پیش کئے گئے وہ صرف ان کی کتاب 'غبارِ خاطر' سے تھے جن میں ان کے اُنتیس مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار 'الہلال' میں حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں اُن لوگوں پر طنز ہے جو ایک دن قبل تک مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے کے بدترین مخالف تھے مگر رات کو لفٹیننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد انھوں نے اپنی رائیں بدل دیں۔ مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی تین مضامین میں ملتا ہے۔

" اتنے میں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور اُن نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کیجئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اینست وابرو این وناز وعشوہ این

الفراق اے ہوش وتقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم و جدید کو اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلد تا کو نہیں بلکہ صبح ۹ بجے سے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہو گی کہ صبح تک معدے میں فرو کش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدے سے۔ مگر افسوس کہ دوسرے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔

دل از من، دیدہ از من، آستیں از من، کنار از من

لیکن یہ جو کچھ ہُوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیئے آج کل ہماری نظریں (بحر مارمورہ) اور (دردانیال) کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں۔ تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۶۔ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیر افکار و اعمال کی پہلی منزل تھیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں "صبح امید" کے عنوان سے دو افتتاحیہ مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے تفصیل سے لکھیں۔"

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور انشائیہ بیان، جس پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ٭

فرمودات آزادؒ

دُنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اُٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے۔ اور یہ بھی اس شاہدِ عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور افتادگی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دلوں کو، اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے، اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خوں چکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں، اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں کو، پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا ہاتھ گلیمِ فقر و مسکینی سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو اُلٹ دیتا ہے یا کس کی تماشا آرائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سربسجود کرا لیتے ہیں۔

•

قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں پھر اس کی محرابیں اور اطراف و جوانب بھی طیار ہو جائیں گے۔ کشاکشِ حیات و ممات اور تسابقِ اقوام کی کش مکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خوابِ ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جائیے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصے کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی طیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی۔

ہاں رہِ عشق ست دریں گشتن ندارد بازگشت — جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

•

اس عالمِ اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی ایک قدرتی طبیعت اور مزاج رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے اور تعمیر سرتا سر سکون اور خاموشی ہے۔ تعمیر، جمع، نظم، ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب تفرقہ، برہمی، اضطراب اور سلب و نفی ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و اضطراب کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے گرنے میں دھماکا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر تخریب کا عمل تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پُرشور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے لیکن تعمیر کی دلآویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکا دور سے بھی سن لیا جا سکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے

•

دہقان ایک بیج اُٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بارآور ہونے کے لئے قدرتِ الٰہی نے کس طرح اپنا کارخانۂ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے، بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کرے۔ لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لئے بیکار ہوگا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اُسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرۂ آب ختم کر ڈالے جب بھی اُسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

•

جب آپ ریل سے سفر کرتے ہیں!

تو کیا آپ زیورات، قیمتی پتھر، گھڑیاں، ریشمی کپڑے، شال دوشالے، کشمیرے

سازِ موسیقی یا دوسری قیمتی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں!

اگر ایسا ہے تو آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب آپ ایسی چیزیں ریلوے کے سپرد کریں اور ان چیزوں کے کسی ایک پیکج کی قیمت تین سو روپے سے زائد ہو تو آپ کو یہ کرنا چاہیئے:-

۱۔ بکنگ کراتے وقت ان چیزوں کی قیمت لکھ کر دے دیں۔ اور

۲۔ بھاڑے کے علاوہ ان چیزوں کی قیمت کا ایک فیصدی حصہ ادا کر دیں۔

اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو ریلوے ان چیزوں کی گم شدگی، ٹوٹ پھوٹ، خرابی یا نقصان کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

مندرجہ بالا چیزیں اور کئی دوسری چیزوں کے نام آپ کو ریلوے ٹائم ٹیبل اینڈ گائیڈ میں Excepted Articles کی فہرست میں ملیں گے۔

اس سلسلے میں تفصیلی معلومات اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر سے حاصل کیجئے

ناردرن ریلوے

ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۲۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
جواہرلال نہرو کی تقریریں (۱)،(۲)، (۳)، (۴)،(۵)، (۶)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

پچیس ۲۵ روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ اولڈ سکریٹریٹ دہلی

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی رسالے

انڈین انفارمیشن
(پندرہ روزہ رسالہ)
اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔
قیمت فی کاپی ۳۰ نئے پیسے ۔ سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا
"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دل چسپ مرقع"
(سنڈے نیوز آف انڈیا)
فی کاپی ایک روپیہ ۔ سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر
کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دل کش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔
فی کاپی ۵۰ نئے پیسے ۔ سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ
سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان — اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔
فی کاپی ۲۵ نئے پیسے — سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیر
سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے ۔ سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی

میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کُروکشیتر
اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک
یہ رسالہ کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔
فی کاپی ۱۰ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)
چیف ایڈیٹر:- خوشونت سنگھ
اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اُن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے
سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار
(پندرہ روزہ رسالہ)
اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔
فی کاپی ۲۵ نئے پیسے ۔ سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)
یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی ثقافتی مسائل اور غیر ملکی معاملات سے متعلق مضامین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔
قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ چھ روپے۔

بال بھارتی
ہندی میں بچوں کا باتصویر رسالہ۔ دل چسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں۔
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے۔
سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان
ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کا ترجمان
فی کاپی ۳۵ نئے پیسے
سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں
یا براہِ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی۔

Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi
gd. No. D—509

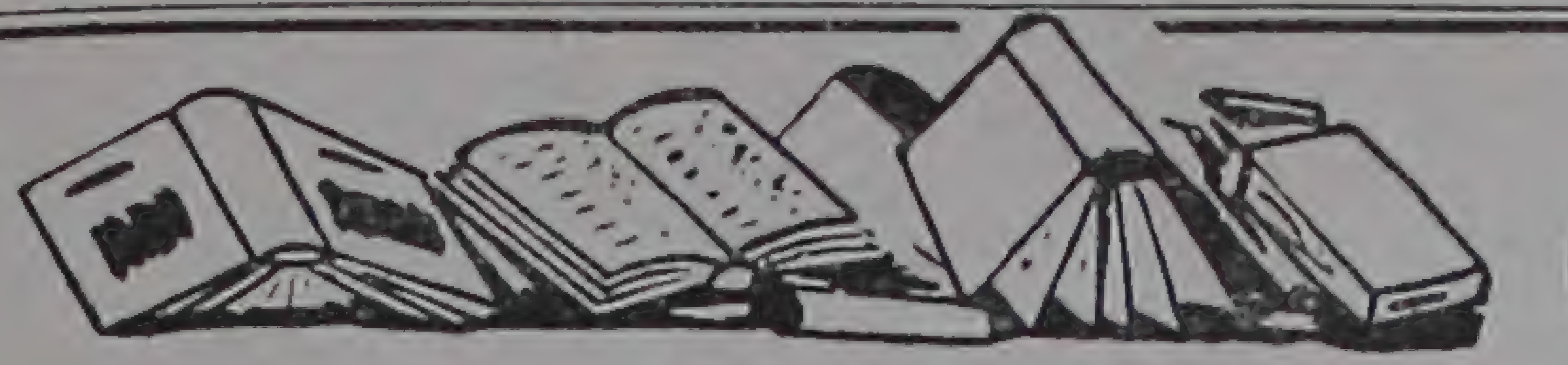
آجکل



اکتوبر ۱۹۵۸ء

اسوج ۔ کارتک شک سمت ۱۸۸۰

۵۰ نئے پیسے



ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پنڈت نہرو سے بات چیت (نامور فرانسیسی جرنلسٹ ٹیبر منڈی سے)	دو روپے	۵۰ نئے پیسے
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۵۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
جواہر لال نہرو کی تقریریں (۱)، (۲)، (۳)، (۴)، (۵)	۱۰ نئے پیسے (فی کاپی)	۸ نئے پیسے (فی کاپی)

ہندوستان ترقی کی راہ پر

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ نئے پیسے فی کاپی	۸ نئے پیسے فی کاپی
آبپاشی اور بجلی		
ہمارے پلان اور سوشلزم		
صنعتی ترقی		
خوراک اور زراعت		
رسل و رسائل		

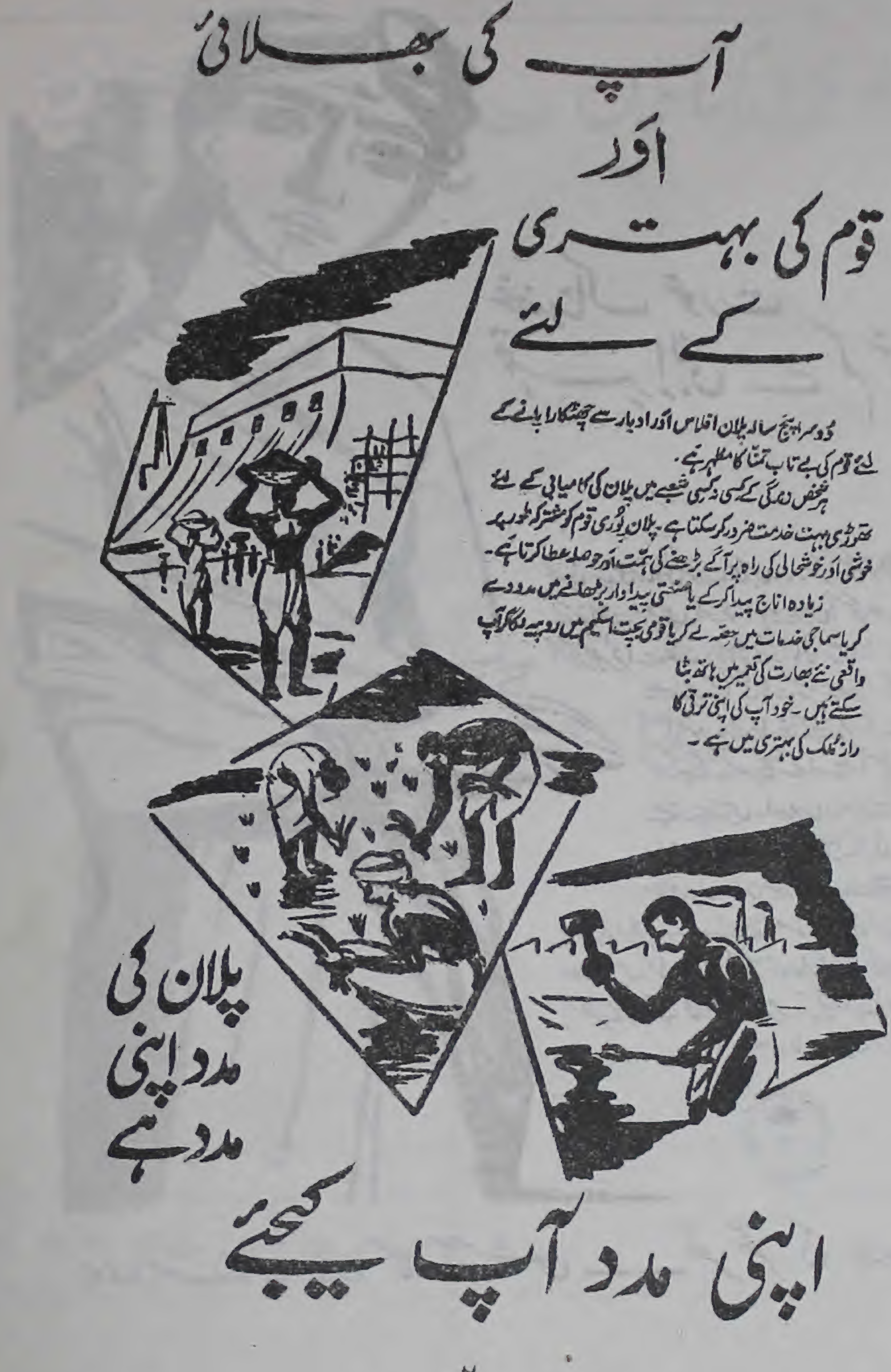
(رجسٹری خرچ الگ)

بچیس ۲۵ روپے یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۸



غضبناک عورت
قہرِ الٰہی سے کم نہیں!
گھر کی سیدھی سادی عورت ہی سہی . . . مگر اُسکی خواہشیں ہمارے لئے نہایت اہم ہیں۔ گھریلو کام کاج میں اُسکی ضرورتوں سے آنکھ پھیر کر اُسے غصّہ دلانا کوئی دانائی نہیں۔ اسی لئے اِس سلسلے میں ہم اُسکی بات کو ہمیشہ حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔
اُسکی ضروریات جاننے کیلئے ہم سارے مُلک میں مارکیٹنگ ریسرچ کے ذریعے اُسکی مانگوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور یوں درحقیقت گھر کی یہ سیدھی سادی عورت ہی وہ معیار پیش کرتی ہے جن کے مطابق ہندوستان لیور کی مصنوعات تیار کیجاتی ہیں۔
یہ معیار برقرار رکھنے کیلئے مصنوعات کی تیاری کے دوران میں، بار بار اُن کی کڑی جانچ پرکھ کی جاتی ہے، اور اسطرح ہم آپ کی خدمت میں آپکی ضرورتوں کی اعلےٰ مصنوعات پیش کر پاتے ہیں۔
ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت
BLL N-XSRUD


آپ کی بھلائی
اور
قوم کی بہتری
کے لئے
دوسرا پنج سالہ پلان افلاس اور ادبار سے چھٹکارا پانے کے
لئے قوم کی بے تاب تمنا کا مظہر ہے۔
ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں پلان کی کامیابی کے لئے
تھوڑی بہت خدمت ضرور کر سکتا ہے۔ پلان پوری قوم کو مشترکہ طور پر
خوشی اور خوشحالی کی راہ پر آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔
زیادہ اناج پیدا کر کے یا صنعتی پیداوار بڑھانے میں مدد دے
کر یا سماجی خدمات میں حصہ لے کر یا قومی بچت اسکیم میں روپیہ لگا کر آپ
واقعی نئے بھارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹا
سکتے ہیں۔ خود آپ کی اپنی ترقی کا
راز ملک کی بہتری میں ہے۔
پلان کی
مدد اپنی
مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجیے

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق ـ بشنو از نے چوں حکایت می کُند

اکتوبر ۱۹۵۸ء

اسوج - کارتک شک سمت ۱۸۸۰

جلد ۱۷- نمبر ۳

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے | پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۵۰ نئے پیسے | پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مُرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

مُلاحظات

۲ اکتوبر کو راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا جنم دن ہے۔ اس عظیم ہستی نے اہنسا کا جو پیغام دیا، آج ایٹمی دھماکوں سے سہمی ہوئی دنیا کے لئے وہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ حالات و واقعات نے ثابت کر دکھایا ہے کہ نفرت اور جنگ و جدال سے دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ صلح و آشتی پیار اور محبت کے راستے پر چل کر ہی دنیا کی سب چھوٹی بڑی قومیں امن اور چین سے رہ سکتی اور ترقی کر سکتی ہیں۔ یہی گاندھی کا پیغام ہے جس کی اہمیت اور ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مغربی ایشیا میں لبنان اور عراق کی سیاسی صورتِ حال نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جس سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ اب خطرے کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر عرب ملکوں کا ریزولیوشن منظور کر لیا جس میں اقوامِ متحدہ سے کہا گیا ہے کہ وہ براہِ راست تعلق رکھنے والے ملکوں کے مشورہ سے ایسے انتظامات کرے جس سے لبنان سے امریکی اور اردن سے برطانوی فوجوں کے تخلیہ میں سہولت ہو۔ اس ریزولیوشن میں سیکریٹری جنرل سے کہا گیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے متعلقہ حکومتوں سے جلد از جلد بات کریں۔

جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا ہے۔ اس ریزولیوشن کی منظوری سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک تو یہ کہ عرب ممالک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور عرب قومیت کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔ دوسرے جو ملک عرب قوم پرستی کے جذبہ کو نظرانداز کرتے رہے تھے، وہ اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

روس نے یک طرفہ طور پر ایٹمی تجربے بند کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اب امریکہ اور برطانیہ بھی بعض شرائط کے ساتھ ایٹمی تجربے بند کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ خدا کرے، بڑی بڑی طاقتوں میں جلد کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور دنیا ایک مستقل خوف و ہراس سے نجات پائے — اس کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سمجھوتے کی نگرانی کا انتظام کیوں کر ہو؟ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مشرق و مغرب کے ایٹمی ماہرین کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس نے طویل غور و خوض کے بعد یہ سفارش کی ہے کہ اس بات کی نگرانی کے لئے کہ ایٹمی تجربات واقعتاً بند ہو گئے ہیں یا نہیں، بین اقوامی کنٹرول کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ تمام ضروری آلات سے لیس، نگرانی کی چوکیوں کا ایک سلسلہ براعظموں اور جزیروں پر اور بڑے سمندروں کے بیچ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قائم کیا جائے۔ یہ ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بعض امکانات اور حدود کے اندر ایک ایسا قابلِ عمل اور مؤثر نگرانی کا نظام قائم کرنا ممکن ہے جس سے ایٹمی تجربات بند کرنے کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کا پتہ چل سکتا ہے۔

جب کوئی ملک ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مشکلات کو حل کرنے میں جہاں اندرونی وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے وہاں بیرونی امداد کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں تعمیر و ترقی کے بڑے بڑے کام چل رہے ہیں جن کے لئے ہمیں بیرونی ممالک سے بھاری سامان وغیرہ منگانا ہوتا ہے اور اس کے لئے غیر ملکی زرِ مبادلہ کی ضرورت ہے۔ جس میں بعض اوقات مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ اطلاع باعثِ تسلی ہے کہ واشنگٹن میں ہندوستان کی بقایا ادائیگیوں کے مسئلہ پر عالمی بنک کے ماتحت جو گفتگو ہو رہی تھی وہ کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور اب ہندوستان کو مزید معقول امداد حاصل ہو جائے گی۔

بخشی غلام محمد وزیرِ اعظم کشمیر اور ان کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے کہ انھوں نے پنڈت ہری چند اختر مرحوم کے بچوں کی امداد کے لئے -/۱۸۰۰ روپے فی سال کا وظیفہ دو سال کے لئے جاری فرمایا ہے۔ اختر صاحب ایک بے مثال ادیب و شاعر تھے۔ کشمیر میں بھی وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ لیکن اس دور میں ریاستی حکومتیں کتنے ادیبوں اور شاعروں کے پسماندگان کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہیں؟ حکومتِ کشمیر کا یہ اقدام اس کی ادب نوازی کا ایک بے مثال ثبوت ہے۔ اس سے قبل بھی بخشی غلام محمد صاحب نے ادب دوستی کی ایسی ہی مثالیں قائم کی تھیں۔ بہی خواہانِ ادب ان کے شکر گزار ہیں۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

دَورِ حاضر کا مردِ اعظم

خاکِ ہند نے بہت سی عظیم ہستیاں پیدا کیں۔ تاریخ کے صفحے اس کے شاہد ہیں۔ بڑے بڑے راجا مہاراجا، بادشاہ شہنشاہ جنھوں نے آس پاس کے ملکوں پر اپنا سکہ بٹھایا۔ بڑے بڑے مدبر، دُنیا نے جن کا لوہا مانا، بڑے بڑے فن کار جنھوں نے وہ لازوال دولت بخشی جس سے آج بھی ہم فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن اِن سب سے بڑھ کر وہ عظیم ہستیاں تھیں جنھوں نے زندگی کی مستقل قدریں قائم کیں۔ وہ قدریں جنھوں نے سیاست، ادب، معاشیات، فن غرضکہ زندگی کے ہر شعبے پر اپنا اثر ڈالا۔ ایسی ہی ہستیوں کو اپنے دَور کا مردِ اعظم کہا جاتا ہے۔ رام اور کرشن کا زمانہ تو زمانۂ قبل تاریخ مانا جاتا ہے لیکن گوتم بدھ کے زمانے کی مستند تاریخ ملتی ہے اور اگر ہم ان روایات سے قطع نظر بھی کریں جن کی تہ میں واقعیت سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بدھ کی ہستی نے ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ خونیں انقلاب نہیں بلکہ وہ انقلاب جو ذہن اور ضمیر میں پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے انسانوں میں ایسی ہی ہستی مہاتما گاندھی کی تھی جن میں بہت سی خوبیاں اور بہت سے کمال تھے لیکن میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ مانتا ہوں کہ انھوں نے سیاسی میدان میں رہ کر بلکہ اس میدان میں آزادی کے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے بھی مستقل قدروں کو منظر میں رکھا اور یہ کہنے کی جرأت کی کہ ذریعے کا نیک اور مناسب ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مقصد کا۔ اگر دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہ کر کوئی سادھو یا مہاتما ایسی بات کہے یا اس پر عمل کرے تو یہ چنداں مشکل بات نہیں لیکن اگر کوئی سیاسی رہنما یہ اعلان کرے اور اپنے عمل میں اپنے عقیدے پر پورا اُترے تو یہ بات ضرور حیرت میں ڈال دینے والی ہے۔

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے گاندھی جی کے متعلق یہ لکھا تھا کہ "سیاسی میدان میں اِن سے بڑے سیاسی مدبر بھی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور سنتوں میں اِن سے بڑے سنت بھی ہوئے ہیں لیکن اتنا بڑا سیاسی درویش دنیا میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔" عام طور پر لوگ سیاست کو مصلحتوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ ایک پُرانی کہاوت چلی آتی ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے لیکن گاندھی جی جن مستقل قدروں کو لے کر میدانِ سیاست میں آئے اُن پر آخر تک قائم رہے۔ لوگ حیرت میں تھے کہ سچائی اور سیاست ان دونوں کا نباہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مقابلہ اور اہنسا! یہ اجتماعِ ضدین کیسا؟ مگر دنیا نے دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ زندگی میں الگ الگ خانے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ذاتی اور مجلسی زندگی کو شخصی اور سیاسی زندگی کو الگ الگ کیا جائے۔ سیاسی میدان میں یہ نئی بات تھی۔ بہتوں نے مذاق اڑایا، بہتوں نے حیرت کا اظہار۔ کچھ نے اس کی باتوں پر غور کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ گئے تھے تو انھیں کُل مجمع میں سے گیارہ آدمی اپنے کام کے ملے تھے لیکن ایک سال کے اندر بات دِنوں میں گھر کر گئی۔ تمام ملک میں گاندھی کی جے ہونے لگی اور وہ تحریک شروع ہوئی جس کی بدولت ۲۷ سال بعد ہندوستان کو آزادی ملی۔ اہلِ کارواں مائلِ جشن تھے مگر میرِ کارواں نے کہا کہ یہ منزل نہیں نشانِ منزل ہے۔ سیاسی آزادی کا حصول پھر بھی آسان ہے لیکن اس کا استحکام زیادہ سخت منزل ہے۔ ایک بدیشی حکومت کے مقابلے میں غریبی اور مفلسی، جہالت اور تعصب کا مقابلہ زیادہ ہے۔ آج ہم اُسی منزل سے گزر رہے ہیں وہ رہنما ہم میں نہیں مگر اس کی ہدایتیں موجود ہیں۔ آفتاب غروب ہوا مگر روشنی باقی ہے۔ دیکھنا! یہ روشنی مدھم نہ ہونے پائے۔ اس کی بتائی ہوئی منزل کی طرف بڑھو گے تو روشنی بڑھتی جائے گی۔ اس منزل کی طرف سے منہ موڑ لو گے تو اندھیرا ہو جائے گا۔

واجیندر ناتھ شیدا

اُردو کی ایپک شاعری

ایپک، اس کی رزمیت اور دوسرے لوازم

شروع ہی میں یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ اردو میں ایپک شاعری کا وجود متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس بات پر اردو کے بلند ترین ادبی حلقوں میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس کا اندازہ ایک تو اس بحث سے ہو سکتا ہے جو انیس کے سلسلے میں ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھنؤ کے رسالے "نگار" میں چلتی رہی، دوسرے حال ہی میں اردو کی ایپک شاعری سے متعلق آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن نے جو مباحثہ نشر کیا ہے اس میں بھی یہ اختلاف رونما ہوا۔

"نگار" والی بحث کا آغاز ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے ایک طویل مضمون "انیس کی مرثیہ نگاری" سے ہوا تھا جو اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ستمبر ۱۹۴۹ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس کا جواب اثر لکھنوی نے اسی پرچے کے مارچ سے جولائی ۱۹۵۰ء تک کے شماروں میں دیا۔ اثر کے اس مسلسل مضمون پر نیاز فتح پوری بھی جا بجا حواشی کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے جاتے تھے جس کا مقصود ڈاکٹر فاروقی کی تائید معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا نیاز کے حواشی کا جواب اثر نے اپنے "مجموعۂ مقالات" انیس کی مرثیہ نگاری "کے مقابلے "طوطی پسِ آئینہ" میں دیا ہے۔

یوں تو بدیہی طور پر اس بحث کا اصل موضوع انیس کے مراثی تھے لیکن ضمنی طور پر اس میں مرثیے کے ایپک شاعری میں شمار کئے جانے یا نہ کئے جانے کے بارے میں بھی بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر فاروقی کا خیال تھا کہ مغرب میں جو اصنافِ سخن رائج رہی ہیں مرثیہ ان میں سے کسی کی شرائط پوری نہیں کرتا اس لئے اس پر ایپک کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری ہی غلط ہے کیونکہ ایپک میں رزم کا ہونا ضروری نہیں۔ نیاز نے اس پر یہ اور اضافہ کیا کہ "شاہنامہ خالص ایپک شاعری نہیں لیکن اس خیال سے کہ اس میں ایک قوم کی تاریخ کا ذکر ہے اسے ایپک کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔" (نگار بابت ماہ مارچ ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۰ فٹ نوٹ) ان دونوں کے برعکس اثر کا اصرار تھا کہ انیس کے زمانے میں مرثیہ ایپک کے تمام لوازم کو پورا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ارسطو کی بوطیقا سے متعدد بیانات نقل کر کے ان کی وضاحت کی گئی۔ مثلاً اثر نے کہا:-

> "یہ ضرور ہے کہ مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں سیدھی سادی ایلیجی Elegy تھا لیکن انیس و دبیر نے اس کو مرتفع کر کے ٹریجیڈی اور ایپک شاعری کا (وسیع ترین یونانی مفہوم میں) رتبہ دے دیا۔"

> "ایپک شاعری کے جو خصوصیات بیان کئے گئے ہیں میر انیس کی شاعری ان تمام لوازم کو پورا کرتی ہے۔"

> "انیس کی شاعری میں ایپک کے تمام اوصاف اپنے پورے عروج پر موجود ہیں۔"

(انیس کی مرثیہ نگاری۔ اثر لکھنوی)

ایسا ہی کچھ اُس نشری مباحثے میں ہُوا جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اس میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام اور میں نے حصہ لیا تھا۔ بحث کا موضوع تھا۔ "اردو میں ایپک شاعری کا رواج کیوں نہیں ہوا؟ کیا اس کا سبب غزل ہے؟" ظاہر ہے کہ یہاں اردو میں ایپک شاعری کے وجود و عدم سے بحث کرنا مقصود نہیں تھا۔ یہ پہلے ہی فرض کر لیا گیا تھا کہ اوّل تو اردو میں ایپک شاعری ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کم از کم اس کا رواج کبھی نہیں ہوا۔ مباحثہ کی غرض و غایت درحقیقت ان اسباب کا پتہ چلانا تھی جو ایسی شاعری کی تخلیق میں رکاوٹ ثابت ہوئے، اور اس مسئلہ پر خصوصاً غور کرنا تھا کہ کیا اردو میں غزل کا رواج ایپک کی راہ میں حائل رہا ہے اور اگر رہا ہے تو کیونکر؟

ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر سرور انہیں پہ مذکورہ بحث کے زمانے میں لکھنؤ ہی میں تھے۔ یہ مقالات وہاں جلسوں میں پڑھے بھی گئے ہیں۔ انھوں نے غالباً انھیں صرف نگار میں پڑھا ہی نہیں مقالہ نگاروں کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اسی بحث کے تاثرات کے زیرِ اثر ہیں۔ چنانچہ ریڈیو والی بحث کے وقت محمد حسن نے بھی کہا کہ ایپک میں لڑائی کا ذکر ہونا ضروری نہیں ہے اور سرور نے اس کی تائید کی۔ میں اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتا۔ میری نظر میں ایپک میں سماجی یا نفسیاتی کشمکش ہی کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس میں جسمانی ٹکراؤ کا بیان بھی لابدی ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ یا لڑائی میں مروجہ آلاتِ جنگ استعمال ہو بھی سکتے ہیں نہیں بھی۔ فوق الفطرت قوتوں اور غیر معمولی آلات کا ذکر ایپکوں میں برابر آتا رہا ہے۔ جب میں نے دریافت کیا کہ ایسی ایپک نظمیں آخر کون سی ہیں جن میں کسی لڑائی کا ذکر ہی نہیں آتا تو ڈاکٹر محمد حسن نے پیراڈائز لاسٹ اور ڈیوائن کامیڈی کو پیش کیا۔ اگرچہ یہ بات ریکارڈ نہیں کی گئی، میری رائے میں اس بنیادی بات پر پریشان خیالی سے ایپک کا پورا تصور اپنے محور سے ہٹ جاتا ہے جس سے اس کے حدود متعین کرنے ہی میں نہیں بلکہ ادب پر اس کے اطلاق میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اس لئے پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

سب سے پہلے پیراڈائز لاسٹ اور ڈیوائن کامیڈی والی بات صاف کر لیں۔ ایپک نظم کی حیثیت سے پیراڈائز لاسٹ کی اہمیت میں تسلیم کرتا ہوں مگر یہ نہیں مانتا کہ اس میں لڑائیوں کا ذکر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔ رہی ڈیوائن کامیڈی سو اس کو ایپک سمجھنا غلط ہے۔ یہ غلط فہمی کچھ اور بھی لوگوں کو رہی ہے: انھوں نے اس کی خصوصیات پر غور کئے بغیر اور اسے اینیڈ اور پیراڈائز لاسٹ کی درمیانی کڑی سمجھ کر ایپک تصور کر لیا تھا۔ اسی لئے محققین کو یہ غلط فہمی دور کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے ثبوت میں میں فی الحال حوالہ جات کی دو مستند کتابوں سے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

'ڈکشنری آف ورلڈ لٹریری ٹرمز' کا مقالہ نگار دنیا کی معروف ایپک نظموں کا ذکر کرتے ہوئے بعنوان "ایپک شاعری" لکھتا ہے:

" کبھی کبھی ایسی نظموں کو ایپک کے نام سے پکارا جاتا ہے جو اُن نظموں سے بے حد مختلف ہیں جن سے اوپر بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کو بھی ایپک کہا گیا ہے۔ اس نظم میں کوئی ہیرو نہیں۔ اس کا خاص کردار خود شاعر ہے جو شروع سے آخر تک صیغہ متکلم میں واقعات بیان کرتا ہے ... اصل میں ڈیوائن کامیڈی کے حجم، اسلوب اور وزن سے متاثر ہو کر نقاد اسے ایپک کہہ دیتے ہیں۔"

Dictionary of World Literary Terms Edited by J. T. Shipley—Epic Poetry

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں "ڈانٹے" کے عنوان سے لکھا گیا ہے:

" غرض کامیڈیا، جسے بہتر اصلاح نہ ہونے کے باعث اکثر اوقات ایپک کہہ دیا جاتا ہے، اپنے اسلوب اور تعمیر کے لحاظ سے اس نوع کی ساری نظموں سے کلیتاً مختلف ہے۔ خود واقعات بیان کرنے والا اس کا ہیرو ہے۔ واقعات کا کہانی کے اُٹھان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ضمنی واقعات کی جگہ مذہبی اور مابعد الطبیعاتی بحثیں ہیں۔ جس دنیا سے شاعر اپنے قارئین کو گزارتا ہے اس میں رزمیہ داستان کے کردار نہیں بستے بلکہ ایسے مرد عورت آباد ہیں جن سے یا تو شاعر ذاتی طور پر واقف ہے یا جن کی شہرت شاعر اور قارئین تک پہنچ چکی ہے۔"

Encyclopaedia Britannica—Dante

غرض ان دونوں اقتباسات میں جہاں اور شرائط کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں پورا نہ کرنے کے باعث کامیڈیا کو ایپک کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیا گیا وہیں ایک بات کی کمی دونوں میں محسوس کی گئی ہے یعنی اس نظم میں ایپک کی طرح کا ہیرو نہ ہونا۔ یہ صحیح ہے کہ آج ہیرو کا مفہوم بدل گیا ہے نیز یہ کہ مختلف ایپکوں کے ہیرو متنوع خصوصیات کے حامل رہے ہیں۔ اس کے باوصف ایپک نظموں کے ہیروؤں میں ایک قدر مشترک

بھی ہوتی ہے اور وہ ہے شجاعت۔ ایپک کے ہیرو کی عام خصوصیات مضبوط جسم، غیر معمولی جرأت اور دلیری، فن سپہ گری میں مہارت، مہم پسندی، تکالیف برداشت کرنے کی صلاحیت، استقلال وغیرہ ہیں جن میں سے کچھ نہ کچھ ایپک کے ہر ہیرو میں ہونا ہی چاہئیں۔ انھیں خصوصیات کی کمی بیشی سے اور ان میں دوسرے ذہنی، جذباتی، اخلاقی، روحانی محاسن و معائب کی شمولیت سے ان ہیروؤں کے کرداروں میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی نظم میں ایسا کوئی ہیرو نہیں ہے تو اس پر ایپک کا اطلاق نہیں ہو سکتا خواہ دوسری خصوصیات کے باعث وہ کتنی بھی اہم اور قابلِ قدر کیوں نہ ہو۔ ایپک کے افسانہ کا ایسے ہیروؤں کے عظیم کارناموں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی شاعری کو "ہیروِاک پوئٹری" بھی کہا جاتا ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایپک میں ہیرو کا کردار نمایاں کرنے کے لئے شاعر کو کسی نہ کسی صورت سے لڑائی کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے مافی الذہن کو ہیروؤں کے عمل کے سہارے ہی پیش کر کے اپنے بیان کو مؤثر بنا سکتا ہے کیونکہ اس کا بہترین موقع اُسے محاربات میں ملتا ہے جہاں ہیروؤں کی شجاعت کا مظاہرہ نہایت سہولت سے کرایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اردو میں ایپک کا ترجمہ "رزمیہ شاعری" کیا گیا ہے تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ کسی عمدہ ادبی اصطلاح سے ہم یہی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے موضوع کی کسی اہم خصوصیت کی نمائندگی کرے۔ کوئی بھی اصطلاح ——— غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی ——— ایسی نہیں ہے جو اپنے موضوع کے پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ رزمیہ شاعری کے لفظ سے اگر خاص کرداروں کی شجاعت کا براہِ راست پتہ نہیں چلتا تو اُن واقعات کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے جو ہیرو کی تخلیق کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں اُن کی تصدیق چند باتوں سے ہو سکے گی۔ سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی معروف اور مسلّمہ ایپکوں میں لڑائیوں کا ذکر آتا ہے یا نہیں نیز یہ کہ شجاعت کو ایپک کے ہیروؤں کے کرداروں کی ایک لازمی خصوصیت سمجھا گیا ہے یا نہیں سمجھا گیا ہے۔

ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی اور ورجل کی اینیڈ ایپک کی ایسی مثالیں تصوّر کی جاتی ہیں جن کے سہارے ایپک نگاری کے اصول و قواعد وضع کئے گئے ہیں۔ لفظ ایلیڈ، ایلیم سے مشتق ہے جو ٹرائے کا دوسرا نام تھا۔ یہ ساری نظم ٹرائے کے محاصرے سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ ٹرائے کا شاہزادہ شاہِ اسپارٹا مینی لوس کی بیوی ہیلن کو اڑا کر لے گیا تھا اس لئے مینی لوس انتقاماً ٹرائے پر حملہ آور ہوتا اور دس برس تک اس کا محاصرہ کئے پڑا رہتا ہے۔ نظم کا پلاٹ محاصرے کے آخری سال میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا ہے۔ اس کا سب سے اہم کردار اکیلیز پہلے تو اپنی فوج کے کمانڈر انچیف اگامیمنن سے ایک ذاتی معاملے میں خفا ہو کر جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن بعد کو جب جنگ خطرناک صورت اختیار کرتی ہے تو وہ سمجھانے بجھانے سے دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ ایلیڈ چوبیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں تیسرے باب سے کر بائیسویں باب تک برابر لڑائی ہوتی رہتی ہے جس میں متعدد کرداروں کو شجاعت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اوڈیسی کا ہیرو اوڈیسیس، جس کے نام پر نظم کا نام رکھا گیا ہے، جہاز کے ذریعہ اتھاکا پہنچ کر ایک قدیم اور وفا شعار خادم کے گھر ٹھہرتا ہے لیکن چونکہ وہ پہچانا جانا مناسب نہیں سمجھتا اس لئے فقیرانہ لباس پہن کر محل میں وارد ہوتا ہے۔ وہاں پینی لوپ کو عاشقوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان سے عاجز آکر پینی لوپ یہ اعلان کر دیتی ہے کہ جو اوڈیسیس کی کمان کو خم دے گا وہی اس سے شادی کر پائے گا۔ یہ کام سوائے اوڈیسیس کے اور کسی سے نہ ہو سکا اور اس طرح اس کی اصلیت کا راز افشا ہو گیا۔ لہٰذا محل کے اندر ہی اوڈیسیس اور اس کے رقیبوں میں لڑائی ہوتی ہے جس میں اوڈیسیس کامیاب ہوتا ہے۔ اس نظم کے بھی چوبیس ابواب ہیں جن کا بائیسواں باب لڑائی بیان کرنے کی غرض ہی سے لکھا گیا ہے۔

اینیڈ کے واقعات ٹرائے کی فتح کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ اس کا ہیرو اینیس ایک دشوار سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اٹلی واپس آتا ہے جو اس کا وطن ہے۔ اٹلی کا بادشاہ لیٹی نس صرف اس کا استقبال ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے اپنی بیٹی لیوینیا کی شادی کا وعدہ بھی کر لیتا ہے۔ مگر وعدہ کرنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ لیوینیا کی ماں نے اس کی منگنی پہلے ہی شہزادے ٹرنس سے کی ہوئی ہے۔ اس سے وہ بڑی اُلجھن میں پھنس جاتا ہے۔ اُلجھن سے نکلنے کے لئے وہ لیوینیا کے دونوں عاشقوں کو ہتھیاروں کے ذریعے اپنے حق کا فیصلہ کر لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح اینیس اور ٹرنس میں لڑائی ہوتی ہے جس میں ٹرنس مارا جاتا ہے اور اینیس سے لیوینیا کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس لڑائی کا ذکر اینیڈ کے بارہ ابواب میں سے آخری تین میں آتا ہے۔

غرض یونانی اور لاطینی ادب کی ان تینوں عظیم ایپکوں میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں

اوران کے ہیرو شجاع بھی ہیں۔ لیکن شجاعت شجاعت میں بھی فرق ہوتا ہے اور ہیروؤں کے کرداروں کی دوسری خصوصیات ان میں امتیاز اور انفرادیت قائم کرنے کی ضامن ہوتی ہیں۔ ہر اچھے کتب خانے میں اس موضوع پر لٹریچر ملتا ہے اس لئے اس بحث کو طول دینا غیر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف تین مستند محققین کی کتابوں سے اقتباسات پیش کرتا ہوں جن میں سے پہلا اقتباس ہیرو اور رزمیہ شاعری کے تصورات سے زیادہ متعلق ہے اور باقی دو میں ان تینوں شاہکاروں کی متنوع خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سی۔ ایم باورا نے اپنی کتاب "ہیروِک پوئٹری" میں جو بڑی محنت سے لکھی گئی معلوم ہوتی ہے رزمیہ نظموں کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے مختلف زمانوں اور قوموں کی اس نوع کی شاعری میں تنوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے شروع میں وہ ہیرو اور اس کے کردار و عمل کی اس طرح وضاحت کرتا ہے:

> "ہیرو اور اس کی قوتوں کا تصور دور دراز تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے اظہار اور اجزائے ترکیبی میں تنوع ہونے کے باوصف کچھ مشترک خصوصیات بھی ہیں جو یونانیوں کے اپنے ہیرو کے تصور سے ہم آہنگ ہیں۔ جس زمانے میں لوگ وقار حاصل کرنے کے لئے سعی و عمل کے معتقد ہوں وہ زمانہ قدرتی طور پر اپنی تحسین کا اظہار عمل، مہموں، دلیرانہ جدوجہد اور نیک آدرشوں کی شاعری کے ذریعہ کرنا چاہے گا۔۔۔۔
>
> ایسی شاعری کی تخلیق کا محرک یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے کچھ ساتھیوں کا جو احترام کرتے ہیں وہ ان کے فطری اوصاف میں واقعی برتری کے باعث ہوتا ہے۔ مگر بے شک کسی شخص کے لئے اعلیٰ اوصاف کا مالک ہونا ہی کافی نہیں ہے، اُسے عملی طور پر اس کا ثبوت بھی دینا چاہیئے۔ ہیرو کی پُر مہم زندگی میں ان اوصاف کا پوری طرح امتحان اور مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس مہم میں اُسے کامیابی ہی حاصل ہو۔ جو ہیرو میدانِ جنگ میں شجاعت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرنے کے لئے مارا جاتا ہے وہ کچھ باتوں میں اس سے بہتر ہے جو زندہ بچ رہتا ہے۔"
>
> (صفحات ۴-۳)

اب ایک جرمن محقق ارنسٹ رابرٹ کرٹی یس کی تصنیف "یورپی ادب اور لاطینی قرونِ وسطیٰ" سے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں جو ہیرو کے بارے میں ہومر اور ورجل کے تصورات کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں:

> "ایچی لیز صرف تقدیر ہی کی بدولت ایپک کا ہیرو اور نکبت کا شکار نہیں بنتا بلکہ اس کی ناکامی کا باعث خود اس کی جذباتیت بھی ہے جس پر وہ قابو نہیں پا سکا۔ ہومر سمجھتا ہے کہ قوت اور ذہانت متوازن ہو کر جنگی محاسن میں رچائیت پیدا کرتی ہیں۔ لڑائی کے ذوق کی توقع تو معمولی سپاہیوں سے بھی کی جا سکتی ہے۔ لڑائی کا کام تو سپاہی ہی کو آنا ہی چاہیئے لیکن سپہ سالاروں کے اندر جرأت کے ساتھ ساتھ نہایت اونچے معیار کی دانش مندی کا ہونا بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ ایسا سپہ سالار صرف اوڈیسیس ہے جس میں شجاعت، جنگی قابلیت اور دانش مندی متوازن نظر آتی ہیں۔" (صفحہ ۱۷۱)
>
> "ورجل کی مفکرانہ، صدرجہ شعوری اور پیچیدہ ایپک مختلف موڈ سے ہومر سے منسلک ہے لیکن یہ ایک مختلف زمانے کے آدرشش بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور ان دونوں میں اس اختلاف کا ہونا ویسے بھی ناگزیر تھا۔ اینیڈ میں اس داخلی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔۔۔۔ ورجل پر آگسٹس کے دور کی امن پسندانہ اسپرٹ اور اس کے اخلاقی آدرشوں اور آگسٹس کے ذریعے سو سال پرانی خانہ جنگی کے خاتمے کا بہت اثر تھا۔ بلکہ خود جوپیٹر نے تمام جنگوں کے خاتمے کی پیش گوئی کی تھی۔
>
> اس طرح کی تہذیب میں پرانے آدرشوں کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ ورجل نے اینیڈ میں ہیرو کا ایک نیا آدرش پیش کیا جو اخلاقی قوت پر مبنی ہے۔ اتنا البتہ صحیح ہے کہ یہ ہیرو بھی جنگ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔
>
> غرض اینیس میں دانش مندی کی جگہ اخلاقی خوبیاں لے لیتی ہیں اور بدیہی طور پر اُن میں اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔" (صفحہ ۱۷۳)

European Literature and the Latin Middle Ages by Ernst Robert Curtius, translated into English by Willard R. Trask

موزیز ہاڈس کی "یونانی ادب کی تاریخ" سے ایک مختصر اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے۔ وہ یہاں ہومر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہومر اور ورجل کی بیان کردہ جنگوں کا فرق واضح کر رہا ہے:

" جنگوں کے طویل مناظر سے وہی لوگ اکتاتے ہیں جو ان چیزوں سے طبعاً بیزار ہیں۔ جن لوگوں کو فٹ بال یا برج جیسے کھیلوں سے دلچسپی نہیں ہوتی انھیں ان کے ذکر سے بھی اکتاہٹ ہوتی ہے۔ (ہومر کے یہاں) یہ مناظر جنگ بے دلانہ طور پر شامل کئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ماہر نے انھیں ماہرین کے لئے لکھا ہے۔ ہاں ورجل کے یہاں کبھی کبھی اس کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ وہ صفحہ بھر کر زبردستی انھیں شامل کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قابل غور چیز یہ ہے کہ ان (ہومر کے) مناظر جنگ میں نہ صرف عمل کی تفصیلات میں بلکہ کرداروں کے پس منظروں میں بھی غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۰)

A History of Greek Literature by Moses Hadas

لڑائیوں کا ذکر اور شجاعت کی جھلکیاں صرف انھیں تین ایپکوں میں نہیں ملتیں بلکہ ہر ایپک میں ملتی ہیں مثلاً راماین میں رام کی راون اور بالی سے جنگیں ہوتی ہیں۔ مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان قیامت خیز جنگ ہوتی ہے جس میں متعدد ہیرو ارجن، بھیم، کرن، دریودھن بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ شاہنامے میں رستم اور سہراب کی لڑائی آتی ہے اور ہفتخوان رستم میں تو گھوڑے اور شیر کی لڑائی سے لے کر دیو سپید کے قتل تک جنگیں ہی جنگیں ہیں۔ سکندر نامے میں سکندر اور دارا کی لڑائیوں کا مفصل ذکر ہے۔ نجاتِ یروشلم میں عیسائی مجاہدین کے ہاتھوں ارضِ مقدس کی فتح بیان کی گئی ہے۔ اس کے ہیرو رینالڈو اور گاڈ فرے ہیں۔ نغمۂ رولاں میں شارلیمان کے درباری رولاں کی قرون وسطیٰ کے بربریوں کے خلاف جنگ ہوتی ہے۔ قدیم ترین انگریزی ایپک کا بیوولف اژدہا سے لڑتا اور مارا جاتا ہے اور پیراڈائز لاسٹ میں نیک اور بد فرشتوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔

چونکہ پیراڈائز لاسٹ میں لڑائی کے ذکر سے انکار کیا گیا تھا اس لئے اس پر کسی قدر زیادہ روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم کے پانچویں باب میں رافیئل خدا کی ہدایت کے بموجب آدم کو شیطان کی شرارت سے خبردار کرنے کے لئے فردوس میں وارد ہوتا ہے جہاں آدم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ایک صحبت میں رافیئل خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت کا قصہ بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اس میں نیک فرشتوں اور حضرت عیسیٰ کی شیطان کے خلاف جنگ کا تفصیلی ذکر موجود ہے جو پانچویں باب میں شروع ہو کر پورے چھٹے باب میں جاری رہتا ہے۔ رافیئل بتاتا ہے کہ کن حالات میں اور کس طرح شیطان نے سب سے پہلے جنت میں اپنے ساتھی فرشتوں کو ورغلایا اور بغاوت کرنے پر آمادہ کیا۔ پھر کس طرح میکائیل اور جبرئیل کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے بعد پہلی لڑائی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جس میں آخرکار شیطان اور اس کے ساتھی پسپا ہوتے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ تب شیطان اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے اور ایک خطرناک ہتھیار ایجاد کر لیتا ہے جس کی مدد سے وہ دوسرے دن کی لڑائی میں ایک حد تک میکائیل کی فوجوں میں انتشار پیدا کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر تیسرے روز خدا حضرت عیسیٰ کو بھیجتا ہے۔ وہ آ کر اپنی فوج کی ہمت بندھاتے اور دشمن کی فوج میں گھستے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شیطانی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ شیطان کے ساتھی اپنی جانیں بچانے کے لئے سراسیمگی کے عالم میں جنت کی دیوار سے نیچے کودتے نظر آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ فتح یاب ہو کر خدا کے پاس واپس آتے ہیں۔

یہ بیان اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرے یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر پھر بھی میں نمونے کے طور پر اصل نظم سے کچھ سطریں نقل کرتا ہوں تاکہ موضوع ہی کا نہیں بلکہ نظم کے لہجے اور فضا کی رزمیت اور جرأت کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ اقتباس چھٹے باب سے ماخوذ ہے اور یہ وہ موقع ہے جہاں میکائیل اور جبرئیل کو شیطان کی بغاوت فرو کرنے کی ہدایت کا ذکر آتا ہے۔ اُن سے کہا گیا تھا:

میکائیل! مقدس فوج کے
شہزادے!
اور جنگی قوت میں اس کے ثانی جبرئیل!
جاؤ۔
میرے ان ناقابل شکست بیٹوں کی،

ان سچّے اور عظیم ہستیوں کی
میدانِ کارزار کی طرف
رہنمائی کرو۔
ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں ہے
اور یہ لڑائی پر تُلے کھڑے ہیں،
گنتی میں اس خدا دشمن اور
باغی گروہ کے برابر ہیں
تم اپنے ہتھیاروں سے ان پر
بے خوفی سے حملہ کرو۔
اور جنّت کی حد تک ان کا تعاقب
کرکے انھیں یہاں سے باہر نکال دو
یہاں تک کہ وہ اپنی سزا گاہ
خلیج تاتارس میں پہنچ جائیں۔
جو اپنا وسیع آتشیں
دہانہ کھولے
ان کے نزول کا انتظار
کر رہی ہے۔

(Book VI Lines 44-45)

Paradise Lost edited by Helen Darbishire

پیراڈائز ری گینڈ کے چوتھے باب میں حضرت عیسیٰ اور شیطان میں لڑائی ہوتی ہے۔ شیطان جب مسیح کو حضرتِ داؤد کے تخت و تاج کا لالچ دلا کر اپنی اطاعت قبول کرانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو انھیں طوفان یا دو یاراں کے ذریعے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر مسیح اس پر بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ تب وہ مسیح کو پکڑ کر یروشلم لے جاتا ہے تاکہ انھیں فضا سے زمین پر گرائے۔ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے یعنی وہاں سے خود شیطان اور اس کے ساتھی دوزخ میں گرائے جاتے ہیں۔

ویسے بھی ایپک اور رزمیت کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ایپک کے معنی لکھے ہیں "نظم، رزمیہ جس میں کسی ایک یا چند سورماؤں کے کارناموں کا مسلسل بیان ہو۔"

جامع اللغات میں رزمیہ نظم کے معنی بتاتے ہوئے لکھا گیا ہے "(مؤنث) وہ نظم جس میں لڑائیوں کا ذکر ہو جیسے شاہنامہ، مہابھارت، رامائن، ایلیڈ، اوڈیسی، اینیڈ وغیرہ" عزیز احمد نے جنھوں نے ارسطو کی بوطیقا کو اردو میں منتقل کیا تھا ایپک کا ترجمہ رزمیہ شاعری اور ہیروایک ورس کا ترجمہ بحر کیا ہے۔

یہاں یہ واضح کرنا شاید مناسب ہوگا کہ ایپک کے رزمیہ کردار پر اس قدر زور دینے اور اس کی تفصیلات میں جانے کا اصل مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایپک کے لوازم میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہیں جو بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھیں اختصار کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایپک ایک منظوم قصہ ہوتی ہے جو نہ صرف کہانیوں یا ایسے حقیقی اور غیر حقیقی واقعات سے مرتب کیا جاتا ہے جنھیں عموماً صحیح سمجھا جاتا ہو یا سمجھا جا سکے۔ اس نوع کی نظموں میں حیرت انگیز واقعات اور فوق الفطرت عناصر کی فراوانی رہی ہے۔ ایپک نگار عام طور پر اپنے ماضی کی داستان بیان کرتا ہے مگر کچھ ایپکیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق شاعر کے ہم عصر واقعات سے ہے۔ مثال کے طور پر چاند بردائی کی "پرتھوی راج راسو" جس میں پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ایپک میں جنگوں اور مہموں کے علاوہ بھی طرح طرح کے مناظر آتے ہیں۔ اس کا قصہ ایک مکمل وحدت ہونا چاہیے اس کا آغاز، وسط اور انجام ہونا چاہیے۔ تمام واقعات کو مسلسل اور باہم مربوط ہونا چاہیے اور ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ وہ سب کے سب ایک ہی قصے کے ضروری اجزاء ہیں۔ اصولاً یہ بات مانی جاتی ہے کہ ایپک طویل نظم ہوتی ہے لیکن اس طول کا تعین بہت دشوار ہے جب کہ شاہنامہ ساٹھ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، ایلیڈ میں ۲۷۸۰۳ اور اوڈیسی میں ۹۲۵۳ مصرعے ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے چوبیس ابواب ہیں، پیراڈائز ری گینڈ صرف چار باب کی نظم ہے جس میں صرف ۲۰۳۵ مصرعے ہیں۔

ایپکوں میں کردار کثیر تعداد میں ملتے ہیں ہر ایپک کے کسی نہ کسی یا کچھ کرداروں کا شجاع ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا ایپک نگار اپنے کرداروں کو محض زندگی ہی نہیں بخشتا بلکہ پوری نظم میں ان کرداروں کی خصوصیات کو برقرار بھی رکھتا ہے، ان کے عمل اور گفتگو کے وقت محل و موقع کو فراموش نہیں کرتا۔ اگر کسی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو واقعات میں اس کا تشفی بخش جواز موجود ہونا چاہیے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی طرف اشارہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر ایپک میں اس کی قومی تہذیب و تمدن اور آداب و معاشرت کا وافر ذخیرہ محفوظ ہوتا ہے۔ یہ بات کچھ ایپکوں جیسے ایلیڈ، مہابھارت یا شاہنامے کے متعلق تو بالکل صحیح ہے۔ یہ نظمیں درحقیقت اپنے ہی قومی سورماؤں کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے اور ان کی عظمت کا احساس کرانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ یوں بھی یہ بہت طویل ہیں۔ ان میں گوناگوں اشخاص، واقعات اور مناظر کا مفصل ذکر ملنا ہی چاہیئے۔ قدرتی طور پر ان سے اپنے خالقوں کی ہم عصر زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ مگر ایسی ایپکوں کو نیشنل ایپک کہتے ہیں۔ ہر ایپک کو نیشنل ایپک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پیراڈائز لاسٹ کو لیجیے۔ اس کے قصے کی نوعیت ہی غیر قومی ہے۔ لہٰذا اس میں ملٹن کے زمانے کی برطانوی زندگی زیادہ نہیں جھلک سکتی۔ ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ اس نظم کی تخلیق کا اصل محرک پرہیزگاری اور مذہبی اصلاح کا جذبہ ہے جسے قومی اہمیت حاصل ہے اور جو خیر و شر کے تصادم کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ مگر اس میں پیراڈائز لاسٹ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ صحیح تجزیے کے ذریعے ہر طرح کی تصنیفات کی جڑیں قومی شعور میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جس ہیرو کی توصیف و تعظیم مقصود ہو وہ اپنی ہی قوم کا ہو۔ سکندر نامے کا سکندر نظامی گنجوی کا ہم قوم نہیں بلکہ اس کے ہم قوم دارا کا حریف ہے اور دارا کو شکست دیتا ہے۔ دراصل نظامی کی نظر میں سکندر اس کی نظم کا ہیرو بننے کا مستحق اس لئے ہے کہ وہ کچھ ایسی انسانی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے جو شاعر کو عزیز ہیں۔

ایپک کے موضوع کی عظمت مسلّمہ ہے۔ ایسی ہر نظم کے اسلوب اور لہجے میں وقار اور سنجیدگی ہونی چاہیئے۔ اس میں پست درجے کی بذلہ سنجی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایپک کا کینوس وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں زندگی کے بہت سے پہلو جلوہ گر ہو سکتے ہیں، زندگی کے ہمہ گیر اور دقیق مسائل سے بحث آ سکتی ہے۔ مگر اس میں کامیابی کا انحصار شاعر کی بصیرت، وسیع تجربات اور بیانیہ شاعری کی فنی صلاحیتوں پر ہے۔ مختلف ایپکوں کے تخلیقی مقاصد میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ایپک محض ایک صنفِ شاعری کا نام ہے۔ کسی نظم کا ایپک ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ نظم عظیم بھی ہے۔ خود ارسطو نے جہاں ہومر کی ایپکوں کے محاسن بیان کرکے ان کی عظمت کا اقرار کیا ہے وہیں اس نے دو اور ایپک نظموں لٹل ایلیڈ اور سپریا کی خامیاں بھی بتائی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں:

> " جہاں تک دوسرے ایپک نگاروں کا تعلق ہے، وہ کسی ایک شخص یا کسی ایک دور کی عکاسی کرتے ہیں، یا پھر کسی واقعہ کو لیتے ہیں جو ہوتا تو ایک ہے مگر اس کے متعدد حصے ہوتے ہیں۔ یہ آخری بات سپریا اور لٹل ایلیڈ کے مصنفین کے یہاں پائی جاتی ہے۔" (صفحہ ۸۰)

Aristotle on the Art of Poetry translated by Ingram Bywater

ایپک کے لئے زبان کا استعمال اور بحر کا انتخاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مناظر اور عمل میں تبدیلی کی مناسبت سے زبان میں بھی تغیر ہونا چاہیئے۔ ارسطو نے ایپک کے لئے ہیروئک ورس کو موزوں بتایا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ دنیا میں بیانیہ شاعری کے لئے مختلف بحریں استعمال میں آتی ہیں۔ بحر بیان میں آہنگ پیدا کرتی ہے اور آہنگ کا حسن اہلِ زبان کے ذوق پر منحصر ہے اس لئے ایپک نگار اپنی زبان کے مزاج اور رزمیہ شاعری کی سہولت کے پیش نظر بحر منتخب کر سکتا ہے۔ اردو اور فارسی میں شاہنامہ کی بحر کو اس مقصد کے لئے بہت مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

کچھ لوگ محض بوطیقا کی روشنی میں ایپک کے خدوخال دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو کی یہ کتاب ایپک نگاری کے فن پر نہایت مستند سمجھی جاتی ہے اس کی اہمیت صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ کچھ باتیں جو اس میں کہی گئی ہیں انھیں آج بھی ایپک کی ضروری شرائط میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہ باتیں میں مختصر طور پر بیان کر بھی آیا ہوں۔ مگر یہاں میں کچھ ایسے حقائق کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھیں بوطیقا کے مطالعے کے وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

درحقیقت بوطیقا کی تصنیف کا مقصد یونانی فنِ شاعری پر ایک رسالہ لکھنا تھا۔ یونان کے شعری ادب میں ارسطو کے زمانے میں ڈراما کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں کے ڈراموں میں ٹریجیڈی اور کامیڈی دونوں شامل تھیں لہٰذا بوطیقا میں بھی زیادہ بحث یونانی ڈراما ہی پر ہے۔ ایپک کا ذکر زیادہ تر ٹریجیڈی سے اس کی مماثلت یا اختلاف واضح کرنے کے سلسلے میں آتا ہے۔ دوسری ملحوظ رکھنے کی بات یہ ہے کہ بوطیقا لکھتے وقت ارسطو کے پیش نظر ہومر کی دو رزمیہ نظمیں تو تھیں ہی اور غالباً دو چار اور رہی ہوں گی۔ انھیں کے سہارے اس نے اس قسم کی

شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ بعد کو جن نقّادوں کے سامنے زیادہ نظمیں تھیں انھوں نے ارسطو کے وضع کئے ہوئے اصولوں میں ترمیم اور توسیع کی۔ پھر اصلاً ارسطو کا تبصرہ ایپک نگاری کے فن پر ہے اس لئے موضوع کی زیادہ تفصیلات بوطیقا میں نہیں ملتیں۔ ہو سکتا ہے کہ بیانیہ شاعری کے متنوع نمونے اس کے سامنے نہ ہونے کے باعث بھی موضوع سے تفصیلی بحث کرنا اس نے غیر ضروری سمجھا ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو بہر کیف ارسطو کا کھل کر یہ نہ کہنا کہ ایپک بیانیہ شاعری کی ایک قسم ہے جس میں شجاعت اور رزم کا ذکر ضروری ہے کچھ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔ مگر ایسا خیال بوطیقا کا سطحی نظر سے مطالعہ کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ارسطو نے ایپک کی فنی خصوصیات پر بحث کرتے وقت ایپک کی اس خصوصیت کو برابر ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے ثبوت میں میں بوطیقا سے چند جملے نقل کروں گا اور وہ بھی عزیز احمد کے اردو ترجمے سے تاکہ مفہوم میں ردّ و بدل کا الزام مجھ پر عائد نہ ہو سکے۔

کتاب کے تیسرے باب میں تاریخ اور ایپک کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ارسطو لکھتا ہے:

"۔۔۔۔ اور ترتیب میں وہ (رزمیہ شاعری) تاریخ سے بہت مختلف ہو کیوں کہ تاریخ ایک عمل کو بیان نہیں کرتی بلکہ ایک عہد کے وہ سب واقعات بیان کرتی ہے جو اس زمانے میں کسی ایک شخص یا اشخاص کو پیش آئے۔ تاریخ ایسے واقعات بیان کرتی ہے جن کا ایک دوسرے سے بالکل سرسری تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً سالامس Salamis کی بحری لڑائی اور سسلی میں اہل قرطاجنہ سے جنگ ایک ہی زمانے کے واقعات ہیں۔ لیکن مقصد یا نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلسل تاریخی واقعات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا واقعہ پیش آتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوسرے واقعے کا پہلے واقعہ سے کوئی تعلق ہو۔

اکثر شعراء اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہومر کی خداداد صلاحیت کی بلندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے اپنی نظم میں جنگ کے پورے واقعات کو شامل نہیں کیا بلکہ صرف ایک ایسا مکمّل عمل چنا جس میں آغاز اور انجام دونوں موجود ہیں۔ اگر وہ پورے واقعات کو شامل کر لیتا تو وہ ایک نظم میں اچھی طرح نہیں سما سکتے، اور اگر وہ ان کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا تو نظم اتنی پیچ در پیچ ہو جاتی کہ مطلب ہی خبط ہو جاتا۔ بجائے اس کے اُس نے جنگ کے صرف ایک واقعہ کو چُنا ہے اور دوسرے واقعات ـــ مثلاً جہازوں کی فہرست وغیرہ ـــ کو جا بجا محض تذکرتاً بیان کیا ہے۔"

(صفحات ۵۴-۵۵ فن شاعری از ارسطو مترجمہ عزیز احمد
شائع کردہ انجمن ترقّیٔ اردو (ہند) دہلی)

غرض ارسطو اپنے مافی الذہن کو واضح کرنے کے لئے قدم قدم پر رزمیہ واقعات کی مثالیں پیش کرتا چلتا ہے جس سے ایپک میں جنگوں کے متعلق اس کے نظریے کو جاننا آسان ہو جاتا ہے۔

کوئلے کی پیداوار بڑھانے کا وسیع پروگرام

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں صنعتی ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب دوسرا منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا تو اس وقت کوئلے کی پیداوار تین کروڑ اسی لاکھ ٹن تک پہنچ چکی تھی۔ دوسرے پنج سالہ پلان میں مشہور صنعتی نشانوں اور ریلوے کی ترقی و توسیع کے پیشِ نظر یہ توقّع کی جاتی ہے کہ دوسرے منصوبے کے اختتام پر تقریباً ۶ کروڑ ٹن کوئلہ درکار ہوگا۔ یہ اعداد و شمار کوئلے کی مانگ میں ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں کو سونپی گئی ہے

غزل

محبت کا بالآخر رقص بتیابانہ کام آیا
نگاہِ شرمگیں اُٹھی، سلام آیا پیام آیا

نہ جانے آج کس دھن میں زباں پر کس کا نام آیا
قضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا

ادب اے گردشِ دوراں کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی کہ وقتِ انتقام آیا

جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی خلوصِ غم ہی کام آیا

نئی تخریب لازم ہے نئی تعمیر کی خاطر
ہوا کیا؟ تو اگر کچھ گرتی دیواروں کو تھام آیا

سنبھل کر یوں تو ہم گذرے کسی کی راہ میں لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گر پڑنا ہی کام آیا

مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
مری قسمت میں دل آیا ترے حصے میں جام آیا

اُٹھا تعظیم کو ساقی جھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون رندِ تشنہ کام آیا

اندھیروں سے اُجالے پھوٹ نکلے دل یہ کہتا ہے
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا

نکل آیا جگر جب میکدے میں شور یہ اُٹھا
وہ رندِ دل بہ یاروے یہ جام و تشنہ کام آیا

عبادت بریلوی

میرؔ کی شاعری کا جمالیاتی پہلو

میرؔ صاحب ریختے کے صنّاعِ طرفہ ہیں۔ انھوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے فن کار اور ایک بہت بڑے خالقِ جمال ہیں۔ باتوں کو شعر کا روپ دے دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انھوں نے شعر نہیں کہے، موتی سے پرو دئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تغزّل اور تفکّر دونوں میں غضب کی دل کشی اور بلا کی دلآویزی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا راز میر صاحب کی فن کاری اور صنّاعی میں ہے۔ یہ فن کاری اور صنّاعی اُن کے اظہار و بیان، انداز و اسلوب، لب و لہجہ، تشبیہات و استعارات، علامات و اشارات اور الفاظ و زبان کے مجموعی امتزاج کا نام ہے۔ یہ سب مل کر ان کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کی تشکیل کرتے ہیں، جن کے اثر سے ان کے یہاں تاثر کا سحر پیدا ہوتا ہے۔ میر صاحب کی غزلوں میں سارا کھیل اسی جمالیاتی پہلو کا ہے۔ ان کا کمال صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انھوں نے تغزّل اور تفکّر دونوں کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے اور حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی تفصیل و جزئیات کو ان میں جگہ دی ہے۔ ان کا کمال تو اس میں ہے کہ انھوں نے ان سب کو پیش کر کے غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو ان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے جس کے باعث غزل کی صنف ان کے یہاں ہم دوشِ ثریّا ہو گئی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میرؔ صاحب غزل کے فن اور اس صنف کے بنیادی اصول کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو صحیح طور پر سمجھا ہے اور سمجھ کر اس کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں فنی اعتبار سے ایک تجربے کا احساس بھی ہوتا ہے اور روایت اور تجربے کی اسی ہم آہنگی ہی سے ان کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی ہی سے ان کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کو ان کے فنی شعور ہی نے پیدا کیا ہے۔ اس فنی شعور کی بنیاد کچھ ان خیالات پر ہے کہ فن کی تشکیل معنویت اور خیال کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی اور معنویت جگر کو خون کرنے کا نام ہے، کہ اس کے بغیر فن میں گرمی کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ میر صاحب کے خیال میں غزل موزوں کرنے کے لئے دل جگر کو خون کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح فن زبان و دل کا ترجمان بنتا ہے۔ اسی سے اس میں حسن و جمال کی قدر پیدا ہوتی ہے۔ سادگی، روانی، پیچ داری، رمزیت، ایمائیت، علامتیں، اشارے، تشبیہیں، استعارے میر صاحب کے یہاں معنویت سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ معنویت ہی ان سب کو پیدا کرتی ہے۔ اور اسی طرح ان کے ہاتھوں اُن کے فن میں حسن کی اقدار کا وجود ہوتا ہے۔ میر صاحب اس حقیقت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اس لئے اُن کے فن میں محض صنّاعی کا احساس کسی ایک جگہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ فطری طور پر وجود میں آتی ہے۔

میرؔ صاحب کا فن ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ جو کچھ ان کی شخصیت میں تھا، وہ ان کے فن میں بھی ہے۔ جن عناصر سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے، وہی ان کے فن میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ میر صاحب کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا خلوص اور صداقت ہے۔ دورنگی اور منافقت سے وہ بہت دُور تھے۔ اسی لئے ان کے یہاں تکلّف اور تصنّع نہیں ہے۔ مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی نہیں ہے۔ ان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا صحیح اور مکمّل اظہار اُن کے فن میں ہوتا ہے۔ اسی لئے میر صاحب کے فن میں سب سے پہلے ایک بے ساختگی اور برجستگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے یہاں باتیں کرنے کی سی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا سبب بھی یہی برجستگی اور بے ساختگی ہے ـــــ ان کی سادگی اور سلاست جس کا اس قدر شہرہ ہے، اور

جس کی ان کے فن میں ایک لہر سی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، وہ بھی درحقیقت اسی بے ساختگی اور برجستگی کا ایک پہلو ہے۔ میر صاحب نے شعر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بات بنانے اور بات کرنے کو جو اتنی اہمیت دی ہے، اس کا سبب بھی یہی سادگی کا خیال ہے۔ اور اسی خیال کا یہ اثر ہے کہ میر صاحب نے باتوں کو شعر اور شعر کو باتوں کا روپ دے دیا ہے۔ ان کے فن میں اسی لئے کسی طرح کی مشکل پسندی کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی قسم کی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ برخلاف اس کے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کی کہی ہوئی بات پہلے سے پڑھنے والے کے دل میں موجود تھی۔ اسی لئے ان کا ہر خیال پڑھنے والے کو اپنا خیال معلوم ہوتا ہے۔

اس بے ساختگی اور برجستگی ہی کا یہ اثر ہے کہ میر صاحب کے فن میں سادگی اور سلاست کا حُسن ہے۔ کسی ایک جگہ بھی اس حسن کا دامن اُن کے فن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ میر صاحب کے فن میں اظہار و ابلاغ چونکہ ایک فطری ردِّ عمل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں تکلّف اور تصنّع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے فن میں پُرکاری کے نہ ہونے کا بنیادی سبب بھی یہی ہے ــ میر صاحب کا گہرا اور شدید تاثر ایک فطری اور واقعی ردِ عمل کی صورت میں اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ انھیں اس کی تراش خراش کا موقع ہی نہیں ملتا، اور اسی لئے فنی اظہار کو پُرکار بنا کر پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ میر صاحب کے فن میں تو بس سیدھی سادی باتیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں سادگی کا حُسن بھی نظر آتا ہے اور حسن کی سادگی بھی!

میر صاحب کے کلام میں اس سادگی کے حُسن اور حُسن کی سادگی کی ہر جگہ کارفرمائی ہے اور اس نے ان کے فن میں بڑے کارہائے نمایاں ادا کئے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ ان کے فن کا ہر پہلو درحقیقت اسی کا مرہونِ منّت ہے۔ ان کی زبان میں، اندازِ بیان میں، ترکیبوں میں، تشبیہوں میں، استعاروں میں، اشاروں میں، علامتوں میں، بہت واضح طور پر اس سادگی کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

میر صاحب کا فن غزل کا فن ہے اور انھوں نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔ حسن کا وہ بڑا رچا ہُوا مذاق رکھتے تھے، اور اس میں شک نہیں ہے کہ انسانی حسن کی تصویر کشی انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے باوجود ان معاملات کی ترجمانی میں ان کے یہاں رنگینی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ سادگی کا حُسن ان کے فن کو بیان کی رنگینی سے دُور رکھتا ہے۔ اسی لئے رنگیں بیانی ان کے فن میں نظر نہیں آتی۔ وہ تو بس سادہ پُرکاری کے قائل ہیں اور اس سے اپنے فن میں ایک عمومی فضا قائم کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں تزئین اور آرائش کا پتہ نہیں چلتا۔ بجلی کی تیز روشنی کی سی جگمگاہٹ نظر نہیں آتی۔ وہ جو فضا قائم کرتے ہیں اس پر نظر ٹھہر سکتی ہے، خیرہ نہیں ہوتی۔ اسی لئے ان کے فن میں رنگینی اور رعنائی کی جگہ نفاست اور لطافت ہے، صفائی اور ستھراپن ہے، اور وہ ہر جگہ اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ خواہ وہ کسی موضوع کو بھی فن کے سانچے میں ڈھالیں۔ ان کا یہ انداز بہرصورت باقی رہتا ہے ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ــ ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے ــ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں ــ پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش
سراپا میں اس کے نظر کر کے تم ــ جہاں دیکھو اللّٰہ اللّٰہ ہے

آگہ تو رہیئے اس کی طرز رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم ــ آتا ہے جی میں آنکھوں کو اُن میں گڑوئیے
حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے ــ کہہ سکتے کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے
میر سے پوچھا جو ہم عاشق ہو تم ــ ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت
بھاتی ہے مجھے اک طلبِ بوسہ میں وہ آن ــ لکنت سے اُلجھ جا کے اسے بات نہ آتی
ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا و لے ــ اک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

چھُپ لگ کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میرؔ
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

کیا کیا لکھا ہے میں نے وہ میر کیا کہے گا
گم ہووے نامہ بر سے یارب مری کتابت

آئے ہیں میرؔ منہ کو بنائے خفا سے آج ــ شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

ان اشعار میں محبوب کے حسن کا بیان بھی ہے اور ان روابط کا تذکرہ بھی جو محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کسی ایک جگہ بھی رنگینی اور رعنائی کے عناصر پیدا نہیں ہوتے۔ حالانکہ ان موضوعات کو پیش کرنے میں رنگینی کا پیدا ہونا ایسا عجیب نہیں ہوتا۔ لیکن میر صاحب اس سے بہت دُور ہیں ان کے خیال ہی میں رنگینی نہیں ہے۔ پھر بھلا اظہار میں اس کا وجود کس طرح ہو سکتا ہے

ان کے یہاں تو خیال کی سادگی ہے اور اسی خیال کی سادگی نے ان کے فنِ اظہار میں بھی سادگی کے عناصر پیدا کر دئے ہیں۔

میر صاحب کے فن میں رنگینی اور رعنائی کے پیدا نہ ہونے کا ایک سبب یہی ہے کہ ان کے خیالات حزن و یاس اور رنج و الم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حزنیہ فضا اور ایک المیہ آہنگ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ فضا اور یہ آہنگ بھی ان کے فن میں رنگینی اور پُرکاری کو پیدا نہیں ہونے دیتے برخلاف اس کے سادگی ہی کی پرورش کرتے ہیں۔ حزنیہ اور المیہ آرٹ میں تکلّف اور صناعی کا پنپنا مشکل ہوتا ہے۔ تزئین اور آرائش کا چراغ اس محراب میں نہیں جل سکتا۔ میر صاحب کا فن بھی چونکہ بنیادی طور پر حزنیہ اور المیہ ہے، اس لئے اس میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ ان کا ہر شعر اس خیال کو صحیح ثابت کرتا ہے۔

چونکہ میر صاحب غمِ زندگی کے فن کار ہیں اس لئے انسانی زندگی کا سارا گداز ان کے فن میں کھنچ کر آ گیا ہے۔ اسی لئے اس میں سادگی کے ساتھ ایک آہستہ روی، ایک نرمی، ایک گھلاوٹ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیات غزل کے فنی اصول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ میر صاحب کے یہاں شدید داخلیت ہے اور اسی داخلیت نے ان کے فن میں حزن و یاس کی فضا پیدا کر کے اس کو نرمی، گھلاوٹ اور شیرینی سے آشنا کیا ہے۔ میر صاحب کے خیالات اپنی سادگی اور معصومیت کے باعث بذاتِ خود حد درجہ نرم اور شیریں ہوتے ہیں اس لئے ان کا اظہار بھی انھیں خصوصیات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے جو گھلاوٹ اور شیرینی ٹپکتی ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔

میر صاحب کی شاعری غنائی شاعری کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے دیکھا جائے، تو ایک مترنم انداز ملتا ہے۔ میر صاحب کے اظہار میں نغمگی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نغمگی محض الفاظ کے در و بست کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں جو خیال ہوتا ہے، وہ اس نغمگی کو وجود میں لاتا ہے۔ اس نغمگی میں بلند آہنگی نہیں ہوتی بلکہ آہستہ روی ہوتی ہے۔ البتہ فطری بہاؤ اور روانی کا احساس اس میں ضرور ہوتا ہے۔ اس روانی اور بہاؤ کو پیدا کرنے میں بحروں کے انتخاب کو بھی بڑا دخل ہے جس میں میر صاحب اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

اور اس میں شک نہیں کہ میر صاحب نے جس طرح مختلف خیالات اور مختلف موڈ کے اظہار کے لئے مختلف بحروں کا انتخاب کیا ہے، اس نے ان کے فن کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ انھوں نے چھوٹی سے چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور بڑی سے بڑی بحروں میں بھی۔ انھوں نے فارسی کی مروّجہ بحروں کو بھی استعمال کیا ہے اور ہندی کے پنگل کو بھی غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے اس غنائی کیفیت کو پیدا کرنے میں بڑا کام لیا ہے جو ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان بحروں میں الفاظ کے در و بست سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر جس غنائیت کی تشکیل ہوتی ہے اس میں بڑی ہی ڈوبی ہوئی کیفیت ہوتی ہے بڑا ہی رس ہوتا ہے، کچھ ایسی نغمگی ہوتی ہے جس کا اثر کانوں سے کہیں زیادہ دل پر ہوتا ہے۔ میر صاحب کی غنائیت تمام حواس کو متاثر نہیں کرتی براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے اسی لئے اس میں وہ پہلو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس کو عام طور پر فنِ موسیقی میں آواز کے درد سے تعبیر کرتے ہیں۔ میر صاحب کی نَے بڑی دھیمی لیکن بے حد گداز ہے۔ ان کا لہجہ بہت ہی نرم لیکن بلا کا پُرسوز ہے اور اس کو پیدا کرنے میں ان کے بحروں کے انتخاب اور ان بحروں میں الفاظ کے مخصوص در و بست کا بڑا ہاتھ ہے۔

میر صاحب کا فن اس بات کی غمّازی کرتا ہے کہ وہ مکمل اظہار و ابلاغ کے قائل ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کا اثر بھرپور ہو۔ ایسا کرنے کے لئے انھوں نے ایک طرف تو روایت کا سہارا لیا ہے اور دوسری طرف اپنے ماحول کے گرد و پیش سے اثر قبول کر کے اظہار و ابلاغ کے نئے وسائل بھی تلاش کئے ہیں۔ اسی لئے ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک متوازن امتزاج بھی ملتا ہے اور اسی لئے میر صاحب کے فن میں جدّت اور اُپج نمایاں نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میر صاحب ایک حد تک باغی بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کی مروّجہ روایات سے انحراف بھی کیا ہے اور اپنا ایک مخصوص انداز نکالا ہے۔ میر صاحب سے قبل ایک دور ایسا گزر چکا تھا جب غزل کا فن ایہام گوئی سے عبارت تھا۔ میر صاحب نے نہ صرف ایہام گوئی سے روگردانی کی بلکہ اس کو چھوڑ کر ان روایات سے استفادہ کر کے جو فارسی کے وسیلے سے ان تک پہنچی تھیں اپنے فن کو نئی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے اتنے مختلف نظر آتے ہیں۔ اور ان کے فن میں جدّت اور اُپج کی وجہ سے اس قدر دل کشی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں خود بھی اس حقیقت کا

احساس ہے۔ اُنھوں نے جو یہ شعر لکھا ہے ؎

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

وہ بس یونہی نہیں کہہ دیا ہے۔ اس کے پیچھے تو روایت اور تجربے کا وہ پورا پس منظر ہے جس سے اس وقت کی غزل کا فن دوچار تھا اور جس میں میر صاحب پیش پیش تھے۔

فارسی روایات کا میر صاحب پر گہرا اثر ہے لیکن وہ اس کے حلقہ بگوش نہیں ہیں۔ انھوں نے اس روایات سے اس حد تک استفادہ کیا ہے جس حد تک رہتے تک فنی حدود نے اس کی اجازت دی ہے۔ ان روایات نے انھیں لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے تو ان پر اجتہاد کیا ہے۔ اس میں اضافے کئے ہیں۔ ان کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔ نئے حالات سے آشنا کیا ہے۔ اسی لئے اُن کا سخن کسی سے نہیں ملتا اور اُن کی گفتگو کا ڈھب سب سے جدا نظر آتا ہے ؎

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

میر صاحب اس اعتبار سے ایک بڑے صاحبِ کمال فن کار ہیں۔ اور ان کا یہ کمال اُن کی لفظی پیکر تراشی اور شاعرانہ اور فن کارانہ لب و لہجہ میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تشبیہیں اور استعارے، علامتیں اور اشارے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

میر صاحب کے فن میں تشبیہہ اور استعارے کا استعمال بڑے سلیقے سے ملتا ہے لیکن وہ ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ میر صاحب اپنی تشبیہوں اور استعاروں سے ایک طرف تو اپنے خیال کو پوری طرح واضح کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس میں زندگی سے بھرپور تصویریں ان کے فن کو ایک نگارخانہ بنا دیتی ہیں۔ ان کی تصویریں مبہم اور دور از کار نہیں لیکن ان میں ایک اچھوتا پن ضرور نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اندر ایک زندگی رکھتی ہیں۔ میر صاحب کی تشبیہیں اور استعارے ان کی کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان کے تخلیقی عمل کے ہاتھوں وہ فطری طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ میر صاحب نے کیسی کیسی عجیب تشبیہوں اور استعاروں کی تخلیق کی ہے ؎

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے — دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
کارواں ہائے صبح ہوتے گیا — میں ستم دیدہ محوِ خواب رہا
عشق دریا ہے ایک لنگرواد — تہہ کسو نے نہ اس کی پائی ہے
یادِ زلفِ یار جی مارے ہے میر — سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے
دلِ پُرخوں کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے
حاصل ہو گیا سوائے ترائی کے دہر میں — اُٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی — دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی
شاخِ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں — جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے
ان گل رُخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں — جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
تو کہے واں ناگہاں بجلی گری — وہ نگاہِ تند کرتا ہے جہاں
چلتا ہوا تو قافلۂ روزگار سے — میں جوں صدا جرس کی اکیلا جدا گیا
یک بیاباں ہے مری بے کسی و تنہائی — مثلِ آوازِ جرس سب سے جدا جاتا ہوں
یک بیاباں بہ رنگِ صوتِ جرس — مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی
آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں — میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے
ہے تفنن کہ لعل ہیں وے لب — یعنی اک بات سی بنائی ہے
ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہہ — شمعِ مجلس کی رونی صورت ہے
میر تلوار چلتی ہے تو چلے — خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے — دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میر — ملا دی ہیں کہ بجلی فغاں میں
حال گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق — رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے بعض کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاتھوں فن میں مصوری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ میر صاحب کی ان تشبیہوں اور استعاروں میں ان کی تخیل کا کمال نظر آتا ہے۔ اسی تخیل نے ان میں جدت پیدا کی ہے۔ میر صاحب اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا خام مواد اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے حاصل کرتے ہیں اسی لئے ان کے نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا مثلاً دل کے غبار نکلنے کی کیفیت کو آندھی کی سی دھوم سے تعبیر کرنا، عشق کو لنگرواد دریا کہنا، زلفِ یار کی یاد کو سانپ کے کاٹے کی لہر سے نسبت دینا، دلِ پُرخوں کی گلابی کی

وجہ سے اپنے آپ کو شرابی بتانا، گل رخوں کی قامت کو بھولوں کی لچکتی ہوئی ڈالیوں سے تعبیر کرنا، بے کسی اور تنہائی کے ساتھ ہر یک بیاباں بہ رنگ صوتِ جرس کا خیال آنا، دامن کو دریا کا سا پھیر بتانا، دل کو چراغِ مفلس، دیدۂ گریاں کو نہر، خرابۂ دل کو دلی شہر کہنا اور اسی قسم کی بے شمار باتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ میر صاحب نے ان پیکروں کی تخلیق میں اپنی زندگی اور ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا ہے

تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ میر صاحب کے فن میں رمزیت اور ایمائیت بھی خاصے کی چیز ہے۔ میر صاحب خود غزل کے فن میں تہ داری کے قائل ہیں چناں چہ اس تہ داری کے اصول کو انھوں نے اپنے فن میں بھی برتا ہے۔ لیکن اس تہ داری کے نتیجے میں جو رمزیت اور ایمائیت ان کے یہاں پیدا ہوتی ہے وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کا موضوع اور مواد ہی اس کو پیدا کرتا ہے یہ دو چار شعر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

جبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

کچھ کرو ذکر مجھ دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں — پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

پھر جو دیکھا کچھ نہ تھا جز شعلۂ پیچ و تاب — شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل — اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

وصل اُس کا خدا نصیب کرے — میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تلک آئے

اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے — کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

یہ شعر بڑے ہی پہلو دار شعر ہیں اس میں تہہ داری کی خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اسی تہہ داری نے ان میں دل موہ لینے والے انداز کو پیدا کیا ہے۔

میر صاحب کے فن میں، ان کی زبان کے استعمال اور لہجے نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان کی زبان میں فارسی کا غلبہ نہیں۔ انھوں نے بول چال کی زبان میں شعر کہے ہیں۔ پُر کار ترکیبیں ان کے فن میں نظر نہیں آتیں۔ برخلاف اس کے سیدھے سادے الفاظ، دردلیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے جو غزل کے فن کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتا ہے۔

فن کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے میر صاحب کو غزل کا ایک عظیم فن کار بنایا ہے۔ انھیں کا یہ اثر ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ریختے کا صناعِ طرفہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال ان کے دم کے ساتھ رہتا ہے کہ انھوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یوں میر صاحب نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن طبعاً وہ غزل سے مناسبت رکھتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے اس صنف کو اپنا میدان بنا لیا ہے۔ غزل جیسی انھوں نے کہی ہے شاید اردو شاعروں میں سے کسی اور نے نہیں کہی اور اس میں شک نہیں کہ ان سے بڑا غزل گو شاعر اردو میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کا فن اکتسابی نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کرنے کے لئے شاعری نہیں کی ہے۔ انھوں نے تو شعر کو سخن کا پردہ کیا تھا لیکن حالات نے اسی کو ان کا فن بنا دیا۔ اسی لئے تو ان کے یہاں زندگی اور فن کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے اور ان دونوں میں ایک ایسی متوازن ہم آہنگی نظر آتی ہے جس سے وہ سترپردوں میں بھی پہچانے جاتے ہیں ۞

راجپوتانہ عجائب گھر (اجمیر)

راجپوتانہ عجائب گھر (اجمیر) شہنشاہِ اکبر نے ۱۵۷۲ء میں تعمیر کرایا تھا وہاں اجمیر ریلوے اسٹیشن سے صرف دس منٹ میں باسانی یہاں پہنچا جا سکتا ہے۔ اس عجائب گھر کے بانیوں نے راجپوتانہ کے فائدے کے لئے اسے قائم کیا تھا جس میں ۲۲ دیسی ریاستیں اور اجمیر شامل تھے۔ اس وقت اس عجائب گھر کے پانچ بڑے سیکشن ہیں جو زمانہ قبل از تاریخ کی یادگاروں، کتبوں، سکّوں، تصویروں جن میں کچھ نوٹو تصاویر بھی شامل ہیں، کے لئے مخصوص ہیں۔

واہی

گویّا شاعر

اِن سے ملئے، آپ ہیں وہ شاعرِ رنگیں نوا
جن سے بزمِ شعر کی مرطوب رہتی ہے ہوا

بھیرویں کی دُھن میں جس دم دادرا گاتے ہیں آپ
بن کے ساون کی گھٹا محفل پہ چھا جاتے ہیں آپ

آپ پڑھتے ہیں غزل جب لے کے ہلکی گٹکری
آپ پہ قربان ہو جاتی ہے روحِ شاعری

آپ کی آواز یوں لبریز ہے تاثیر سے
گونجتی رہتی ہے محفل نعرۂ تکبیر سے

آپ کی رنگیں نوائی کا ہے یہ ادنیٰ کمال
شعرِ بے معنی بھی بن جاتا ہے اک سحرِ حلال

سر جھکائے دم بخود رہتے ہیں گو اہلِ نظر
جھومتا رہتا ہے مجمع آپ کی ہر تان پر

فلم کے گانوں کی دھن میں جب سناتے ہیں کلام
انجمن پر ٹوٹ پڑتا ہے سڑک کا اژدہام

آپ کے شعروں میں گو آہنگ کا فقدان ہے
آپ کا گانا مگر بزمِ سخن کی جان ہے

آپ کی نغمہ سرائی کی خبر ہے دور تک
آپ کا شہرہ ہے دِلّی سے منظفر پور تک

فرق یہ ہے آپ میں اور پیشہ ور قوّال میں
فیس کا طالب ہے وہ اور آپ خوش ہر حال میں

گُنگُنا کر آپ جب کرتے ہیں صاف اپنا گلا
بزمِ قوّالی کا آ جاتا ہے ہلکا سا مزا

مصرعۂ اوّل کو دو دو بار دہرانے کے بعد
انگلیوں سے تال سُر کا بھاؤ بتلانے کے بعد

لوچ پیدا کر کے قدموں میں تھرک جاتے ہیں آپ
کچھ پھڑک جاتی ہے محفل کچھ پھڑک جاتے ہیں آپ

آپ سے واہی کا ہے یہ دست بستہ مشورا
آپ کو فطرت نے بخشا ہے مغنّی کا گلا

آپ کی شفقت کا ہے محتاج رقّاصی کا فن
کیوں نہ بزمِ رقص میں تبدیل ہو بزمِ سخن

کس قدر بے چین ہیں یہ پاؤں گھنگھرو کے لئے
گردشیں محدود کیوں ہوں چشم و ابرو کے لئے

لطف آ جائے جو سازندے بھی ہوں کچھ ساتھ ساتھ
اِس طرف پیروں میں جنبش اُس طرف طبلے پہ ہاتھ

پھیل جائے چار جانب پھر تو شہرا آپ کا
اور ہر تقریبِ شادی میں ہو مُجرا آپ کا

صالحہ عابد حسین

صدّیقہ قدوائی

شفیق الرحمٰن قدوائی اپنے دوستوں میں صرف "شفیق صاحب" تھے۔ چھوٹے بڑے سب ان کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور بیگم صدّیقہ قدوائی بھابی تھیں۔ اس لئے کہ جامعہ میں سب لوگ اپنے ساتھیوں کی بیویوں کو اسی رشتے سے پکارتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں جب شادی کے بعد میں جامعہ آئی تبھی سے شفیق صاحب سے واقفیت ہوگئی تھی اس لئے کہ وہ میرے شوہر کے بڑے عزیز دوست تھے۔ لیکن بیگم شفیق سے کہیں ۱۹۳۹ء میں جاکر ملاقات ہوئی۔ ان کی شادی مجھ سے ایک سال پہلے ہو چکی تھی مگر وہ اپنے وطن بڑاگاؤں یا لکھنؤ رہا کرتی تھیں۔ جب کبھی میں شفیق صاحب سے ان کے بارے میں پوچھتی وہ مذاق میں بات اڑا دیا کرتے۔ "ارے وہ بچاری گنوار یہاں آکر کیا کرے گی۔" کبھی کہتے "بھابی اُسے ہماری پرواہی کیا ہے" یا "وہ جامعہ کی زندگی کہاں جھیل سکتی ہے۔" اور میں ان کی مزاحیہ طبیعت سے ناواقف عرصہ تک سمجھتی رہی کہ بیگم شفیق جو ایک رئیس گھرانے کی نازونعم کی پلی لڑکی ہیں، ایسے ماحول کی عام لڑکیوں جیسی جاہل، مغرور، آرام طلب، خودپسند امیرزادی ہونگی جو اپنے غریب شوہر کے ساتھ آکر رہنا پسند نہیں کرتیں۔ اور شوہر بھی کیسا؟ جس نے عیش و آرام کی زندگی کو لات ماری، خاندانی روایات کو توڑا، روپیہ پیسہ، عہدہ، عزّت کو ٹھکرایا، علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوڑا اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو لبیک کہہ کر وہیں سے بی اے کی ڈگری لی۔ وہ ڈگری جس کی کوئی حیثیت نہ تھی جس کے ذریعے نہ ڈپٹی کلکٹری مل سکتی تھی نہ تحصیلداری اور پھر یہی نہیں حکومت کو اپنے خلاف کیا، قومی تحریک میں حصّہ لیا، جیل گیا، لاٹھیاں کھائیں، حکومت کی نظر میں مشتبہ ٹھہرا اور اب جامعہ کی چالیس پچاس روپلے ماہوار کی نوکری دنیا کے بڑے سے بڑے عہدے سے بڑھ کر سمجھتا ہے اس "سرپھرے نوجوان" نے ۱۹۲۰ء میں جو راستہ اپنے لئے متعین کیا تھا اس پر پوری ثابت قدمی سے تیس سال تک گامزن رہا۔ جس کا ہر سانس، ہر لمحہ قومی خدمت اور جامعہ کی بہبود اور ترقی کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ جس کو عشق کی اس کٹھن راہ کا ہر کانٹا پھول، ہر پتھر موتی، ہر مصیبت راحت، ہر دکھ سُکھ نظر آتا تھا۔ بھلا اگر ایسے شخص کی نازونعم میں پلی ہوئی بیوی اس کے ساتھ آکر نہ رہے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

لیکن جب ۳۹ء میں صدّیقہ پہلی بار قرول باغ آئیں اور میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے تصوّر کے بالکل برعکس نکلیں۔ رات کا وقت تھا جب میں ان کے گھر پہنچی دروازے پر ہی ایک میری ہم سن خاتون نے جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور دلکشی تھی، میری پیشوائی کی یہی صدّیقہ تھیں۔ وہ بھی مجھے پہلے سے جانتی تھیں اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں میں خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ میں نے کہا "بھابی آپ یہاں آکر کیوں نہیں رہتی ہیں؟" جواب ملا "آپ کے بھائی رکھتے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ رہیں تو وہ رکھیں۔ میرے بھائی بچارے کو کیوں الزام دیتی ہیں۔" ہنسیں۔ آہ! کیسی دلکش ہنسی ہوتی تھی ان کی ۔۔ "تو آخر کہاں رہوں؟ کوئی گھر دہی ہو ان کے پاس۔" ان کا اس وقت کا قیمتی لباس، بھاری زیور، لیسڑوں پر کامدانی کی بھاری بھاری دلائیاں، ساتھ کئی کئی ملازمائیں سبھی میرے اس شبہ کی تصدیق کررہے تھے کہ اس رئیس زادی کے لئے درویش منش شفیق کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ ویسے وہ خاصی پڑھی لکھی، بڑی سمجھدار، ذہین، خوش مزاج، ملنسار، ہنس مکھ خاتون نکلیں۔ شفیق صاحب کے نام پر ان کی سیاہ حیادار آنکھوں میں جو چمک اور ہونٹوں پر جو مدھ بھری مسکراہٹ پیدا ہو جاتی تھی وہ چغلی کھا رہی تھی کہ انھیں اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔

اس سال ان کی بچی عزّت پیدا ہوئی اور وہ پھر لکھنؤ چلی گئیں۔ اس کے بعد

اکثر ان کا آنا جانا ہوتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ ملیہ نے اوکھلے میں جامعہ نگر کی بستی بسائی اور وہاں منتقل ہو گئی۔ البتہ جن اداروں کا تعلق شہر سے تھا، یا جن کے لئے ابھی عمارت نہ تھی وہ وہیں رہے۔ شفیق صاحب کا ادارۂ تعلیم و ترقی بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ ان کا تعلیم بالغان کا اور سوشل سروس کا سب کام شہر میں پھیلا ہوا تھا اس لئے وہ قرول باغ ہی میں رہے۔ بیگم شفیق اب اکثر آکر وہاں رہتی تھیں اور میری اور ان کی کبھی قرول باغ میں کبھی جامعہ نگر میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ دوستی اور محبت کا جو بیج پہلی ملاقات میں بو گیا تھا وہ برابر بڑھ رہا تھا اور ہم میں یگانگی بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۹۴۶ء کے آخر میں جب ملک کی فضا مکدر تھی جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اس وقت جامعہ نگر کی چھوٹی سی بستی کئی ہزار مہمانوں سے آباد تھی۔ خیموں کا ایک خوبصورت شہر بس گیا تھا۔ دور دور سے لوگ آئے تھے۔ ہر گھر میں دوست احباب اور عزیزوں کا مجمع تھا۔ صدیقہ بھی اپنے بہت سے عزیزوں کے ساتھ جامعہ جوبلی میں شرکت کرنے آئی ہوئی تھیں اور مدرسۂ ابتدائی کے ایک بڑے کمرے میں مقیم تھیں۔ یہ دیکھ کر کہ وہ لوگ زمین پر بستر لگا کر سوتے اور ڈائننگ ہال کا کھانا کھاتے ہیں۔ میں سوچنے لگی کہ کس قدر شوق ہے انھیں جامعہ جوبلی دیکھنے کا کہ یہ اتنی تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ اس وقت کیا جانتی تھی کہ اس نازک اندام عورت کے اندر تکلیف اٹھانے اور کٹھنائیاں سہنے کی کتنی بے پناہ طاقت چھپی ہوئی ہے۔

جوبلی میں ایک بڑا جلسہ عورتوں کا بھی طے ہوا تھا جس کا انتظام میرے سپرد کیا گیا تھا اور جامعہ کی کچھ اور عورتیں اور لڑکیاں اس میں میری مددگار تھیں۔ صدیقہ اس جلسے میں صرف دور کی تماشائی رہیں۔ نہ میں نے ان سے کسی کام کے کرنے کے لئے کہنے کی ہمت کی نہ خود انھوں نے پیش کش کی۔ ان کی خود پوشی اور جھجک کو میں اپنی حماقت سے یہ سمجھتی رہی کہ ان بچاری میں نہ اس قسم کے کاموں کی کوئی صلاحیت ہے نہ شوق۔ اب سوچتی ہوں تو اپنی عقل پر رونا آ جاتا ہے کہ میں اس ہستی کو بد شوق اور نا اہل سمجھ رہی تھی جس کا نام اپنے خلوص، خدمت، ان تھک محنت اور کارگزاری کی بدولت چند سال کے اندر اندر دور دور مشہور ہونے والا تھا۔

پھر ۱۹۴۷ء کا ہنگامی دور آیا۔ ایک طرف ملک کو آزادی کی نعمت ملی۔ دوسری طرف سارے دیس میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس میں سینکڑوں سال کی رواداری، انسانیت، محبت اور خلوص جل کر بھسم ہو گیا۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا، بہنوں کی عزت لوٹی، ہمسائگی کی روایات کو خاک میں ملا دیا، بچوں پر وحشیانہ ظلم توڑے اور صبحِ آزادی کو ننگِ شام بنا ڈالا۔ لیکن اس تاریکی میں امید کے کچھ مینارے بھی تھے جو چمک چمک کر بے آسوں کی آس بندھاتے رہے۔ جنھوں نے انسانیت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش میں اپنے تن من کی بازی لگا دی تھی۔ ان مبارک ہستیوں میں سے ایک ہمارے شفیق صاحب کی ذات بھی تھی۔ وہ سچے اور پکے مسلمان بھی تھے اور گاندھی جی کے عقیدت مند اور پیرو بھی۔ انھوں نے اس وقت وہی کیا جو ایک سچے مسلمان کے شایانِ شان تھا اور گاندھی جی کے پیرو کو زیب دیتا تھا۔ دلی کی فساد کی آگ میں شفیق صاحب کا گھر بار، ان کا ادارہ، ان کا مکتبہ جامعہ اور کیا کچھ نہیں بھسم ہو گیا مگر ان کی تیوری پر بل نہیں آیا، دل پر میل نہیں آیا۔ وہ اسی بشاشت اور خندہ پیشانی سے، اسی خلوص اور محبت سے دلی کے باسیوں کی خدمت اور مصیبت ماروں کی مدد اپنی جان پر کھیل کر کرتے رہے۔ اس زمانے میں شفیق اور ان کے ساتھی نوجوانوں نے جن میں ہر مذہب اور خیال کے لوگ شامل تھے مصیبت ماروں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آزادی کی اور انسانیت کی تاریخ کا ایک زریں باب کہا جا سکتا ہے۔

یہاں شفیق صاحب کا گھر اور ادارہ لوٹا جا چکا تھا اور وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے ایسے علاقوں میں بے تکلف گھومتے پھرتے رہتے تھے جہاں ہر وقت موت ناچتی تھی۔ اُدھر لکھنؤ میں ان کی بیوی اور خاندان والوں کا اُن کی فکر میں برا حال تھا۔ صدیقہ تو اس پریشانی میں گھلی ہی جا رہی تھیں انھوں نے آنکھ کھول کر صدمے ہی صدمے دیکھے تھے۔ باپ کا صدمہ، ماں کی جدائی، جوان بہن بھائی کا داغ، جانے کتنے مصائب اور دکھوں سے ان کا دل داغ داغ تھا۔ اور شوہر کی ہستی تو اُن کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ راستے بند تھے ورنہ وہ اپنی جان پر کھیل کر دلی پہنچتیں۔ ڈاک، تار، فون سبھی کچھ تو کچھ عرصے کے لئے بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ان کے دل پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی بارے خدا نے یہ سخت وقت بھی کاٹ دیا اور شفیق کی سلامتی کی خبر سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی ملی کہ ان کا بھرا ہوا گھر لوٹ لیا گیا۔ عورت کو اپنی گھر گرہستی کتنی پیاری ہوتی ہے۔ یہ کچھ عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ اس کی ہر ہر چیز پر اس کے ماں باپ کی محبت کی مہر، اس کی اپنائیت کا ٹھپہ، اس کے سگھڑاپے اور سلیقے کی چھاپ ہوتی ہے۔ اور جب وہ یوں آناً فاناً لُٹ جائے تو اس پر کیا بیتتی ہے لیکن یہ ایک مصیبت تھی جس سے اس خوفناک دور میں ہزاروں لاکھوں عورتوں کو گذرنا پڑا اور اس وقت ہندوستان کی بہت سی عورتوں نے اپنی شخصیت کا یہ دلکش پہلو اجاگر کیا کہ اگر ان کی آبرو اور ان کے پیاروں کی جان بچ جائے تو پھر انھیں کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ صدیقہ ایسی ہی عورتوں میں سے تھیں۔ گھر بار کے لٹنے

کی خبر سن کر ان کو ذرا سا بھی ملال نہیں ہوا - خدا نے شفیق کی جان بچا لی اب انھیں اور چاہیئے بھی کیا ؟ افسوس اور شکایت کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ تو اس طرح ہنس ہنس کر اس کا ذکر کرتیں جیسے کہتی ہوں ؎

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتی ہوں رہزن کو

۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد صدّیقہ نے اب دلّی میں مستقل رہنا شروع کر دیا ، شاید اب شفیق صاحب سے جُدا رہنے کی ان کے دل میں برداشت نہ رہی تھی - شفیق صاحب کا ادارہ اب جامع مسجد میں، مٹیا محل میں منتقل ہو گیا تھا - اسی مکان کے اوپر کے حصّے میں وہ رہتے بھی تھے - صدّیقہ پہلے پردے کی پابند تھیں مگر اب انھوں نے برقع ترک کر دیا تھا - ۴۷ء کے ہنگامے کے جو بہت سے اچھے بُرے نتائج نکلے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بہت سی مسلمان عورتوں نے جو خاندانی روایات یا بزرگوں کے خوف یا رواج کی مجبوری کے سبب پردے کی پابند تھیں ، حالات سے مجبور ہو کر یا ان سے فائدہ اُٹھا کر رواجی پردہ ختم کر دیا - میں اور صدّیقہ بھی اس گروہ میں شامل تھے - وہ مٹیا محل میں رہتیں اور جامع مسجد جیسے علاقے میں بے برقعہ گھومتی تھیں - شروع شروع میں انھیں قدامت پرست اور تنگ نظر لوگوں کی بہت سی دل شکن اور نامعقول باتیں سننی پڑیں مگر اُنھوں نے نہ ان سے جھگڑا مول لیا نہ اُن کی رائے سے متاثر ہوئیں - اور پھر یہی تنگ نظر متعصب لوگ تھے جو چند سال کے اندر اندر صدّیقہ کی پاکدامنی اور شرافت کی قسمیں کھاتے اور اُن کی اپنی ماں کی طرح عزّت کرنے لگے -

میری اور صدّیقہ کی دوستی اب زیادہ گہری اور پائیدار ہو چکی تھی - بہت سی باتوں میں ہم دونوں میں ذہنی اشتراک تھا - ہمارا جامعہ سے دلی تعلق ، سیاسی خیالات ، مذہبی عقیدے ، اخلاقی اقدار اور سماجی نقطۂ نظر بہت کچھ ملتے جلتے تھے - پھر کچھ طبیعت اور مزاج بھی ایک دوسرے سے میل کھاتے تھے - میں ان کی سیرت کی دل کشی اور شخصیت کے حُسن سے بہت متاثر تھی اور ان کی تو خیر فطرت ہی تھی کہ وہ ہر ایک سے حُسنِ ظن رکھتیں اور خلوص و محبت سے پیش آتی تھیں - مگر مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ مجھ سے انھیں کچھ زیادہ ہی خصوصیت تھی - جتنا ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور قدر کرتے تھے شاید کم دوست آپس میں ایسے تعلقات رکھتے ہوں گے - کہنے ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی ہی کہتے مگر ہم میں سگی بہنوں کا سا پیار تھا -

اب جو صدّیقہ مستقل دلّی میں رہنے لگیں تو ان کے جامعہ اور جامعہ والوں سے تعلقات اور زیادہ گہرے اور قریبی ہو گئے - جامعہ کی عورتوں سے تو پہلے ہی سے انھیں بڑی محبّت تھی اب جامعہ کے کارکنوں سے بھی خصوصیت ہو گئی - بڑے چھوٹے سب انھیں بھائی یا آپا جان کہتے تھے - اور وہ بلا استثناء سب سے سگے بہن بھائی کا سا سلوک کرتی تھیں - اب وہ اپنے شوہر کی سیرت اور خیالات کا اثر تیزی سے قبول کر رہی تھیں - قومی اور سیاسی تحریک سے بھی دل چسپی پیدا ہو گئی تھی - اور جامعہ سے تو دلی تعلق پہلے ہی سے تھا - شفیق صاحب کے سوشل سروس اور تعلیم و ترقی کے کاموں کو بھی اب انھوں نے زیادہ قریب سے دیکھا اور سمجھا - ان کے دل میں ان سب کی بڑی قدر اور اپنے شوہر کی ذات پر بڑا ناز تھا لیکن ان کے کاموں میں عملی حصّہ نہیں لیتی تھیں - ان کی طبیعت میں انکسار کا بڑا مادہ تھا - کوئی ان سے کہتا بھی تو وہ کبھی عملی میدان میں آنے پر راضی نہیں ہوتی تھیں - لیکن جامعہ سے ان کی محبّت روز بروز بڑھ رہی تھی - عام طور سے کارکنان جامعہ کی بیویاں جامعہ کی شاکی رہتی تھیں اس لئے کہ اوّل تو وہاں کی کٹھن زندگی اور غربت کی ساری تکلیفیں مردوں سے زیادہ انھیں کو سہارنا پڑتی تھیں - اور پھر جس مقصد کی خاطر ان کے مرد یہ سب جھیل رہے تھے اس سے بھی بہت کم تھیں جو واقف ہوں - لیکن گنتی کی چند عورتیں ایسی بھی تھیں جن کو اس سے لگاؤ تھا اور وہ اس کے اعلیٰ مقصد سے واقف تھیں اور اپنے شوہروں کے ایثار اور خدمت کو فخر اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور اس راہ کی کٹھنائیوں کو خوش دلی سے جھیلتی تھیں - صدّیقہ ان میں سب سے آگے تھیں - وہ ہم سب سے زیادہ ناز و نعم اور آرام و آسائش میں پلی بڑھی تھیں - ان کے شوہر کی تنخواہ پچاس ساٹھ سے زیادہ نہ تھی جو ملتی بھی مہینوں بعد تھی - لیکن اپنی اور بچوں کی ضروریات ، گھر کا خرچ ، مہمانوں کی خاطر مدارات اور ضرورت مندوں کی مدد وہ سب گھر سے روپیہ منگا کر پورا کرتی رہیں اور کبھی اس بارے میں شکایت کیا تذکرہ بھی کسی کے سامنے نہیں کیا - اب ان کا رہن سہن ، طرزِ معاشرت بالکل وہی ہو گیا جو جامعہ کی دوسری عورتوں کا تھا - اپنے قیمتی کپڑے اور زیورات انھوں نے بالائے طاق رکھ دئے اپنے صوبائی اور خاندانی رواج کو ترک کیا - سوتی ململ کے موٹے دوپٹے اور لٹھے اور چھینٹ کے غرارے اور سادی سستی ساڑھیاں پہننی شروع کر دیں - ان کی کوشش تھی کہ ان کے یا ان کے بچّوں کے رہن سہن میں کوئی امتیاز نظر نہ آئے -

ان کا گھر ہمیشہ ایک اچھا خاصا لنگر خانہ بنا رہتا تھا - پاکستان جانے اور وہاں سے آنے والے عزیز اور دوست ہفتوں ان کے ہاں پڑے رہتے - بیمار لوگ علاج کے لئے آتے ، کچھ سیر سپاٹے کے لئے آتے - اور جامعہ نگر سے جو بھی مرد عورت

شہر کسی کام سے آتے وہ کھانے یا چائے کے وقت بے تکلف ان کے ہاں پہنچ جاتے۔ جب شہر میں شفیق صاحب کا گھر موجود ہے تو پھر تکلیف یا تکلف ہی کیا؟ اور دوسروں کے لئے کیا خود ان دونوں میاں بیوی کے لئے بھی یہ معمہ حل طلب ہی ہوگا کہ اس قلیل آمدنی میں مستقل مہمان داری کا یہ خرچ آخر چلتا کیسے ہے؟ جو جس وقت پہنچ گیا اس کے لئے کھانے ناشتے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا اور آنے والا جو بے تکلفی اور اپنایت یہاں محسوس کرتا وہ کہیں اور ممکن نہ تھی۔ ابھی پچھلے سال ہی کا تو ذکر ہے۔ جامعہ نگر کی ایک لڑکی شاید نوکری کی تلاش میں دن بھر شہر گھوم کر، پریشان بھوکی پیاسی مٹیا محل پہنچی۔ اس کو دیکھتے ہی صدیقہ سمجھ گئیں اور کہا جاؤ نعمت خانے میں جو ملے کھالو۔ اس وقت دلی کی چند معتمد خواتین بھی وہاں موجود تھیں۔ انھوں نے پوچھا کہ "یہ لڑکی کون ہے"۔ جواب دیا "میری بیٹی ہے" انھیں "ماں بیٹی" کی صورت میں بہت فرق نظر آیا۔ حیرت کا اظہار کیا۔ اس پر بولیں "صورت نہ ملے تو کیا بیٹی بیٹی نہیں رہتی؟" اور وہ بیچاری ان دونوں کی رنگتوں کے فرق پر ہی غور کرتی رہیں۔ شاید ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ بعض ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کے دل میں سے اپنے اور غیر کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ سب ان کے ہوتے ہیں اور وہ سب کے ہوتے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جب شفیق صاحب کو یونسکو کی طرف سے انڈونیشیا جانے کی دعوت ملی تاکہ وہ وہاں تعلیم بالغاں کو پھیلانے اور سکھانے میں مدد دیں۔ وہ جامعہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اپنے دوستوں کے سمجھانے سے مان گئے۔ صدیقہ بڑی آسانی سے ان کے ساتھ جا سکتی تھیں۔ میں نے ان سے بہت کہا بھی کہ سیاحت کا ایسا موقع پھر نہ ملے گا مگر انھوں نے شوہر کی مرضی نہ پائی تو جانے کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ اب شفیق صاحب دنیا کی نظر میں بڑے عہدے پر تھے۔ آمدنی بھی کافی تھی۔ مگر صدیقہ کے رہن سہن لباس وغیرہ کسی چیز پر اثر نہیں پڑا۔ جامعہ والوں سے خصوصیت کا اور اپنایت کا اظہار کچھ اور بڑھ گیا۔ یوں بھی وہ روپیہ جو یونسکو سے ملا زیادہ تر دوسروں ہی کی ضرورت اور مدد میں خرچ ہوا۔ وہاں شفیق صاحب کے کام کی بہت تعریف ہوئی۔ یونسکو انھیں اور روکنا چاہتی تھی مگر وہ نہ مانے اور اپنی جامعہ کی خدمت کو چھوڑ کر وہاں کی ملازمت پسند نہ کی۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ اب وہ جامعہ میں کام کریں۔ اس زمانے میں دلی اسٹیٹ کی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے اور لوگوں نے بغیر شفیق صاحب کی خواہش کے ان کے لئے انتخاب لڑنا شروع کر دیا تھا۔ شفیق صاحب اس جھمیلے میں پھنسنا نہ چاہتے تھے۔ وہ انڈونیشیا سے واپس آئے تو بمبئی میں چھپ کر بیٹھ گئے لیکن دلی میں ان کے عقیدت مند خود ہی سب کچھ کر رہے تھے۔ نتیجہ نکلا تو وہ بڑی اکثریت سے منتخب ہو گئے۔ اب ان کو دلی اسٹیٹ کی وزارتِ تعلیم کا عہدہ پیش کیا گیا۔ شفیق جامعہ کا خادم ہونا کسی بھی اسٹیٹ کے وزیرِ اعظم سے بڑھ کر اونچا عہدہ سمجھتے تھے۔ اور اس پیش کش کو قبول کرنا نہ چاہتے تھے۔ ان کے دوستوں کی رائے بھی نہ تھی کہ وہ اس عہدے کو منظور کریں۔ مگر جب پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور دیگر حضرات نے اصرار ہی نہیں کیا بلکہ حکم دیا تو انھیں مجبور ہونا پڑا اور وہ دلی اسٹیٹ کی وزارتِ تعلیم کے کرتا دھرتا مقرر ہوئے۔ چند سال کے اس قلیل عرصے میں شفیق صاحب نے جو قابلِ قدر خدمات دلی اسٹیٹ کی اور محکمۂ تعلیم کی انجام دیں وہ نہ میرا موضوع ہے اور نہ میرا منصب، کہ اس پر روشنی ڈالوں میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی، خواص اور صاحب غرض لوگوں ہی میں نہیں عوام میں، غریبوں میں، ضرورت مندوں میں۔ سنا کرتے تھے کہ ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے، اور خدا جب عہدہ اور اعزاز دیتا ہے تو شان و غرور اور احساسِ اہمیت خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شفیق کا تو یہ عالم تھا کہ جیسے شرمندہ ہوں کہ وہ اس عہدے پر کیوں پہنچے! ان کا انکسار اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اور جب میں "اور بھی زیادہ" کہتی ہوں تو اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ پہلے ہی سے ان میں کتنا انکسار اور فروتنی تھی۔ شروع میں انھوں نے بہت سے قاعدے توڑنے چاہے مثلاً کار پر جھنڈا لگانا، سنتری ساتھ رکھنا، دروازے پر پہرہ وغیرہ دینا۔ خیر بعد میں مجبوراً ان کی پابندی تو کرنی پڑی لیکن ان کے مزاج اور طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس طرح مٹیا محل کا دروازہ ان کے دل کے دروازے کی طرح سب کے لئے کھلا ہوا تھا اسی طرح نئی کوٹھی کا پھاٹک ہر کس و ناکس کے لئے آغوش وا کئے رہتا تھا۔ انھوں نے اس عرصے میں دلی کی جنتا کے لئے جو کچھ کیا اور جس طرح ان کے دل میں گھر بنایا اس کی شہادت وہ لاکھوں برستی ہوئی آنکھیں اور تڑپتے ہوئے دل دے چکے ہیں جو ان کی میت کے ساتھ ۳۔ اپریل ۱۹۵۳ء کو نظر آ رہے تھے۔

اور جامعہ والوں سے -- اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے تو ان کی عاجزی اور محبت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ پہلے آیا کرتے تو دو ایک دوستوں سے ملے، کام کیا اور واپس چلے گئے۔ اب آتے تو کوشش ہوتی کہ ایک ایک کے گھر جائیں

اور اظہارِ محبت دے بے تکلفی کریں۔ وہ کیا آتے تھے جامعہ نگر کی بستی میں جان سی پڑ جاتی تھی۔ مجھ سے ان کے دیور بھاوج اور بھائی بہن دونوں رشتے قائم تھے۔ وہ مجھے چھیڑا کرتے تھے اور میں انھیں۔ جیسے ہی میں ان کی آواز سنتی اندر کمرے ہی سے کہتی۔ "آئیے آئیے منتری مہودے — پدھاریئے —" اور شفیق صاحب ایک دم خفا ہو کر سیڑھیاں اُترنی شروع کر دیتے۔ "بھابی دیکھئے — میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ آپ —" وہ مذاق میں بھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی دوست انھیں منتری یا وزیر کہے۔

خیر شفیق صاحب نے تو تیس برس جامعہ ملیہ کے ماحول میں اپنی سیرت کی تشکیل کی تھی لیکن بیگم شفیق میں تو کچھ تبدیلی پیدا ہوتی۔ پہلے بڑے بڑے لوگ جامعہ کے اس معمولی سے کارکن کی سیدھی سادی بیوی کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے تھے۔ آج گویا ساری دلّی اور دلّی سے باہر کتنے لوگ، مرد اور عورت ان کی خوشامد، دلداری تعریف و توصیف میں لگے رہتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ حاضری دے رہے ہیں۔ دن رات لوگوں کے فون آ رہے ہیں۔ جلسوں میں صدارتوں پر اصرار ہے۔ تقریر کرنے کی درخواستیں، اسکولوں اور اداروں کے افتتاح کرنے کے لئے خوشامدیں ہیں۔ ان کے مزاج، طبیعت، ہنر، سلیقے، قابلیت کا اعتراف ہے۔ کسی چیز نے تو صدیقہ کا دماغ خراب کیا ہوتا؟ مگر نہیں — وہ سمجھتی تھیں کہ یہ خوشامد اس کرسی کی ہے جس پر آج ان کے میاں بیٹھے ہیں۔ اور جس کو وہ کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حلقے میں بھی ان کو خلوص سے محبت کرنے والے لوگ ملے۔ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ مخلص لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے اور وہ خود بھی ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ لیکن ان کو کسی قسم کی غلط فہمی یا غرور پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے پہلے کے دوستوں سے ان کی محبت اور انکسار دوچند ہو گیا۔ میاں اور بیوی دونوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی دوست، ساتھی اور عزیز کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم رتی بھر بھی بدلے ہیں۔

اور پھر ۲۳ - اپریل ۱۹۵۸ء کو دلّی کی جنتا کا یہ سچا خیر خواہ، دلّی کا محبوب وزیر اور ہر دل عزیز لیڈر۔ جامعہ کا عاشق، دیس کا پجاری، دوستوں کا جاں نثار عزیزوں کا غمگسار، خدا کو پیارا ہو گیا۔ دیس اور قوم نے کیا کیا اُمیدیں شفیق کی ذات سے وابستہ کی تھیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی اور مقبولیت، ان کی قابلیت اور صلاحیتیں ابھی تو ذرا سامنے آئی تھیں۔ اب وقت آیا تھا کہ جو اہم کام وہ چھوٹے پیمانے پر انجام دیتے رہے تھے۔ اُسے پورے دیس میں پھیلاتے اب وقت آیا تھا کہ تنتیس برس تک جو کوہ کنی انھوں نے قوم اور ملک کی خاطر کی تھی اس سے چشمۂ شیریں جاری ہوتا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ شفیق کا دل اور جسم تینتیس سال تک ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اور ان تھک محنت کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ ہارٹ اٹیک کا بہانہ ہوا اور وہ دو مہینے کی بیماری میں ختم ہو گئے۔ لیکن شفیق جیسا انسان کبھی مرتا نہیں ہمیشہ زندہ رہتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شفیق صاحب کی جدائی ان کے دوستوں اور عزیزوں کے لئے ایک ایسی محرومی تھی جس کو وہ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ اس صدمے سے لوگوں کے دلوں پر جو کچھ گزری اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن مرنے کے ساتھ مرتا کوئی نہیں۔ صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر بعض وقت کسی ہستی کی جدائی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ شفیق صاحب کا حادثہ یوں تو کتنے لوگوں کے لئے روح فرسا تھا مگر ایک ہستی ایسی تھی جس کی دنیا سچ مچ اجڑ گئی۔ اس کا دل ویران ہو گیا۔ اس کے دماغ کا سکون چھن گیا۔ خوشی ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی۔ ہونٹوں کی مدھ بھری مسکراہٹ حُزن دیاس میں بدل گئی۔ چہرے کی شگفتگی کملا گئی۔ صدیقہ کو اپنے شوہر سے محبت ہے۔ اور بہت محبت ہے۔ اس کا اندازہ کم و بیش ان کے سبھی دوستوں کو تھا۔ لیکن یہ ان کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ان کی محبّت عشق کے بڑے اُونچے درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔ جہاں عاشق اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں فنا کرنا اپنی زندگی کا مقصود سمجھتا ہے۔ انھوں نے اس صدمۂ عظیم کو بڑے صبر اور ضبط سے سہارا۔ ان کا صبر "صبرِ جمیل" کی تعریف میں شامل ہو سکتا ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا ابو الکلام آزاد رحمت اللہ علیہ نے حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی جُدائی کے بیان میں صبرِ جمیل کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یعقوب نے بیٹے کے غم میں روتے روتے آنکھوں کی بینائی کھو دی تھی اور ہر وقت ان کی یاد میں بے قرار رہتے تھے۔ پھر بھی ان کے صبر کو قرآنِ پاک میں "صبرِ جمیل" کہا گیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ صبر دراصل مستحق ہے جو انتہائی شدتِ غم میں کیا جائے۔ اگر فراق کی تکلیف، دردِ جدائی کی چمک، ہجر کی کسک دل میں نہ ہو تو وہ ایک بے حسی کی کیفیت ہو گی۔ جہاں صبر اور ضبط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صبر وہی صبرِ جمیل ہو سکتا ہے جب درد و غم کی شدّت

موجود ہو، فراق میں دل تڑپ رہا ہو، پھر بھی زبان سے سوا خدا کے شکر کے کوئی اور کلمہ نہ نکلے دل میں سوا راضی برضا رہنے کے کوئی گلہ نہ آئے۔ اور خالقِ حقیقی کے حکم کے آگے سر جھکا لیا جائے۔ یہی صبر صبرِ جمیل ہے، ولیوں اور نبیوں کی بات ان کے ساتھ ہے۔ ہم عاجز انسانوں میں صبر کی یہ کیفیت شاذ و نادر ہی کبھی نظر آتی ہے۔ لیکن میری پیاری بہن صدیقہ قدوائی کا صبر اس صبرِ جمیل کی تعریف میں آسکتا ہے۔ شفیق صاحب کی جدائی میں پانچ سال ان کا کیا حال رہا ہے اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو ان کی حالت بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس طویل عرصے میں ذرا دیر کے لئے بھی تو وہ انھیں نہ بھلا سکیں۔ ان کی آنکھوں کی وہ چمک جو شفیق کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی۔ ہونٹوں کی وہ مسکراہٹ جو اُن کی دید سے دمک اُٹھتی تھی پھر کبھی دکھائی نہ دی۔ ان دو ہزار دنوں میں کوئی دن نہیں گزرا جب انھوں نے ان کی یاد پر آنسوؤں کی مالا نہ چڑھائی ہو۔ میں نے بہت سی بدنصیب بیوہ عورتوں کو دیکھا ہے جو اپنے شوہروں کو بہت چاہتی تھیں اور ان کے بعد سچ مچ ان کی زندگی ویران ہو جاتی ہے۔ لیکن زمانہ رفتہ رفتہ زخم کو مندمل کر ہی دیتا ہے اور کچھ نہیں تو وہ اپنے بچوں کی خاطر ہی اپنے کو سنبھال لیتی ہیں۔ لیکن صدیقہ کا غم کسی طرح بھی کم نہ ہو سکا، بچّوں کو دیکھ کر تو اُن کے باپ کی یاد میں اور بھی ان کے دل کی تڑپ بڑھ جاتی تھی۔ ایک ناسور تھا جو ہر وقت رستا رہتا تھا۔ اس پانچ سال میں سینکڑوں مرتبہ ہی میری ان کی ملاقات ہوئی لیکن ایک بار بھی تو یہ نہیں ہوا کہ کسی عنوان شفیق کا ذکر انھوں نے نہ کیا ہو۔ ہر بات ان کو شفیق کی یاد دلاتی تھی اور آنکھوں سے موتیوں کی برکھا ہونے لگتی تھی۔ مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کبھی گلہ شکوہ کا کلمہ منھ سے نہیں نکالا۔ ان کے صبر و ایمان میں فرق نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو بس یہ "میں بھی ان کے ساتھ ہی کیوں نہ مر گئی"۔ قسمت سے شکایت تھی تو بس اتنی کہ "میں ان کے بعد زندہ کیوں رہی؟" کسی طرح سے ان کا دل اس پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ شفیق کے بعد وہ زندہ رہیں۔

لیکن یہ سب دل کی کیفیت تھی۔ عمل کا یہ حال تھا کہ غم کا پہلا بلّہ گزرتے ہی صاحبِ عزم شوہر کی حوصلہ مند اور غیور بیوی نے کارزارِ حیات میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ٹھان لی اور شوہر کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا عزم کر لیا۔ انھوں نے ایک طرف اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تو دوسری طرف لوگوں کے لئے شفیق کا نعم البدل بن گئیں۔ ان کا ہر دوست، ہر ساتھی ہر عقیدت مند جو ان کی محبت، سرپرستی اور دوستی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دکھے دل کو جوڑنا صدیقہ کا فرض بن گیا۔ اپنے بچوں کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ ان کے نزدیک شفیق صاحب کے دوستوں کو ان کے بچّوں کا زیادہ خیال اور فکر تھی۔ یاں ان لوگوں کی فکر ہر وقت لگی رہتی تھی جو شفیق سے سچ مچ اپنے باپ کی طرح محبت کرتے اور مرشد کی طرح ان سے عقیدت رکھتے تھے، کہتی تھیں۔

"یہ بے چارے بھی تو یتیم اور بے سہارا ہو گئے، مجھے اپنے بچوں سے زیادہ اُن پر رونا آتا ہے۔" ان کی ہر مدد کے لئے صدیقہ کمربستہ رہتیں۔ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو جائے، صدیقہ اس کی حمایت کے لئے موجود، کوئی چھوٹ موٹ جا کر اپنی مصیبت یا دوسروں کی زیادتی کا رونا رو دے۔ صدیقہ سخت بے چین ہو جائیں گی۔ ہر قسم کی مدد دامے، درمے، قدمے، سخنے کرنے کو حاضر۔ یہی نہیں انھوں نے شفیق صاحب کے کاموں کو بھی سنبھالا۔ ادارۂ تعلیم و ترقی کے مختلف شعبوں کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ اور اس کے زیرِ نگرانی جتنے کام ہو رہے تھے۔ ان سب کی بہبود اور ترقّی کے لئے تن من سے کوشش میں لگ گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو بے پایاں محبت شفیق کو جامعہ سے تھی وہ صدیقہ کو سونپ گئے ہیں۔ مگر ان کی کارگزاریاں اور خدمتیں صرف جامعہ ہی کے لئے محدود نہ رہیں بلکہ پانچ سال کے اس عرصے میں جتنے کام سوشل سروس کے، سرکاری یا غیر سرکاری دلّی میں ہو رہے تھے۔ ان سب کی خدمت اور ترقّی کی کوشش وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کا کام کرسی پر بیٹھ کر حکم دینے والے اور صرف زبان اور قلم سے جنتا کی سیوا کرنے والوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ حقیقی خدمت اور ٹھوس کام خاموشی سے کرنے کی قائل تھیں۔ اس قسم کے ہر کام میں لوگ ان کو کھینچنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی شک نہیں ابتدا میں لوگ شفیق صاحب کی بیوی ہونے کی وجہ سے ان سے خصوصیت برتتے اور اس قسم کے عوامی خدمت کے کاموں میں ان کو شریک کرتے تھے، لیکن بعد میں خود ان کی اَن تھک محنت، خلوص اور لگن کی وجہ سے انھیں ان کاموں میں شریک ہونے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ہر وہ تحریک جس میں عوام کی اور خصوصاً عورتوں اور بچوں کی بھلائی کا کچھ کام ہو رہا ہو صدیقہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں ضرور نظر آئیں گی۔ کسی کی سیکرٹری ہیں، کسی کی صدر ہیں، کسی کی کنوینر ہیں کسی کی مُشیر اور سرپرست ہیں۔ لاکھ انکار کرتیں، اپنی خرابیٔ صحت کا عذر کرتیں اپنی "نااہلیت" اور "ناقابلیت" کا بہانہ پیش کرتیں مگر لوگوں کا اصرار اور اپنی

دلی لگن انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ مان لیں ۔ کام تھے کہ بڑھتے جا رہے تھے صحت تھی کہ گرتی جا رہی تھی مگر کسی بات کی پروا نہ تھی ۔ دلّی میونسپلٹی کی ممبری زبردستی گلے لگا دی گئی ۔ انکار کرتی رہیں ۔ اصرار بڑھتا گیا ۔ شفیق کے خاص دوست جن کو وہ اپنا بزرگ سمجھتی تھیں ، ہمیشہ ان کے مشیر رہے ۔ ان سے مشورہ کیا ، رائے دی گئی کہ منظور کر لیجئے ، مان گئیں ، اب وہاں کوئی قصہ جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے ۔ تو صدیقہ کو ایسی فکر جیسے ساری ذمہ داری انھیں پر ہے ، اُسے نپٹانے کے لئے ہر کوشش ہو رہی ہے ۔" ان کا یہی طریقہ تھا ۔ " کبھی کسی پارٹی بندی میں شریک نہیں ہوئیں یہ اُن کے مسلک کے خلاف ہے ۔" گویا ہر کام اس لئے کیا جاتا تھا کہ " وہ یہی پسند کرتے تھے ۔" جب راجیہ سبھا کے لئے پہلی بار وہ نامزد کی گئیں تو بہت گھبرائیں ۔" میں اس قابل کہاں ہوں ؟ " مشورے کے لئے شوہر کے دوستوں کے پاس دوڑیں ، رو رہی ہیں " میں کسی قابل نہیں ، کچھ نہیں ۔ یہ سب اُن کی وجہ سے لوگ مجھے اعزاز دیتے ہیں ۔ مجھ میں تو کوئی قابلیت نہیں ـــــ صلاحیت نہیں ـــــ " سمجھایا گیا ، اصرار کیا گیا ۔ مان گئیں ۔ مصروفیت اور بھی بڑھ گئی ، ہم لوگ سمجھتے یہ جتنی زیادہ مصروف رہیں گی ان کے لئے اچھا ہو گا ۔ غمِ مفارقت کو سہارنے کی سب سے بہتر تدبیر یہی تو ہے کہ کام میں اپنے کو فنا کر دیا جائے اور صدیقہ یہی کر رہی تھیں ۔ مگر غم کو بھلانے کے لئے نہیں تازہ رکھنے کے لئے ، ہر کام ، ہر خدمت ، ہر اعزاز اور ہر عہدہ کو قبول کرتے وقت یہی چیز ان کے پیشِ نظر رہتی تھی کہ اُن کا کام اور اُن کا نام زندہ رکھیں ۔ صحت خراب ہے ، دردِ سر کے دورے بڑھ رہے ہیں ۔ رنگت روز بروز سفید پڑتی جا رہی ہے مگر کوئی پروا نہیں ، تمام کام بدستور ہو رہے ہیں ۔ جامعہ کے کام ، تعلیم و ترقّی کے کام ، سوشل سروس کے کام ، محلہ ، پڑوس والوں کی خدمت ، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کسی کی سفارش کے لئے اپنے سے کم رُتبہ لوگوں تک کے پاس دوڑی جا رہی ہیں ان سے جھگڑ رہی ہیں ، اصرار کر رہی ہیں ۔" یہ میرا کام ہے ۔" ہر کام ، ہر ایک کا کام ان کا اپنا ہی کام ہوا کرتا تھا ۔ کوئی بیمار پڑ گیا تو اسپتال میں علاج کا انتظام کرا رہی ہیں ڈاکٹروں سے سفارش کر رہی ہیں ۔ کسی کے بچہ ہونے والا ہے تو لیڈی ڈاکٹر کو لے کر پہنچ گئیں لوگوں میں آپس میں کوئی اختلاف ہو جائے تو گھبرائی گھبرائی ایک ایک کے پاس پھر رہی ہیں کہ آپس میں صلح صفائی ہو جائے ۔" بدنامی نہ ہو غیر ہم پر نہ ہنسیں " کسی کے ہاں خوشی کی تقریب ہے تو دلِ شکستہ کو دبائے وہاں بھی موجود ۔ آنکھوں سے آنسو چھلکے پڑ رہے ہیں مگر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پیدا کر لی ہے ۔

کبھی چپکے سے کسی ہمدرد سے کہہ دیتی ہیں " وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے " اور سب کی آنکھ بچا کر کھدر کی موٹی سفید ساڑھی کے آنچل میں آنسو جذب کر لئے جاتے ہیں ۔ کوئی موت ہو جائے تو صدیقہ سب سے پہلے آنسو بہانے کو موجود نظر آئیں گی ۔ کسی کو کوئی عہدہ یا اعزاز ملے ، صدیقہ سے بڑھ کر خوش اور نازاں دوسرا نہ ملے گا ۔ کوئی اپنے سگے بھائی بہن اور اولاد کی ترقّی اور اعزاز سے اتنا خوش نہ ہوتا ہو گا جتنا وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لئے ہوتی تھیں یہ کیسے کہوں کہ لوگ ان سے حسد یا رشک نہ کرتے تھے ، یہ کہوں تو گویا اقرار کروں کہ دنیا میں تنگ نظر اور حاسد لوگوں کا کال پڑ گیا ہے ۔ بے شک ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی ہر دل عزیزی اور اعزاز سے جلتے تھے ۔ کہتے تھے خود ان میں کیا ہے ؟ کچھ نہیں ، یہ سب شفیق صاحب کی وجہ سے انھیں مل رہا ہے ، جلتے تھے کہ خود ان کو یہ منصب ، یہ عزت کیوں حاصل نہیں ۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے اور جو تھے بھی اُن کے ڈنک بھی صدیقہ کی شرافت اور خلوص کے سامنے گر جاتے تھے ۔

اور صدیقہ اپنی ہر دل عزیزی سے بے نیاز ، اپنی صلاحیتوں سے بے خبر ، اپنی اونچی پوزیشن سے بے پروا ، ان تھک بے غرض خدمت میں اپنے کو کھپائے شفیق کی یاد کو انمول دولت کی طرح سینے سے لگائے ، قوم کی خدمت کی راہ پر کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں ۔ بڑے بڑے پُرانے خادموں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ، بڑے بڑے ماہرِ فنِ سیاست دانوں کو مات دیتی ہوئی ، ان کی ہر دلعزیزی کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ابھی چند مہینے پہلے جب دلّی اسٹیٹ کی طرف سے راجیہ سبھا کی ممبری کے لئے ان کا انتخاب ہوا تو وہ متفقہ فیصلہ سے دلّی والوں کی نمائندہ چُنی گئیں اور کتنی مضحکہ خیز تھی ، ان کے حریف کی پوزیشن جس کو سُنا ہے کہ صرف ایک ووٹ ملا ۔ ہم ان کو " اربابِ حکومت " کہہ کر چھیڑتے تھے ، اور آہ کتنا چڑاتی اور شرماتی تھیں وہ اس وقت کتنا انکسار تھا ان میں ، لوگ ذرا سا موقع نام اور شہرت کا مل جاتا ہے تو کتنا اچھلتے ہیں ـــ ان کے قدم شہرت اور عزت خود آ کر چومتی تھی اور وہ اسے اپنے شوہر کی ہر دلعزیزی سے یا جامعہ سے منسوب کر دیتی تھیں ۔

اور صدیقہ یہ سب کرتی رہیں اور شمع کی طرح اندر ہی اندر گھلتی رہیں کاموں کی زیادتی کے ساتھ ساتھ دردِ سر کے دورے بڑھتے رہے ۔ مگر انھوں نے باوجود عزیزوں اور دوستوں کے اصرار کے جھگڑے لڑائی کے کبھی سنجیدگی سے اپنے علاج اور صحت

کے مسئلے کو نہ سوچا۔ بہت تکلیف ہوتی تو چار چار چھ چھ اسپرین کی گولیاں کھا کھا کر جیسے تیسے کسی جلسہ یا میٹنگ میں پہنچ جاتیں۔ پچھلے رمضان میں ملنے گئی۔ معلوم ہوا روزے سارے رکھتی رہیں یہاں تک کہ طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ دیکھا کہ جسم میں خون کی چھینٹ نظر نہیں آ رہی۔ بہت ہی کمزور ہو گئی ہیں۔ کتنی دیر میں ان سے ان کی صحت کے مسئلے پر جھگڑتی اور سمجھاتی رہی۔ مگر وہ کبھی میری اس قسم کی بات کو سنجیدگی سے نہیں سنتی تھیں۔ ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ سب کچھ یہ کہہ کر ٹھکرا دیتیں "میں بہت سخت جان ہوں بھابی — مروں گی نہیں — مجھ جیسے بدنصیبوں کو موت نہیں پوچھتی —" اس بار کچھ زیادہ ہی افسردہ تھیں۔ جوں جوں ۳۔ اپریل قریب آ رہی تھی ان کے دل اور دماغ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ "بھابی کتنی بار میری قسمت میں یہ منحوس تاریخ دیکھنی لکھی ہے —" اور میں کچھ جواب بھی تو نہ دے سکی۔ آہ — مجھے کیا خبر تھی کہ ان کے ہجر کی رات کٹ رہی ہے اور ہماری مفارقت کی شب قریب آ رہی ہے۔ میں تو ہمیشہ اپنے دل کو یہی سوچ کر تسلی دے لیتی تھی کہ عورت بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ بہت کچھ سہار لیتی ہے۔ اور صدیقہ بھی یہ سب جھیل لے جائیں گی۔ وہ زندہ رہیں گی اپنے کم سن بچوں کے سر پر ان کی محبت کا سایہ برقرار رہے گا۔ شفیق صاحب کے غم زدہ دوستوں کو ان کی دوستی کی نعمت حاصل رہے گی۔ ان کی خدمات سے دیس اور قوم کو فائدہ پہنچتا رہے گا — ان کی حسین و دل کش شخصیت اپنے حلقے میں چمکتی رہے گی اور میں — (اور میرے ساتھ کتنے اور) ان کی پُرخلوص محبت اور انمول دوستی کی دولت سے مالا مال رہیں گے — مگر آہ — ہر امید خاک میں مل گئی۔ صدیقہ کے لئے باغِ دنیا کی ساری نعمتیں، ساری خوشیاں، سارے اعزاز، ساری محبتیں خاک تھیں۔ محبوب کی ملاقات کی امید پر وہ ایک کیا ہزار زندگیاں نچھاور کر سکتی تھیں ؎

سوختن بر شمعِ کشتہ کارِ ہر پروانہ نیست
چوں زنِ ہندی کسے در عاشقی مردانہ نیست

زندگی کے علائق نہ پہلے ان کے پاؤں کی زنجیر بنے تھے نہ بسدھارتے وقت دامن گیر ہوئے۔ انھوں نے اپنے پیارے بچوں اور سب چاہنے والوں کو اس خدا کے سپرد کر دیا جو سب کا والی و وارث ہے — زندگی اور اس کے بندھنوں پر ایک بے نیازی کی نگاہ ڈالی اور مسکرا کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی — جیسی سبک بار آئی تھیں ویسی ہی سبک دوش واپس گئیں۔ اپنے خالق کی بارگاہ میں — اپنے محبوب کے پہلو میں ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تم چلی گئیں صدیقہ — آہ کتنی جلد چلی گئیں — مگر اپنی حسین و دل کش زندگی کی یاد ہمیشہ کے لئے ہزاروں دلوں میں ثبت کر گئیں — تم نے سب کو بھلا دیا صدیقہ — مگر بتاؤ — تمھیں کون بھلا سکے گا — تمھارے یتیم بچے، جن کی زندگی کا ہر لمحہ تمھاری اور اپنے بے مثال باپ کی یاد میں بسر ہوگا — تمھاری قوم اور تمھارا دیس؟ جس کو تمھاری سی خدمت اور خلوص والی ہستی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے — جس کے افق پر تم ایک شہابِ ثاقب کی طرح اُبھریں، چمکیں، اپنی روشنی سے دم بھر کے لئے تاریک گوشوں کو منور کیا اور پھر ہمیشہ کے لئے فضا میں غائب ہو گئیں — تمھاری جامعہ؟ جس کو تم جیسا عاشق زار خادم اب کبھی نہ ملے گا۔ تمھارے عزیز؟ جن کے لئے تم محبت کا سرچشمہ اور فخر و ناز کا سبب تھیں۔ اور تمھارے دوست جن کو ایسا مخلص اور سچا دوست اب نہیں ملے گا کبھی — اور تمھاری حرماں نصیب بہن صالحہ — آہ وہ کیسے تمھیں بھولے گی صدیقہ ؎

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
یادِ تم یارِ غم گسار ہے آج

اور تمھیں بھلانے کا سوال ہی کیا ہے؟ بھولتے وہ ہیں جو مر جاتے ہیں۔ تم مری ہی کب ہو؟ تمھاری ہنسی کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ تمھاری موہنی صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ دل اب بھی تمھاری پُرمحبت اور ہمدرد باتوں کے مزے لے رہا ہے۔ تصور اب بھی تمھیں زندگی کے ہر شعبے میں ان تھک محنت اور بے پایاں لگن کے ساتھ سرگرمِ کار دیکھ رہا ہے۔ تخیل میں اب بھی تم مجسم حُسن و خوبی کی مورت، سامنے موجود ہو۔ تم زندہ ہو — زندہ رہو گی — آنکھوں میں آنسو بن کر —— دل میں کسک بن کر —— دماغ میں روشنی کی کرن بن کر ؎

تمھیں کہتا ہے مُردہ کون، تم زندوں کی زندہ ہو
تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

ہمارے لکھنے والے



ساغر نظامی



جی، ایل ادیب لکھنوی

پہل گام





پہلگام کا ایک نظارہ

دریائے لدر



کے چند مناظر



کولائی گلیشیر

چندن واڑی کا راستہ

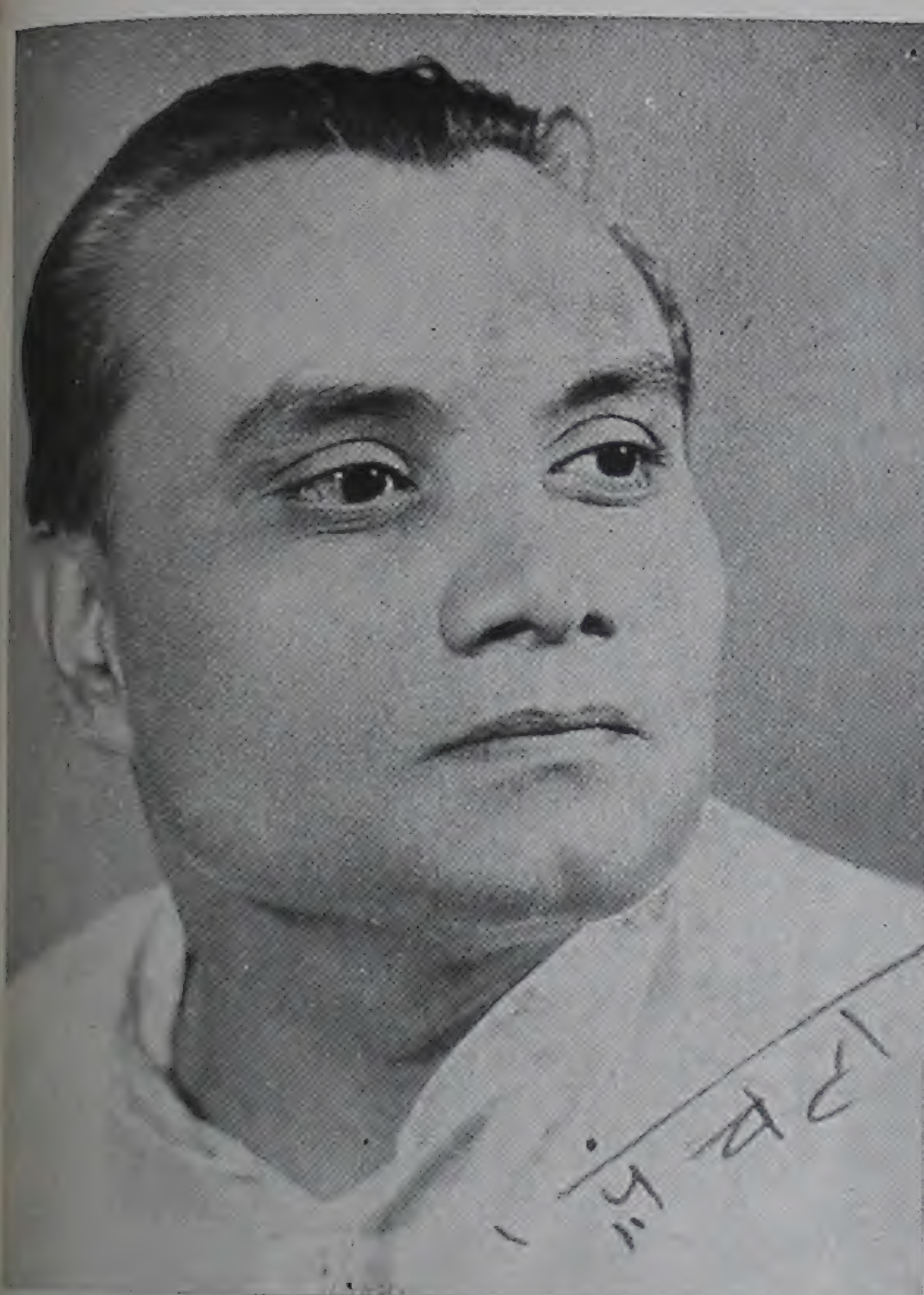


چندن واڑی





مرحومہ بیگم صدیقہ قدوائی
آپ کے بارے میں
بیگم صالحہ عابد حسین کا مضمون
اس شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔



ہندی کے نوجوان شاعر 'انچل'
آپ کی شاعری پر
جی، ایل ادیب لکھنوی کا مقالہ
اس شمارے میں شامل ہے۔

ادیب

انچل

ہندی کے عظیم الفکر ممتاز شاعر — انچل — کی شخصیت پر غالب کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پہلی نظر میں آپ انچل کو دیکھ کر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ایک تنومند فربہ جسم پر موٹی اور کچی گردن لئے ہوئے "غیر شاعرانہ" اور کچھ بھدّی شکل و شباہت کا مالک ایک ایسا انسان ہے جس کے سینے میں حساس دِل اور بیدار روح ہے۔ جس کا دماغ دانا اور توانا ہے۔ جس کے ضمیر و خمیر میں شاعری کے لطیف احساسات اور جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہیں۔ جن میں حُسن ہے، توازن ہے، لطافت ہے، اور خلوص ہے — اور جن کے مجموعہ کا دوسرا نام ہندی شعر و ادب نے "انچل" رکھ لیا ہے۔ ہندی کا یہ بلند پایہ شاعر اُردو ادب کی دُنیا میں اس لئے متعارف ہونا چاہیئے کہ اس نے بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اُردو شاعری کے تخیّل کی لطافت اور ہندی جذبات کے خلوص کا ایک حسین امتزاج پیش کیا ہے — 'ہندی بول' کے امرت رس میں اُس نے اُردو شاعری کی شگفتگی کو حل کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ اُس کے قلم نے اُردو شعر و سخن کے عروض کی تنگنائے سے ہندی بھاشا کے لوچ کو سبک اور رواں انداز میں گذارا ہے

چونکہ قومی یک جہتی کے لئے لسانی یک جہتی ضروری ہے۔ اس لئے ہندی شعر و ادب اور مطالعہ کی خدمت کو اُردو شعر و ادب کی خدمت اور مطالعہ تصوّر کرنا چاہیئے۔

ہندی ادب کی دُنیا میں اس مایۂ ناز شاعر اور سلیم الفکر ادیب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

رامیشور شکل انچل، کشن پور (ضلع فتح پور، ہسوہ یو۔پی) میں یکم مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اُس میں ادب کا ذوق اور شعر و سخن کا چرچا تھا۔

انچل نے ابتدائی تعلیم کشن پور میں حاصل کی۔ اور لکھنؤ سے ایم۔اے (انگریزی ادب) کا پہلا سال ختم کیا تھا کہ مالی پریشانیوں کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ مختلف محکموں کے دروازے کھٹکھٹائے اور چھ سات سال تک کئی حیثیتوں سے ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ناگ پور یونی ورسٹی سے ہندی میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۴۵ء میں رابرٹسن کالج جبل پور میں ہندی کے لکچرار مقرر ہوئے اور آج کل محکمۂ لسانیات میں ہندی کے ریڈر ہیں۔

جو ادبی ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا وہ لکھنؤ کی فضا اور ذاتی ذوق و شوق کے سایہ میں پرورش پا کر نظم و نثر کے حسب ذیل مجموعوں کی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

۱- تارے	۱۹۳۸ء	۲- مدھولیکا	۱۹۳۸ء
۳- اپراجتا	۱۹۳۹ء	۴- کرن بیلا	۱۹۴۱ء
۵- کرئیل	۱۹۴۲ء	۶- لال چنر	۱۹۴۴ء
۷- سماج اور ساہتیہ	۱۹۴۴ء	۸- چڑھتی دھوپ	۱۹۴۵ء
۹- نئی عمارت	۱۹۴۶ء	۱۰- اُلکا (شہابِ ثاقب)	۱۹۴۶ء

ل رابرٹسن کالج جبل پور میں پروفیسر انچل کو دیکھ کر جو تاثرات راقم السطور کے ذہن پر مرتسم ہوئے اُن کو بے کم و کاست بیان کرنے کی جراءت کی ہے۔ شاعر اور ناظرین کرام - دونوں سے اس بے باکانہ اظہارِ خیال کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ (ادیب)

۱۱- مراؤ دیپ (چراغِ صحرا) ۱۹۵۲ء ۱۲- ورشانت کے بادل ۱۹۵۵ء

اِن کے علاوہ کئی درسی تالیفات کے مالک ہیں۔

تارے ایک مقبول افسانہ ہے۔ شاعرانہ اور لطیف زبان میں سماجی حالت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

مدھو لیکا اور اپراجتا میں رومانی نظمیں ہیں۔ مگر کریل اور کرن بیلا، میں آپ کو ترقی پسند عناصر بھی ملیں گے۔ کریل کی بعض نظموں (سنہاکس نے یوں للکارا۔ چل چتر، انتر جوالا، کوی کا سوپن، کرانت کی پکار، کسان وغیرہ) میں جذبات کا گہرا مطالعہ پایا جاتا ہے۔ مگر انداز بیان اور الفاظ کی غرابت کی وجہ سے اکثر نظمیں پامال طبقہ کی موافقت میں ہمدردی کے جذبات اُبھارنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔

افلاس و عُسرت وہ موضوع نہیں جو محبت کے فرشتہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں۔ اس لئے "ترقی پسندی" سے شاعر پھر محبت کی خوبصورت دنیا میں آجاتا ہے۔

"کریل" میں ظلم و تشدد، غلامی اور سرمایہ داری کے خلاف غریب پامال طبقہ کی ہمدردی میں جو آواز بلند ہوئی تھی۔ تیشے۔ وہ لال چنر کی شفق زادیوں میں گارہی ہے —— جاگ سوزِ عشق جاگ!

لال چنر میں انچل اپنے جذبات کے اظہار کی نفاست اور لطافت میں کامل طور سے جلوہ گر ہے۔ نظموں کی زبان آسان ہے۔ ان میں حیرت خیز تازگی اور اثر ہے۔

"سماج اور ساہتیہ" گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اُن میں جدید ہندی ادب پر متوازن انداز میں سائنٹفک طریقہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ سماج اور ادب کے آئینہ میں نظر آنے والے سماج کے خدوخال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

پریم چند، جینندر، اگیہ اور جوشی وغیرہ ادیبوں پر "درشت مگر درست" انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر تکرار ہے۔ مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے مگر تکرار اور مبالغہ سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

"چڑھتی دھوپ" میں سماج اور سیاست کی کشمکش ہے۔ نئی عمارت کی بُنیاد ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی کے مواد پر رکھی گئی ہے۔

اُلکا۔ اَن میل بیاہ کے عنوان پر معاشرتی حالات کا آئینہ دار ہے۔

مراؤ دیپ۔ میں ہندوستانی بیوہ کے حالات کی مصوّری کی گئی ہے۔ پورا فسانہ۔ شانتی۔ (بیوہ) کے گرد گھومتا ہے۔ جو اپنی روایاتی جذباتی کشمکش کی بے پناہ ہیبوں کو لئے ہوئے ہے۔

"عروجِ افسانہ" میں جذبات کی کشمکش کی انتہا ہے۔ جو انسانی خدمت کے بہترین جذبہ پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

"ورشانت کے بادل" - انچل کی پچاس اور چار تازہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم اپیل اور حظ بخشی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔

اظہارِ جذبات کی برجستگی اور الفاظ کی مرصّع کاری کا کمال، تمنا اور شاعر گیت کیسے دیپ جلے گا۔ کالی داس۔ تم میٹھا گاتی ہو، وغیرہ نظموں میں دیکھئے۔ ان میں آپ کو شاعرانہ تخیل کی بلندی اور تازگی ملے گی۔ اِن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں گرانی اور ثقل نہیں۔

آیئے! انچل کی ذہنی تخلیقات کے اس سرسری جائزہ کے بعد ہم اس کی شاعری پر اچٹتی سی نظر ڈالیں۔

انچل کے ابتدائی کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے گیت گیت نہیں وقت کی پُکار ہیں۔ اُن میں تلخ چیخیں ہیں۔ دُکھ بھری اور سسکتی آوازیں ہیں۔ مگر چوں کہ "رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں نہیں ہے۔" اس لئے اثر کے لحاظ سے وہ بے حد کمزور ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طالب علموں کے سامنے کوئی استاد لکچر دے رہا ہے۔

معاشی مشکلات، افلاس، ناداری اور سرمایہ داری کی دُنیا میں وہ ایک انقلاب چاہتا ہے۔ اور اس انقلاب کو وہ عمل کے ذریعہ لانا چاہتا ہے۔

مانگنے اور رونے سے نہ ملتا انقلاب
تو سوہم[1] بڑھ کر اُلٹ دے موت کے منہ سے نقاب
چوٹ ڈنکے پر پڑی
اٹھ!
مور چہ پہچان لے!

جس انداز میں "جراَتِ انقلاب" کو دعوت دی ہے۔ اس میں وہ بے باکی اور جراَت نہیں جو انقلاب لاتا ہے۔

زمین دار کا ظلم ہمارے ادب میں نئی چیز نہیں ہے۔ رومان کی بولن گاہ 'پنگھٹ' پر وہ اس کے ظلم کی تصویر یوں کھینچتا ہے۔

---

[1] خود

زمین دار کے ظلم سے تنگ آکر ایک کسان اپنی زمین سے بے دخل ہو کر گھر کی سہانی فضا اور معصوم بچوں کی مسکراہٹ کے سکون بخش ماحول سے دور تلاشِ معاش میں پردیس چلا گیا ہے۔ اس کی بیوی پنگھٹ پر اس کی راہ تک رہی ہے۔

دل میں کس کا دیپ جلائے - مَون[1] کھڑی ہے پنگھٹ پر
سانجھ ہوئی۔ پنتھ[2] دیکھ رہی ہے کس کا - بھرے درگون[3] کی گگری
کہیں پیٹ کی آگ بجھانے گئے پیا - تیج[4] اس کی نگری
بیتے کتنے ورش اسے - یوں پنتھ میں اپنی رَین[5] بچھائے
اور کھلی آنکھوں میں اس کی اب تو کوئی سوپن نہ آئے
اس کی بھی آئی تھی - آموں[6] سی پوراتی کبھی جوانی
کتنی گئی چپ چاپ - زمینداروں کے ڈر کی چھوڑ کہانی
ان ظالموں کی یاد نہ پوچھو - جل اٹھتا پرتی رَوم[7] سہر کر
دیے کنٹھ سے روتی بچھوا - بینی رجنی[8] پہر پہر . .
دل میں کس کا دیپ جلائے . . . .

عیش و عشرت کی پناہ گاہ ' حویلی ' کے قریب سے گذرتے ہوئے مزدوروں کی حالت کو جب وہ بیان کرتا ہے۔ تو غربت کے وقار اور سرمایہ داری کے شکوہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔

روز صبح اس پنتھ سے جاتیں مل کے مزدوروں کی پاتیں
دسے ادھ جلے[9] یوک - ادھر پکے[10] پالکوں کی خاموش جماعتیں
پر مرکر تی - بھوک کی سوکھی - بھیڑ سی - ادھ ننگی ناری
رہتے ہی کچھ سے - ملون کی جو کرنے لگی تیاری
جھول رہی ہے - پھانسی کے تختے پر شو[11] سی جن کی مسکانیں
اندھی ماتو تا جن کی بھاگ سمجھ جو ظلم نہ جانے
آنکھیں پھاڑ تہار[12] رہے ہو - جیسے جگ جگ سجی تو یلی
ادھر راج[13] پتھ سے کچھ ہٹ کر شون نت سے تر حویلی

[1] خاموش [2] راہ [3] آنکھوں [4] چھوڑ کے
[5] رات [6] آموں کی مانند گدرائی ہوئی [7] رواں
[8] رات [9] نیم سوختہ جوان [10] تو خیز لڑکے [11] لاش
[12] مسکراہٹ [13] انسانیت [14] دیکھنا [15] شاہراہ۔

نظم "بڑھتے آتے" میں وہ لکھتا ہے کہ مزدوروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور اب مذہب کے نام پر زیادہ دنوں تک اس طبقہ کو فریب نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے دھارے میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا۔

یہ کون کھڑا ہے ؟ سناٹے میں ہند و ہت کی آواز لئے
یہ کون کھڑا ہے ؟ دھرم لئے۔ ننگے پن کی لاج لئے
مذہب مذہب چلا کر روکے گا کون ؟ پرانن[1] شو
کس کی باہوں میں طاقت روک سکے جو طوفانی وپلو[2]

شاعر ایک خواب دیکھتا ہے جس میں موجودہ سماجی نظام سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ ظلم و تشدد اور موت کے اندھیارے پر عیش و عشرت اور زندگی کی روشنی غالب آ رہی ہے

کوی کے اس "سوپن" کی ابتدائی پنکتیاں[3] ملاحظہ کیجئے۔

بھوک میں پڑا اُپری[4] وار
بند کئے گھر کا لڑکھڑاتا دوار[5]

سوچتا ہے کوئی یہی
ہوگی جیون کی - جاگرت[6] کی وجے[7]
اس مرتیو[8] پہ

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کرن سیلا کا انقلابی شاعر لالی چنرک کے آنچل میں پھر حسن و محبت کے نغمے گاتا ہے۔ زلف و رخسار کی باتیں کرتا ہے کہتا ہے ؎

چاندنی میں آج کیول چاند کی باتیں کرو

تصور کو زحمت دیجئے کہ اس منظر کو نگاہوں کے سامنے پیش کرے جب "پریم کی مدھو جھیل کی تٹ" پر دو چاہنے والے ایک جا ہوں - اور جب عاشق کی فراق زدہ زندگی کی تلخیاں قربتِ محبوب کے سکون میں گم ہو رہی ہوں - !

اور کتنی حسین ہے ان پیار بھری آنکھوں کی درخواست جو دیدِ یار کی تمنائیں واہیں -

' ٹھہر جاؤ گھڑی بھر اور تم کو دیکھ لیں آنکھیں

[1] پرانی لاش [2] انقلاب [3] سطریں [4] خاندان میت
[5] دروازہ [6] بیداری [7] فتح ، [8] موت

تمہارے روپ کا ست آورن[1] کتنا مجھے شیتل[2]
تمہاری چتونوں کی چھاؤں میری آتما اُجول[3]
الجھنیں پھوٹ پھوٹ آتیں۔ پران پنچھی کی تری آنکھیں
ٹھہر جاؤ! گھڑی بھر اور تم کو دیکھ لیں آنکھیں

یہ روشن اندھیرے[4] بار بار نہیں آتے۔ اس لئے وہ معشوق سے درخواست کرتا ہے کہ

"ٹھہر جاؤ! گھڑی بھر!!!"

تاکہ اس کی روح اس کے حسین روپ سے سرشار اور شیریں آواز سے مست اور "بے پناہ" مژگان کی چھاؤں میں قرار یاب ہو سکے۔ کتنی حسین تمنّا ہے۔!

انچل کے کلام میں محاکات کی دل کشی بھی ہے۔ جب وہ منظر کشی کرتا ہے تو واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔

ذیل کے بند میں معشوق سے مخاطب ہے۔ کہ جب مشرقی اُفق سے نور کی بارش ہو رہی ہو اور تیری مست گلابی آنکھیں کسی حسین خواب کی تمنا میں نرگس کی مانند بار بار کھل رہی ہوں۔ بند ہو رہی ہوں۔ اور جب تیرا نازک جسم چمپئی رنگ کی ساری میں "فردوسِ نظر" ہو تو اُس وقت تجھے اس ستم نصیب کی یاد آتی ہے؟

پَو پھٹے اُسکمار[5] لبوں پر شبنم سویدھ[6] کن۔ ایک تمہارا
دور دھڑکتا۔ نبھ میں جیسے پرات دی پی[7] کا تارا
جب رنگین مدھر سپنوں کی سدھ میں چنچل مست انکھڑیاں
کھُل کھُل بند ہوئی جاتی ہوں جیسے نرگس کی پنکھڑیاں
اور شتھل[8] بیٹھی ہو گی پہنے چمپئی رنگ کی ساری
جب اشوک کی ٹہنیوں سے نازک یہ انگ کماری[9]

---

[1] نقاب [2] ٹھنڈا [3] روشن
[4] کہاں پھر یہ قسمت میں روشن اندھیرے
ادھر آؤ اک بار پھر پیار کر لیں
[5] نرم [6] پو پھٹنے پر پسینہ میں ڈوبا ہوا۔
[7] صبح کا چراغ [8] ڈھیلے
[9] نازک بدن۔

دیکھ رہے سپنوں کا درپن[1]۔ پاگل کی منہ بند کلی
تب اپنے ہمدم کو کیا تم پل بھر کو بھی یاد کرو گے

اس بند میں دیکھئے۔ عاشق کے جذبات شاعر کی زبانی کن کن شکلوں کو اختیار کرنے کے لئے بے تاب ہیں ؎

میرا بس چلتا۔ میں بن جاتا
جب تم سہج[2] لجاتیں[3]۔ بنتا میں گالوں کی لالی
شرم[4] سے تن میں۔ بنتا میں پلکوں کی گھنجالی
میں نہ چھلکنے دیتا۔ مسکانوں کی گوری پیالی
میرا بس چلتا۔ میں بن جاتا
ان بیدھے[5] موتی کی بجلی تابش[6] بھر بھر دیتا
کھس کھس پڑتے منتقل پتیر کو مسک پر کر دیتا
میں گت چنچل۔ منجیروں اُدھکنے بجنے دیتا
میرا بس چلتا......

محبت کی دنیا کے اس راز کی کہ
"کب کیسے من جاتا ہے؟ آنکھوں سے ملنے سے پہلے"
کب کیسے.........
جو آج لگتا بہت باہر وہ پرانوں[7] تک چھا جاتا ہے
جو دکھتا آج بہت اوپر وہ تن من کو نہلاتا ہے
سہما جیون کی[8] رتیو[9] بدلی۔ رس کر نرد ھنتا شرمائی
بھر مائے پنتھی کی سندھیا[10] پھر سپنوں کے من میں آئی
....
"کب گندھ پون سے آتا ہے۔ کلیکا کے کھلنے کے پہلے"
وہ چاند بہت بڑا اُگا۔ جگ گیا گگن[11] کا اندھیارا
ہے جگ جگ تاروں کی گھاٹی شیلون پہ چھایا اُجیارا
پر من کی ریت نرالی ہے۔ آکاش انوکھا جیون کا

---

[1] آئینہ [2] ذرا [3] شرماتیں [4] گہرا سفنۃ
[5] تاب [6] روح [7] "دفعتاً" [8] ریت
[9] مفلس [10] شام [11] آسمان۔

بن دیکھے - بن جانے بھی - سب سنتاپ بجھا جاتا تن کا

ورنانت کے بادل کے بھی کچھ حصّے ملاحظہ کیجئے:-

فطرت کے تمام مظاہر موسمِ گرما کی شدّت سے تنگ آکر آسمان کی سمت نظریں جمائے ہوئے بادلوں سے سکون بخش رِم جھم کے منتظر ہیں۔

ہے یہ کیسی بان تمھاری ترساتے جگ کو

پُروا کی تھپکی دے دے کر برماتے جگ کو

من کی بوندوں سے کب تک جیون کو ترپتی ملے

کب تک جلتی بالو پر یون کا پھول کھلے

تم برسو جلتی دھرتی کا تن شیتل ہو جائے

تم برسو اُتری نمدکان کا من مصری گھولے

او نبھ میں منڈلاتے بادل

شاعر کی اس تمنّا کو بھی دیکھئے۔

دُنیا بدلے - تم نہ بدلنا - تم ایسے ہی رہنا

نوٹر کا لیما بیچھے مجھے تم گت کی راہ دکھانا

اندھیاری جیون رجنی میں تم دیپک بن جانا

تھکے اُچٹے ٹوٹے من میں سپنے نئے سجانا

دے دینا وشواش کو ٹوٹے سپنوں کا ہر جانا

دُنیا بھولے - تم نہ بھلانا - سب دن اپنا کہنا

مختصر یہ کہ اس فطری شاعری کے کلام کے مطالعہ سے ہم یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اُس کی نظموں کے تصوّرات دائمی قدر کے مالک ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہندی شعر و سخن کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرے گا۔

---

[1] تسلّی [2] ٹھنڈی [3] تاریکی [4] رات

صابر اکبرآبادی

غزل

دنیا ہے ایک خواب پریشاں ترے بغیر
ہیں مرگ و زیست دست و گریباں ترے بغیر

کیا یہ بھی زندگی ہے نہ خوش ہوں نہ غمزدہ
گریاں ترے بغیر نہ خنداں ترے بغیر

پھیکی سی وہ بہار کے چہرے پہ تازگی
اڑتا ہوا سا رنگِ گلستاں ترے بغیر

کتنی طویل ہو گئی دو دن کی زندگی
زنجیر بن گئی ہے رگِ جاں ترے بغیر

طوفانِ رنگ و بو ہو گلستاں کو کیا کریں
کس کو ہے اعتبارِ بہاراں ترے بغیر

شمس و قمر کے چہروں سے نور اڑ گیا تمام
دونوں ہیں داغِ دامنِ امکاں ترے بغیر

آنکھیں سیاہ پوش نگاہیں اُداس اُداس
کانٹوں کا ڈھیر ہے چمنستاں ترے بغیر

جیسے خزاں نے لوٹ لیا ہو کوئی چمن
یوں ساری کائنات ہے ویراں ترے بغیر

نظریں لگی ہیں میری طرف کائنات کی
سود و رو و غم ہیں سلسلہ جنباں ترے بغیر

عنوانِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
کیا بڑھ چلی ہے تلخئ دوراں ترے بغیر

صابر نے کرکے کوششِ بے سود دیکھ لی
دل مانتا نہیں کسی عنواں ترے بغیر

غلام ربّانی تاباں

غزل

ترے قریب ترے آستاں سے دور رہے
وہیں خیال رہا ہم جہاں سے دور رہے

کسے یہ فکر کہ انجامِ عشق کیا ہوگا
کسے یہ ہوش کہ راہِ زیاں سے دور رہے

قریب آئے تو خود جانِ اعتبار بھی تھے
وہی جو مدتوں وہم و گماں سے دور رہے

وہ حرفِ شوق جو تمہیدِ آرزو ٹھہرے
خدا کرے کہ میری داستاں سے دور رہے

یہ میکدہ ہے یہاں مہر و ماہ پلتے ہیں
کہو کہ خیمۂ ظلمت یہاں سے دور رہے

وہ ہمسفر بھی نہایت عزیز تھے تاباں
چلے جو ساتھ مگر کارواں سے دور رہے

عمیق حنفی

گیت

غزل شاعری کے علاوہ موسیقی کی صنف بھی قرار دی جاتی ہے۔ زیرِ نظر غزل میں جوگیا کی کیفیات اور تغزل میں خالص ہندستانی فضا پیدا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ ہندی شاعری میں گیت دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) خالص ادبی اور (۲) غنائیہ یعنی جنھیں گایا جا سکے۔ اگر غزل کی ایسی ہی دو قسمیں کر دی جائیں تو زیرِ نظر غزل قسم دوم میں شمار ہوگی۔ (عمیق حنفی)

یاد آتے ہو تو من میں ہوک اُٹھتی ہے پیا
جیسے سارنگی پہ کوئی چھیڑتا ہو جوگیا

اپنے آنگن میں کوئی سُکھ ہے نہ جنگل میں سکوں
اے گھنی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں تو نے کیا کیا

پھول رُت میں اچھے اچھوں کے گریباں چاک ہیں
پھول کا دامن سیا بھی تو کسی نے کیا سیا

بیل منڈھے سے لپٹ جاتی ہے جس انداز سے
یوں کسی کی یاد نے دل کو مرے لپٹا لیا

رات بھر گہری نراشا کے تھپیڑے جھیل کر
بجھ گیا آخر سویرے آس کا ننھا دیا

چھیڑ دے کوئی کہانی، گیت کا چُپ توڑ دے
ٹکڑے ٹکڑے ہو نہ جائے درد سے بوجھل جیا

سرلا دیوی

خودکُشی

رات بھر بڑی گرمی رہی تھی۔ آسمان میں چاروں طرف دھول چڑھی ہوئی تھی لیکن ہوا کا ایک جھونکا بھی کہیں سے نہیں آ رہا تھا۔ کانتا کی طبیعت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ رات بھر وہ ایک جھپکی بھی نہیں لے پائی تھی۔ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھ جاتی کبھی پھر لیٹ جاتی۔ کبھی اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتی۔ ایک آدھ بار اُس نے کمرے میں جاکر پنکھے کے نیچے سو جانے کی کوشش کی پر وہ ہوا اُس گھٹن سے بھی بُری لگی اور کانتا پھر باہر نکل آئی۔ صراحی میں سے پانی لے کر پیا۔ کچھ ٹھنڈا تھا، جان میں جان آئی۔ دو تین گلاس اور لئے اور اپنے پیروں پر ڈالے۔ بچّوں کو دیکھا سب آرام سے سو رہے تھے۔ شوہر کی طرف دیکھا تو وہ بھی آرام سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ کانتا پھر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پر نیند تو شاید یہ لگا کر کہیں اڑ گئی تھی۔ لیٹی لیٹی وہ آکاش کی طرف تکنے لگی۔ دھول نے چاند کے خوبصورت چہرے کو مٹیالا اور کچھ اگہرا سا کر دیا تھا۔ تارے تو دکھائی نہیں پڑتے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ کوئی نظر بھی آجاتا تھا۔ کانتا کے فکرمند چہرے سے یہ صاف جھلکتا تھا۔ کہ اُسے کوئی ایسی پریشانی ہے جس کو دُور کرنے کا علاج اُس کے پاس نہیں ہے۔ لیٹے لیٹے گردن پھیر کر اُس نے پھر دیکھا ابھی اُس کا شوہر بے فکر چین سے سو رہا تھا۔ اتنے میں چھوٹا بچہ اٹھا اور اُس نے پانی مانگا۔ کانتا پھر اُٹھی اور بچے کو پانی پلاکر سُلا دیا۔ کانتا سوچ رہی تھی کہ گرمی کی وجہ سے صرف اُسی کو نیند کیوں نہیں آتی۔ یہ سب کیا ہے؟ میرے لئے ہی دُنیا سے سارا چین، سکون کیوں اڑ گیا ہے؟ یہ میرا شوہر ہے، ہمیشہ کا مہمان، میں کچھ بھی کروں اِسے اُس سے سروکار نہیں۔ ایسے ناشتے میں اگر یہ چاہئے تو کھانے میں وہ۔ اس نے میرے ساتھ بیاہ کیا تھا۔ میری دیکھ ریکھ کا بھار اپنے اوپر لیا تھا۔ میری بانہ پکڑ کر ساری عمر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی پر یہاں تو سب اُلٹ کر میرے ہی کندھوں پر آ پڑا ہے۔ اِسی میں بس ہو جائے تو بھی غنیمت ہے۔ ہر بات میں دخل اندازی اور قدم قدم پر رکاوٹ ڈالی جاتی ہے میں جسے بیٹھنے کا کمرہ بنا دوں، میلے کپڑے وہیں پر ڈالے جاتے ہیں۔ ریڈیو سونے والے کمرے میں رکھنا چاہوں تو وہ ضرور باہر کے کمرے میں آئے گا۔ اِدھر میری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دن پر دن میرا مزاج چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کیا ہوگا یہ گھر کیسے چلے گا۔ ان بچوں کا کیا بنے گا۔ یہ سب سوچتے سوچتے کانتا کی پلکیں بھاری ہو گئیں اور وہ سو گئی۔

کانتا کسی دفتر میں کام کرتی تھی۔ تھوڑی تنخواہ اور گھر کا سارا خرچ۔ اُس پر آئے دن مہمانوں کا جمگھٹ، آنے والے کہتے کہ ہماری خاطر نہیں ہوتی۔ انہیں کون سے پلاؤ پکا پکا کر کوئی دیتا ہے اور اُدھر سادی روٹی اور چائے پانی میں ہی کانتا کا ناک میں دم آچکا تھا۔ اُس کا شوہر مہینے میں دس دن کے لئے باہر جاتا تھا اور بیس دن گھر آکر بات بات میں خواہ مخواہ کی بحث کرتا۔ کانتا کے شام کو گھر پہنچنے تک روز کوئی نہ کوئی لڑائی کا نیا سلسلہ تیار رہتا اور وہ بے چاری تھکی ماندی برداشت نہ کر سکنے پر تلملا اٹھتی۔ یہ روز کی جھک جھک ہر بات کی ذمہ داری اور فکر اُس کی صحت کو خراب کئے جا رہی تھی۔ کانتا صبح اُٹھتی، گھر کا کام ختم کر کے دفتر چلی جاتی۔ اور شام کو آکر پھر چولھا جھونکتی بڑی لڑکی بیرا اُس کی کافی مدد کرتی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کانتا سوئی ہوگی کہ شوہر صاحب کی آنکھ کُھلی اور اُٹھتے ہی انھوں نے پکارا:۔

"کانتا او کانتا!"

کانتا سوتی رہی۔ اُس نے سُنا یا نہیں سُنا۔ یہ تو وہی جانے پر اُس نے جواب کچھ نہیں دیا۔

"سُنتی ہو میں کہہ رہا ہوں۔ دوپہر ہونے کو آئی ابھی تک رانی صاحبہ نیند ہی کے

مرے لوٹ رہی ہیں۔ آج کیا فاقہ کرنا ہوگا ؟ "

" کیا شور مچا رکھا ہے۔ صبح ہی صبح۔ دن تو ابھی نکلا نہیں۔ دوپہر کہاں سے ہوگئی مجھے نیند آرہی ہے۔ تنگ مت کرو۔ "

" مجھے جلدی جانا ہے آج، جلدی سے آلو کے پراٹھے بنا دو۔"

" کہاں جانا ہے تمھیں ؟ روز ہی کہہ دیتے ہو اور ناشتہ کر کے پھر پڑے رہتے ہو۔ "

" کہیں بھی جانا ہو تمھیں اس سے کیا ؟ "

" مجھے نہیں تو اور پڑوسیوں کو غرض ہوگی ؟ خود تو ساری رات سوتے رہے میری ابھی ابھی آنکھ لگی تو دیکھ کر اتنا نہیں برداشت کر سکے کہ میں بھی دو لمحے آرام کر لوں۔ میری نیند کے تو تم شروع ہی سے دشمن ہو۔"

" ارے صبح جاگنا صحت کے لئے بڑا اچھا ہوتا ہے بس تو تمھارے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔"

" میں اپنے بھلے اور بُرے کی ذمہ دار خود ہوں تم رہنے دیا کرو مجھے اور میری صحت کو ہر وقت تنگ کرتے رہتے ہو اور چلے ہو اپنی باتوں سے ہمدردی دکھانے۔"

" تم مجھ سے تنگ آگئی ہو تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ؟ تمھیں میری ہمدردی کی ضرورت ہی کہاں ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں سے باتیں کر کے تم خوش ہوتی ہو۔ انھیں سے ملنا جلنا چاہتی ہو۔ اُن کے سامنے جا کر میری بدنامی کرتی رہتی ہو۔"

" جیسے کوئی کام نہیں ہوتا تمھاری بدنامی کرنے کے سوائے وہاں۔ خیر چھوڑو سونے دو مجھے۔ اب تو کل سے نوکر بھی مل گیا ہے۔ اُس کو کہہ دو بنا دے گا تمھیں جو کچھ کھانا ہو۔"

کانتا پھر کروٹ لے کر پڑی رہی۔ پتی دیو اُٹھے اور نیرا کو جگانے لگے۔

" اٹھو بیٹا، تم تو بڑی اچھی رانی بٹیا ہو، چلو جا کر ذرا آلو اُبلنے کے لئے رکھ دو۔"

" کیا ہے پاپا جی ؟ "

" بیٹی اٹھو نا۔ اب تو تمھیں ہی اُٹھ کر سب دیکھنا پڑے گا۔ تمھاری ممی تو جیسے ہو نہیں جیسے نہ ہوئیں۔"

" کیا ہوا ہے پاپا جی۔" نیرا آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

" یہ جو تیری ماں ہے نہ، اس کو کسی کی کیا پروا ہے بھلا ؟ دن بھر غائب رہتی ہے۔ دوپہر تک سوتی رہتی ہے۔ اور پھر نہا کر جلدی جلدی ہوتی چلی جاتی ہے۔ بس تو تنگ آگیا ہوں اس سے۔"

نیرا نے اُٹھ کر کانتا کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔ " پاپا جی، ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل شام بھی زور سے سر میں درد ہو رہا تھا۔ ممی تم آرام کرو۔ میں اُسے چیزیں دے آتی ہوں۔" اتنا کہہ کر گیارہ سال کی بچی نیرا نے رسوئی گھر میں قدم رکھا۔ اسٹور کھولا۔ چیزیں نکالیں اور نوکر کو سب بتا کر واپس آگئی۔ چھوٹا بچہ اٹھا تو اُسے بھی لے گئی اور اُس کا منہ ہاتھ دُھلا کر لے آئی اور کہنے لگی۔

" پاپا جی آج ہم خربوزے کھائیں گے۔ آپ ہمیں ابھی لا دیجئے۔ وہ سامنے ہی تو دوکان ہے۔"

" اچھا بٹیا ٹھہرو میں لے کر ابھی آتا ہوں۔ تب تک شاید تمھاری ماں کا مزاج بھی درست ہو جائے۔"

کانتا کہنے لگی " نیرا بیٹی جاؤ ذرا بھیّا کے لئے دودھ لا دو۔ میں اسے پلا دوں گی۔"

" اچھا ممی جاتی ہوں۔ پر آج کیا بات ہو گئی صبح ہی صبح ؟ "

" کچھ نہیں بیٹی، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی ابھی ابھی سو گئی تھی ذرا سا۔ تو تیرے پاپا ناراض ہونے لگے۔"

" نیرا دودھ لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو کہنے لگی " پتہ نہیں، پاپا جی ہر وقت آپ کو کیوں تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

کانتا نے بچے کو دودھ پلایا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں اُس کا شوہر خربوزے لے کر آپہنچا۔ آتے ہی کہنے لگا " دیکھ لو کیسے بڑھیا خربوزے لایا ہوں۔ میں نے کہا تمھاری میم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چلو انھیں خوش کرنے کے لئے اتنے فالتو پیسے خرچ ہی کر دو اور تم ہو کہ تمھیں ہمارا ذرا بھی خیال نہیں آتا۔"

کانتا نے آنکھ اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

" نہ میری عزت نہ میری لائی ہوئی چیز کی قدر۔ ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہاں تیرے باپ کا بنایا ہوا باغیچہ ہے کیا ؟ شکل مزدوروں کی اور دماغ پریوں کا۔"

" اب چپ بھی ہو جاؤ گے کہ جھگڑا بڑھا کر ہی رہو گے۔"

" یہ جھگڑا میں بڑھا رہا ہوں یا تم ؟ "

" اچھا میں ہی قصوروار سہی، بس اب تو چھوڑو۔ کیا صبح اٹھتے ہی کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتے ہو۔"

" پھر وہی بات میں شروع کر دیتا ہوں ؟ "

اور اسی طرح کی باتیں وہ کرتا رہا پر کانتا نے ایک چپ ہی پکڑ لی۔ وہ اور بھی تلملا کر کہنے لگا۔

"میرے ساتھ بات کرنا اس کے شایانِ شان نہیں۔ ابھی کوئی اور آجائے باہر سے تو ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے گی۔ بُرا تو میں ہی لگتا ہوں اسے۔ مجھے پتہ ہوتا کہ تم اس طرح بدل جاؤ گی تو کبھی نوکری نہ کرنے دیتا۔"

"میں کیا بدل گئی ہوں بھلا؟"

"تم، تم میں تو زمین آسمان کا فرق آگیا ہے۔"

"تو نوکری میں آج چھوڑے دیتی ہوں۔ میں تو چاہتی یہ ہوں کہ تم اپنی ذمہ داری خود سنبھالو۔"

"تو اب تم نے سنبھال ہی رکھی ہے کیا؟ سب کچھ تمھیں کرتی ہو؟ میں بالکل ہی نکما ہوں، یہی نہ۔"

"یہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو دُنیا سے پوچھو؟"

"یہ ہوتی ہے عورت کی ذات، چار پیسے کمانے لگی تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ میں ہی بے وقوف نکلا جو تمھیں اتنی آزادی دے دی۔"

"کیا آزادی دے دی ہے مجھے تم نے؟ دفتر جانے کی؟ اپنی غرض سے بھیجتے ہو۔ نہ بھیجو، نہ کراؤ مزدوری، مجھے اپنے گھر اور بچے چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھانے اور طرح طرح کی باتیں سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے آرام سے گھر بیٹھنا نصیب ہو تو رونا کس بات کا۔"

"یہ میرا ہی حوصلہ ہے جو تمھیں اکیلے اِدھر اُدھر جانے دیتا ہوں۔"

"جو ایسی فکر ہے تو رکھوالی کیوں نہیں کرتے میری؟"

"میں تمھارا پتی ہوں، چوکیدار تو نہیں۔"

"پتی ہو تو پتی بن کر رہو، نکلو میدان میں جس دن کچھ کر کے دکھاؤ گے میرا سر تمھارے قدموں پر اپنے آپ جھک جائے گا۔ سارا دن عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہنے پڑے رہتے ہو۔"

"میں کہتا ہوں کانتا، میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

"اوہو، زبان کھینچ لوگے؟ دیکھوں تو کیسے؟ سچی بات تو سب ہی کو کڑوی لگتی ہے۔"

"میں تیری کمائی تو نہیں کھاتا جو تو مجھ پر رعب گانٹھتی ہے۔ عورت کی بساط ہی کیا ہے۔ ایک پاؤں کی جوتی اور اُس پر چرّ مرّ۔"

"جوتی بھی کاٹنے لگے تو بُری طرح سے کاٹتی ہے۔ تم میں ہے کیا، بڑھ چڑھ کر مجھ سے جو مجھے پاؤں کی جوتی بناتے ہو۔"

"شروع سے ہی چلا آتا ہے۔ عورت مرد کی لونڈی ہوتی ہے اور پتی اُس کے لئے بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔"

"مرد پتی بن کر عورت کو ذلیل کرتا ہے اور بھگوان کے ساتھ برابری کرے بھگوان کو۔"

"میں کہتا ہوں تو چپ بھی رہے گی یا نہیں؟"

"کب تک چپ رہوں میں؟ کیسے رہوں؟ کب تک زبان ہونٹوں سے دُور رکھوں؟ برسوں سے سب کچھ دیکھ رہی ہوں، گُھٹ رہی ہوں۔ سہہ رہی ہوں آخر میں بھی سوچ سکتی ہوں کہ فرض کیا ہے اور حق کیا ہے۔ پر یہاں اس گھر میں جتنا فرض ہے وہ سب میرا اور جتنا حق ہے وہ سب تمھارا۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟"

"کیوں کیا نہیں کرتا ہوں میں؟ چار دن مہمان کی طرح میں تمھارے پاس آجاتا ہوں تو تم میرے ساتھ یہ سلوک کرتی ہو۔"

"باز آئی ایسے مہمانوں سے جو کھائیں بھی اور احسان بھی رکھیں۔"

"غریب آدمی کی کہیں عزّت نہیں ہوتی۔ عورت پیسے ہی کی دوست ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی لیکن میں تمھارے ساتھ رہ کر بھی ابھی اتنی نیچے نہیں گر گئی ہوں۔"

"تمھارا دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا ہے۔"

پر میں نے تمھارا پیسہ دیکھا ہی کب تھا؟ آج کی بات چھوڑو جب سے شادی ہوئی بتاؤ تم نے کب میرے لئے کچھ کیا، کھانا ملتا رہا ہے میں مانتی ہوں۔ پر وہ تو ایک کتے کو بھی دیا جاتا ہے جو گھر کے ایک کونے میں پڑا رہے اور میں تو اپنی ہمّت سے بڑھ کر گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ جب تمھارے پاس کچھ ہوتا ہے تو تمھارے اپنے رشتے ناتے والے دوست کافی ہوتے ہیں۔ اُس وقت تمھیں میری کیا پروا ہوتی ہے۔ تمھارے راج میں تو ترس ترس کر ہی دن کاٹتی رہی۔ مجھے کچھ بھول تو نہیں گیا ہے۔"

"ہاں ہاں یہ کہو کہ تم دانہ دانہ کو ترستی رہیں۔ کھانا تمھارے لئے تمھارے ماں باپ کے گھر سے آتا تھا۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم سب اُن کا دیا ساری عمر کھاتے رہے۔ چار دن کے لئے آجاتا ہوں۔ تو یہ عورت میری جان کھا جاتی ہے۔ ذرا لاؤ میرا بیگ میں نہیں رہوں گا یہاں۔"

"ہاں یہ ایک نیا تماشا شروع کر رکھا ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور بوریا بستر اٹھا کر بھاگنے کی سوجھی۔ جیسے یہاں رہنا بھی ہمارے اوپر احسان ہے۔"

یہ سُن کر کانتا کا شوہر ٹپک ٹپک کر سامان جمع کرنے لگا۔ یہ سب دیکھ کر نیرا گھبرا کر رونے لگی۔

"ہائے پاپا جی۔ نا جاؤ، پاپا جی نہ جاؤ۔"

"چپ رہو تم، اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ کبھی اس گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گا۔"

"ہاں تو کیا" ؟ کانتا کہنے لگی "کہاں جا رہے ہو تم۔ ذرا میں بھی سنوں۔"

"جا رہا ہوں جہاں نصیب لے جائے۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی ؟"

"میں پوچھنے والی کوئی نہیں یہ میں مانتی ہوں، پر میں پھر تمہارے بچوں کو پالنے والی بھی کوئی نہیں سُن لیا ناجانا ہے تو ان سب کو لے جاؤ۔ میں خود جا رہی ہوں اپنی ماں کے پاس۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ صبح سے شام تک ٹھوکریں کھاتی پھروں اور گھر آ کر یہ سب برداشت کروں۔ جہاں محنت کروں گی روٹی کپڑا مل جائے گا۔"

"کیا ؟ تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ گی ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پندرہ بار انھوں نے بلایا ہے۔"

"کب جاؤ گی ؟"

"میں آج ہی چلی جاؤں گی۔ ابھی چلی جاؤں گی۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں تمہارے دروازے پر تو میں کام کرتے کرتے مر جاؤں گی، پر تمہارے منہ سے دو میٹھی باتیں کبھی سننے کو نہیں ملیں گی۔ وہاں کوئی دکھ سکھ کا ساتھی تو ہوگا۔"

"اچھا تو تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ گی ؟"

یہ کہہ کر کانتا کا پتی کمرے میں گیا اور سائیکل لے کر باہر آ گیا کہنے لگا۔

"تم تو جب جاؤ گی، جاؤ گی، لیکن میں جا رہا ہوں اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔"

یہ سن کر نیرا اور زور سے رونے لگی۔

"لے کانتا میں جا رہا ہوں۔ اب تو تُو خوش ہے نا۔ میں نے ساری عمر تیرے لئے کچھ نہیں کیا تو تیرے لئے جیسے ہوا ویسے نہ ہوا۔ اب اس گھر میں کبھی پاؤں نہیں رکھوں گا۔ ریل کے نیچے آ کر مر جاؤں گا، پھر تو منا لینا رنگ رلیاں، کر لینا شادی جس سے تیرا جی چاہے۔"

"میں کہتی ہوں تم چپ ہو گے یا نہیں۔ شرم نہیں آتی ایسی دیوانگی کی باتیں اپنے منہ سے نکالتے ہوئے۔"

"اور تم تو میری بڑی عزّت کر رہی ہو نوکروں اور بچّوں کے سامنے، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ ایسی زندگی سے تو موت بھلی۔"

یہ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہوا اور چل دیا۔

"ممی ! ممی پاپا جی کہاں گئے ؟ کیوں چلے گئے ممی ! ممی" اور نیرا بلک بلک کر رونے لگی۔

"چپ رہو نیرا، کوئی جاتا ہے تو جائے میں کیا کروں ؟ کوئی بچہ ہو تو اُسے سمجھائے یا روکے پر ہو جانے پر ہی تُل جائے اُسے کون روک سکتا ہے۔"

"ممی اٹھو تم پاپا کو بلا لاؤ۔"

"میں کیوں بلانے جاؤں سڑک پر تماشا دکھانا ہے لوگوں کو مجھے ؟ وہ تو دس دن کے بعد چلے جائیں گے پر میں کیا منہ لے کر لوگوں کے سامنے گھر سے باہر نکلوں گی" اور کانتا بیٹھ گئی۔ بیٹھی بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ "میں کیا کر سکتی ہوں یہاں۔ بھگوان جانے اس گھر کا کیا حشر ہوگا۔ اوہو، میں تو تھک چکی ہوں۔ ہار مان چکی ہوں۔ اس مرد نے کبھی مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ کبھی اپنے برابر کی ساتھی نہیں سمجھا۔ میں ہار گئی ہوں۔ میں ختم ہو چکی ہوں۔"

"ممی اٹھو نا۔ کیوں روئے جا رہی ہو۔ پھر سر درد کہنے لگے گا۔"

"تم جاؤ بیٹی کھیلو۔" نیرا ایک طرف ہٹ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی : یہی بیاہ ہوتا ہے۔ میں کبھی بیاہ نہیں کروں گی کبھی نہیں۔ میں اکیلی رہوں گی اور کبھی کسی کو اپنے گھر میں آ کر نہیں رہنے دوں گی۔"

اتنے میں بچہ آیا۔ "ممی ہم بھی کھوجا کھائیں گے۔ ممی ہمیں کھوجا دے دو۔ ہمیں جلدی کھوجا دو۔" کانتا نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا بھولا بھالا چہرہ اُس پر خربوزے کی فرمائش۔ کانتا اٹھی، چھری اور پلیٹ لی اور خربوزہ کاٹنے لگی۔

"ممی تم بھی کھاؤ۔ بڑا میٹھا ہے۔"

"نہیں بیٹا تم ہی کھاؤ۔ دیدی کو دو۔"

نیرا بولی "ممی تم بھی کھاؤ نہیں تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔"

"نہیں بیٹی تم کھاؤ میرا ابھی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

بچّے نے کٹی ہوئی پھانک لی اور کانتا کے منہ میں ٹھونس دی۔ کانتا نے بچّوں کو دیا خود بھی کھایا اور باقی کاٹ کر نیرا سے کہنے لگی : "نیرا یہ پاپا کے لئے رکھ دو۔"

"ممی پاپا جی تو گئے۔"

کانتا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس کا شوہر آیا اور ایک طرف سائیکل رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"پاپا جی لو خربوزہ کھاؤ۔"

"نہیں مجھے نہیں چاہیئے۔"

"پاپا جی اب کھا بھی لو نا۔"

"کانتا میں سچ کہتا ہوں کہ ریل نہیں آئی، نہیں تو . . . ."

کانتا نے چھری خربوزوں پر ٹیکی اور تیزی سے کپڑے جھاڑتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

گھنشیام سیٹھی

لدر کی گھاٹی میں : کولائی تک

۱۲ مئی

تم گئیں تو بھاگتے دوڑتے بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ گاڑی کا وقت ہو گیا تھا، مسافر بیٹھ چکے تھے۔ قیوم میری جگہ روکے بس کے پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سامان چھت پر رکھ دیا گیا تو بس چل پڑی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم شہر سے دور نکل گئے۔ جہاں دور دور تک، فلک بوس کوہساروں کے سرسبز دامنوں کو چومتی ہوئی وادی میں کوسوں تک پھیلے ہوئے سرسوں اور دھان کے ہرے بھرے کھیتوں کا دل کش اور دل فریب منظر میرے سامنے تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر میلوں تک پھیلی ہوئی سفیدوں کی قطاریں تھیں اور درمیان میں کہیں کہیں چنار کے شان دار درخت باہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ چنار کے یہ درخت کشمیر کے ایوانِ بہار کے سبز مینار ہیں۔ جن کے پتے پتے پر تہذیبِ ... وجیل کا نام لکھا ہوا ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بل کھاتا ہوا اور اپنی ہی اٹکھیلیوں میں مست دریائے جہلم مجھے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ اجنبیت کا وہ احساس میرے دل و دماغ سے مٹ چکا تھا جو اسی سڑک پر سری نگر آتی بار مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ بلکہ مجھے یوں لگا گویا میں غیروں سے چھٹکارا پا کر اپنوں میں آ گیا ہوں۔

کئی چھوٹے بڑے دیہات گذر گئے۔ کئی مسافر اترے اور کئی نئے مسافر سوار ہوئے۔ پھر پہل گام آ گیا۔ پہلگام میں نے بچپن میں دیکھا تھا لیکن اب یہ صرف خیمے گاڑنے کے لئے ایک 'پلیٹو' ہی نہیں رہا بلکہ ایک چھوٹا موٹا شہر بن چکا ہے اور رہن سہن کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ہوٹل ہیں۔ کلب ہے۔ سرکار کی بنائی ہوئی Huts ہیں۔ بنگلے ہیں، ریستوران ہیں، کافی ہوٹل ہیں۔ لیکن یہاں زیادہ تر سیاح خیموں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے چمکتے ہوئے، شفاف پانی والے سیماب صفت لدر دریا کے کنارے، پُل کے نزدیک ایک خیمہ طے کر لیا ہے۔

آج شام کو کرسی باہر ڈال کر بیٹھا۔ یہاں کے مناظر کا کیا کہنا۔ چاروں طرف آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑ، دامن میں نغمہ سرا لدر کا تیز رفتار دریا، پیش منظر سبزہ زار زیرِ قدم رنگا رنگ پھولوں کے گلستاں، پُربہار۔ بس ایک کیف و سرور کی دنیا تھی۔ لدر کی مدھر کل کل سنتے سنتے ایک جھپکی سی آ گئی تو پتہ چلا کہ پاؤں تلے کی زمین کے علاوہ کہیں اور بھی ہوں۔ وہاں، جہاں تم بیٹھی ہو۔۔۔۔

دیکھتے دیکھتے میرے خیموں کے دونوں طرف کچھ خیمے لگ گئے۔ آج بڑی خوبصورت چاندنی چھٹکی ہوئی۔ سامنے چاندنی میں تیرتی ہوئی لدر ہے اور لدر میں مچلتی ہوئی لہریں۔ کشمیر کے صحت افزا اور خوب دید مقامات میں پہل گام کا ایک امتیازی مقام ہے۔ لدر کے کنارے پر بسا ہوا یہ مرغزار وادی کے سینے پر ہیرے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر قدرت کا یہ حسن و جلال دل کو بے قابو بنا دیتا ہے۔ سنا ہے بہت پہلے اس جگہ پر ایک بڑا گھنا جنگل کھڑا تھا۔ سوچتا ہوں تب فردوسِ بریں کے اس خاموش گوشے کی شکل کیا ہوگی۔ سرسبز، تر شے ترشائے درختوں سے ہرے بھرے جنگل۔ فلک بوس پہاڑ ــــ ساکت اور خاموش، کیسے لگتے ہوں گے۔

۱۳۔ مئی۔

لدر کے اس پار، اوپر بہت اوپر، 'بائی سرن' کا پلیٹو ہے۔ اس پلیٹو کے چاروں طرف بڑے بڑے، اونچے اونچے اور سرسبز کیل، بدو، چیل اور

دیودار کے درختوں والے گھنے جنگل ہیں۔ شاید کبھی حوریں ان میں رہتی ہوں۔ یا کون جانے وہ آج بھی چندن کا لیپ لگائے۔ پھولوں کے گجرے اور مالائیں پہنے اپنے محبوب کی تلاش میں دور — دور آسمان میں مل جانے والی پگڈنڈی پر رات کو بھٹکتی پھرتی ہوں۔ اکثر یوروپین سیّاح اسی جگہ آکر ٹھہرتے ہیں۔ سیر کے لئے اُسی طرف نکل گیا۔ راستہ بڑا بھیانک اور چکردار تھا۔ ایک طرف ہزاروں فٹ کی اونچائی اور دوسری طرف ہزاروں فٹ گہرے کھڈ اپنا ڈراونا منہ کھولے آسمان کو خالی خالی نگاہوں سے تک رہے تھے۔ ان گہرائیوں میں کہیں ننگی چٹانیں، کہیں چھوٹی بڑی رنگارنگ پھولوں سے لدی جھاڑیاں، کہیں باجرے اور مکّی کے سیڑھی دار کھیت، کہیں کوئی تالاب، تو کہیں کوئی برساتی ندی پگھلی ہوئی چاندی کے دھارا کی طرح۔ چٹان کی ہر ایک اٹھان پہ مچلتے، اُچھلتے جھرنے، کہیں کوئی کل کل کا مدھر سنگیت کرتی ہوئی لِدر کی کوئی سکھی، پہاڑی ندی۔ لِدر کی ان سکھیوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ نہ جانے یہ کب سے بہہ رہی ہیں اور کب تک بہتی رہیں گی۔ شاید یہ دنیا کی ابتدا کو انتہا سے ملا دیں۔ ہم انسان ذرا سا بڑھ جانے پر غرور، تکبر اور انا کے غلام ہو جاتے ہیں اور ذرا دکھی ہوتے ہی زندگی کی اہمیت اور عظمت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ مگر پانی کے یہ کھلونے اتنے گمبھیر ہیں کہ ہمیشہ ایک چال سے چلتے ہیں۔ رات دن ایک مشن اور ایک جذبے سے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ تلین کی برفانی جھیل کو جانے والا بائی سرن کا یہ راستہ چیل اور بلوط کے گھنے جنگلوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اور ایک اچھی خاصی بھول بھلیاں ہے۔ پہل گام سے تین میل کی کھڑی چڑھائی کے بعد لگ بھگ ایک میل کا یہ میدان ہریالی میں گھرا ہوا۔ خاموشی سے خدا کی قدرت کو تک رہا ہے۔ جس کی دلآویزی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ یہی بائی سرن ہے۔ کھلے آسمان کی چھاؤں میں زندگی کی تھکا دینے والی گھما گھمی سے بھاگ کر لوگ یہاں بسے، کچھ وقت بائی سرن میں گذارنا چاہتے ہیں۔ میں نے دیکھا خیموں کے باہر، ادھ کھلی دھوپ میں کچھ کرسیاں لگی تھیں۔ جن میں کچھ مرد عورتیں اور بچے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

تقریباً تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تلین کی برفانی جھیل واقع ہے۔ چاروں طرف گلیشیر ہی گلیشیر نظر آتے ہیں۔ سنہری دُھوپ جھیل پر بکھری ہوئی تھی اور برفیلی چوٹیاں روپہلی ہو کر جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ جھیل کی سطح اور اس پر بکھرے ہوئے برف کے اُجلے تودے رنگین نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ جھیل ہے، جھیل کے کنارے ہیں۔ کناروں سے لگے پہاڑوں کے سہارے ہیں۔ پر دھوپ کہاں ہے؟ کہاں ہے اور کس میں ہے؟ وہ سب پر چھائی ہے۔ سب پر بکھری ہے، سب پر پھیلی ہے وہ سب کو چومتی ہے۔ اور سب اس کی چھایا میں اپنے کناروں کو چومتے ہیں، اپنی باہوں سے لپٹی باہوں کو چومتے ہیں۔

اُترتے وقت تو ڈھلان پہ پیر ٹکے ہی نہیں۔ بس تلین سے اُترا تو اترتا چلا گیا۔ پہاڑ کی سہانی دُھوپ اور ہوائیں! ایسا لگا کہ مسکراتی ہیں اور پھر جیسے بھیگ کر۔ بنا پوچھے ہی ایک دوسرے کو چوم جاتی ہیں۔ میں اکثر ناہموار تنگ راہ پہ چلتے چلتے پاؤں اُچھل اُچھل جاتے اور راستے کے کنکر، پتھر پیر کی ٹھوکر کھا کر نیچے لڑھکتے تو لڑھکتے چلے جاتے۔

۱۴- مئی

کل رات کو یہ ادھورا خط لکھا اور سو گیا۔ آدھی رات کے قریب سردی نے بہت ستایا تو نیند اُچٹ گئی۔ پل اوور پہن کر مفلر سر پہ لپیٹا تب جا کر ٹھٹھرن رُکی بلا شبہ یہ جگہ بڑی پیاری ہے۔ لیکن یہ اکیلاپن — کوئی ساتھی ہو تو لِدر کا یہ طوفانی بہاؤ، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر دودھ کی طرح جھاگ دیتا ہوا اور گر گر کر پھر اُٹھتا اُبھرتا ہوا اس کا پانی اچھا بھی لگتا ہے۔

یہاں سے تھوڑی دور ہی مملیشور کے مندر کے آگے پانی کا ایک آبشار ہے۔ ابھی میں آبشار سے ایک میل دور ہی ہوں گا کہ بلندی سے پانی گرنے کی صدا سنائی دینے لگی۔ پھر دور سے آبشار نظر آنے لگا۔ پانی کا ایک ریلا کئی دھاروں میں تقسیم ہو کر پتھروں سے ٹکراتا ہوا شور مچاتا ہوا گر رہا تھا۔ دور دور تک پھیلی ہوئی پھواروں میں شعاعوں نے طرح طرح کے رنگ بنائے تھے جدھر نگاہ جاتی تھی جنگلی پھولوں کی روشیں ہی روشیں تھیں۔ قدرت کے معصوم مگر عظیم ہاتھوں کی گلکاری ہی گلکاری نظر آتی تھی۔ نظریں ان روشوں پر دوڑتیں تو پھر لوٹتی نہیں۔ بس دوڑتی ہی چلی جاتیں۔ نیچے پہنچنے پر جو دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چٹانوں سے لپٹے ہوئے بھیانک، شور مچاتے ہوئے، اس آبشار کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ وہیں اپنی بلندی، اپنے اوج پر رُکنا چاہتا ہے۔ پر دیکھتے دیکھتے اپنی ہی فطرت کے بھرم کا احساس ہوتا ہے۔ پانی ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ اسے روکنے کے لئے بڑی بڑی چٹانیں کوشاں ہیں۔ بڑے بڑے درخت آبشار کے بہاؤ کی زد میں آکر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ مجھ جیسا ناستک بھی اس عظیم کارخانۂ قدرت کے عجیب و غریب خالق کی عظمت کا

قائل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ۔۔ ؟ لگتا ہے آج تک جن اصولوں پر زندگی چلائی ہے ان کے پاؤں ریت پر ٹکے ہوئے تھے اور اب پاؤں تلے کی ریت نکلتی چلی جا رہی ہے۔ میں گھبرا سا گیا کہیں دل پھر دماغ کے غم نہ سمیٹنا شروع کر دے۔ کہیں جھوٹی اُمیدوں کے پول نہ کھل جائیں۔ کہیں غمزدہ حقیقتیں عیاں نہ ہو جائیں۔۔۔ پانی غصّے میں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر دودھ بن رہا تھا۔

پہل گام ایک عمدہ قیام گاہ ہے۔ سیلانی اور مجھ جیسے گھمکڑ یہاں آ کر خیمے گاڑ دیتے ہیں اور پھر آس پاس کی وادیوں کو کھوندنے چل دیتے ہیں۔

آج میں دیر تک لِدر کے کناروں پر گھومتا رہا۔ کہرے اور دھند لکے نے پہل گام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دُھواں پھواروں سے ٹکرا ٹکرا کر عجب دائرے بنا رہا تھا۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان، یہاں وہاں، بکھرے مٹی کے گھروندوں کی لپی پُتی چھتوں پر سُکھانے کے لئے ڈالے گئے مکئی کے بھٹے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ کہیں کسان بھٹے بھون رہے تھے اور کہیں گوالنیں دودھ بھری چھاگلیں سروں پر اٹھائے، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر سہاگ کے گیت بکھیرتی ہوئی اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ کہیں چراگاہوں میں بھولی کسنیں گھاس کے گٹھے بنانے میں مشغول ملیں تو کہیں بکروال سینکڑوں بھیڑ بکریوں کے گروہ لے کر پہاڑیوں کی طرف جاتے نظر آئے اور کہیں گوجر عورتیں کمر پر لکڑیوں کا بوجھ لادے پہل گام جانے والی پگڈنڈیوں پر رواں تھیں

اس سبز پوش خواب آگیں وادی کے باشندوں کی زندگی بڑی کٹھن ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر جسم توڑ دینے والی مشقت اور کمر توڑ دینے والی محنت سے انھیں لوہا لینا پڑتا ہے۔ شروکے سلونے بادل کے ٹکڑے سے بھی کومل، دل کش اور دل فریب حُسن، جو کشمیری عورت کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ یہاں گھاس کاٹتا ہے اور کمر پر لکڑیاں لادتا ہے۔ لیکن آفرین ہے ان کی جوانمردی اور استقلال پر جو زندگی پر ان کا اعتقاد اٹل بنائے ہوئے ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسکول جا رہے تھے۔ قوم اور ملک کے ننھے معمار 'نیا کشمیر' کی اُمیدوں کے اُٹھتے ہوئے مینار۔ جب یہ بڑے ہوں گے تب کشمیر کی کایا پلٹ چکی ہو گی۔ ان کی آنکھوں میں خودداری کی چمک آ چکی ہو گی اور توہمات کا پردہ ان کے ذہن پر سے ہٹ چکا ہو گا۔ کشمیر میں جس ذہنی انقلاب کی ابتدا ہو چکی ہے۔ وہ انھیں مکتبوں میں ارتقا کی منزل پر پہنچے گا۔ تب تک مہذب زندگی کے مختلف شعبوں میں ارتقائی ترقّی کی تمام راہیں کھُل چکی ہوں گی۔۔ بچوں کے ہنستے چمکتے اور معصوم چہروں کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ بچپن کی وہ دلربائی، معصومیت اور کج ادائی یاد آ گئی۔۔۔ زندگی کی ہر منزل میں کتنی تیزی سے طے کرتا آیا ہوں۔ سوچ کر تعجب ہوا۔ سامنے پہاڑ کے دامن میں ایک طرف ہٹ کر گاؤں کا چھوٹا سا مکتب تھا آنگن میں اخروٹ کا گھنا درخت لہلہا رہا تھا۔ اس کے نیچے چبوترے پر سلیٹ پتھر کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا، جی چاہا کیوں نہیں بھاگتا بھاگتا پہنچ جاؤں۔ گاؤں کے اس مکتب میں جہاں دودھ پتھری کے ٹوٹے ٹکڑوں اور سلیٹ پتھر کے چھرّوں کو جیتنے کی بازی لگی رہتی تھی۔ من کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ میں جیتتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈھیر سے چھرّے، ڈھیر سی دودھ پتھریاں، ڈھیر سی ٹھیکریاں۔ یکایک وہ ننھا منا جھپٹا۔ جھولی کھُلی اور سب بکھر گیا۔ یہیں اس پیڑ کے نیچے۔۔۔۔ پر یہاں نہیں، اس پیڑ کے نیچے نہیں، یہ وہ مدرسہ نہیں، چبوترا نہیں، یہ میرے ہاتھ وہ نہیں، اور یہ میں وہ نہیں، تب وہ ننھے ننھے لاپرواہ ہاتھ تھے۔ نٹ کھٹ اور شریر، اور آج، آج یہ ہاتھ خوشی بندھے ہیں۔ چھوٹے سلام کرتے ہیں اور کھوکھلے آداب بجا لاتے ہیں۔ اٹھا لوٹنے کے لئے۔ لیکن اگلے موڑ پر جا کر نہ جانے کیوں قدم پھر پیچھے لوٹ آئے۔ جلدی جلدی چڑھائی چڑھی۔ چبوترے پر ہاتھ پھیلا کر ایک دودھ پتھری اٹھالی اور اُسے مٹھی میں بند کر کے نیچے بھاگ آیا۔ بچپن کے اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا جو کبھی حقیقت تھا۔ ماضی کو کوئی واپس نہیں لا سکتا صرف دل کے دروازے پر کھڑی یادوں کے ہجوم کبھی کبھی اُسے پکار کر رہ جاتے ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کتنی دُور نکل آیا۔ ہوش آیا تو دیکھا۔ سامنے پھولوں کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ بنفشہ کے پھولوں کے کھیت، بنفشہ یہاں اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ہم وزن نمک لے کر بنفشہ دے دیتے ہیں۔ ساری فضا بنفشہ کے پھولوں میں بس کر مہک اٹھی تھی۔ ایک عجیب سی غنودگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اتنی بلندی پر ہوا کا ہر جھونکا ایک نیا پیغام لاتا۔ کبھی پھولوں کا، کبھی کلیوں کا، کبھی آبشاروں اور جھرنوں کا۔ جی چاہتا ہے ان جھونکوں کو چوم چوم لوں، رس میں بھیگ کر اُن کے پروں پر اڑ جاؤں۔۔۔۔ پر کہاں؟

اور آ گئے امراوتی اور لِدر کے سنگم پر آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھلی رہ گئیں بیسیوں چھوٹے چھوٹے نالے عجب برق رفتاری سے ایک مرکز کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کا چپّہ چپّہ فردوس بریں ہے۔ جہاں کی ہر عورت

دیو بالا ہے۔ جہاں ہزاروں، لاکھوں ندی نالے دھرتی کی چھاتی پر بہہ رہے ہیں اور انسانی زندگی کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں۔

۱۵ مئی

آج ہم کولائی کی راہ پر ہیں۔ راہ کی یہ رات لارووٹ کے ڈاک بنگلے میں کٹ رہی ہے۔ لارووٹ کولائی گلیشیر اور پہل گام کے درمیان ایک پلیٹو ہے۔ جس پر ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ ہم کوئی تین بجے کے قریب یہاں پہنچے، ایسا لگا جیسے دُنیا کی چھت پر آ گئے ہیں پر ابھی اور بلندی پر جانا ہے۔

لارووٹ کا میدان گلمرگ کی طرح ہے۔ اس کی سبز مرتفع ڈھلانوں پر لیٹے رہ سکئے، سو جانے اور کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔ چٹانوں کے کنجوں میں چھپے ہوئے اس کے آبشار، وہ جنگل تر و تازہ، رنگین پھولوں کی خوشبوؤں سے مست، دُنیا سے دور، الگ، سورج کی وہ کرنیں چھن چھن کر گرتی ہوئی۔ بدلیوں کی وہ پھوہار رہ رہ کر پڑتی ہوئی، نیچے وادی میں کوسوں تک پھیلی ہوئی رعنائی اور دلربائی ایک سراپا حسن — یہ سب دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا عشر عشیر کسی کالی داس اور کسی شیکسپیر کا قلم بھی بیان نہ کر سکے گا۔

دوپہر ڈھلے ہم دودھ سر کی جھیل دیکھنے گئے۔ دن ڈھلنے میں تھوڑی دیر تھی کہ ہم نے درختوں کے جھرمٹ میں پانی کی چمک دیکھی۔ آس پاس کی پہاڑیاں "تلین" کی طرح تنگ نہ تھیں۔ ایک کے بعد ایک تین چار کھلے پہاڑ تھے جو بالترتیب نیچے ہوتے چلے گئے تھے۔ اور جیسے دھند کے درمیان کسی جوہری نے سنبھال کر روئی کے ایک گالے پر کوئی بیش قیمت ہیرا رکھ دیا ہو۔ ویسے ہی ایک جھیل چمک رہی تھی ... جی چاہا وہیں بیٹھ جاؤں، ہمیشہ کے لئے گھر بنا لوں، ایسا کچھ کروں کہ نظر زندگی کا سہارا اور منظر زندگی کا سامان بن جائے۔ لدر کی اس وادی میں آ کر میری حالت عجب سی ہو گئی ہے۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کہ کشمیر آ کر آدمی کی حالت اُس مہمان کی طرح ہو جاتی ہے جسے بہت سے دوست ایک ساتھ بلا رہے ہوں۔ وہ سب کو عزیز رکھتا ہو اور کسی کی دعوت کو بھی نامنظور نہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسا مہمان انتخاب میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ... لدرووٹ کی راہ ہی میں دن ڈھل گیا تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں دھند کا چھانا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑیوں کی سیاہ بلندیوں کے سوائے اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

۱۶ مئی

کولائی کا گلیشیر یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی علاقے میں دُنیا کے سب سے اُونچے راستے پندرہ سے بیس ہزار فٹ بلندی پر سے گذرتے ہیں۔ دس سے اٹھارہ بیس ہزار فٹ اُونچی چوٹیاں یہاں جگہ جگہ ہیں۔ گلیشیر کو جانے والا راستہ بے حد سنکرا، پیچ دار، تنگ اور بھیانک ہے۔ ایک طرف حدِ نظر تک ڈھلان ہی ڈھلان ہے۔ ادھر بہتے پانی کی چمکتی ہوئی ایک لکیر جس میں جگہ جگہ برفانی تودے سر اٹھائے خدا کی قدرت کو تک رہے تھے اور دوسری طرف بلندی ہی بلندی، چٹانیں ہی چٹانیں اور چٹانوں پر برف — اور پھر برف۔

کولائی کے دامن میں بھی ایک بڑا ہی شاندار سرسبز پلیٹو ہے۔ میرے خیال میں تم نے کولائی کا نام تک بھی نہ سنا ہو گا۔ کشمیر کے کوہستانی سلسلوں میں یہ سب سے شاندار اور بلند گلیشیر لگ بھگ اٹھارہ ہزار فٹ اونچا ہے اور ایک طرف سے چار ہزار فٹ ترچھا کٹا ہوا ہے۔ ہم گلیشیر پر تھوڑی دور تک چلے بھی، فلک شگاف پربتوں سے آبشار گر رہے تھے۔ نالے اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کے بہاؤ کی روانی میں بڑی بڑی چٹانیں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھیں۔ جدھر بھی نظر جاتی، آنکھ کھلتی، مندتی اور جھک جاتی۔ کھلتی اس لئے کہ برف کے یہ ذخیرے اور قدرت کے یہ مناظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور مندتی اس لئے کہ برفانی چوٹیاں روپہلی بن کر چمک رہی تھیں اور ان کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اور جھکتی اس لئے کہ کولائی کا ماتھا میرے ماتھے سے بہت اونچا ہے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی بلندیوں سے برف پگھل کر آ رہی تھی تاکہ انسان کو کبھی پانی کی قلت محسوس نہ ہو۔ اس کے کھیت ہرے بھرے اور لہلہاتے رہیں۔ اس کی پھلواری طرح طرح کے رنگا رنگ پھولوں سے سجی رہے۔ اس کے پھلوں کا رس کبھی خشک نہ ہو۔ پانی - بادل - اور برف — ایک ہی چیز کی الگ الگ شکلیں ہیں۔ ایک کی تباہی دوسرے کی تخلیق ہے یہی قانون شاید زندگی کا بھی ہے۔

کولائی سے لوٹ کر ہم تارسر اور مارسر کی جھیلوں تک گئے۔ یہ جھیلیں تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ شاید کبھی یہ ایک ہی جھیل رہی ہو گی لیکن آج تک ایک ننھا سا پہاڑ انھیں دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف جھیل سے نکل کر بہتا ہوا تیز پہاڑی نالا ہے۔ تیز، خنک اور سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں گھاس میں سے ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ کر دیر تک آدھے میل کی تارسر کو دیکھتا رہا۔ قدرت کی دریا دلی نے وہاں لالہ زار اُگائے تھے اور گل و یاسمین کے چمن کھلائے تھے۔ جھیل کے

ساتھ ہی ایک مرغزار تھا، اور برف پوش چٹیل پہاڑوں نے دونوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ گویا جھیل کیا تھی ایک بیضوی پیالہ سا تھی جو آسمان کے گنبدِ مینائی کی طرف تک رہی تھی — اور دیو نما فلک بوس پہاڑ اس گنجِ گرانمایہ کی حفاظت کر رہے تھے — تارسر سے جو پہاڑی نالا نکلتا ہے۔ وہی لارڈ تک پہنچتے پہنچتے لِدر دریا ہو جاتا ہے اور پھر کل کل کا شور مچاتا منچلے انداز سے چٹانوں میں الجھتا، سانپ کی طرح بل کھاتا، اور اژدھے کی طرح پھنکارتا ہوا پہل گام جا پہنچتا ہے۔ یہ نالا ایک لمبی کہانی بیان کرتا ہے فکر و تصوّف کے ان خاموش گوشوں سے پہل گام کے ہنگاموں تک کی داستان — اور داستان کی ہر ایک کیفیت میں یہ خود ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

مارسر کی دودھ سے دُھلی اور دھوپ سے منجھی جھیل میں سے بھی ایک ایسا ہی نالا نکلتا ہے جو ڈاچی گام کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جس کی منزل ہارون کی بلوری جھیل ہے۔ جس کا پانی موتی کی آب کو بھی شرماتا ہے۔ وہاں اس کی خاموشی اس کی محویت کا پتہ دیتا ہے۔ جس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں یہ کتنی شوخ اور چنچل ہے۔ سرینگر میں کبھی نل کے نیچے بیٹھے، یا پیاس بجھاتے ہوئے یا ہارون کے باغ میں کسی اتوار کو پکنک کرتے کبھی تمھیں خیال آیا ہے کہ ہارون کی اس جھیل کی اتنی لمبی کہانی ہو سکتی ہے!

من موہن تلخ

ماوراء

تلخ ایسی کوئی تصویر بنا دے اپنی
جسے تکتے ہی ہر اک شخص کو چُپ لگ جائے

یوں نظر آئے تری زیست کا پُر ہول کھنڈر
کہ تری عمر کا ہر موڑ ہر اک راہگذر
تیرا بکھرا ہُوا شیرازۂ ہستی ہو جائے
محض عنواں ہی سے اندازۂ ہستی ہو جائے
ربط ہو کوئی لکیروں میں نہ کوئی مفہوم
کارفرما رہے ہر رنگ میں یادِ معدوم
اپنی ویران نگاہوں میں وہ وحشت بھر دے
رُخ کو پردے ہی پردے میں جو عُریاں کر دے
یوں اُبھر آئے رُخِ پردہ پہ ہر عکسِ خیال
کہ ہر اک نقش نگاہوں میں چُبھے بن کے سوال
کوئی بھی خط نہ ہو پہلے کسی خط کی مانند
ساری تصویر ہو اک حرفِ غلط کی مانند
جس طرح مٹنے سے پہلے کسی گونگے کی پکار
سر پہ لٹکی ہوئی ہو موت کی ننگی تلوار

تلخ ایسی کوئی تصویر بنا دے اپنی
رنگ ایسا کوئی تصویر میں گہرا بھر دے
جو سبھی دھندلے نشانوں کو علیحدہ کر دے
ایسی منہ بولتی تصویر کہ جس کی آواز
سُن کے سب پوچھیں سُنی کس نے یہ کس کی آواز
دیکھنا چاہے نہ کوئی بھی مگر سب دیکھیں
بیچ کے اک دوسرے سے ایک نظر سب دیکھیں
نظر آئے نگہِ تیز اِدھر سے دیکھیں
پاس آ جائیں تو بے ربط صِفر[1] سے دیکھیں
ایک اک نقش سے یوں بول اُٹھے رازِ خموش
کس نے دیکھا ہے یہاں نُور کا اعجازِ خموش
ایک آورد وہ ضیا کس کو مقدس ہوتی
اور اگر ہوتی تو یوں زیست نہ بے بس ہوتی
کہ ہے جو کچھ بھی کوئی اس کے سوا کچھ بھی نہیں
تلخ تصویر بنا دے کوئی ایسی اپنی
صرف تصویر نہ ہو اس سے زیادہ ہو کہیں

[1] لفظ صِفر ہے

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

میرؔ غالب کے حریف؟

غدر کے بعد مغربی علوم اور نئے طرزِ تعلیم کے اثر سے اردو ادب میں ایک انقلابی لہر اُٹھی۔ روشن خیال اور زمانے کے مزاج میں نگاہِ بشریت رکھنے والے ادیبوں نے محسوس کیا کہ اردو کا جامہ نئے زمانے کے جسم پر تنگ ہے، اس لئے غدر کے بعد انگریزی علوم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا خیال پیدا ہوا۔ گو کہ انگریزی ادب تاریخی طور پر انسانی مذاق کے بالکل قریبی دَور کا آئینہ دار ہے، یورپ میں ہم ۵۰ سو برس سے علمی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے مگر ہندوستان میں نئی زبان نے جب قدم پھیلانا شروع کیا تو علمی تحقیق اور ذوق نے تنقیدی ادب کا ایک واضح معیار قائم کیا۔ اس کے لئے حدود قائم کئے اور اصولوں کی روشنی میں وسیع اور واضح طریقے سے شعر و ادب کے جائزہ کی بات بھی سوچی گئی کہ اس طرح فکر کے مختلف دبستاں، سوچنے کے مختلف زاویے اور بیان کے مختلف اسلوب قائم ہوئے —— اُردو ادب میں سب سے پہلی بار زندۂ جاوید ادیب غالبؔ نے عملی طور پر قدم اُٹھایا۔ اس سلسلے میں دو تذکروں کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

سید فخرالدین حسن تخلص سخن بن سید جلال الدین حسین نے ۱۲۸۱ھ میں فسانۂ عجائب کے مقابلے میں سروشِ سخن کے عنوان سے ایک فسانۂ حسن و عشق نول کشور پریس سے شائع کیا۔ ختمِ داستان کے بعد جناب سخن شاگرد صفیر بلگرامی غالب کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"حضرت جنابِ تقدس مآب گردوں رکاب سر دفترِ محققانِ سخن افسرِ شاعرانِ زمن، نجم الدولہ دبیر ملک نواب اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ عرف مرزا نوشہ تخلص غالب اعلی اللہ درجہ و تعالی اللہ تعالیٰ شانہٗ جو جدِ فاسد خرد داستاں ہیں۔ سرآمد شاعرانِ حالِ گذشتگان ہیں۔ عرصۂ دراز تک کمترین کو معظم الیہ سے درس و تدریس میں استفادہ رہا، تحریرِ نظم و نثر پارسی اور اُردو کی مزاولت پر دل آمادہ رہا۔ سبحان اللہ حضرت غالب مدظلہ العالی امام شعرائے ذی کمال اور پیشوائے نثارانِ صاحب دانش و شعور ہیں۔ قبلۂ اربابِ دیوان ہیں۔ ہم کیا کہیں وہ تو ہند سے شیراز تک بلکہ دور دور آفتاب سے زیادہ مشہور ہیں۔ شاعر بہت سے گزر گئے، حضرت کے ہم عصر ہمسری کا دعویٰ کیے لکھتے لکھتے مر گئے، مگر آج تک کوئی آپ سے بہتر نہ ہوا۔ بہتر تو کیا کوئی آپ کے برابر نہ ہوا۔ منصف مزاج آپ کا کلام دیکھے اور غور فرمائے۔ طبع عالی دقت پسند اور مائل بندشِ معانی بلند ہے، اگر سمجھے تو لطف اٹھائے، دیوان اردو جب تصنیف فرمایا معنی رس اور سخنداں لوگوں نے ایک ایک شعر میں سو سو طرح کا مزا پایا۔ لیکن بعض شاعر جو بڑے مشاق تھے اپنے فن میں لاق شہرۂ آفاق تھے، اکثر اشعار نہ سمجھے اور ہر ایک ماریہ پر اُلجھے یہاں تک اضلاع و امصار سے خطوط آنے لگے، لوگ نواب صاحب کی خدمت میں مطلب دریافت کرنے جانے لگے۔ آسان اشعار لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ دوسرا دیوان مرتب کرنے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے اس دیوان کو دریا بُرد کیا اور دوسرا دیوان موافق فہم ابنائے روزگار کے ترتیب دیا پھر یہ رباعی لکھ کر لوگوں کو سنا دی اور دیوان کے آخر میں لگادی۔ غالب مدظلہ:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اوسے سخنورانِ کامل

آساں سمجھنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل "

جناب سخن اپنے استاد جناب صفیر بلگرامی کی شان میں اس داستان دل آرام اور ملکہ حسن افروز ــــ جس کا تاریخی نام " سروشِ سخن "[1] ہے (سروش سخن، کتاب مذکور کا تاریخی نام ہے) جس سے ۱۲۷۶ھ سن ظاہر ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ داستان " نغمۂ عندلیب " کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن منظرِ عام پر " سروشِ سخن " کے نام سے ۱۲۸۱ھ میں آئی ــ چنانچہ آخر کتاب میں ایک مقدمہ، ایک جلسہ [تذکرہ ادباء واحباب] بہ نام " انجمنِ احباب " اور چند غزلیات سخن پھر قطعات تاریخ مندرج ہیں۔ قطعات ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۸۱ھ دونوں ملتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مروجہ دستور کے مطابق احباب نے بیشتر ہی مصنف کی اطلاع پر قطعات نظم کر کے بھیج دئے ہوں گے [لیکن یہ واضح رہے کہ ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۸۱ھ میں پانچ سال کی طویل مدت باقی رہتی ہے] رقمطراز ہیں :

" سید فرزند احمدؔ صفیر بلگرامی جو صاحب دیوان ہیں، تحریر اون کی چست، روزمرہ درست، نہایت خوش بیان ہیں، ہر شہر و دیار

---

[1] سروش سخن ــــ کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالب دہلوی کے پاس برائے ملاحظہ ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ اس کا جواب غالب نے دیا :

" مولوی سید فرزند احمدؔ... اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہونچے، آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستروّاں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے ؎

سینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس

بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروش سخن اس کے دوسرے دن پہونچا...... تو بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بیٹھا رکھا۔ وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہونچاتے ہیں...... "

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا :

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب　　بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد فیض کی ہے دعا　　خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

(س ش ص صفحہ ۱۹۷)

ہیں اون کے علومِ خاندانی کی شہرت ہے۔ ہر جگہ اون کی قدر و منزلت ہے۔ بیان کرنے کی کیا حاجت ہے۔ "

صفیر بلگرامی کا نام سید فرزند احمدؔ تھا۔ آپ حضرت سید صاحب عالم صاحب بلگرامی تم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے۔ صفیر بلگرامی نے بھی غالب کے حالات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ جلوہ خضر حصہ اوّل مطبوعہ ۱۲۸۵ھ میں لکھے ہیں۔ اقتباس قابل غور ہے :

"...... اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبرآبادی مولداً۔ دہلی مسکن المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔ یہ وہ خوش مذاق شخص گذرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا فرمایا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلامِ فارسی پر ولائتی فارسی کا یقینی چار شخصوں کے کلام پر ہوا :

اوّل امیر خسرو　دوم حسن دہلوی　سوم مرزا بیدل　چہارم غالب
اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جان جاناں مظہرؔ اور غنی کشمیری اور غنیمت، اور خان آرزو، اور آزاد بلگرامی، اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد ــــ یہ سب کے سب خوش گو اور شاعرِ بے بدل تھے، مگر جامۂ ایجاد جو خداداد ہے اونہیں چاروں کے راست قامت آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں اون پر بھی تخستر گفتاری کا خاتمہ ہوا... "

(جلوہ خضر مطبوعہ ۱۲۸۵ھ)

لیکن میرے پاس جلوہ خضر حصہ اوّل و دوم کا جو مسودہ حضرت صفیر بلگرامی کے دست و قلم کا موجود ہے اُس میں :

" اول امیر خسرو　دوم میر حسن　سوم میر تقی　چہارم مرزا بیدل
پنجم مرزا غالب "

تحریر ہے، میر تقی کے سلسلے میں حاشیہ پر یہ عبارت بھی درج ہے :

" میر تقی صاحب کو اگر اردو نثر نگاری کا موقع ملتا تو ان کی نثر اور نظم میں سوز و گداز ایک سا ہوتا۔ شاعر وہ تو باکمال تھے، نثر کی باکمالی کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "

لیکن یہ عبارت قلمزد کر دی گئی اور نہ جانے کیوں ترتیب بھی بدل دی گئی۔ حالانکہ میر تقی کے حالات میں صفیر بلگرامی صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں :

"۔۔۔ میر غزل کے بادشاہ تھے، جو بات کہ غزل میں انھوں نے اختیار کی اوس کی تقلید سب پر واجب ہوگئی اور سب اوس ڈھرے پر چلنے کو مستعد ہوئے، مثنوی میر صاحب کی اگرچہ ممدوح انام ہے مگر غزلیت کے سبب سے زیادہ مطبوع ہے ۔۔۔"

(جلوۂ خضر حصہ اول)

جناب سخن "سروش سخن" میں میر کی بابت لکھتے ہیں:

"میر تقی صاحب غفران مآب تو بادشاہ شاعران استاد سارے جہان کے تھے، اس میں تو کسی کو جائے گفتگو اور تقریر نہیں اور اگر ہو تو ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"

جناب صفیر کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی عظمت کا رجحان محض غزل کے نام پر روا رکھنا انھیں کو منظور نہ تھا۔ بلکہ وہ نثر میں بھی میر کو اسی شان اور تمکنت سے دیکھنا چاہتے تھے، جو درجہ غزل میں مقرر تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس تحقیق میں صفیر کو ناکامی ہوئی اور اردو نثری میدان سے میر کو فلمرد کرنا پڑا۔ چنانچہ میر و مرزا[1] کے سلسلہ میں تحریر کا جو نمونہ جلوۂ خضر میں پیش کیا گیا ہے اس میں مرزا کا نثری نمونہ اردو میں ہے لیکن میر کا نمونۂ فارسی پیش کیا گیا ہے۔ گویا صفیر بلگرامی کے ذہنی گوشہ نے میر کو غالب کا حریف بنانا چاہا لیکن پھر خود ہی اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ یا یہ کہ اپنے استاد غالب کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں اس موضوع سے جدا ہونا پڑا۔ بہرحال اس سے انکار نہیں۔ کہ غالب پہلا شخص ہے جس نے فارسی جو کہ اس زمانے میں مروجہ زبان تھی، کے برخلاف آسان اور سلیس اردو میں نثر لکھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کی نئی ادبی زندگی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان، نیز دلی کالج سے ہوئی۔ لیکن اس سے بھی کسی کو انکار ممکن نہیں کہ دلی کے ادب نواز یا ادیب صرف چار تھے: شاہ نصیر۔ ذوق - مومن اور غالب - لیکن غالب نے اپنے فطری رجحان سے اردو ادب میں تبدیلی کی، اس کے جمود کو توڑا بلکہ ہماری نئی نثر کی صحیح قدروں کو اجاگر کرنے اور روشناس کرنے میں غالب کا بہت زیادہ حصہ ہے یہی نہیں، اگر غالب کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے ایسے نقوش ملیں گے جو سادگی و پرکاری سے بھرپور ہوں گے اور کیفیت و جامعیت کا امتزاج بھی ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ تمام چیزیں یہاں مل جاتی ہیں جن کا ایک ادب میں ہونا لازمی ہے مثلاً اصلاح زبان، صحیح الفاظ، شستگی، مناسب تراش خراش، ذو معنی الفاظ، سادہ اور سلیس انداز - غرض وہ تمام لوازم جن سے زبان میں زندگی اور اس کا رچاؤ پایا جائے بہ درجہ اتم موجود ہے۔ سادہ اور سلیس استعمالِ زبان غالب نے میر ہی سے ترکہ کے طور پر پایا - میر نے اپنی غزلوں میں جس انا کو اجاگر کیا ہے، مروجہ روش سے جس طور سے انحراف کیا ہے، اس نے غالب کو چونکایا ہی نہیں بلکہ اپنا لینے پر مجبور کیا - مگر ہوا یہ کہ میر نے سادگی و پرکاری غزل میں سموئی، لیکن غالب نے مشکل پسندی کے باوجود اردو غزل اور نثر کو آسان اور بامحاورہ بنا دینے کی ایک بہتر مثال قائم کر دی۔ یہ ان کی عظمت کی نشاندہی کرتے اور ان کے معاصرین سے ممتاز بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام تذکرہ نویس غالب کی عظمت، ان کے فن، ان کی سوجھ بوجھ، ان کے جدید رجحانات کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نشانِ راہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگرچہ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا لیکن مغلیہ سلطنت کے تاجدار کے احکام سارے ملک میں جاری و ساری تھے یا کم سے کم دلی اور گرد و نواح میں یہی سکہ رائج تھا۔ اس طرح ہم اسے عبوری دور کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ دور پرانی دیوار کے گرنے اور نئی دیوار کے تیار ہونے کا وقفہ تھا۔ چنانچہ اگر اس وقت کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو صرف غالب کی شاعری اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ بصیرت، پیش بینی سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ گرچہ غالب بیک وقت رند، فلسفی اور صوفی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ غم ان کی آنکھوں سے چھلکتا ہے، لیکن وہ اس کشاکش کو دنیا کا مضحکہ اڑا کر چپ رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل غالب کی عظمت اور ان کا فن ہے جو ایک دور کی عکاسی اور نمائندگی بھی کرتا ہے اور پرانے دور و اقتدار کی صحیح حالت کا تجزیہ بھی پیش کرتا ہے - ورنہ:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ   تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یا

ضعف سے اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

کے تمثیلی اشعار پردۂ غیب سے ظہور میں نہ آتے!

---

[1] مرزا سودا سے مراد ہے۔

سنت رام

اُستاد علاؤ الدّین خاں

فن موسیقی کے لاثانی ماہر استاد علاؤ الدین کی کہانی اُن کی اپنی زبانی کا اُردو ترجمہ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

بیوی کی موت ہو جانے پر دینا ناتھ دیو شرما کے لئے اپنے گاؤں میں رہ سکنا دشوار ہو گیا تو وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے۔ گھومتے گھماتے وہ کُوکیوں میں پہنچ گئے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ آدم خور ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ کالی کے مندر میں پجاری بن گئے۔ یہاں وہ بالکل محفوظ تھے۔ پجاری کی طرف ان کالی کے بھگت کُوکیوں کی نظر میلا کیسے اُٹھتی۔ بلکہ وہ تو ان کے لئے نذرانہ اور چڑھاوا لانے لگے۔

لیکن براہمن دینا ناتھ کے بیٹے نے بڑے ہو کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے کُوکیوں کے ساتھ مل کر اپنا ایک گروہ بنایا۔ اور غریبوں کا خون چوسنے والے زمینداروں اور متمول سیٹھوں کے خزانے لوٹ کر غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں کلائیو نے جنگ میں فتح پائی۔ اور ان لٹیروں کو گرفتار کرنے کے لئے لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں اس براہمن کے بیٹے نے اسلام قبول کر کے اپنا نام سراجو رکھ لیا۔ سراجو ڈکیت کے نام سے ان دنوں لوگ کانپ اُٹھتے تھے۔ ایک دن سراجو نے سلہٹ کے ایک زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالا۔ وہاں اسے ایک چھوٹی سی بچّی، پچھوتے پر سوئی ملی۔ ڈاکہ کی پہلے سے ہی اطلاع مل جانے کے باعث گھر کے سب لوگ تو بھاگ گئے ــــ مگر گھبراہٹ اور پریشانی میں بچّی کو وہیں چھوڑ گئے تھے۔ سراجو اسے اپنے ساتھ لے آیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بھی پرورش کرنے لگا اور جب لڑکی بڑی ہوئی تو اپنے بیٹے سے ہی اس کا بیاہ کر دیا۔ اس کے بعد خود بھی وہ پیشہ چھوڑ کر تمبیرہ کے شو پور نامی گاؤں میں خانہ دار زندگی بسر کرنے لگا۔

اس لڑکی سے سراجو کے تین پوتے ہوئے۔ علی احمد۔ صالح احمد اور جعفر محمد۔ پھر جعفر محمد کے ایک بیٹا ہوا، مادر حسین۔ مادر حسین کے ہاں ایک لڑکا سعدو خاں پیدا ہوا۔ سعدو خاں کے پانچ بیٹے ہوئے۔ ثمر الدّین، آفتاب الدّین علاؤ الدّین اور حیات علی۔ یہی ہے میرا شجرۂ نسب۔

میرے والد بڑے سنگیت پریمی تھے۔ وہ عموماً بیس بائیس میل پیدل چل کر گانا بجانا سُننے جایا کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب الدّین کو بھی موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ وہ استاد انھیں موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ اس ماحول میں میں بھی سنگیت پریمی کیوں نہ ہوتا! آہستہ آہستہ سنگیت کی چاٹ اتنی بڑھی کہ اسکول جانے کے بہانے میں اپنے گاؤں کے شیو مندر میں چلا جاتا۔ اور سادھوؤں کا سنگیت سُنا کرتا۔

ایک دن یہ چوری پکڑی گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے گھر آ کر میرے اسکول نہ جانے کی شکایت کی۔ اس پر میرے والد صاحب نے تو کچھ نہیں کہا بلکہ وہ تو سادھوؤں کے ساتھ گانے بجانے میں حصّہ لینے پر خوش ہی ہوئے۔ مگر ماں کو بہت غصّہ آیا۔ گھر کی مالک تو وہی تھیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا اور تین دن تک تک کھانا پانی نہیں دیا اور خوب پیٹا۔ تیسرے دن میری بڑی بہن مدھو مالتی نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔

اس کے بعد ہی میں ماں کے صندوق سے دس بارہ روپے چُرا کر گھر سے بھاگ نکلا۔ آخر تھا تو ڈکیت خاندان کا ہی۔ گاؤں سے مانک نگر اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے

بذریعہ ریل نارائن گنج ہوتا ہوا سیالدہ پہنچ گیا۔ اب میں کلکتہ میں تھا اتنے بڑے شہر میں بالکل اکیلا، بے یار و مددگار اور نہ کوئی رہنے کا ٹھکانہ۔ ہیرسن روڈ سے ہوتا ہوا گنگا کے کنارے پہنچا اور رات وہیں گھاٹ پر بسر کی۔

سویرے اٹھ کر دیکھتا کیا ہوں کہ میری روپے کی تھیلی غائب ہے۔ دُکھ کے مارے رونے لگا۔ میرا واحد سہارا مجھ سے چھن گیا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر پولیس کا ایک سپاہی میرے پاس آیا۔ مگر میری دکھ کی کہانی سُن کر وہ الٹا مجھے ہی ڈانٹنے لگا۔

"بے وقوف کہیں کا، ایسے کہیں روپے رکھے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرا رونا بند نہ ہوا۔ اسی حالت میں اُٹھ کر چل دیا اور نیم تلہ گھاٹ پہنچا۔ وہاں کچھ سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ گانجے کا دور چل رہا تھا۔ انھیں سادھوؤں میں سے ایک نے میری بات سُن کر کہا "کچھ پروا نہیں۔ گنگا نہاؤ۔ اور وہ سامنے دیکھو، کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ وہاں جا کر پیٹ بھر کھاؤ....."

میں نے بھی یہی کیا۔ ان لولے، لنگڑے، اندھے اور کوڑھی بھکاریوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور رات میں ایک ڈاکٹر کی دوکان کے باہر چبوترے پر سو گیا۔

اس طرح دن کٹنے لگے۔ کنگالی لنگر میں جا کر پیٹ بھرتا۔ اور ڈاکٹر کی دوکان کے باہر چبوترے پر سو جاتا۔ بہت سے لوگوں نے میرا پتہ، ٹھکانہ اور مقصد پوچھا۔ ان سب کو میں نے یہی بتایا "میں گانا، بجانا سیکھنے آیا ہوں۔ استاد کی تلاش میں ہوں" میرے ہم عمر، چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑے شوق سے مجھ سے سوال کرتے اور ان سب سے یہی کہہ دیتا۔

ایک دن ایک لڑکے نے مجھ سے کہا "میں ایک استاد سے سنگیت سیکھتا ہوں۔ چلنا چاہو تو چلو وہیں۔" میں بڑی خوشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ اُستاد تھے۔ لُلّو گوسوامی مشہور دھروپد گانے والے۔ خیال بھی گاتے تھے۔ انھوں نے کہا۔ بارہ برس تک موسیقی کی مشق کرنی ہوگی۔ میں نے فوراً کہا کہ میں عمر بھر کروں گا۔ درخواست منظور ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا۔ اب میں دن رات میں صرف ایک ہی وقت کنگالی لنگر میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اور گانا سیکھتا۔ گورو جی بڑی لگن سے گانا سکھاتے۔ انھوں نے مجھے تین سو ساٹھ پلٹے سکھائے ساتھ ہی تان بھی۔ ایک دن پلیگ کی بیماری میں اچانک گورو دیو اس دنیا سے رحلت کر گئے اور میں پھر بے سہارا رہ گیا۔

اس کے بعد میں وویکانند جی کے بھائی ہابودت کے پاس گیا۔ وویکانند جی کا تو سارا خاندان ہی سنگیت پر مبنی تھا۔ خود وہ اچھا دھروپد گاتے تھے۔ ہابودت کلارنٹ، ستار اور دوسرے کئی ساز بجاتے تھے۔ نیشنل تھیٹر کا کنسرٹ بھی وہی تیار کرتے تھے۔ ان سے میں بیلا سیکھنے لگا۔ پھر انگریزی بینڈ اور شہنائی کی طرف رجوع ہوا اور اُن کی تعلیم بھی لینے لگا۔ ہابودت کے کنسرٹ کا راگ ہوتا تھا ایمن۔ ایک ایک دن میں بیٹھ کر ان سے چار یا پانچ گت سیکھتا۔ اس طرح ترقی کی راہ پر میں بڑی تیزی سے چلنے لگا۔

میرے ایک دوسرے محسن تھے نندو بابو، وہ لُلّو بابو کے ساتھ مردنگ اور طبلہ بجاتے تھے۔ اُس طرف بھی میرا دھیان گیا۔ اور ان سے میں مردنگ اور طبلہ سیکھنے لگا۔ موسیقی سے میرا اتنا لگاؤ دیکھ کر بابو بابو بہت متاثر ہوئے انھوں نے مجھے سبھی ساز سکھانے کا وعدہ کیا اور منروا تھیٹر میں جس کے مالک گریش گھوش تھے بارہ روپے ماہوار پر نوکر بھی رکھوا دیا۔ اب میں تھیٹر میں کام کرتا اور سنگیت بھی سیکھتا۔ اس دوران میں میں نے مشہور وائلن بجانے والے لوبو صاحب سے وائلن اور ان کے اُن شاگرد سے کلارنٹ سیکھا۔ ادھر ہابودت کلارنٹ اور ہزاری استاد شہنائی، نقارہ اور چکارہ سکھا ہی رہے تھے۔ ڈھائی برس تک ایسے ہی کام چلتا رہا اب مجھے سنگیت آ گیا تھا اور مجھے اپنی لیاقت پر غرور ہونے لگا۔ ایک دن مکتا گاچھا کے راجہ صاحب کے پاس پہنچا اور ان کے پوچھنے پر بڑے غرور کے ساتھ بولا۔ "میری طرح کا استاد تو آپ کو سارے ملک میں نہیں ملے گا۔ دنیا کا ہر باجہ میں بجا سکتا ہوں۔" یہ سب کچھ بلاشبہ تھیٹر کی بُری صحبت کا نتیجہ تھا۔ میری بات سُن کر راجہ صاحب نے مجھے دوسرے دن سویرے آٹھ بجے اپنے ہاں آنے کو کہا۔ اس وقت میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔

دوسرے دن جب میں راجہ صاحب کے ہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک شاندار محفل جمی ہے اور لمبی داڑھی والے ایک صاحب سرود کا سُر ملا رہے ہیں۔ اُدھر وہ ٹوڈی کا سُر باندھنے لگے اور اِدھر میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں چیخ مار کر رونے لگا۔ ان کے پاؤں پکڑ کر میں نے کہا "آپ ہمارے گورو ہیں، میں آپ کے گھر میں جھاڑو دوں گا۔ سب کام کروں گا۔ مجھے اپنا کی تعلیم آپ دیجئے۔" مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میرا بُرا حال تھا۔ اسی دن میں اس ماہرِ موسیقی کا شاگرد بنا۔ یہ ماہرِ موسیقی تھے رام پور ریاست کے مشہور و معروف استاد احمد علی عابد علی کے بیٹے۔

اب میں انھیں کے ساتھ رہ کر موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ان کے لئے میں ہی کھانا پکاتا۔ گھر کا سب کام کاج کرتا۔ وہ سویرے سویرے

چائے پی کر کلکتہ چلے جاتے اور میں باورچی خانہ میں بیٹھ کر چوری چوری سرود بجانا سیکھتا۔ چوری چوری اس لئے کہ ایک سال تک وہ مجھے سرگم ہی سکھاتے رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے ساتھ باہر بھی لے جاتے۔ ایسے موقعوں پر طبلہ یا بیلا بجانے کی اُجرت کے طور پر پچیس تیس روپے مل جاتے تھے۔ استاد کو مجھ پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ اپنے سارے روپے پیسے مجھے ہی رکھنے کے لئے دیتے تھے۔ اور بوقت ضرورت مانگ لیتے تھے۔ اسی طرح چار سال گزر گئے۔ اس کے بعد ایک دفعہ وہ ملک میں دو تین جگہ موسیقی کے پروگرام میں شرکت کے لئے گئے۔ وہیں سے مجھے رام پور لے گئے۔ میں نے وہاں دیکھا کہ ان کا مکان مٹی کا ہے اور اوپر کھپریل پڑی ہوئی ہے۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا۔ آپ کے روپے کافی ہو گئے ہیں میرے پاس۔ حساب کر لیتے تو اچھا تھا۔ وہ چونک پڑے "روپے کیسے روپے؟ اب تک تو کسی نوکر نے روپوں کا حساب مجھے نہیں دیا۔" میں نے ان کے سامنے مہروں کا بھرا صندوق رکھ دیا۔ اس میں گرو دکشنا (استاد کے نذرانہ) کے طور پر میں نے اپنے کچھ روپے بھی شامل کر دیئے تھے۔ کل ملا کر لگ بھگ دس ہزار روپے تھے۔ اتنے روپے پا کر اُن کے ماں باپ بہت ہی خوش ہوئے اور جلد ہی انھوں نے اپنا نیا مکان بنانا شروع کر دیا۔ اب مجھے پھر ایک مشکل سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ استاد کے والد صاحب عابد علی نے مجھے بُلا کر کہا۔ تم نے میرے بیٹے سے جتنا سیکھنا تھا سیکھ لیا۔ اب وزیر خاں کے پاس جا کر ان سے بھی کچھ سیکھو ایک ہی شخص سے سیکھ کر موسیقی کا مکمل علم حاصل نہ کر سکو گے۔ مگر وزیر خاں سے ملنا کوئی آسان نہ تھا۔ لاکھ کوشش کی۔ مگر اُن کے دولت خانے میں داخل نہ ہو سکا۔ آخر ہار کر میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ ایک مولوی صاحب نے مجھے بچا لیا اور نواب صاحب رام پور کے دربار میں رسائی کی صورت پیدا کر دی۔ اس وقت رام پور دربار میں سات سو گانے بجانے والے تھے۔ خود نواب صاحب کو بھی موسیقی کی اچھی واقفیت تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو نواب صاحب نے مجھ سے کہا۔ "میں گاتا ہوں۔ تم بیلا پر سنگت کرو۔" انھوں نے گایا اور میں نے سنگت کی۔ میں اُن کے گانے پر فریفتہ ہوا اور وہ میرے باجے پر۔ انھوں نے مجھے نوکری دینا چاہی مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور وزیر خاں صاحب سے تعلیم لینے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے فوراً وزیر خاں کو بُلایا اور مجھے شاگرد کے طور پر ان کے سپرد کر دیا۔ شاگرد بنانے وقت مجھ سے یہ وعدہ لیا گیا کہ میں اپنا علم کسی نا اہل کو نہیں دوں گا۔ بُری صحبت میں نہیں جاؤں گا۔ اپنے اس علم کے بدلے کسی سے کچھ مانگوں گا نہیں کسی رنڈی کو گانا بجانا نہیں سکھاؤں گا۔

اب میں اپنے گورو جی کے ساتھ رہنے لگا۔ دن بھر اُن کے جوتے، حقے پان دان، کھڑاؤں وغیرہ کی صفائی کرتا۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا تھا۔ "اپنے گورو جی کی خوب خدمت کرنا۔ روپے کے زور سے نہیں، خدمت کے زور سے ہی یہ علم سیکھا جا سکتا ہے۔" ان کی ہدایت کے مطابق میں ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے گانے بجانے بیٹھتے تھے اور تڑکے تڑکے سوتے تھے۔ پھر آٹھ بجے سو کر اُٹھتے تھے۔ ان کے اُٹھنے سے پہلے ہی پاخانے کو فینائل سے دھو کر صاف کر دیتا تھا۔ بدھنے میں پانی بھی بھر دیتا۔ اس وقت سے جو میرا کام شروع ہوتا تو دن بھر یونہی چلتا رہتا تھا۔ ان کے کسی بھی کام کے لئے میں نے کبھی چون و چرا نہیں کی۔

استاد کی رہائش گاہ کے قریب ہی میں ایک گھر میں رہتا تھا۔ خدمت میں لگے رہنے کے باعث دن بھر تو مجھے وقت ملتا نہیں تھا۔ اس لئے شام کو سات بجے ریاض کرنے بیٹھتا۔ پھر سویرے چائے پینے کے بعد بھی وقت نکال کر تھوڑا گانا بجانا۔ بھیروی مجھے بہت پسند تھی۔ اس لئے سویرے عموماً بھیروی ہی چھیڑتا۔ لیکن اب تک استاد نے مجھے کچھ سکھانا شروع نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ڈھائی برس گزر گئے۔ ان دنوں میں صرف چنے کھا کر پانی لیتا تھا اور بس۔

ایک دن استاد کے پاس میرے گھر سے تار آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ میری بیوی نے جس کے ساتھ میرا بیاہ سات برس کی عمر میں کر دیا گیا تھا۔ تین تین بار خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس تار کے ملنے کے بعد سے ہی استاد کا میرے ساتھ رویہ ایک دم بدل گیا۔ اور انھوں نے خود اور اپنے لڑکے کے ذریعے مجھے سرود سکھانا شروع کیا۔ وہ میری تعلیم پر کافی محنت کرنے لگے۔ میرے کھانے پینے کا انتظام بھی انھوں نے اپنے ہی گھر کر دیا۔ اسی اثنا میں میں رام پور کی بینڈ پارٹی میں ایک گھنٹہ بیلا بجانے کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ جس کے بدلے میں مجھے بطور اُجرت بارہ روپے ملتے تھے۔

تعلیم کا یہ سلسلہ تیس سال تک چلا اور کئی سازوں اور باجوں سے میری واقفیت ہو گئی۔ تب ایک دن استاد جی نے کہا۔ جاؤ سیر و سیاحت کرو۔ تعلیم، اوپدیش اور تجربہ یہ تینوں ہی علم ہیں۔ باکمال لوگوں کا گانا بجانا سنو اور انھیں اپنا گانا بجانا سناؤ۔

چناں چہ میں ملک کی سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ کئی جگہوں کی سیر کرتے کے بعد کلکتہ پہنچا۔ وہاں بھوانی پور میں ایک محفلِ موسیقی کا انتظام کیا گیا۔ جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ لیکن بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی کے سامنے میری کیا پوچھ ہوتی۔ اس پر میرا پہناوا بھی سیدھا سادہ تھا۔ لیکن جب میری باری آئی اور میں نے طنبورے پر ایک تان چھیڑی تب لوگوں کا دھیان میری طرف ہوا۔ پورے آدھ گھنٹے تک ولمبت کا آلاپ لیتا رہا۔ لوگوں کو اب کہیں جاکر یقین ہوا کہ میں بھی کچھ سنگیت جانتا ہوں۔ اب تو محفل کا یہ حال تھا کہ کوئی پان کھانے جارہا تھا تو پان ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ سگریٹ جلانے کی کوشش کرنے والے لوگوں کا سگریٹ منہ میں مگر دیا سلائی ہاتھ میں جوں کی توں، پورے چار گھنٹے گزر گئے سب کے سب ششدر، طبلچیوں کی تو حالت نہ پوچھئے۔ اب ہر طرف سے لوگ مجھے شاباش دے رہے تھے۔ میرا دل اپنے استاد کے لئے جذبۂ احترام سے بھر اٹھا۔ میری ریاضت بے کار نہیں گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس کا مظہر تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں شام لال کھتری کے کہنے پر میہر ریاست میں آیا اور وہاں کے راجہ صاحب نے مجھے سنگیت سکھانے کے لئے اپنے پاس رکھ لیا۔ لیکن جب انھوں نے میری تنخواہ طے کرنی چاہی تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سنگیت سکھانے کے لئے میں کوئی معاوضہ نہیں لے سکتا۔ تب انھوں نے مجھے دیوتر جائداد کا منتظم مقرر کر دیا اور اس حیثیت سے ایک سو پچاس روپے ماہوار دینے لگے۔ راجہ صاحب کو میں نے سنگیت سکھایا اور اس کے بعد شاہی خاندان کا معلمِ موسیقی بن گیا۔ اس دوران میں ملک کے دوسرے لوگوں نے بھی میری تعریف کی اور اس سے میری ہمت بڑھتی گئی موسیقی کی مشق جاری رہی اور آج تک قائم ہے۔ ایک بینڈ پارٹی بھی میں نے میہر میں قائم کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ذریعے بھی فنِ موسیقی کی کچھ خدمت ہو رہی ہے۔ اسی یقین پر اپنی زندگی کے دن بتائے جارہا ہوں۔

آخر میں ایک دو باتیں اپنے خاندان اور خیالات کے بارے میں بھی کہہ دوں۔ میری پیدائش ۱۸۶۲ء میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے اب میری عمر ۹۴ برس کی ہے۔ میرے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ میرے بیٹے علی اکبر سے آپ سب واقف ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں۔ سروجنی، انّ پورنا اور جہاں آرا۔ انّ پورنا کے باعث مجھے ایک اور گویا بیٹا مل گیا ہے یعنی روی شنکر داماد کی شکل میں۔ میری بیٹیوں کے نام اور ہندو داماد کی بات سے آپ کو کچھ اچنبھا ہوتا ہوگا۔ لیکن حقیقت میں میں ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں مانتا۔ میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ یہ تو آپ جان ہی گئے ہیں۔ اپنے پوتے کا نام میں نے ایسا ہی رکھا ہے۔ محمد آشیش۔ مسلمان ہونے کے باعث محمد اور ہندو ہونے کے باعث آشیش گوشت بھی میں نے کبھی نہیں چھوا — اسے آپ میرا ہندو پن کہئے یا اور کچھ ماتا سرسوتی کا ایک ادنےٰ سا پجاری ہوں۔ حقیقتاً یہی میرا مذہب ہے یہی میری ذات اور یہی سب کچھ۔

رند فیض آبادی

غزل

ہم جو جینے کا حوصلہ کرتے — خونِ دل سے چمن ہرا کرتے
اہلِ گلشن ہی بے خبر ٹھہرے — خوشہ چینوں سے کیا گلہ کرتے
حادثوں کا شمار ہو نہ سکا — خونِ دل کا حساب کیا کرتے
ہم کو اپنوں سے رنج پہنچے ہیں — غیر کیا ہم کو بے مزہ کرتے
جاگ اٹھتا ہے زندگی کا گداز — ورنہ نغموں سے دل جلا کرتے
دل کے جلنے کی بو نہیں چھپتی — اشک ہوتے تو پی لیا کرتے

جام خالی ہی ہو گئے ورنہ
رندؔ اپنا بھی تجزیہ کرتے

مظفرؔ شاہ

اقوامِ متحدہ اور ہندوستان

ہندوستان شروع ہی سے اقوام متحدہ میں شامل ہے۔ ہندوستان نے سان فرانسسکو چارٹر پر دستخط کئے تھے جس کی رو سے ادارۂ اقوام کا قیام عمل میں آیا۔ اس چارٹر میں کہا گیا ہے کہ اس ادارہ کی بنیاد تمام ممبر قوموں کی خود مختاری اور برابری کے اصول پر قائم ہے۔

دُنیا کی مجالس میں پہلی مرتبہ آزاد ہندوستان کی آواز اس وقت سُنی گئی جب کہ ستمبر ۱۹۴۶ء میں نئی ایگزیکیٹو کونسل بنی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کونسل کے نائب صدر اور امورِ خارجہ کے ممبر کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ وہ اور اُن کے ساتھی اس توقع پر حکومت میں شامل ہوئے ہیں کہ ملک کو بہت جلد مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نئی حکومت بین اقوامی کانفرنسوں میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پورا حصہ لے گی اور خود اپنی پالیسی پر عمل درآمد کرے گی، کسی دوسری قوم کے ضمیمہ بردار کی حیثیت قبول نہ کرے گی۔

چناں چہ ۱۹۴۶ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستانی نمائندوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ پنڈت نہرو جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے حکومت میں شریک ہوتے وقت جن اصولوں کی وضاحت کی تھی انھیں پر ہندوستانی نمائندوں نے عمل کیا۔ پنڈت نہرو نے کہا تھا "خارجی معاملات میں ہندوستان ایک آزاد پالیسی اختیار کرے گا اور ان سیاسی دھڑے بندیوں سے الگ تھلگ رہے گا جو ایک دوسرے کے خلاف قائم ہوں گی۔ ہندوستان محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت کرے گا اور جہاں کہیں بھی نسلی امتیاز برتا جاتا ہے اُس کی مخالفت کرے گا۔ وہ بین اقوامی تعاون اور خیر سگالی کے لئے دوسری امن پسند قوموں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ جس کا مقصد یہ ہو گا کہ کوئی ایک قوم دوسری قوم سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوستان چارٹر کی روح اور الفاظ کے مطابق اقوام متحدہ کے ساتھ پورا پورا تعاون اور غیر مشروط وفاداری کا برتاؤ کرے گا۔ اسی مقصد کے لئے ہندوستان اس ادارہ کے مختلف کاموں میں پورا پورا حصہ لے گا اور جہاں تک ہندوستان کی جغرافیائی حیثیت، آبادی اور پُر امن ترقی میں حصہ لینے کا تعلق ہے وہ ادارہ اقوامِ متحدہ کی مختلف انجمنوں میں اپنا یہی رول ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔"

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پوری طرح آزاد ہوا تو اس نے نہ صرف اقوامِ متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے تمام ذمہ داریوں کو قبول کیا بلکہ اس کی خارجی پالیسی کی بنیادی باتیں بھی وہی رہیں۔ چناں چہ اس نے اندرونی اور بیرونی مسائل میں انھیں اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اس میں ہندوستان کی دل چسپی صرف اپنے متعلقہ مسائل تک محدود نہ رہی بلکہ اُس نے دوسرے اہم مسائل اور خاص کر امنِ عالم سے متعلق تمام مسائل میں گہری دل چسپی لی۔ اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ کیونکہ ہندوستان کا شروع سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ ان سب کی بقا امن و سلامتی میں ہے۔ وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کا خیال ہے کہ دنیا کو مخالف کیمپوں میں بانٹ دینے کا طریقہ ہی جھگڑے کی جڑ ہے جس کو دُور کرنا ضروری ہے۔ اس سے زبردست خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے جس سے انسانوں کے دماغ دھندلا جاتے ہیں اور وہ غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں۔ اسی مقصد سے ہندوستان ان تمام کارروائیوں کو بڑی دل چسپی کی نظر سے دیکھتا رہا ہے جو ادارۂ اقوامِ متحدہ کو

عالمی امن وسلامتی کی حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی خاطر کی جاتی رہی ہیں۔ ۱۷ جنوری کو پارلیمنٹ میں وزیراعظم نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"اقوام متحدہ کو امن کے لئے ایک بڑی تنظیم سمجھنے کے بجائے اس کے کچھ ممبر رفتہ رفتہ اسے ایک ایسی تنظیم سمجھنے لگے ہیں جس کے ذریعہ جنگ چھیڑی جا سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام کی پشت پر جو اصلی خیال تھا وہ اس خیال سے بہت دور ہے اور اگرچہ اقوام متحدہ کا چارٹر موجود ہے لیکن کسی نہ کسی طرح حقائق نے جھٹلانا شروع کر دیا۔"

اس کے علاوہ ہندوستان نے امن کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے بہت سے عملی قدم بھی اٹھائے۔ کوریا کی لڑائی سے متعلق مسائل کو حل کرنے میں اس نے جو حصہ لیا وہ اس بات کی نہایت شاندار مثال ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہندوستان نے جنگی قیدیوں کے الجھے ہوئے مسئلہ کے حل کے لئے ایک تجویز پیش کی چنانچہ ۱۹۵۳ء میں ہندوستانی تجویز کی بنیاد پر ہی جنگی قیدیوں سے متعلق سمجھوتہ عمل میں آیا۔ ہندوستان نے اس سمجھوتہ پر عمل درآمد کرانے میں بھی اہم پارٹ ادا کیا۔ وہ قیدیوں کی واپسی کے غیر جانبدار قوموں کے کمیشن کا چیئرمین بھی تھا۔ اور اس کمیشن کی امداد کے لئے مسلح فوجیں اور دیگر کارکن بھی ہندوستان ہی نے مہیا کئے تھے۔

جن دیگر مسائل میں ہندوستان کی مساعی بہت نمایاں رہیں۔ ان میں تخفیف اسلحہ اور ایٹمی طاقت کے بین اقوامی کنٹرول کی تجویزیں شامل ہیں۔

ہندوستان نے یہ بھی محسوس کیا کہ اقوام متحدہ عالمی معاملات اسی وقت اپنا اخلاقی اثر ڈال سکتی ہیں جب کہ یہ ادارہ وسیع بنیادوں پر قائم ہو۔ اور بین اقوامی صورتِ حال سے متعلق موجودہ سیاسی اور فوجی حقائق کا آئینہ دار ہو۔ اسی وجہ سے ہندوستانی نمائندے برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اقوام متحدہ کے دروازے سب قوموں کے لئے کھلے ہوں اور چین کی قومی جمہوریہ کو اس ادارہ میں اس کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔ چونکہ چین کی عوامی جمہوریہ کی حکومت ہی ملک پر مؤثر کنٹرول رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو اقوام متحدہ میں نمائندگی کا پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اقوام متحدہ کے دائرے میں ان عالمی مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی یہ کوشش بھی رہی کہ بین اقوامی میدان میں جنگ اور ایسے دیگر مسائل کے بنیادی اسباب کو دور کیا جائے۔ ان میں سے بعض سبب یہ ہیں: ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتدار، نسلی امتیاز، غریبی، بیماریاں اور جہالت۔ آج انسانیت کا ایک بڑا حصہ ان کا شکار ہے۔ اور انہیں دور کرنے کے لئے اقوام متحدہ جیسے بین اقوامی ادارہ کو اہم کام کرنا ہے۔ اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ایک سچے بین اقوامی ادارہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کا دنیا بھر میں وقار قائم ہو۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے ہندوستان شروع سے ہی اقوام متحدہ کے ساتھ پورا پورا تعاون اور غیر مشروط وفاداری پر عمل پیرا رہا ہے۔

ساحر ادیبی

غزل

ادب ہے شرط کہ ہے ان کی بارگاہِ جمال
یہاں جبینِ محبت جھکا کے بات کرو

سمجھنے والے سمجھ لیتے ہیں اشارے بھی
یہ کیا ضرور ہے سب کو سنا کے بات کرو

فرازِ طور پہ ہوتی نہیں جس طرح باتیں
یونہی ہمیں بھی کسی دن بلا کے بات کرو

فریب ہے یہ محبت، نہ تم کہو ناصح
نظر کا تیر کلیجے پہ کھا کے بات کرو

چمن میں ہو جو کسی گل سے گفتگو ساحر
تو نوکِ خار سے دامن بچا کے بات کرو

ع۔م

نئی کتابیں

انقلابِ روس اور روس انقلاب کے بعد

مُصنف م۔م۔جوہر، ناشر مکتبہ بُرہان اردو بازار دہلی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۶۲۸ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ، کاغذ اوسط، جلد اور جلد پوش اوسط سے بہتر۔ قیمت سات روپے۔

شروع میں ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی تقریظ ہے۔ کتاب کے پہلے حصّے میں انقلابِ روس کے محرکات اور لینن کی رہنمائی میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تفصیلات ہیں۔ دوسرے میں ۱۹۲۵ء سے دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کی شکست تک کے حالات کا تفصیلی بیان اور جائزہ ہے یہ کتاب بڑی مفصل اور جامع ہے مُصنّف نے بڑی محنت اور کاوش سے مستند بیانات کی بنیادوں پر اس تصنیف کو مکمل کیا ہے۔ لینن نے مارکس کی تعلیمات کی بنیاد پر انقلاب کا جو نظریہ قائم کیا تھا مُصنّف اس کے حامی ہیں اور بڑی دیانت داری سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اردو میں ایسی کتابیں کم ہیں۔ معلومات سے پُر یہ کتاب اردو داں حضرات کے لئے یقیناً دل چسپی کا سامان ہوگی۔ قطع نظر اس کے کہ انھیں مُصنّف کے خیالات سے اتفاق ہو یا اختلاف۔

میر کی آپ بیتی

میر محمد تقی میرؔ کی خود نوشت سوانح عمری، ذکرِ میر کا اردو ترجمہ ضروری حواشی اور تعلیقات کے ساتھ۔ مرتب و مترجم نثار احمد فاروقی۔ ناشر۔ مکتبہ برہان، اُردو بازار دہلی ۶۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

نثار احمد فاروقی ان نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جو ادب کا مطالعہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے کرتے ہیں۔ اتنی کم عمری میں آپ نے سُلجھے ہوئے ادیبوں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ یہ مفید اور دل چسپ کام بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذکرِ میر فارسی میں تھی اور وہ بھی کم یاب۔ اب اردو میں اس کا ترجمہ ہو گیا تو وہ لوگ جن کی دسترس فارسی تک نہیں اسے پڑھ کر میرؔ کے مستند حالاتِ زندگی اور اُس عہد کی تاریخ کے مطالعے سے بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔

بیگماتِ اودھ

مُصنّف شیخ تصدق حسین۔ پبلشر کتاب نگر۔ دین دیال روڈ لکھنؤ۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ تقطیع کے ۲۰۸ صفحات قیمت تین روپے کتابت دطباعت اوسط

شیخ تصدق حسین نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ تاریخِ اودھ کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ یہ کتاب اُسی طویل مطالعے کا نتیجہ ہے۔ زبان سادہ اور بامحاورہ ہے۔ بیان میں مبالغے کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ نواب سعادت خاں برہان الملک سے لے کر نواب سعادت علی خان تک پانچ نوابوں کی بیگمات کے ذکر کے بعد شاہ زمن غازی الدّین حیدر بادشاہ اوّل اور اس کے بعد کے چار بادشاہوں کی بیگمات کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں ہے۔ جانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہِ پنجم تھے۔ انھیں کی بیگمات کے حالات پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔ کتاب بڑی دل چسپ ہے اور قدر افزائی کی مستحق۔

چراغ فکر

من موہن تلخؔ کا مجموعۂ کلام۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ ناشر مکتبۂ قصرِ اردو، اردو بازار دہلی۔ تلخؔ بڑے ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں۔ مطالعہ اور اُس کے بعد فکر ان کا محبوب مشغلہ ہے سُونی زندگی اور اس کا ویرانہ پن انھیں اس قدر پسند ہے کہ یہ اسے دُور کرنے کا نہ جتن کرتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

ویرانۂ ہستی میں خلاؤں کی ہے گونج

ہیں کس پہ صداؤں کو ئی آواز بھی ہو

لیکن یہ بات بڑی حوصلہ افزا ہے کہ "تلخ" غمِ ایّام کی تلخیوں سے گھبراتے نہیں ان کی زندگی، مایوسیوں، محرومیوں اور ناشادیوں کا مجموعہ سہی لیکن وہ اِن تمام مدارجِ زندگی میں اپنے فکر کے فلسفیانہ انداز کو نہیں چھوڑتے۔ اُمید کی کرن کبھی کبھی پھوٹتی ہے تو بے پناہ اُجالے کی حامل ہوتی ہے۔

شکستہ پا کو بھی اب ذوقِ رہ نوردی ہے　　دلوں میں ہم نے وہ دُھن منزلوں کی بھردی

"تلخ" کا بیشتر کلام نہ غمِ جاناں ہے نہ غمِ دوراں، اس میں خود اپنا غم ہے۔ اپنی زندگی کی تصویر ہے۔ انداز قنوطی ہی سہی لیکن اس حدیثِ جاں گداز میں چونکہ حقیقت ہے اس لئے دل میں کُھب جاتی ہے۔ "تلخ" کا کلام ایک اٹھتے ہوئے شاعر کا کلام ہے۔ وہ شعور و آگہی کی پُرثبات منزل میں ہیں۔ ان کے کلام میں تنوع ہے۔ غزل، رُباعی اور نظم سب اصناف پر انھیں قدرت ہے۔ ان کی زبان لطیف ترکیبوں کی حامل ہے۔ وہ زبان کے عامیانہ پن اور عام اصطلاحات سے بچتے ہیں اور اس میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ایک نسبتاً کم عمر شاعر کے کلام میں اگر کہیں کہیں زبان و بیان کا سقم ملے تو یہ کہہ کر خاموش ہونا پڑے گا

ع　گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

اتنی گنجائش نہیں کہ کلام پر طویل تبصرہ یہاں درج ہو۔ ورنہ تلخ کا کلام۔ اس امر کا متقاضی ہے کہ اُس پر تفصیل سے لکھا جائے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ "تلخ" کی زندگی میں وہ وقت بھی آئے جب وہ اسکی رنگینیوں اور دلآویزیوں سے ہم کنار ہو۔ جب دنیا میں اُسے وہ لوگ بھی ملیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکے۔ یوں تو آہ میں جو لُطف ہے واہ میں نہیں پھر بھی ہم متمنی ہیں کہ "تلخ" یہ کہنے پر مجبور نہ ہو۔

دوستی کا کوئی فریب ہی دے　　اس قدر زندگی میں تنہا ہوں

اُردو کے چاند تارے یا مرقعِ شعرائے اُردو

مرتب امیر حسن نورانی۔ ناشر راجہ رام کمار بک ڈپو۔ وارث نول کشور بک ڈپو لکھنؤ۔ ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ کتابت، طباعت، جلد عمدہ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ اس کتاب میں اردو کے باکمال شاعروں کا مصوّر تذکرہ و نمونۂ کلام ہے۔ امیر خسرو سے لے کر فیضؔ تک ۹۴ شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس حسین و جمیل کتاب کو نادر تصاویر کی بناء پر ہر لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔

نامہ ہائے پدرے بدخترش

پنڈت جواہر لال نہرو نے جو خطوط اندرا گاندھی کو دو اڑھائی سال کی مدّت میں جیل سے لکھے تھے۔ ان میں تاریخِ عالم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ خطوط انگریزی میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا ترجمہ فارسی میں محمود تفضلی نے کیا ہے اور یہ کتاب ایران میں چھپی ہے۔ کتاب مصوّر ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ کتاب فردوسی پریس تہران میں خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔

حسرت کدہ

شفقت کاظمی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر علمی کتب خانہ مظفر گڑھ (پاکستان) قیمت تین روپے۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کتابت، طباعت، جلد اوسط، جلد پوش عمدہ۔

شفقت کاظمی حسرت موہانی کے نامور شاگرد ہیں۔ غزل آپ کا میدانِ سخن ہے اور اس میں بھی حسرت ہی کا انداز نمایاں ہے۔ نیاز فتح پوری اور سالک نے کتاب کے شروع میں مصنّف کو دادِ سخن دی ہے۔ نیاز کا قول ہے۔

ایک اچھے شعر کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر ہم اس کی خوبیوں کو بیان کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں اور یہ خصوصیت ہم کو کلام شفقت میں زیادہ ملتی ہے۔

انھیں کے قرب کی حسرت رہی مجھے شفقت　　جو میری بزمِ تصوّر میں بار بار آئے

آہ وہ ماجرائے دردِ جگر　　جو کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

سالک صاحب کا قول ہے۔ شفقت کاظمی کی غزل میں وہی خوشبو محسوس ہوتی ہے جس سے کلامِ حسرت مہک رہا ہے۔ وہی مہذب و شائستہ اسلوبِ اظہار، وہی نچے تُلے الفاظ و تراکیب، وہی عشق و تصوّف کی آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی آگ شفقت کاظمی کے کلام میں موجود ہے۔

اب یہ اپنے سے ہے گلہ مجھ کو　　تجھ سے کیوں رسم و راہ پیدا کی

آباد رہے دیار تیرا　　کچھ روز قیام کر چلے ہم

دُنیا طلبی سے تنگ آ کر　　دنیا کو سلام کر چلے ہم

ان بھاری بھر کم آرائے سے مرعوب نہ ہو کر شفقت کے کلام کو دیکھئے۔ ہر صفحہ سہل ممتنع اور برجستہ اشعار کا حامل ہے۔ کلام میں محبت کی پاکیزگی، جذبۂ عشق کی وارفتگی اور صفائی زبان و بیان کی عذوبت و حلاوت ہر جگہ ملے گی۔

یہ رنگ اگر ہے بے کسی کا　　دل ٹوٹ نہ جائے زندگی کا

دیکھا تھا جو اک بار تجھے آنکھ اٹھا کر　　اب تک ہیں مری سمت زمانے کی نگاہیں

اُن سے اظہارِ حال کون کرے　　وہ مری بات کم سمجھتے ہیں

شفقت کاظمی نے ڈیرہ غازی خان ایسے دُور افتادہ مقام پہ زندگی بسر کی ہے۔ زبان میں یہ لوچ اور رس اللہ کی دین ہے۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ

شاید دلّی اور لکھنؤ تک کبھی آئے بھی نہیں - ان کا یہ شعری کارنامہ ہر حیثیت سے داد اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے -

زمزمستاں

حسن عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ جو غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے - ضخامت ۱۷۶ صفحات - قیمت تین روپے - ملنے کا پتہ - پروفیسر حسن عظیم آبادی گورنمنٹ کامرس کالج چٹاگانگ - مشرقی پاکستان - پیش لفظ حضرت جمیل مظہری نے لکھا ہے - حسن کے کلام میں بڑی گوناگونی ہے - کہیں وہ زندگی کی دشوار گزار راہوں کو طے کرتے اور کہیں حسن کی دلآویزیوں کے ساتھ کھیلتے نظر آرہے ہیں -

کھڑا ہوں بن کے میں کوہِ عزائم ——— پلٹ جائیں نہ کیوں طوفاں کے دھارے

حاصلِ عمر بن گئی ہیں حسن ——— حسنِ ایماں شکار کی باتیں

حسن کا کلام بڑا صاف اور ستھرا ہے - بیان کے البیلے پن کے ساتھ فکر کی سنجیدگی بھی کمیاب نہیں - اس دور میں جب کہ بہکی بہکی شاعری کی فراوانی ہے اس طرح کا سکون آمیز اور ٹھہراؤ کا حامل کلام بڑی غنیمت چیز ہے -

موصولات

لکھنؤ اور جنگ آزادی

۱۸۵۷ء اور اس زمانے کے حالات جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے - ضخامت ۱۳۶ صفحات - قیمت عہ - ملنے کا پتہ - ادبی اکاڈمی نیا گاؤں لکھنؤ یا مکتبہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ -

ادبی تجزئے

پروفیسر مبشر علی صدیقی کے مضامین کا مجموعہ - ضخامت ۹۶ صفحات - قیمت عہ - ملنے کا پتہ - سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ رسالہ رہنمائے تعلیم مفتی والان دہلی -

سوزِ مسلسل

فرحت انوار صاحب کے افسانوں کا مجموعہ - پبلشر بیگ اینڈ سنز ناقد بک ڈپو کراچی - قیمت تین روپے - شاہد احمد دہلوی نے مصنف کے باب میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے -

"فرحت انوار صاحب کے تمام افسانے روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی ہیں ...... ان میں مریضوں کا ذکر ہوتا ہے مگر ان کے افسانے مریضانہ نہیں ہوتے - شگفتگی اور زندہ دلی ان کے ہر افسانے سے ٹپکتی ہے -"

محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ وقار خلیل - قیمت ۵۰ نئے پیسے - سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو شعبہ ادبِ اطفال حیدرآباد کے بانی، اردو کے پہلے عوامی شاعر، تاجدارِ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی ۳۲ صفحات

ٹونک کی عیدیں

مصنف منظور الحسن برکاتی - قیمت ۶ آنے ضخامت ۳۲ صفحات - کتاب مصنف سے شفا منزل ٹونک راجستھان کے پتے سے مل سکتی ہے -

شاخِ زیتون

جناب شفاء گوالیاری کی رباعیات کا ایک مختصر کتابچہ - بظاہر کہتر و بہ قیمت بہتر - قیمت فی جلد ۴ آنے - ناشر عبیدیہ پبلیکیشنز نزد بھوپال ٹاکیز -

غنچہ و گل

بیتاب علی پوری کے کلام کا مجموعہ - ضخامت ۱۴۴ صفحات - ملنے کا پتہ - مینجر ہفتہ وار اشوک - رام بازار سونی پت -

---

ضروری گزارش

۱- مضمون پورے سائز کے کاغذ کے ایک طرف، صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہونا چاہیئے -

۲- غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں گے -

---

تصحیح - اس شمارے کے صفحہ ۲۳ پر جی ' ایل ادیب لکھنوی کی جگہ پروفیسر ادیب جبل پوری پڑھا جائے -


دھرتی
اور
کھڈی
بھارتی معیشت کا بنیادی جزو ہیں
صدیوں سے کروڑوں لوگوں کے طریقِ زندگی پر ان کی چھاپ گہری رہی ہے
زمانہ کتنا کیوں نہ بدل جائے اور اس کے ساتھ رسم و رواج بھی لیکن
بھارتی ہاتھ کھڈی کپڑوں کی ندرت اور نفاست میں
فرق نہیں آسکتا۔ ان کی مقبولیت لازوال ہے۔
یہ ثبوت ہے اس لاجواب مہارت اور فن کاری کا
جس کی بدولت بھارتی بُنکر آئے دن
قدیم اور جدید کی سحر آفریں آمیزش سے
نئے نئے نمونے تیار کرتے رہتے ہیں
بھارتی
ہاتھ کھڈی کے کپڑے
آل انڈیا ہینڈ لوم بورڈ
شاہی باغ ہاؤس، ویٹ روڈ، بمبئی ۱
DA 59/159

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی رسالے

انڈین انفارمیشن
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔

قیمت فی کاپی ۳۰ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا

"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مرقع"
(سنڈے نیوز آف انڈیا)

فی کاپی ایک روپیہ — سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر

کشمیر کی زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ

سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان — اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے — سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیئر

سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی

میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کُروکشیتر

اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک

یہ رسالہ کمیونٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔

فی کاپی ۱۰ نئے پیسے۔

— سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۰ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)

چیف ایڈیٹر۔ خوشونت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اُن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے

سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار
(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)

یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی ثقافتی مسائل اور غیر ملکی معاملات سے متعلق مضامین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔

قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے۔

سالانہ چندہ چھ روپے۔

بال بھارتی

ہندی میں بچوں کا باتصویر رسالہ۔ دلچسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے۔

سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان

ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا ترجمان

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں

یا براہِ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی۔

...d. No. D-500

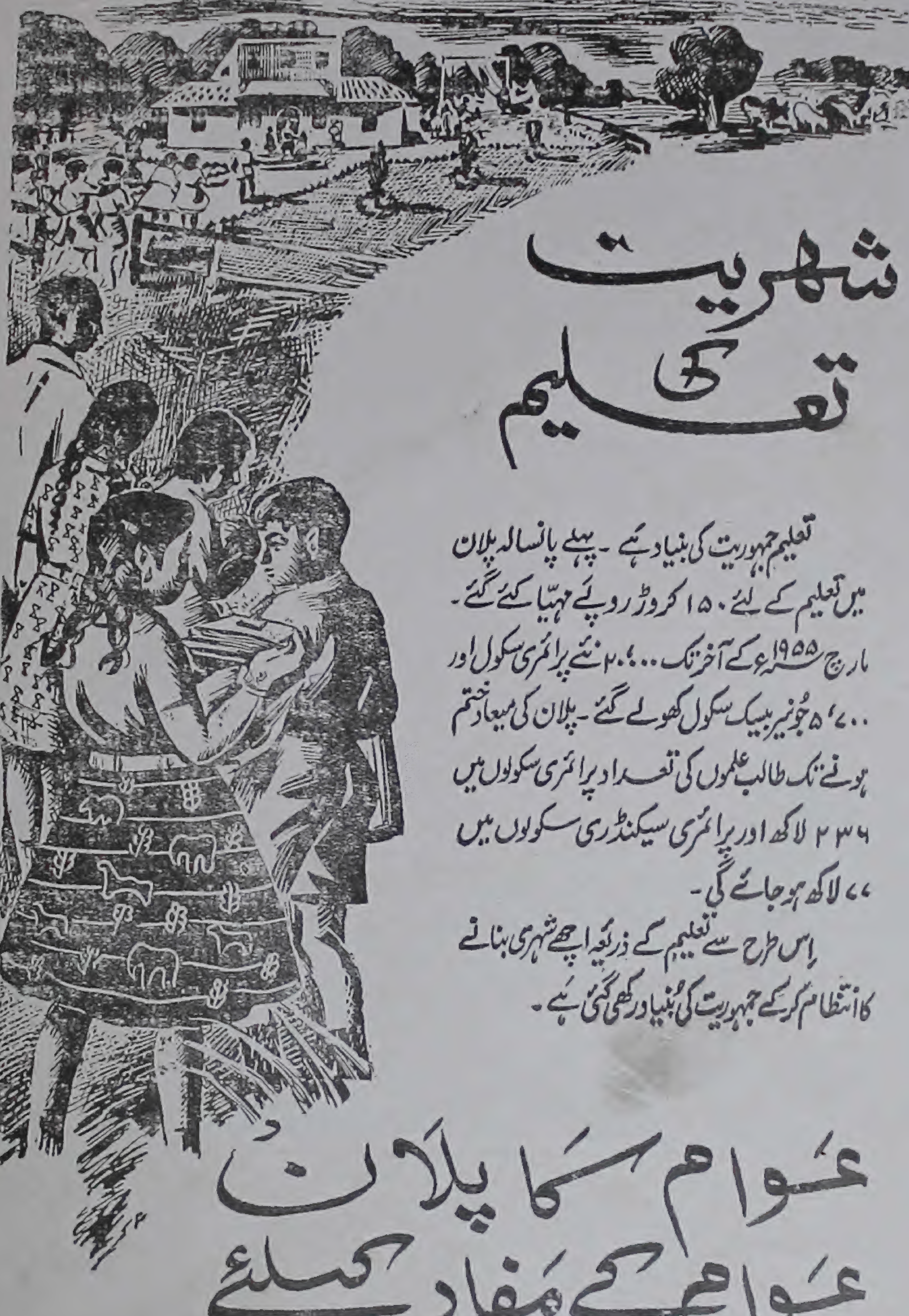
Edited and Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

آج کل



فروری ۱۹۵۶ء

آٹھ آنے



شہریت کی تعلیم

تعلیم جمہوریت کی بنیاد ہے ۔ پہلے پانسالہ پلان میں تعلیم کے لئے ۱۵۰ کروڑ روپے مہیّا کیے گئے ۔ مارچ ۱۹۵۵ء کے آخر تک ۲۰،۰۰۰ نئے پرائمری سکول اور ۵،۷۰۰ جونیر بیسک سکول کھولے گئے ۔ پلان کی میعاد ختم ہونے تک طالب علموں کی تعداد پرائمری سکولوں میں ۲۳۶ لاکھ اور پرائمری سیکنڈری سکولوں میں ۷۷ لاکھ ہو جائے گی ۔

اِس طرح سے تعلیم کے ذریعہ اچھے شہری بنانے کا انتظام کر کے جمہوریت کی بُنیاد رکھی گئی ہے ۔

عوام کا پلان
عوام کے مفاد کیلئے

DA55/130

ترتیب

سرورق :- بہارِ روح فزا

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ —— نمبر ۷

سالانہ چندہ :— ہندوستان میں چھ روپے / پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ :— ہندوستان میں :- آٹھ آنے / پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

فروری ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

شاعری

رُباعی

تخئیل کا ہے شوق، لحنِ داؤد نہیں
اس طرز میں حمد کی کہ محمود نہیں
دل سے سامع کے آہ بھی تو نکلے
اک واہ ہی شاعری کا مقصود نہیں

کس کام کا وہ رنگ، نہ ہو بو جس میں
بے معنی ہے وہ بیں کہ نہ ہو تو جس میں
جس مے میں نشہ نہیں وہ مے کیونکر ہو
جس نَے میں صدا نہیں وہ نَے کیونکر ہو
وہ علم ہی کیا، کہ جس میں عرفاں نہ ہو
عرفان وہ کیا کہ جس میں ایمان نہ ہو
ایمان ہی وہ کیا، نہ ہو اُلفت جس میں
الفت ہی وہ کیا نہ ہو صداقت جس میں
وہ شعر ہی کیا جس میں جذبات نہ ہوں
وہ پیر ہی کیا جس میں کرامات نہ ہوں
الحق، کہ سخن کی جان ہے سوزِ نہاں
جب عشق نہیں تو حسن میں حسن کہاں
ہر چند عوام شاعری کہتے ہیں
ہم تو اسے سحرِ سامری کہتے ہیں
ہاں ہوش ربا ہے اولوالالباب سے شعر
عرفان ستار ہے تو مضراب ہے شعر

رُباعی

ہر مرتبہ آئینۂ دل ڈھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تُلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ سمجھوں کیوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

رُباعی

کیا فکر ہے کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو
جھوٹی دُنیا میں عزّ و شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے
ہم زندہ رہیں، نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

رُباعی

اے حضرتِ شیخ اپنی خبر لو پہلے
دامن خود موتیوں سے بھر لو پہلے
دنیا میں کوئی قدر کرے یا نہ کرے
تم آپ تو اپنی قدر کر لو پہلے

سردار جعفری

کفن بردوش

ضعیفی محفلِ عشرت میں خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب بھی آتی ہے کفن بردوش آتی ہے

مرزا جعفر علی خاں اثر نے ایک بار یہ لکھا تھا کہ اردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے بھیڑیے اٹھا کر لے گئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو میں ایک شیلی پیدا ہوا تھا جسے جوان ہونے سے پہلے ہی نامساعد حالات کے سمندر نے نگل لیا۔ ڈاکٹری اعتبار سے مجاز کا انتقال ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ لیکن حقیقتاً وہ اس سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ جب اس کی آبگینہ کی طرح نازک اور حساس طبیعت ماحول کی سختیوں کی تاب نہ لا سکی اور اس کے دل و دماغ کے "تار ٹوٹ گئے"۔ مجاز کے عہد کے ہندستان میں یہ کیفیت کئی اور بڑے شاعروں پر طاری ہو چکی ہے جس کی زندہ مثالیں ہندی کے شاعرِ اعظم نرالا اور بنگالی کے باغی نذر الاسلام ہیں۔ اگر یہ رنگین بیان اور خوش نوا شاعر زندہ رہتا تو اس عہد کا سب سے بڑا انقلابی اور قومی شاعر ہوتا۔ اس کی مٹی حسن، شراب اور نغمے سے گوندھی گئی تھی اور بغاوت اور سرکشی کے سانچوں میں ڈھالی گئی تھی۔

بعض دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح مجاز کی شاعری کا محور بھی حسن و عشق ہے اور اس کی سطح سے اس نے سماجی حقیقتوں کا ادراک کیا۔ مجاز نے اپنی شاعری کی ابتدا ہلکی پھلکی خوبصورت رومانی نظموں سے کی جن میں شروع ہی سے سرکشی اور بغاوت کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے مجاز کی پہلی نظم جو اس کی زبان سے سُنی "انقلاب" تھی۔ یہ غالباً ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک عام بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی اور فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جو کانگرس کے ایوان تک پہنچ گئے اور ۱۹۳۶ء میں کانگرس کے اجلاس لکھنؤ کے صدارتی خطبے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے ادا ہوئے۔

نوجوانوں کی یہ بے چینی اس ماحول کی پیداوار تھی جسے صدیوں کی غلامی اور انحطاط نے سڑا دیا تھا اور اس کی عفونت ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی اور نوعمر شاعر اس گندے انقلاب اور رومان کے پیچ رنگے پروں کی مدد سے پرواز کر رہے تھے اور "شبستانِ طرب" "نشاطِ زندگی" اور "باغِ تصوف" سے نکل کر اس میدان میں آ جانا چاہتے تھے جہاں ہندستان کی تحریکِ آزادی اپنے سارے جلال اور جمال کے ساتھ چل رہی تھی۔ یہ انقلاب کا بالکل رومانی تصور تھا جس سے مجاز کی ابتدائی شاعری سرشار تھی۔ اپنی نظم "انقلاب" میں شاعر نے مطرب سے رباب پھینک دینے کا مطالبہ کیا اور اس خون آلود صبح کے رنگِ شفق میں کھو جانے کی خواہش کی جس میں "باہزاراں آب و تاب" ؏

جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اس کے ساتھ حرکت اور ارتقاد کا بھی ایک تصور کارفرما تھا جس کا بڑا خوبصورت اظہار مجاز کی نظم "رات اور ریل" میں ملتا ہے۔ اس بالکل ابتدائی زمانے کی نظم میں بھی شاعر نے ریل سے کچھ فلسفیانہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے ؎

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
دامنِ تاریکیِ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

اس نظم میں ریل اپنے عہد کی نوجوان امنگوں کی ترجمان بن گئی ہے۔

اس وقت مجاز کے محبوب شاعر جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی تھے۔ جوش کی رندی اور بیباکی، اختر کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس رندی، بیباکی، معصومیت رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی جس نے اپنے وقت کی ساری فضا کو سرشار کر دیا۔ پھر مجاز کی جادو بھری آواز جو سننے والوں پر سکتہ سا طاری کر دیتی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ مجاز علی گڑھ میں ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر بیٹھے ہوئے اپنی نظمیں سنا رہے تھے۔ سننے والوں میں دو تین بچے بھی تھے۔ وہ شعر نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن ترنم کے حسن سے متاثر تھے۔ اور جب ایک بچے کے منہ سے کوئی آواز نکل گئی تو دوسرے بچے نے تتلا کر کہا "چپ رہو باجا بج رہا ہے"۔

مجاز کی شاعری میں شروع سے آخر تک نشاط ہی نشاط ہے۔ وہ خود اس نشاط میں ڈوب جانا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو اس میں غرق کر کے مدہوش کر دینے کی فکر میں ہے۔ اس کے یہاں غم بھی شعر کا جامہ پہن کر ایک نشاط اور کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مجاز کی رومانیت اپنے عہد کے دوسرے شاعروں کی رومانیت سے مشترک ہونے کے باوجود اپنی ایک انفرادی کیفیت رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر جذبی اور فیض نے عشق کے غم کو محسوس کیا اور مجاز نے عشق کے نشاط کو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فیض کے یہاں حسن خواب آلود، خاموش اور دردمند ہے لیکن مجاز کے یہاں حسن تیز، طرار اور شوخ ہے (اصنامِ نمائش، نورا، ارباب نشاط، آج کی رات وغیرہ) اس کیفیت کا اثر مجاز کی پوری شاعری پر پڑا ہے۔ جب اس نے سماجی حقیقت کا ادراک کیا تو اسے تبدیل کرنے کے لئے اس پر بھرپور وار کیا اور اس طرح اپنی شاعری میں ایک ایسی دل نشین خارجیت پیدا کر لی اور ایک ایسے بیانیہ عنصر کی آمیزش کی جس نے اس کی رومانیت کو تاریک اندیشی سے بچا لیا۔ یہ افتادِ طبع مجاز کے لہجے کو اب اس کے ہم عصر شعرا کے لہجے سے الگ کر لیتی ہے۔ یہ بات بھی ایک تقابل سے واضح ہو گی۔ فیض اپنے دل سے باتیں کرتا ہے اور مجاز سماج سے۔ فیض گنگناتا ہے اور مجاز گاتا ہے اور اس کے گیت میں بغاوت کا آہنگ سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس کے ساز کی لے میں ہمیشہ شمشیر کی تیزی ملے گی۔

اپنی بالکل ابتدائی شاعری میں بھی وہ صرف یہ شکایت کر کے خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ ؎

نہ طوفان روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

بلکہ اپنے اس نوجوان حوصلے کا بھی اظہار کرتا ہے کہ ؎

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو یہ دعوے کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیان
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں!
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

اب اگر اس کے ساتھ طفلی کا یہ خواب بھی شامل کر دیا جائے تو مجاز کی شاعری کا رومان اور باغیانہ مزاج پوری طرح واضح ہو جاتا ہے ؎

صحرا ہو، خارزار ہو، وادی ہو، آگ ہو
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو، مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

یہیں سے بڑھ کر وہ پردے کی رسم پر حملہ کرتا ہے جس نے مجاز کے نزدیک ظلم اور بربریت کو عصمت اور تقدس کے لباس میں چھپا دیا ہے۔

"کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے"

مجاز عورت کا تقدس اور عصمت کا محافظ اس کی آزادی اور وقار کو سمجھتا ہے۔

مجاز غالباً اپنے عہد کے شعرا میں وہ تنہا شاعر ہے جس نے عورت کو کارزارِ زندگی میں پیچھے رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے آزادیٔ نسواں

کے مقابلے میں نہ تو زمرد کے گلوبند کو پیش کیا اور نہ علم کو عورت کے حسن کی توہین سمجھا۔ اُس نے آزادی اور انقلاب کے نام پر عورت کو محبت دینے سے کبھی انکار نہیں کیا، اور نہ کبھی اس سے یہ کہا کہ

تو مری جان مرے ساتھ کہاں جائے گی

اس نے ہمیشہ حسن کو مشن کے ساتھ میدان میں اُترنے اور جد و جہد کرنے کی دعوت دی۔ اسی لئے اس کے یہاں اکثر مشن اور بغاوت ہم معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔ یہ جذبہ صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب عورت کو مرد عیش و عشرت کا کھلونا یا محض بچہ پیدا کرنے کی مشین نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی سماجی حیثیت اور انسانیت کو بھی تسلیم کیا جائے۔ تب وہ اچھی معشوقہ بھی بن سکتی ہے اور پُر وقار ماں بھی۔ میدانِ آزادی کی مجاہد بھی، اور شاعر کے دل کی ملکہ بھی۔ اردو شاعری میں یہ عشق کا ایک نیا تصوّر تھا اور یہ تصوّر اُس تحریکِ آزادی کے ساتھ پیدا ہوا تھا جس نے جھانسی کی رانی سے لے کر سروجنی نائیڈو تک بے شمار ہندوستانی ہیروئنیں پیدا کی تھیں۔ اسی لئے مجاز اپنی نظم "نوجوان خاتون" میں جب جدید عورت کا تصوّر پیش کرتا ہے تو اُسے آزادی کی جد و جہد سے الگ نہیں کرتا۔ بلکہ ایک قدم آگے جا کر یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ ہندوستان کی نئی عورت کا حسن تحریکِ آزادی کی آگ میں پک کر ہی نکھر سکتا ہے ؎

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبّے
اُنھیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں
جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کا عشق ارضی اور حقیقی ہے۔ جسے پُرانی شاعری میں "عشق مجازی" کہا گیا ہے، اور اس کی تصویرِ حسن میں جسمانیت ہے۔ لیکن یہ عشق ہوسناکی سے بہت دُور ہے (اس کا خمیر بہترین عشقیہ شاعری میں پائے جانے والے اجزا سے اٹھا ہے) اور حُسن پر ابتذال اور عریانی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی ہے۔ یہ حُسن بھرپور ہے، اور اس کے خد و خال شوخ اور دل کش رنگوں سے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا اور ایلورا کی دیواروں کی دیویوں، شہزادیوں، اپسراؤں اور عام عورتوں کی طرح مجاز کے تخلیق کئے ہوئے حُسن کے انگ انگ سے صحت اور جوانی ٹپکی پڑتی ہے۔ وہ ایک ایک دو دو مصرعوں میں تصویریں کھینچ دیتا ہے، اور یہ تصویریں انتہائی جسمانی ہونے کے بعد بھی انتہائی لطیف ہوتی ہیں۔ اس کا ایک بہت اچھا نمونہ بتانِ حرم میں ملتا ہے ؎

وہ حسیں پیشانیاں آئینۂ تمکین ناز!
وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگانِ دراز
نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لئے
زُلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے
وہ سباب چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صنّاعی کے زندہ شاہکار
رُخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش
چُست پیراہن، نمایاں جسمِ سیمیں کی تراش
اک طرف سحرِ ملاحت، اک طرف افسونِ ناز
اک طرف زُلفِ بریدہ اک طرف زلفِ دراز
آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہتِ خلدِ بریں آتی ہوئی
آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب
وہ لچک سی جسمِ نازک میں، خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلی تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے
وہ سمٹنے کی ادا طوفانِ رعنائی کے ساتھ
ذوقِ خود بینی مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

مجاز کی نظم "کس سے محبت ہے" اس سادہ سے اور انتہائی شاعرانہ بیان سے شروع ہوتی ہے کہ

میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے

اور اتنی معصومیت سے شاید ہی کسی اور شاعر نے یہ بات کہی ہو۔ لیکن وہ سراپا "رنگ و بو" اور "پیکرِ حسن و لطافت" ہونے کے باوجود اس دنیا سے اکڑ اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ شاعر کے تخیل کے بازو بھی اُسے نہیں چھو سکتے۔ وہ بیجا جراتوں پر بے نیازی کی سزا دیتی ہے، اور "ہوس کی ظلمتوں" پر "ناز کی بجلی" گرا دیتی ہے۔ اور نظم کے خاتمے تک وہ مجاز کی شاعری کا حُسن بن کر رہ جاتی ہے:

کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے لبِ شیریں کی مے پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

کبھی کبھی تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ مجاز اپنے آدرش کو جو ایک بہتر اور حسین مستقبل کا خواب ہے عورت کے روپ میں سجا کر پیش کر رہا ہے۔

مجاز کی ذاتی زندگی مسلسل محرومی اور ناکامی، افلاس اور بدنصیبی کی زندگی تھی، اور اس کی تلخی کہیں کہیں جھلک اُٹھتی ہے۔ لیکن یہ جو اس کی ساری شاعری سے رس اور رنگ چھلکا پڑ رہا ہے کہاں سے آ رہا ہے۔ یقیناً اس کے خوابوں نے اس کی شاعری کو حسین بنایا ہے۔ جس نظامِ زندگی کا تصور اس کے ذہن میں ہے اس کا عکس اس کی شاعری پر پڑتا رہتا ہے، اور یہ عکس اُسے رنگین بنا دیتا ہے۔

اس کے لئے یہ خیال بڑا تکلیف دہ ہے کہ حسن کی لطافت اور عشق کی پاکیزگی اس سماج میں آزاد نہیں ہے۔ یہ خیال اُسے بعض رومانی شاعروں کی طرح سماج سے ہٹ جانے پر آمادہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے شعور کی سطح ذرا بلند ہے۔ وہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کے نظام کو بدل دینے کو زیادہ شاعرانہ چیز سمجھتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالتا ہے، حقیقت کا جائزہ لیتا ہے، اور اس کی باغی فطرت اُسے اصل دشمن کا پتہ لگانے پر مجبور کرتی ہے، اور اُسے سماج کے کتنے ہی حجابوں کے پیچھے سے باہر گھسیٹ لاتا ہے۔ وہ شبستانوں میں بھی جھانکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں بھی، اور اُسے نہ تو دنیا کی "زہرہ جبینوں" سے شکوہ ہوتا ہے جن سے اس کے "شوقِ رسوا کی پذیرائی" ممکن نہیں اور نہ اپنے "پاک دامن نکتہ چینوں" سے جو شاعر کی فطرت کو انگڑائی نہیں لینے دیتے اور نہ اُن "صاحبانِ جاہ و ثروت" سے جن کی ایک بھی پائی مجاز یا کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی ہے بلکہ ــــ

زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

اس نظم میں جو نومبر یا دسمبر ۱۹۳۸ء کی تخلیق ہے مجاز کا سماجی شعور زندگی کے تمام پردوں کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے، یہ شاعر صرف رومان پرست نہیں ہے بلکہ بغاوت کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی ادراک پر سے تعصب اور جہالت کے تاریک جالوں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ وہ حرکت، ارتقا اور تغیر کے ساز پر گانا زیادہ پسند کرتا ہے، اس کا انداز اب بھی رومانی ہے، لیکن وہ زندگی کے حقائق سے دست و گریباں ہے۔

اس دور کی دو سب سے زیادہ اہم اور مجاز کی نمائندہ نظمیں "آوارہ" اور "اندھیری رات کا مسافر" ہیں۔ ان دونوں کی تخلیق کے درمیان صرف چند مہینوں کا وقفہ حائل ہے۔ "آوارہ"، داخلیت اور خارجیت کا بڑا حسین امتزاج ہے، اور اس میں "ذاتی مسرتیں اور رنج و کاوش وسیع تر حقائق کے اجزا معلوم ہوتے ہیں"۔ اس نظم میں اُس عہد کی کیفیت بھرپور طریقے سے آئی ہے۔ یہ اُس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو سرمایہ داری کے بنائے ہوئے شہروں میں بے روزگار پھر رہا ہے اور جس کی بے روزگاری کو آوارگی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے دل میں نہ جانے کتنی اُمنگیں، آرزوئیں اور حسرتیں ہیں لیکن یہ بستی جو اُس کی اپنی بستی ہے اُسے غیر کی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو تنہا اور اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں کہ کیا کرے۔ پھر بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دل میں باقی ہے اور یہی حوصلہ مندی اس نظم کی اہمیت اور اثر آفرینی کو بڑھا دیتی ہے۔

"اندھیری رات کا مسافر" میرے نزدیک "آوارہ" کے آخری حصے کا پھیلاؤ ہے، جہاں شاعر نے یہ کہا تھا کہ ــــ

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اُس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

مجاز سب کو آزادی کے لئے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ اپنے آپ کو، نوجوان مرد کو، نوجوان خاتون کو، کارخانے کے مزدور کو، سارے ہندوستان کے باشندوں کو۔ لیکن وہ دشمن کے خط و خال کو مبہم نہیں چھوڑتا۔ وہ دشمن ایک بیرونی سامراج اور اس کا لایا ہوا نظام اور ایک ایسی حکومت ہے جس کی

منافقت ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کر رہی تھی، اور جس کے لئے بچے بچے کے دل میں حقارت کا جذبہ تھا، جو بقول مجاز "خون پی پی کر بہکتی ہے" اور ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے" (سرمایہ داری) شاعر اپنے بغاوت کے لشکر کو لے کر آگے بڑھتا ہے، اور یہ لشکر تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہے" اور اس لشکر کے سب سے زیادہ جاں باز مجاہد کون ہیں؟ ایک خود شاعر اور دوسرے وہ عوام جن کے لئے

"سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں"

بغاوت کی اس منزل پر پہنچ کر شاعر تبلیغ کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی وہ عوام سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے۔

"اُٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ مے خانہ"

اور کبھی خود عوام کے ہجوم میں گُم ہو کر گانے لگتا ہے

آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

اور کبھی بیرونی سامراج کو للکارتا ہے

مسافر بھاگ وقتِ بیکسی ہے

وہ کبھی سرفروشوں سے صف باندھ کر آتا ہے اور کبھی شمشیر بکف ــــ اور یہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی عشقیہ نظموں کی طرح اس کی سیاسی اور سماجی موضوعات کی نظمیں بھی ترنم کی دولت سے مالا مال ہیں ــ بے سُرا پن مجاز کی شاعری میں کہیں ملتا ہی نہیں۔ اس کی فطری شائستگی اور لطافت اس کے ایک ایک شعر میں ملتی ہے۔

اس پوری شاعری میں جس کا اوپر ذکر ہوا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندستان کا مزاج ہے اور یہ ہماری تحریکِ آزادی کی اُمنگوں اور ولولوں سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن کسی قومی تنگ نظری اور تعصب کا شکار نہیں ہے۔ وہ وسیع تر انسانیت کے جذبات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ وہ قومی مزاج اور سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ مگر ساتھ ساتھ عالم گیر انسانی قدروں کی حامل ہے۔

اس عہد میں مجاز کی نگاہ جو حُسن کی جویا ہے نئے عہد کے حُسن کی بھی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور مجاز اپنا "خوابِ سحر" لے کر محفل میں آجاتا ہے۔ اس چھوٹی سی خوبصورت نظم میں انسانی تاریخ کی وسعت ہے اس کی ابتدا اور انتہا ماضی سے مستقبل تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اس نظم میں مجاز صرف ہندستانیوں کی نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کی بات کرتا ہے۔ اب تک دنیا میں کتنے ہی مصلح آئے، کتنے ہی نظام پیدا ہوئے اور مٹ گئے لیکن دردِ انسانی کا علاج کوئی نہ کر سکا۔ آج کی دنیا میں پہلی بار درد کا درمان تلاش کیا جا رہا ہے اور شاعر خوش ہے کہ انسان کی نجات کی منزل قریب آگئی ہے۔ یہ نظم مجاز نے انقلابِ روس کی ایک سالگرہ کے موقع پر کہی تھی۔

ہندستان کی تحریکِ آزادی کی لہر جتنی اونچی ہوتی جا رہی تھی مجاز کے انقلابی نغمے کا آہنگ بھی اتنا ہی بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اگر ایک طرف ہندستان کے مسائل کے پیشِ نظر وہ یہ کہہ رہا تھا ع

مسافر بھاگ وقتِ بیکسی ہے

یا

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

تو دوسری طرف ساری دنیا کو فاشزم کے خطرے سے یہ کہہ کر آگاہ کر رہا تھا کہ "پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اُٹھو"۔ اُس وقت مجاز اپنے عہد کے تمام عظیم شعرا کا ہم نوا تھا ؎

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کوئی دمساز بھی ہیں
روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دُور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

مجاز کے لئے انسان سب سے زیادہ بلند، سب سے زیادہ مقدس چیز ہے۔ وہ اس کی دنیا کو حسین اور اس کے دل کو مسرتوں سے سرشار دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے لئے اور حد یہ ہے کہ اپنے لئے بھی تنہائی کی عشرت پسند نہیں کرتا۔ اس نے اپنی اس پاکیزہ خواہش کو ایک چھوٹی سی حسین نظم میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار مرا عشرتِ تنہائی سے
آنکھ مجبور نہیں ہے مری بینائی سے
محرمِ درد و غمِ عالمِ انساں ہوں میں
اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

آخری مصرعے میں مجاز کی اپنی ذاتی آرزوئیں اور حسرتیں چھپی ہوئی ہیں جس نے اپنے ذاتی غم کو وسیع کر کے انسانیت کے غم کا ایک حصہ بنا لیا ہو۔ وہ اس طرح بات کرتا ہے اور مجاز کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے انسان کے لئے اور اپنے لئے ایسی خواہش کی جسے اس نظام اور سماج نے معاف نہیں کیا۔

شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے گیتوں کی مٹھاس اور اپنے خوابوں کے حُسن پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُسے بھی دوسرے انسانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی مادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایک چھوٹا سا گھر چاہیئے، ایک بیوی چاہیئے، اپنے بچے چاہئیں، دو وقت کی روٹی اور کچھ دُھلے ہوئے کپڑے چاہئیں۔ ایک تھوڑی سی فراغت، تھوڑا سا اطمینان، تھوڑی سی خوشی چاہیئے۔ یہ قارون کے خزانے کی طلب ہے نہ کسی سلطنت کی خواہش۔ یہ بس زندگی کی معمولی ضروریات پوری کرنے کی تمنّا ہے۔ جو سماج اپنے شاعر کو یہ بھی نہ دے سکتا ہو اور اس میں چاروں طرف بے انصافی پھیلی ہو اور ہمدرد دوستوں کے بجائے ہر قدم پر ناصح اور محتسب ملتے ہوں اس سماج میں اگر شاعر پاگل نہ ہو جائے گا تو اور کیا ہوگا۔ اور مجاز کی طبیعت تو اتنی نازک اور حساس تھی کہ ۱۹۴۶ء میں اس نے بمبئی میں ایک قتل دیکھ لیا تھا تو کئی دن تک کھانا نہیں کھا سکا تھا اور کئی رات سو نہیں سکا تھا۔ کیٹس اور پریم چند کو اس افلاس اور تلخ ماحول نے موت کے گھاٹ اُتار دیا اور مجاز، نذرالاسلام اور نرالا کو پاگل کر دیا۔ چنانچہ مجاز پر دیوانگی کا پہلا دورہ ۱۹۴۰ء میں پڑا۔ اس سے وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو سکا۔ اس لئے دوبارہ ۱۹۴۵-۴۶ء میں اس کا شکار ہوا اور آخری بار ۱۹۵۲ء میں، جب وہ قاضی نذرالاسلام کے ساتھ رانچی کے پاگل خانے میں تھا۔

اس دیوانگی اور نیم دیوانگی کے عالم میں بھی مجاز نے جو کچھ کہا ہے وہ جذبات کی شدّت سے چُور ہے اور اس سماج پر بڑی سخت تنقید ہے۔ مجاز کو اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا بڑا شدید احساس ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس سماج نے اُسے جنم دیا ہے وہ اس کی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتا ہے

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز، مرا نالۂ زار
شدّتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ اپنے ہی مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

یہ مجاز کی آخری حسین نظم ہے اور اس کے بعد اس کے دل و دماغ کے تار بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کہتا رہا اور اچھا کہتا رہا۔ گانا اس کی فطرت تھی۔

اس عالم میں بھی اس کا وطنی، سماجی اور سیاسی شعور زندہ رہا اور اس نے کسی موقعے پر بھی ملک اور وطن اور قوم اور انسان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو مجاز ساری رات بمبئی کی سڑکوں پر اپنا گیت "راج سنگھاسن ڈانوا ڈول" گا گا کر ناچتا رہا اور دوسرے دن جب جشنِ آزادی کے سلسلے میں جلسہ ہوا تو اس میں مجاز نے ایک حسین نظم پڑھی اور اس دھرتی کو اپنا خراجِ عقیدت اور محبت پیش کیا جس کی تعریف اُس نے یوں کی ہے۔

"زمینِ ہند کہ جولانگہ غزالاں ہے"

پھر جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو آزادی کے بعد کا سب سے بڑا قومی حادثہ پیش آیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے مہاتما گاندھی نے دہلی میں اپنی جان دے دی تو مجاز پھر محبّت اور عقیدت کے پھول لے کر حاضر ہوا ہے

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انسان کی تلاش میں انساں چلا گیا

اس کے بعد کی بھی مجاز کی بہت سی چیزیں ہیں جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ اُس میں بھی مجاز کی شائستگی، حُسن، ترنّم اور شعور کار فرما ہے۔ انتہائی شکستہ ہو جانے کے بعد بھی اس نے آخر وقت تک شکست تسلیم نہیں کی۔ وہ موت کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا، موت کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی لیکن پھر بھی اپنے مرنے سے

دو دن پہلے اس نے لکھنؤ کے مشاعرے میں آخری شعر یہ پڑھا ؎

بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

اور آج جب نوجوانوں کا ہو گرمانے والا، نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلانے والا، اردو شاعری کو حسین بنانے والا، ہمارا محبوب اور چہیتا مجاز ہمارے درمیان نہیں ہے تو اس کے نغمے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

۱۹۴۰ء میں جب مجاز اپنی دیوانگی کے بعد خاموش ہو گیا تھا تو میں نے ۱۹۴۱ء میں بنارس سنٹرل جیل سے لکھ کر اُسے ایک نظم بھیجی تھی جو اس طرح شروع ہوتی تھی ؎

ہم نشیں اب تیری خاموشی سے گھبراتا ہے دل
تیرے نغمے یاد آتے ہیں تو بھر آتا ہے دل

مگر میں آج زندگی اور موت کی سرحد کے اُس پار چلے جانے والے دوست سے اس کی خاموشی کی شکایت بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں خود ہی مجاز کی طرف سے یہ جواب دوں گا کہ مجاز خاموش ہو گیا ہے لیکن اس کے نغمے خاموش نہیں ہوں گے۔ یہ آنے والے زمانے میں نئے نئے دلوں کے تاروں کو مرتعش کریں گے، نئے نئے شاعروں کو متاثر کریں گے اور جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے نغمے سے نغمہ پیدا ہو گا۔

جاؤ مجاز آرام سے سوؤ۔ تمہیں مدتوں کے بعد چین اور قرار مل گیا لیکن تمہاری یاد ہمارے دلوں کو ہمیشہ بے چین اور ہماری روح کو ہمیشہ بے قرار رکھے گی۔

زندگی رکتی نہیں ہے لیکن فطرت کسی چیز کو دہراتی بھی نہیں ہے۔ ایک سے ایک اچھا شاعر پیدا ہو گا۔ ایک سے ایک اچھا نغمہ اپنی ترنم ریزی سے روح میں بالیدگی پیدا کرے گا لیکن تمہاری طرح کوئی گیت نہیں گائے گا۔

سیلِ ماتم

۱۹۵۵ء کے آخری مہینے اُردو کے لئے بہت ہی منحوس ثابت ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کے بعد بے خود دہلوی اور ان کے بعد علامہ کیفی دہلوی راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ یہ حادثے اپنی جگہ بڑے سخت تھے کہ مجاز کی موت "سنگ آمد و سخت آمد" کا مصداق ہوئی۔ مولانا اقبال سہیل کے ساتھ علم و فضل، ذہانت و فطانت اور مزاح و شگفتگی کی ایک دنیا اُٹھ گئی۔ علی منظور حیدرآبادی، ہوش بلگرامی اور اسلم جیراج پوری یکے بعد دیگرے اپنے دوستوں، عقیدت مندوں اور خوشہ چینوں کو ماتم کناں چھوڑ گئے۔ یوں تو ادیب اور شاعر کبھی مرتے نہیں۔ اُن کے کارنامے ادب کے صفحات پر زندگی اور تابندگی کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ہنستی بولتی صورتیں اب نظر نہیں آئیں گی۔ مجھے ان سب کرم فرماؤں کی نیاز مندی کا فخر حاصل تھا۔ اب وہ ملاقاتیں خواب و خیال بن گئیں۔ یہ ایک رسم ہو گئی ہے کہ پس ماندگان سے اظہارِ ہمدردی کیا جائے لیکن یہاں تو پس ماندگان کے علاوہ ساری دنیائے ادب ہمدردی کی محتاج ہے۔ اردو ادب کے یہ معمار اپنی اپنی حیثیت سے منفرد تھے۔ زمانہ اب اُن کے کارناموں کو دیکھے گا اور اُن کی صلاحیتوں کی داد دے گا۔ خدائے پاک ان سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ جانا تو سب کو ہے لیکن یہ لوگ غنیمت تھے۔ ہم ماتم زدوں میں سے ایک ایک کو اُن کی رُوحیں ادب اور زبان کی خدمت کے لئے پکار رہی ہیں اور سعدی کا یہ شعر یاد دلا رہی ہیں ؎

خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

عرش ملسیانی

مالک رام

نوّاب شمس الدّین احمدؐ خاں

سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں وسط ایشیا سے تین بھائی —— قاسم جان، عالم جان اور عارف جان کچھ ساتھیوں سمیت تلاشِ روزگار میں ہندستان آئے۔ جب یہ مختصر قافلہ اٹک پہنچا تو یہاں کے صوبہ دار میرزا محمد بیگ نے سب سے چھوٹے بھائی میرزا عارف جان سے اپنی بیٹی بیاہ دی اور انھیں اپنے پاس ٹھیرا لیا۔ لیکن جلد ہی یہ تینوں بھائی یہاں سے چل کر شاہ عالم ثانی کے عہد میں (۱۷۵۹ - ۱۸۰۶ء) دارالخلافے میں پہنچ گئے۔ [1]

عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ نبی بخش خاں، احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں (معروف) اور محمد علی خاں۔ ان میں سے احمد بخش خاں نے ریاست گوالیار میں فوج کی نوکری اختیار کر لی۔ یہاں وہ سواروں میں ملازم تھے۔ حالت معقول تھی نہ مفلس، نہ تونگر۔ خوش اسلوبی سے دن گذر رہے تھے۔ لیکن خدا معلوم کیا صورت پیش آئی کہ وہ ملازمت جاتی رہی۔ اس کے بعد یہ گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اسی سلسلے میں ایک گھوڑا لے کر اجمیر گئے۔ خیال تھا کہ عُرس کے موقعے پر گھوڑا معقول قیمت پر بک جائے گا لیکن کوشش کے باوجود گھوڑا فروخت نہ ہُوا۔ اُنھیں روپے کی ضرورت تھی اور ہاتھ بہت تنگ تھا۔ خدا کی شان، کہ ایک دن درگاہ میں پہنچ کے تضرع سے دُعا کی اور اس کے بعد گھوڑا منہ مانگے داموں بک گیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد شاداں و فرحاں واپس دہلی آ رہے تھے کہ راستے میں مہاراؤ راجہ بختاور سنگھ والئ الور سے ملاقات ہو گئی اور انھوں نے انھیں اپنے ہاں ملازمت پیش کی۔ یہ بے کار تو تھے ہی، اس پیش کش کو بخوشی قبول کر کے مہاراجہ کے پاس الور چلے گئے۔ [2]

جب انگریزوں اور ریاست الور میں معاہدہ ہُوا، تو مہاراجہ نے انگریزوں کے ہاں اپنے مفاد کی نگہداشت کے لئے احمد بخش خاں کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی حیثیت تقریباً وہی تھی، جو آج کل سفیروں کی ہوتی ہے۔ یہاں احمد بخش خاں نے اپنے فرائض منصبی اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے کہ یہاں ایک طرف مہاراجہ ان سے ہر طرح خوش اور مطمئن تھے، وہاں انگریزوں کو بھی ان کی معاملہ فہمی اور حسنِ تدبیر پر پورا اعتماد تھا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کی ریاست بھرت پور سے چھیڑ ہو گئی اور انھوں نے ڈیگ کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ احمد بخش خاں نے زور لگایا کہ مہاراجہ الور اس موقعے پر انگریزوں کا ساتھ دیں اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ ریاست الور نے سواروں کا ایک دستہ خود احمد بخش خاں کی کمان میں بطور کمک بھیجا اور سامان رسد، خوراک وغیرہ سے بھی بڑی مدد دی۔ میدان جنگ میں انگریز سپہ سالار کے گولی لگی اور قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے گر پڑتے، کہ احمد بخش خاں نے لپک کے اسے سنبھال لیا اور اُچھل کر اُس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور لڑتے بھڑتے اسے دشمنوں کے نرغے سے نکال لائے۔ لیکن زخم ایسا کاری تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ البتہ مرنے سے پہلے اس نے اس حادثے کی مختصر روداد اور احمد بخش خاں کی جانبازی کا حال ایک کاغذ پر لکھ کے ان کے حوالے کیا اور انگریزی حکومت سے سفارش کی کہ ان کی خدمات کا انھیں مناسب صلہ دیا جائے۔ یہ سند اب بھی ریاست لوہارو میں موجود ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب فتح کا دربار ہُوا تو لارڈ لیک نے انھیں جاگیر استمراری کے طور پر فیروزپور جھرکہ، پونا ہانا، بچھور، سانکرس کے اضلاع عطا کئے اور سند میں ان کا نام لکھوایا —— فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ —— مہاراجہ بختاور سنگھ بھی دربار میں موجود تھے۔ انھوں نے پرگنہ لوہارو، جو ریاست لوہارو کا حصہ تھا، اپنی طرف سے مرحمت فرمایا اور اس طرح اس کے بعد احمد بخش خاں، نواب احمد بخش خاں والئ فیروزپور جھرکہ و لوہارو ہو گئے۔

---

[1] دیباچہ دیوان معروف

[2] مرقع الور از منشی محمد مخدوم تھانوی

الور کے قیام کے دوران میں نواب احمد بخش خاں کے پاس ایک عورت مدّی نام رہی ۔ اس کے بطن سے ان کے چار بچے ہوئے ۔ دو لڑکے ۔ شمس الدین احمد خاں اور ابراہیم علی خاں اور دو لڑکیاں — نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم ۔ بعد میں اسی نواب بیگم کا نکاح زین العابدین خاں عارف سے ہوا تھا ۔ جہانگیرہ بیگم ایک ایرانی خاندان میں بیاہی گئی تھیں ۔ ان کے شوہر کا نام محمد اعظم خاں تھا ۔ یہ لوگ آگرے میں رہتے تھے اور ممکن ہے کہ اس خاندان کے نام لیوا اب بھی وہاں ہوں ۔

اب انھوں نے ایک ہم کفو بیگم سے شادی کرلی ۔ ان کا نام بیگم جان تھا اور یہ ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی تھیں ۔ اس بیگم سے بھی ان کی چار اولادیں ہوئیں امین الدین احمد خاں ، ضیاء الدین احمد خاں ، ماہ رخ بیگم اور بادشاہ بیگم ۔

بظاہر شمس الدین خاں کے وارث ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا ۔ کیونکہ اُن کی والدہ ، نواب احمد بخش خاں کی بیاہتا بیوی نہیں تھی ۔ اسی وجہ سے خاندان کے چھوٹے بڑے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سب کے سب ان کے خلاف تھے اور انھیں اپنے برابر کا سمجھتے ہی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے انھیں گدی کا وارث قرار دیا ۔ اس کا ایک سبب تھا ۔

مہاراجہ بختاور سنگھ کے پاس ایک طوائف موسی نام تھی اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اس مدّی کی بہن یا کم از کم قریبی رشتہ دار ضرور تھی ، جو نواب احمد بخش خاں کے گھر میں تھی ۔ موسی سے مہاراجہ کے دو بچے ہوئے ۔ ایک لڑکی چاند بائی اور ایک لڑکا بلونت سنگھ ۔ مقامی رواج کے مطابق ایسی اولاد حقِ نجابت نہیں رکھتی اور خواص والی کہلاتی ہے اس لئے بلونت سنگھ کے الور کی گدی پر بیٹھنے کی کوئی امید نہیں تھی ۔ مدّی کے اثر کے تحت یا کسی اور سبب سے نواب احمد بخش خاں ، بلونت سنگھ کے حامی تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ کے بھتیجے بنے سنگھ کے حصے کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے انعام و اکرام کے وعدے پر ایک سید کو تیار کیا کہ وہ ان کا کام تمام کر دے ۔ چنانچہ ایک رات جب نواب دہلی میں اپنی ملکیت نور باغ (واقع آزاد پور) میں اکیلے مقیم تھے ، اس شقی نے ان پر سوتے میں حملہ کر دیا ۔ بارے وار اوچھا پڑا ۔ جان تو بچ گئی لیکن زخم بہت شدید آئے اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کٹ گئی ؎

نواب احمد بخش خاں نے شمس الدین خاں کو فیروز پور جھرکہ کی گدی پر بٹھانے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ کسی طرح الور کے لئے ایک مثال قائم کر دیں اور وہاں بلونت سنگھ کا حق تسلیم کر لیا جائے ۔ لیکن انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور مہاراجہ بختاور سنگھ کے بعد ان کا برادر زادہ بنے سنگھ ہی الور کا حکمران بنا دیا گیا ۔

شمس الدین خان سے اپنے خاندان کی دشمنی ، نواب احمد بخش خان سے مخفی نہیں تھی ۔ ابراہیم علی خاں صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا ۔ اب انھیں تشویش تھی تو امین الدین خاں اور ضیاء الدین خان کی ۔ کیونکہ گمان غالب تھا کہ خاندان کی مخالفت کا خمیازہ ان دونوں کو بھگتنا پڑے گا ، اور شمس الدین خان ، صاحبِ جاہ و مال ہو جانے کے بعد ان کی خبر تک نہیں پوچھے گا ۔ اس لئے احمد بخش خاں نے دُور اندیشی سے کام لیا اور تقسیم وراثت کا انتظام اپنی زندگی ہی میں مکمل کر دیا ۔ انھوں نے ۱۸۲۲ء میں حکومت انگریزی اور دربار الور کی منظوری سے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے بعد فیروز پور جھرکہ کی گدی پر شمس الدین احمد خاں بیٹھے اور لوہارو دوسری بیگم کے دونوں بیٹوں کے حصے میں آئے ۔ اس فیصلے کو پختہ کرنے کے لئے اُنھوں نے فروری ۱۸۲۵ء میں شمس الدین خاں سے بھی ایک دستاویز لکھوائی کہ میں بہ طیب خاطر لوہارو کا پرگنہ اپنے دونوں بھائیوں کو دینا منظور کرتا ہوں ، بشرطیکہ وہ ہمیشہ میری اطاعت کرتے رہیں اور اس دستاویز پر جنرل اختر لونی اور سر چارلس مٹکاف کے دستخط بطور گواہ کرائے ۔ موخر الذکر ان ایام میں دہلی میں انگریزی ریذیڈنٹ تھے ۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس کا پورا اطمینان نہیں تھا کہ شمس الدین خاں اپنے دونوں بھائیوں کے حق میں انصاف کرے گا ۔ پورے سوچ بچار کے بعد ، اس اندیشے کا سدِّ باب انھوں نے اس طرح کیا کہ ۱۸۲۶ء میں وہ ریاست کے کاروبار سے خود بخود دست بردار ہو گئے اور اس تقسیم پر ان کی عین حیات ہی عملدرآمد شروع ہو گیا ۔ اپریل ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا ۔ اس وقت شمس الدین خاں کی عمر ۱۸ ۔ ۱۹ برس کے لگ بھگ تھی ۔ امین الدین خاں ۱۱ ۔ ۱۲ برس کے تھے اور ضیاء الدین خاں صرف سات برس کے ۔

والد کے جیتے جی نواب شمس الدین خاں نے جائداد کی اس تقسیم کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھائی تھی ۔ لیکن جونہی نواب احمد بخش خان کی آنکھیں بند ہوئیں انھوں نے ان تمام اندیشوں کو درست ثابت کر دیا جو اس مرحوم کے دل میں تھے

؎ مرقع الور صفحہ ۱۲۵ ۔ ۱۳۲

اب انھوں نے سرکارِ انگریزی میں درخواست دی کہ خلفِ اکبر ہونے کی حیثیت سے پوری ریاست یعنی فیروز پور جھرکہ اور لوہارو دونوں بلا شرکت غیرے مجھے ملنی چاہیئں۔ دوسری اولاد کو زیادہ سے زیادہ مقررہ گذارہ دلایا جا سکتا ہے لیکن ان کی دال نہ گلی۔ ان دنوں دہلی میں سر ایڈورڈ کولبروک انگریزی ریذیڈنٹ تھا اور اسے تمام حالات معلوم تھے۔ اس نے صدر میں مخالفانہ رپورٹ کی اور فیصلہ نواب صاحب کے خلاف ہو گیا۔ اتفاق سے اس کے بعد جلد ہی کولبروک ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر معزول کر دیا گیا اور اس کا جانشین فرانسس ہاکنس نواب کا گہرا دوست بن گیا۔ اس نے اس معاملے کو پھر اُٹھایا اور نواب کے نظریے کی تائید کی اور پہلا فیصلہ منسوخ کروا کے لوہارو بھی انھیں دلوا دیا۔ لہ

ہاکنس کی تبدیلی پر ۱۸۳۲ء میں سر ولیم فریزر ریذیڈنٹ ہو کر آئے۔ یہ اچھی خاصی عمر کے آدمی تھے اور اس سے پہلے بھی دہلی میں رہ چکے تھے۔ نواب احمد بخش خاں کی زندگی میں اُن کے آپس میں اتنے قریبی اور دوستانہ تعلقات رہے تھے کہ نواب صاحب کی اولاد اُنھیں اپنا بزرگ اور چچا کہہ کے خطاب کرتی تھی۔ وہ نوابِ مرحوم کی جائداد کی تقسیم کی تفصیلات اور اس سے متعلق ان کی کوششوں اور اندیشوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ جب یہ ریذیڈنٹ ہو کر آئے تو قدرتی بات تھی کہ وہ نواب شمس الدین خاں کی کارروائیوں پر ناراضی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پُرانے تعلقات کی بنا پر نواب شمس الدین خاں سے برملا کہا کہ تم نے اپنے دونوں بھائیوں کا حق غصب کر لیا ہے اور اس طرح نواب مرحوم کی وصیت کی خلاف ورزی کی ہے۔ بلکہ انھوں نے زبانی سرزنش ہی پر اکتفا نہیں کی، صدر میں بھی لکھا کہ لوہارو پر نواب شمس الدین خاں کا کوئی حق نہیں اور پہلا فیصلہ بحال کر کے لوہارو ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں — امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کو واپس ملنا چاہیئے۔ نہ صرف یہی، انھوں نے امین الدین خاں کو ۱۸۳۴ء میں کلکتے بھیجا کہ وہاں وہ اصالتاً عدالتِ عالیہ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کریں۔ چونکہ خاندان کے دوسرے افراد کی طرح غالب بھی نواب شمس الدین خاں کے خلاف تھے، اس لیے انھوں نے بھی اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام سفارشی خط لکھے کہ کہ وہ امین الدین خاں کی پوری مدد کریں۔ ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوہارو دوبارہ ان دونوں بھائیوں کو مل گیا۔

لہ ذکرِ غالب صفحہ ۶۱

کہ کلیاتِ نثرِ غالب صفحہ ۱۰۷

نواب شمس الدین خاں فریزر کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باعث اس سے سخت ناراض تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سینہ بہ سینہ جو روایات سننے میں آئی ہیں کہ ان دونوں کی مخالفت کی تہ میں کوئی "زن" تھی، اگر وہ درست نہ بھی ہوں تو بھی فقط یہی لوہارو کا قضیہ ہی انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

جس وقت کلکتے سے اس تازہ فیصلے کی خبر موصول ہوئی، نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ میں مقیم اور کھانے پر بیٹھے تھے۔ جونہی یہ اطلاع ملی انھوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اسی طرح مغموم بیٹھے تھے کہ ایک منہ چڑھا مصاحب کریم خاں نامی جو اُن کا داروغۂ شکار تھا، داخل ہوا۔ اس نے جو انھیں اس حالت میں دیکھا تو پوچھا، خیر باشد، کیا معاملہ ہے۔ جب اسے معلوم ہے کہ نواب صاحب کی آزردگی کا سبب کیا ہے، تو ایک روایت کے بموجب اس نے خود بخود اور دوسری کے مطابق خود نواب صاحب کی انشا لکسا پر فریزر کے قتل کا فیصلہ کر لیا اور اس مہم کو سر کرنے کے لیئے ایک میواتی انیا نامی کو ساتھ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ سہ

یہاں دہلی میں وہ کم و بیش تین مہینے گھات میں لگا رہا۔ لیکن اس تمام مدت میں اسے فریزر پر حملہ کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ جب وہ ناکام فیروز پور واپس گیا تو نواب صاحب بہت ناراض ہوئے اور اسے دوبارہ دہلی بھیجا کہ جس طرح بھی ہو سکے، فریزر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اب کے قسمت نے کریم خاں کا ساتھ دیا

فریزر کی کوٹھی بارہ ہندو راؤ میں تھی۔ ۲۲-مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کا کھانا اس نے راجہ کشن گڑھ کے ساتھ ان کے مکان واقع دریا گنج میں کھایا۔ نواب شمس الدین خاں کی کوٹھی بھی دریا گنج ہی میں تھی اور کریم خان یہیں ٹھیرا ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اسے بھی فریزر کی نقل و حرکت کا پتا چل گیا۔ جونہی کافی رات گئے، نشہ میں سرشار، فریزر یہاں سے بارہ ہندو راؤ واپس جانے کے لیئے روانہ ہوا، کریم خاں بھی گھوڑے پر سوار اُس کے پیچھے لگ گیا۔ آخر کار اُس نے انھیں پہاڑی کے قریب جا لیا اور گولی سے ہلاک کر دیا۔ اگر کریم خاں اسی وقت یا کہیں شہر سے باہر کی طرف موڑ کے نکل جاتا، تو ممکن تھا کہ وہ تلوہ بچ جاتا اور معاملے کا سراغ بھی نہ ملتا۔ لیکن غالباً اُسے یقین نہیں تھا کہ فریزر اُس کی گولی سے

سہ غالب دہلی صفحہ ؟

واقعی ہلاک ہوگیا ہے۔ اس لئے وہ راہ فرار اختیار کرنے کی جگہ واپس دریا گنج میں اپنے مسکن پر آگیا۔ ادھر چونکہ گولی فریزر کے مکان کے بالکل قریب چلی تھی، اس لئے نہ صرف اس کے ساتھ کے اسوار ہی جو اس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے سے آرہے تھے بلکہ اس کے مکان پر سے گارد بھی معاً موقع پر آپہنچی۔ فریزر گولی لگتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ سپاہی لاش اُٹھا کے اندر لے گئے۔ مقتول کے بھائی سائمن فریزر شہر کے مجسٹریٹ تھے۔ انھیں اطلاع دی گئی۔ وہ بھی فوراً آگئے۔ چونکہ قاتل شہر میں داخل ہوتا دیکھ لیا گیا تھا، اس لئے انھوں نے حکم دیا کہ بلا توقف شہر کے تمام دروازے بند کردئے جائیں اور کوئی شخص باہر نہ جانے پائے اور تحقیقات کی جائے[1]

کریم خاں نے مکان پر پہنچتے ہی انیا کو فوراً فیروز پور جھرکہ بھیج دیا کہ نواب صاحب کو کارگذاری کی اطلاع دی جائے، چنانچہ ناکے بند ہونے سے پہلے وہ شہر سے نکل گیا۔ انیا کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین اور تیز ترین دوڑنے والوں میں سے تھا۔ اس نے چوبیس گھنٹوں میں اسّی نوّے میل کی مسافت طے کرکے اگلے دن شام کے وقت ساری روداد نواب صاحب کے گوش گذار کردی۔

اس کے بعد حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ ہر قدم پر تفتیش کرنے والوں کو کامیابی ہوتی گئی۔ غالب نے ایک فارسی خط میں لکھا ہے[2] کہ چونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ میرے اور نواب شمس الدین خاں کے تعلقات آپس میں کشیدہ ہیں، اس لئے انھوں نے کہنا شروع کردیا کہ میں نے اس معاملے میں نواب کے خلاف مخبری کی ہے، حالانکہ یہ سارا کیا دھرا خود نواب کے ابن عم فتح اللہ بیگ خاں کا ہے اور میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خود نواب شمس الدین خاں کو بھی فتح اللہ بیگ خاں کے خلاف شکایت تھی، لیکن اگر یہ درست نہ بھی ہو تو بھی ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود تھیں۔

(۱) یہ کسی سے مخفی نہیں تھا کہ لوہارو کے قضیے میں فریزر نے جس سرگرمی سے نواب صاحب کے خلاف کام کیا ہے، اس سے نواب صاحب بہت برافروختہ ہیں۔

(۲) اسی شبہے کی بنا پر نواب صاحب کی دریا گنج والی کوٹھی کی تلاشی ہوئی اور وہاں سے نواب صاحب کے کریم خاں کے نام لکھے ہوئے بعض خطوط اور دوسرے کاغذ برآمد ہوئے، جن سے معاملہ اور مشتبہ ہوگیا۔

(۳) جب کریم خاں سے اس کی نقل و حرکت سے متعلق پوچھ گچھ ہوئی تو اس کے جواب ناتسلی بخش پائے گئے، اس پر اسے زیر حراست لے لیا گیا۔

(۴) قتل کے دو تین دن بعد دریا گنج کے علاقے میں ایک شخص کا ڈول کنوئیں میں گر گیا۔ جب غوطہ خور کنوئیں میں اُترا تو ڈول کے علاوہ اس میں سے ایک بندوق بھی نکلی جس کی نال کٹی ہوئی تھی۔ ایک لوہار نے اسے شناخت کیا اور کہا کہ یہ بندوق کریم خاں کی ہے اور خود میں نے اس کے کہنے پر اس کی نال کاٹی تھی۔ ادھر جس گولی سے فریزر ہلاک ہوا تھا وہ اسی بندوق سے چلی تھی۔

(۵) نواب شمس الدین خاں کو جب بہت دن تک دہلی سے کوئی اطلاع نہ ملی، تو انھوں نے کریم خاں کے بہنوئی واصل خاں کو صورت حال معلوم کرنے کے لئے دہلی بھیجا۔ وہ اتفاق سے قتل کے اگلے ہی دن یہاں پہنچا اور گرفتار ہوگیا۔

غرض کریم خاں اور واصل خاں کے جوابات سے مجسٹریٹ کا اطمینان نہ ہُوا اور اسے شبہ ہُوا کہ اس قتل میں خود نواب صاحب کا بھی ہاتھ ہے، تو انھیں دہلی آنے کے لئے لکھا گیا۔ بعض لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ انگریز کا کوئی اعتبار نہیں، آپ دہلی نہ جائیں اور اپنی جان بچا کر کسی طرف نکل چلیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور یہاں چلے آئے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ گرفتار ہوگئے۔

مقدمہ چلا، انیا جو اس اثنا میں گرفتار ہو چکا تھا، سلطانی گواہ بن گیا اور اس نے سارا راز طشت از بام کردیا۔ آخر کار پہلا فیصلہ یہ ہُوا کہ واقعی قتل کریم خاں نے کیا ہے۔ چنانچہ اسے بروز جمعہ ۲۸۔ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی۔ موقع پر چار سو پیادہ فوج موجود تھی۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ کریم خاں بے گناہ ہے۔ انھوں نے اس کی سرخ و سپید رنگت کی مناسبت سے اسے گل سُرخ کا خطاب دیا تھا۔ کریم خاں نے وصیت کی تھی کہ مسلمان میری مغفرت کے لئے دعا کریں۔ چنانچہ جس دن اُسے پھانسی کی سزا ہوئی، اُس دن دہلی کی تمام مسجدوں میں اس کے لئے دعا مانگی گئی۔ مدتوں لوگ اس کی قبر پر پھول چڑھاتے اور چراغاں کرتے رہے۔ قوّال وہاں قوّالی گاتے اور رقص کرتے۔ معلوم نہیں اس

---

[1] کرنیل سلیمان کی انگریزی کی کتاب Recollections and Rambles of an Indian Official. باب سولہ نیز دیکھئے واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۱۹۲-۱۹۳

[2] کلیات نثر صفحہ ۱۶۳ نیز ذکرِ غالب صفحہ ۶۲

کی قبر کہاں تھی[1]

نواب صاحب سے متعلق مجسٹریٹ کا یہ فیصلہ تھا کہ قتل ان کی انگیخت پر ہوا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ریاست کے حکمران تھے۔ اس لئے وہ خود انھیں سزا دینے کا مجاز نہیں تھا۔ اس نے مقدمے کے سارے کوائف، تفتیش کے نتائج، اپنی رائے وغیرہ لکھ کے صدر کلکتہ میں حکم صادر کرنے کے لئے بھیج دی۔ نواب صاحب کو جب اس کا علم ہوا، تو انھوں نے اپنے وکیل مرزا اسفندیار بیگ[2] کو مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتے بھیجا۔ اسفندیار بیگ نے وہاں ایک انگریز وکیل چارلس تھیکرے کی معرفت کارروائی کی، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخری حکم صادر ہوا کہ نواب شمس الدین خاں کو بھی پھانسی دے دی جائے۔

اس حکم کی تعمیل میں نواب صاحب کو جمعرات کے دن ۸۔ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ موقع پر دیسی اور گورہ فوج کا کافی انتظام تھا کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں شہر میں فساد نہ ہو جائے یا لوگ عین موقع پر نواب صاحب کو بچانے اور رہا کرانے کی کوشش نہ کریں۔ نواب شمس الدین خاں سے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اتفاق سے جب نعش لٹک رہی تھی تو اپنے آپ قبلہ رخ ہو گئی۔ اس سے بھی لوگوں نے یہی اثر لیا کہ ڈپٹے گئے شہید ہوئے ہیں۔ نماز جمعہ آٹھ ہزار کے مجمع کے ساتھ دہلی کے مشہور عالم، حضرت شاہ عبد العزیز رح کے نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق رح نے پڑھائی۔ قدم شریف میں دفن ہوئے[3]

---

[1] تاریخ صحافت اردو صفحہ ۹۶-۹۸

[2] مرزا اسفندیار بیگ کا نام غالب کے اردو اور فارسی خطوں میں کئی جگہ آیا ہے یہ بریلی کا رہنے والا تھا۔ پہلے ضلع مظفر نگر میں نیابت فوجداری پر متمکن رہا۔ وہاں سے نواب شمس الدین خاں کے پاس منصرم اور مختار کار ہو کے آ گیا۔ جب اس مقدمے میں اسے ناکامی ہوئی، تو اس نے دستار باندھنا ترک کر دی اور اس کے بعد ساری عمر سر پہ ایک مختصر سا دوپٹا لپیٹتا رہا۔ جب وہ الور میں منشی امو جان کے زمانے میں نائب دیوان ہو کے گیا اور بعد میں ان کے وہاں سے نکلنے پر خود دیوان بن گیا تو ہمیشہ اسی وضع میں رہا۔ اسی لئے وہ الور میں مرزا پھینٹے باز کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا (مرقع الور صفحہ ۱۴۴-۱۵۲، اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۱)

[3] تاریخ صحافت اردو صفحہ ۱۰۱، ذکر غالب صفحہ ۶۹-۷۵

باوا کرشن گوپال مغموم

غزل

رقابت کا کسی عنوان افسانہ نہیں رہتا
محبت مشربی میں کوئی بیگانہ نہیں رہتا

فقط اہلِ نظر پر اس کی وسعت آشکارا ہے
بقیدِ دیدہ و دل حسنِ جانانہ نہیں رہتا

نظر میں جن کی ہے انجامِ گل انجامِ گلشن بھی
نظر میں اُن کی ویرانہ بھی ویرانہ نہیں رہتا

بقیدِ ہوش ہو کوئی تو دیکھے تیرے جلوؤں کو
بقیدِ ہوش لیکن تیرا دیوانہ نہیں رہتا

مزہ پھیکا نہ کیجیے ذکرِ زاہد، ذکرِ واعظ سے
کہ ان باتوں سے لطفِ بزمِ رندانہ نہیں رہتا

جمالِ یار کے جلوؤں سے بتخانہ عبادت ہے
اگر جلوے نہ ہوں، بتخانہ بتخانہ نہیں رہتا

شکایت ہے یہی مغموم کو اے پیرِ مے خانہ
کہ مے خانے سے باہر لطفِ مے خانہ نہیں رہتا

محمد مظفر خاں گرم رامپوری شاگرد ذوق نے تاریخِ وفات ایک معمے کی شکل میں لکھی۔ فرماتے ہیں:

یہ دست درازئ ستم کس سے بیاں ہو
بے جرم و گنہ مسندِ نواب کو اُلٹا
تاریخ معمے میں نئی طرح سے لکھ گرم
کیا چرخ نے نوابئ سہراب کو اُلٹا

تاریخ "نوابئ سہراب" کے لفظوں کو اُلٹنے سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۵۲ھ لیکن اس میں ایک زیادہ ہے۔ صحیح ۱۲۵۱ھ ہوگا۔ ۸۔ اکتوبر ۱۸۳۵ء کے مطابق ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ تھا۔ ایک عدد کی کمی بیشی شعراء نے بعض اوقات جائز رکھی ہے[1]

نواب شمس الدین خاں کے چار اولادیں تھیں۔ ان کی بیاہتا بیوی جانی بیگم، مرزا مغل بیگ خاں کی بیٹی تھیں۔ ان سے دو لڑکیاں — محمد النساء بیگم اور احمد النساء بیگم ہوئیں۔ ایک داشتہ چھپا نامی سے ایک لڑکی رحمت النساء ہوئی دوسری وزیر بیگم (عرف چھوٹی بیگم) سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام نواب مرزا تھا۔ یہی نواب مرزا آگے چل کر ہماری زبان کا مشہور شاعر داغ دہلوی کہلایا۔

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۱۲۴ (حواشی)

خواجہ احمد فاروقی

غالب کا قیامِ آگرہ اور تذکرۂ سرور

مرزا غالب اکبرآباد میں پیدا ہوئے تھے (۱۷۹۷ء) اور انھوں نے اپنی نوجوانی اس ارضِ تاج میں بسر کی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے قیامِ آگرہ کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ البتہ ان کے بعض خطوط اور منظومات میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا یہ زمانہ بڑے عیش میں گزرا تھا۔ اور اُس کی نشاط انگیز یادیں اُن کے ذہن میں آگرہ چھوڑنے کے بعد بھی محفوظ رہیں۔

ایک مرتبہ نواب ضیاء الدین خاں آگرہ گئے تھے۔ ان کو درست افشاں اور پاکوباں لکھتے ہیں۔

"آں ویرانہ آبادیازی گاہِ بچپن مجنونے ۔۔۔۔۔۔ رہ نگار
بود کہ دراں سرزمین جوہر گیاہ نہ رستے و ہیچ نہال جز دل بار
نیاوردے نسیم صبح دراں گل کدہ بستانہ وزیدن دلہا را
آں مایہ از جا برانگیختے کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر و
پارسایاں را نیت نماز ز ضمیر فرو ریختے"

اور آخر میں لکھتے ہیں۔

"رخش سنگین رعائے مرا بکدام ادا پذیرفت و دریا بیا بیخ
سلام من بزبان موج چہ گفت"

مہرنیم روز میں تو اپنی بے ہُدہ کوشی اور ان اوقاتِ عزیز کے ضائع ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے، اور لکھا ہے۔

"با فرو فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن با فرومایگاں
ہم نشین و با اوباش ہم رنگ پائے بیراہہ پوئے و زبان بہرزہ گوئے"

۱ کلیاتِ نثر غالب (فارسی) مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۵ء

۲ مہرنیم روز۔ نسخہ قدسیہ ۱۸۵۴ء۔ ذاتی

لیکن آگرہ کی یہ مدتِ قیام جو شاہد و شعر اور شراب و شکر سے عبارت تھی، کتنے عرصے رہی، اور وہ دہلی کب منتقل ہوئے اس کے لئے غالب کے بعض خطوں کی ورق گردانی کرنا ہوگی۔

۱۔ مرزا غالب نے نواب علاء الدین خاں کے نام خط میں جو ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے، اپنا دہلی کا قیام اکیاون برس سے بتایا ہے۔

کل تمھارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے ۔۔۔۔ جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔

اس خط کی رُو سے غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۸۱۱ء ہونا چاہیے۔

۲۔ نواب کلب علی خاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون ترپن برس سے یہاں (دلی) رہتا ہوں۔ عرش آرام گاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی یا امسال نظر آئی ہے۔"

اس حساب سے غالب نے دہلی کا مستقل قیام ۱۳-۱۸۱۲ء میں اختیار کیا۔

۳۔ مرزا غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے ہیں۔ اپنے سفر کی کیفیت اور مالی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبرآباد کو لکھتے ہیں۔

"اکنوں ششمین سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل
بمرگ ناگاہ نہادہ بہ کنجے نشستہ ام"

۱ خطوطِ غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد ص ۳۳۵ - ۳۳۶ خط نمبر ۳۷۶

۲ مکاتیبِ غالب طبع چہارم ص ۵۷

اس طرح یہ خط ۱۸۳۵ء کا مکتوبہ ہونا چاہیئے۔ اسی میں "درازیِ زمانِ فراق" کے متعلق لکھتے ہیں۔

"بہ گمانِ مخدوم شانزدہ سال است و بہ دانست نامہ نگار کم از بست سال نیست[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے ۱۸۱۵ء کے قریب دہلی میں سکونت اختیار کی ہوگی۔

۴۔ لیکن اس سلسلہ میں غالباً سب سے زیادہ اہم وہ خط ہے جو غالب نے منشی شیونرائن آرام کے نام ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے۔

"برخوردار نورچشم منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند ہو۔۔۔۔۔۔ میں اور وہ ہم عصر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔۔۔۔۔ ہمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔۔۔۔۔۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے[2]"

اس خط کی شہادتیں زیادہ وزنی اور وقیع معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے غالب کے اوقات ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انیس بیس برس کی عمر تک آگرہ میں رہے۔ اور دہلی کا مستقل قیام ۱۸۱۶ء کے بعد پیش آیا۔ اسی خط میں راجہ بلوان سنگھ (خلف مہاراجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس) کے ساتھ پتنگ اُڑانے کا بھی ذکر ہے جنھوں نے آگرہ میں مستقل اقامت ۱۸۱۲ء میں اختیار کی تھی[3]۔

غالب کی سیرت اور شخصیت کا اوّلین نقش آگرہ ہی میں صورت پذیر ہوا تھا۔ اس لئے اکبرآباد کے قیام کی روداد اور اس زمانے کے کلام کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے لیکن مستند معاصرانہ شہادتوں کی غیر موجودگی میں اس قیام کی تفصیل پیش کرنا یا اس کی کوئی قطعی اور فیصلہ کن تاریخ مقرر کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ لیکن غالب کے نقل کردہ خطوط اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ۱۸۱۵ء تک ضرور آگرہ ہی میں تھے۔ اور اکثر و بیشتر شہادتیں اس خیال کو پایۂ یقین تک پہنچاتی ہیں کہ اُنھوں نے آگرہ کی مستقل سکونت ۱۸۱۴ء کے بعد چھوڑی ہوگی۔

بیرونی ماخذ میں نواب اعظم الدولہ سرورؔ کا نادر اور گراں قدر تذکرہ ہمارے لئے خاص طور پر اہم ہے۔ اس لئے کہ اس سے غالب کی ابتدائی زندگی اور اُن کے قیام آگرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

تذکرۂ سرور یا عمدۂ منتخبہ کا ذکر ڈاکٹر اشپرنگر نے فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے بعض بیانات ناقص اور گمراہ کن ہیں۔ ترجمہ اسد میں سرور کے حوالے سے لکھا ہے۔

"اسد۔ اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ۔ اُن کے بزرگ سمرقند کے تھے اور یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے[1]"

ظاہر ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں، اور غالب دہلی میں نہیں آگرے میں پیدا ہوئے تھے۔ اشپرنگر کو سرور کی عبارت کے پڑھنے اور سمجھنے میں سہو ہوا۔ اس کے الفاظ جو انڈیا آفس کے نسخے سے نقل کئے گئے ہیں۔

"اسد تخلص، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافۂ اکبرآباد[2]"

شیخ محمد اکرام صاحب آثارِ غالب نے بھی سرور سے استفادہ کیا ہے لیکن ان کے یہاں بھی "غلطی ہائے مضامین" کچھ کم نہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرور کے ترجمۂ اسد کو پیش کرکے اس کی تنقیح کی جائے۔

اس تذکرے کی شانِ نزول یہ ہے۔

"حامی میر محمد خاں المتخلص بہ سرور سمیع بلند فہماں نکتہ طراز و فصاحت منشان بلاغت پرداز می رساند کہ از ابتدائے سن شباب ذوقِ شعر گوئی ریختہ در دل متمکن بود، بعد چند

---

[1] کلیاتِ نثر فارسی (غالب) طبع چہارم
[2] خطوطِ غالب ص ۳۸۰۔ ۳۸۱ اور خط نمبر ۲۱۴
[3] غالب غلام رسول مہر طبع سوم ص ۷۹

[1] بارگاہِ شعرا ص ۲۲
[2] تذکرۂ سرور (عمدۂ منتخبہ) مخطوطہ انڈیا آفس

بقدر استعداد ذاتی آنچہ کہ از دل بزبان می آمد موزوں
می نماید بنا بر علیٰ ہذا بخاطر فاتر خطور کرد کہ اشعار ریختۂ شعرائے
ماضی و حال جمع نمودہ بطور تذکرہ تالیف نماید و معنیٔ قلی و
دل منظور دارد، تا مطالعہ کنندگان را از طوالت رنج نیفزاید"[1]

سرور کے ذاتی حالات مجموعۂ نغز میں زیادہ تفصیل سے دئے ہیں۔

"سرور یعنی سردار تخلص اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر
سلمہ اللہ اکبر خلف الصدق نواب غفران مآب اعظم الدولہ
ابو القاسم بہادر مظفر جنگ است ۔۔۔ جوانے است
خوش طبع، خندہ پیشانی، نیک اختلاط، پاکیزہ زندگانی
شیریں گفتار عذوبت بیان، نیکی کردار، رافت نشان ...
استفادہ کتب متداولہ فارسی از مرزا جان بیگ سامی
نمودہ و مشق سخن در ابتدا از میر فرزند علی موزوں فرمودہ
دیوانش ..... دلچسپ و خاطر فریب است، تذکرۃ الشعرا
بسیار خوب نوشتہ"[2]

اشپرنگر کا خیال ہے کہ قاسم کا مجموعۂ نغز سرور کے تذکرے پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے۔ قاسم کے تذکرے میں ایسا مواد بھی ہے جو ان کی اپنی کوششوں سے جمع کیا گیا ہے اور جو تذکرۂ سرور میں موجود نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ تذکرۂ سرور کا ترجمہ غالب پیش کیا جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تاریخ تصنیف کا اندازہ کرلیا جائے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا خیال ہے کہ عمدۂ منتخبہ یا اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور کا یہ تذکرہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) اور ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) کے درمیان لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ انڈیا آفس کے اس قلمی تذکرے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے[3] اور یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا ترجمۂ غالب کس زمانے کا ہے، یہ بات بھی درست نہیں، اس لئے کہ اس نسخہ کے خاتمہ پر ایک چھوڑ تین تین

[1] تذکرہ اعظم الدولہ سرور نسخۂ لندن
[2] مجموعہ نغز ص ۲۹۴ و ۲۹۵ ج اول
[3] آثار غالب ص ۲۲ و ۲۶ طبع چہارم

تاریخیں درج ہیں۔

تذکرۂ سرور کے آخر میں نظام الدین خاں ممنون کی تاریخ دی ہے۔
جو تاریخ پوچھی تو ممنون نے کہا " یہ ہے معیار نقد سخن " ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء
بھولا ناتھ عاشق نے "باغ و بہار" سے تاریخ نکالی ہے۔

مری بلبل طبع نے دیکھ عاشق
کہی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

اس سے ۱۲۱۷ ہجری (جو مطابق ہے ۱۸۰۲ء) نکلتی ہے۔
اعظم الدولہ سرور کا بیان ہے کہ

"ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹ء)
صورت اختتام پذیرفت"[1]

یہ امر یقینی ہے کہ یہ تذکرہ کئی سال میں جاکر اختتام کو پہنچا ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں تقریباً بارہ سو شعرائے اردو کا حال درج ہے اور کافی ضخیم اور مبسوط ہے۔ آغاز تالیف کے متعلق کوئی بات پوری قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن تذکرہ میں بعض شہادتیں ایسی موجود ہیں جن کے پیش نظر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتدا برخلاف صراحت اشپرنگر ۱۸۰۱ء سے پہلے ہو چکی تھی۔

۱۔ سرور نے خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے۔

"مدتے شد کہ بدار الجنان اقامت گزید"[2]

درد کا انتقال ۱۷۸۵ء (۱۱۹۹ھ) میں ہوا ہے[3]۔ سرور جس وقت تذکرہ لکھ رہے تھے درد کی وفات کو ایک مدت ہو چکی تھی۔ اعظم الدولہ نے میر قمر الدین منت کی رحلت کا سنہ دیا ہے۔

"در ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) سفر آخرت گزید"

مؤلف نے آصف الدولہ کو بھی مرحوم لکھا ہے اور ان کے عین شباب میں مرنے پر انتہا درد افسوس کیا ہے

"آصف تخلص وزیر الممالک مدار المہام آصف جاہ

[1] تذکرہ اعظم الدولہ سرور ص ۸۸، (مخطوطہ لندن)
[2] ایضاً ترجمۂ درد
[3] بیل۔ اورنٹیل جیوگرافیکل ڈکشنری۔ بیدار نے تاریخ لکھی ہے۔
حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

یحییٰ خاں آصف الدولہ بہادر ہزبر جنگ مرحوم ..... حیف کہ در عین شباب بسن چہل سالگی رخت اقامت ازیں عالم پر آشوب و فتن بر بست[1]"

تاریخ مظفری کی روایت کے بموجب انھوں نے انچاس برس کی عمر پائی، اور "وزیر نامے" سے ثابت ہے کہ وہ پچاس سال سے زیادہ عمر پاکر فوت ہوئے۔ اُس کو "عین شباب" کہنا درست نہیں۔ آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء (۱۲۱۲ ہجری) میں ہوا ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں[2]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ سرور کی تالیف ۱۷۹۷ء کے بعد شروع ہوئی ہوگی۔

۲۔ اعظم الدولہ نے بیان کا ذکر حالیہ صیغوں میں کیا ہے۔

"بیان تخلص خواجہ احسن الدین خاں شاگرد مرزا جان جاناں مظہر رحمۃ اللہ علیہ اصلش از کشمیر و مولد شاہ جہان آباد مرید جناب مخدومی حضرت مولوی محمد فخر الدین صاحب قدس اللہ سرہ از چندے بطرف حیدر آباد رفتہ در سرکار نواب نظام علی خاں مرحوم در ریختہ گوئی مشاق و خوش گو است و مربوط گو و فصیح البیان"

خم خانۂ جاوید، گلِ رعنا اور جواہرِ سخن کی تصریح کے مطابق بیان کا انتقال ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں ہوا ہے۔ مولانا عرشی نے یکتا کی دستور الفصاحت کے دیباچے میں "استاد از جہاں رفت" جو مادۂ تاریخ نقل کیا ہے اس سے بھی یہی سنہ نکلتا ہے[3]۔ دستور الفصاحت ۱۲۱۳ ہجری (۱۷۹۸ء) سے پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں یکتا نے بیان کے متعلق لکھا ہے۔

"می گویند کہ تا حال زندہ است[4]"

ان امور کے پیشِ نظر قرینہ غالب ہے کہ تذکرہ سرور آصف الدولہ کے انتقال (۱۷۹۷ء) کے بعد اور بیان کی وفات (۱۷۹۸ء) سے پہلے شروع کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مؤلف کے دیئے ہوئے سال اختتام یعنی ۱۸۰۹ء تک پہنچنے میں حذف و اضافہ اور ترمیم و اصلاح کی بہت سی منزلوں سے گذرا ہوگا۔ بعض اندرونی شہادتوں سے بھی یہی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ تالیف آغاز کے بعد کئی برس تک جاری رہی اور ۱۸۰۹ء میں انجام کو پہنچی۔

[1] تذکرۂ سرور
[2] ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ج ۳ ص ۳۵۰ اور فرح بخش مؤلفہ فیض بخش
[3] دستور الفصاحت ص ۸۳ حاشیہ
[4] ؍؍ نیز دیباچہ عرشی ص ۲۷

۱۔ سرور نے مکرم الدولہ بہادر کے انتقال کا سنہ ۱۲۱۸ ہجری (۱۸۰۳ء) دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس مرحوم کے یہاں مشاعرے اور رقص کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔

۲۔ سرور نے انشا کے بیان میں لکھا ہے۔

"در ایامے کہ بسرکار مرشد زادہ آفاق کوترا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ ملازم بود، قصیدہ در تہنیت سال گرہ شہزادہ دام عمرہ موزوں نمودہ، ہمہ پر از مضامین عالی است کہ مطلعش این است

صبح دم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی نیند اُچٹ[1]"

انشا ۱۲۱۵ ہجری (۱۸۰۰ء) تک مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم رہے یہ بیان اس کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے۔

۳۔ سرور نے بادشاہِ دہلی شاہ عالم آفتاب کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے اور اُس کی سلطنت کی پائیداری کی دعا مانگی ہے۔ شاہ عالم کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا ہے۔

۴۔ اثر کے ترجمے میں لکھا ہے۔

"....... برادر کوچک حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ اشعار ہندی بہ صحت محاورہ می گفت از چندے ازیں جہان فانی رخت اقامت بربست[2]"

اثر کا انتقال اتمام مجموعہ نغز یعنی ۱۸۰۶ء سے پہلے ہوا ہے۔

۵۔ سرور نے جرأت کا حال ان کی زندگی میں لکھا ہے۔

"جرأت تخلص قلندر بخش .... از چندے بسبب اتفاق سعے قبائل بہ لکھنؤ رفتہ طرح اقامت انداخت ..... مصلح اشعار اکثر سکنائے لکھنؤ است۔ در علم نجوم نیز مہارت دارد و بعلم موسیقی ہم آشنا است۔ چنانچہ در نواختنِ ستار دستے دارد .... دریں زمانہ ہمچو شخص بسا مغتنم[3]"

اکثر اہلِ تذکرہ کا اتفاق ہے کہ جرأت کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا ہے۔

[1] تذکرہ سرور
[2] تذکرۂ سرور
[3] تذکرۂ سرور

۶۔ اسی طرح سرور نے میر کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جو ان کی زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ آصف الدولہ مرحوم کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔

"پرداخت و مراعات شعرا منظور نظر۔۔۔۔ داشت۔
چنانچہ میر محمد تقی متخلص بمیر کہ در فنِ ریختہ گوئی سر آمدِ شعرائے
وقتست بہ صیغہ شاعری دو صد روپیہ در ماہہ را ملازم بود"[1]

میر کے ترجمے میں بھی لکھا ہے۔

"فی الواقع مرتبہ شاعری او دریں زمانہ بسا بلند است"[2]

میر کی تاریخ وفات ناسخ کے اس مصرع سے "واویلا مُرد شہ شاعران" ۱۲۲۵ ہجری (۱۸۱۰ء) نکلتی ہے۔

سرور کے بیان اور "عمدہ منتخبہ" کی اندرونی شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۸۰۹ء میں ہو چکی تھی، اور غالب کے کسی خط سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے آگرہ کی سکونت ۱۸۱۱ء سے پہلے ترک کی ہو بلکہ زیادہ شواہد اس بات کے ہیں کہ وہ ۱۸۱۴-۱۸۱۳ء کے بعد آکر دہلی میں بسے ہوں۔

ان امور کے پیش نظر بہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سرور نے مرزا غالب کے جو حالات لکھے ہیں اور ان کے جو اشعار نمونے کے طور پر نقل کئے ہیں وہ مرزا کے قیام اکبر آبادی سے متعلق ہیں۔

اعظم الدولہ سرور نے 'عمدہ منتخبہ' میں غالب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا پُورا متن یہ ہے۔

"اسد تخلص اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافۂ اکبر آباد جوان قابل و یار باش و دردمند همیشہ بہ خوش معاشی بسر بُودہ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز تربیت یافتہ خم کدہ نیاز در فن سخن سنجی متتبعِ محاورات مرزا عبد القادر بیدل علیہ الرحمتہ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ بمضامین نازک موزوں گشتہ، رویہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"

[1] تذکرہ سرور [2] تذکرہ سرور

اس متن کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے "اکبر آباد" کا لفظ نظر انداز کر دیا ہے[1]۔ اس کی وجہ سے انھوں نے سرور کے حوالے سے غالب کا مولد دہلی کو قرار دیا ہے۔ جو کسی طرح نہیں۔

۲۔ شیخ محمد اکرام نے "ذوقِ ریختہ گوئی" کا ٹکڑا حذف کر کے "غمہائے عشقِ مجاز" کا تعلق "خاطر" سے جوڑا ہے جو درست نہیں۔ موصوف نے اس طرح لکھا ہے۔

"ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بودہ۔۔۔۔ در خاطر متمکن
غمہائے عشقِ مجاز"[2]

۳۔ متن کے آخری جملے کو شیخ محمد اکرام نے اس طرح نقل کیا ہے۔

"رُویہ خیال بندی بیش از بیش نہاد خاطر دارد"

رُویہ خیال بندی بھی اور پیش نہادِ خاطر بھی یہ جملہ صحیح نہیں۔ موصوف کو پڑھنے میں سہو ہوا ہے۔ فارسی میں روّیہ کے معنی ہیں دستور۔ چلن۔ طریقہ۔

سرور کے اس ترجمہ میں مندرجہ ذیل باتیں بھی غور طلب ہیں۔

۱۔ یہ ترجمہ اس زمانے کا ہے جب غالب، بیدل کے طرز میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری کے متعلق اس سے بہتر رائے نہیں ہو سکتی۔

"ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند" یا "موجد
طرز خود است" یا "اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ
بمضامین نازک موزوں گشت۔ روّیہ خیال بندی بیش از بیش
پیش نہاد خاطر دارد"

۲۔ سرور نے اس ترجمے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ غالب اب دہلی میں سکونت رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات لکھنے کی تھی۔ کریم الدین تو سالہا سال کے بعد بھی اس کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

"ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے، اب شاہ جہاں
آباد میں ۱۲۵۰ ہجری (۱۸۳۴ء) کے قبل سے رہتے ہیں"[3]

سرور بالعموم سکونت کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں مثلاً اُمید کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

[1] یادگار شعراء
[2] آثار غالب (غالب نامہ) طبع چہارم ص ۴۲
[3] تذکرہ کریم الدین ص ۲۷۷

"اصلش از ایران و مسکنش شاہ جہاں آباد ست"

یہ امانی اسد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"از بسکہ بشاہ جہاں آباد در کوچۂ ارباب نشاط کہ مشہور محلّۂ دار الخلافہ است مسکن داشت"

احسن اللہ خاں احسن کے متعلق لکھتے ہیں۔

"قریب دروازۂ لاہوری" دار الخلافہ در مسجد سر ہندی استقامت دارد"

اگر غالب اس زمانے میں دہلی میں اقامت گزیں ہوتے تو یہ مستبعد نہیں کہ سرور اس کی تصریح ضرور کرتے جیسا کہ انھوں نے بعض دوسرے شاعروں کے باب میں کی ہے اور جیسا کہ غالب کے متعلق کریم الدین۔ میر محسن علی محسن، سر سید اور نسّاخ نے صراحتاً لکھا ہے کہ اُن کا مولد اکبر آباد اور مسکن دہلی ہے۔ اس کے علاوہ سرور نے غالب کی "نرش معاشی" کا جو ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ بھی اس کی غمازی کرتی ہے کہ یہ اندراجات غالب کے قیام آگرہ ہی سے متعلق ہیں۔

سرور نے غالب کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔

شمشیر صاف یار جو زہر آب دادہ ہو   وہ خطِ سبز ہے کہ بر خسار سادہ ہو
دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو   آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

یہ دونوں اشعار نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

آئے ہیں پارہ ہائے جگر اب میانِ اشک   لایا ہے لعل بیش بہا کاروانِ اشک

نسخہ حمیدیہ میں میان کے بجائے درمیان ہے۔

آنسو کہوں کہ آہ سوارِ ہوا کہوں   ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

یہ شعر نسخہ حمیدیہ میں موجود ہے۔

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے   یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے
دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے   دیدۂ گریاں مرا فوّارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش   اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے
مجلس شعلہ عذاراں میں جو آجاتا ہوں   شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہو وے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام   جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک رُوکے نہ رہنے سے ہو   کہ بیک جنبشِ لب مثل صدا جاتا ہوں
اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانہ کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہو وے ہو گئی سناں پیدا   دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

مندرجہ بالا نو اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود نہیں ہیں۔

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع اس طرح ہے

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر   جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر
یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں راہ غلط   کی تصوّر نے بصحرائے ہوس راہ غلط

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

گلشن میں بند و بستِ بضبطِ دگر ہے آج   قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

یہ شعر نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ زاہد کو مُباح اور مالِ صوفی کو حلال

نسخۂ حمیدیہ میں دوسرا مصرع اس طرح ہے۔

مالِ سُنّی کو مُباح اور خونِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل   دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پُوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پُھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہیں۔

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے   ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے
ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے   عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے   سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رسوائی   دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوا ہے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز الخ

یہ اشعار سرور کے یہاں اس مقام پر نہیں ہیں۔ مندرجہ بالا غزل نسخۂ حمیدیہ میں ہے۔

کب سُنے ہے وہ کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع یوں ہے۔

کیا وہ سنتا ہے کہانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ　　دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے لوگ　　مگر آشفتہ بیانی میری

بعض مطبوعہ نسخوں میں "لوگ" کے بجائے "یار" ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا

یہ غزل نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز　　گرم بازارِ فوجداری ہے
پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع یوں ہے۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب　　بے قراری کا حکم جاری ہے

نسخۂ حمیدیہ میں "بے قراری" کے بجائے "اشک باری" ہے۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بیخودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۵۰ مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مطبوعہ دیوانوں میں اس رباعی کا دوسرا مصرع اس طرح ہے۔

سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

رباعی منقولہ سرور سے جواں سال غالب کی اس نفسیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو ان کے آگرہ کے قیام میں تھی۔ وہ ریختہ کو محاورات فارسی میں لکھنا اور بیدل کی پُر پیچ شاعری کی تقلید ہی کو معراج سمجھتے تھے۔ اس لئے معترضین بھی اُن کی رائے میں "جاہل" تھے۔ لیکن دوسرے مصرع کی تبدیلی جو مروجہ دیوانوں میں ہے، صاف ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے اپنی غلطی کو محسوس کرلیا، اور "سخنورانِ کامل" کی تنقید کے آگے سپر ڈال دی۔ یہ تبدیلی غالب کے ایک نئے اور بالیدہ ذہن کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو یقیناً دہلی کی آب و ہوا کا پروردہ ہے۔ لیکن سرور نے جس طرح رباعی کو نقل کیا ہے وہ آگرہ کے قیام ہی کی یادگار ہوسکتی ہے۔

معلومات اور اعداد و شمار

پہلے پنج سالہ پلان کے اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت ترقی کے لئے بلاکوں کی انتہائی تعداد ایک ہزار دو سو مقرر کی گئی تھی۔ اس تعداد میں سے ۱۰۳۱ بلاکوں میں کام شروع ہوگیا ہے، اور ان بلاکوں میں دیہات کی تعداد ۱۰۶۰۵۷ ہے۔

سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء میں نوجوانوں کے ۴۴۷ کیمپ قائم کئے گئے اور اپریل ۱۹۵۵ء سے ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک ان کیمپوں کی تعداد ۷۹۵ رہی۔ مرکزی حکومت نے ۱۹۵۴-۵۵ء کے دوران میں کیمپوں کے اخراجات کے لئے ۲۲۱۸۴۶۸ روپیہ کی مالی امداد دی اور ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک ان کیمپوں تک ان کے اخراجات کے سلسلے میں ۴۴۹۶۵۲۸ روپیہ کی رقم دی۔

آج کل ہندوستانی ریلوں پر سیاحوں کے لئے تیسرے درجے کی چوبیس گاڑیاں چل رہی ہیں، توقع ہے کہ ۱۹۵۵-۵۶ء کے آخر تک یہ تعداد ۲۶ ہو جائے گی۔

۱۹۵۵ء کے پہلے ۹ ماہ میں ہندوستان سے ۸۲۲۳۲ ٹن سے بھی زیادہ چاول برآمد کیا گیا ہے۔

۱۸ ریاستی حکومتوں نے پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دینے کے توانین وضع کردئے ہیں۔

مختار الدین احمد

غالب کی ایک مُہر

غالب کی جن مُہروں کا اب تک پتہ چلا ہے اور جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کی تعداد چھ ہے۔ اس موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید مضمون جناب مالک رام صاحب نے عرصہ ہوا ادبی دنیا لاہور بابت (اپریل ۱۹۴۱ء) میں سپرد قلم کیا تھا۔ ان کی کتاب "ذکر غالب" میں بھی اس کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ اس مضمون میں اس مُہر کے متعلق جس میں عربی کا ایک شعر بھی منقوش ہے بعض معروضات پیش کئے جاتے ہیں۔

اس مُہر کا جو غالب کی طرف منسوب کی جاتی ہے پہلی مرتبہ ذکر غالباً جناب غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب 'غالب' میں کیا جس کی اطلاع انھیں حیدرآباد ریڈیو کی ایک نشری تقریر سے ملی تھی اور جس میں بتایا گیا تھا کہ حیدرآباد کی ایک ذاتی کتاب خانے میں طب کی ایک قلمی کتاب پر غالب کی تحریریں اور حواشی ملتے ہیں اور اس پر ان کی ایک مہر بھی ثبت ہے جس پر عربی کا یہ شعر بھی درج ہے۔

رضینا قسمة الجبّار فینا   لنا علم و للجھّال مالُ

راقم کا خیال ہے کہ وہ مہر مرزا غالب کی نہیں بلکہ ان کے ہم نام اور ہم تخلص ایک دوسرے شاعر اسد اللہ خاں غالب کی ہے جو شاعر ہونے کے ساتھ طبیب پیشہ بھی تھے۔

کتب خانۂ شاہی برلین (جرمنی) کا بیشتر حصہ دوران جنگ میں ٹیوبنگن اور ماربرگ بھیج دیا گیا تھا جہاں ہوائی حملوں کی زد سے محفوظ کرنے کے لئے زمین دوز تہ خانوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ تقسیم جرمنی سے کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ یہ ذخیرے اب تک برلین واپس نہ جا سکے اور انھیں دو مقامات پر موجود ہیں اور مطالعہ (نقل و عکس) کی ساری آسانیاں فراہم ہیں۔ راقم کو اپنے کام کے سلسلے میں ان دونوں مقامات میں بھی قیام کرنے اور ان ذخیروں سے جن میں عربی' فارسی اور ترکی کی بیش بہا قلمی کتابیں جمع ہیں مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ذخیرہ ماربرگ میں کلیاتِ طالب کلیم[1] کا ایک قلمی نسخہ دیکھنے میں آیا۔ جس پر کہیں کہیں تصحیحات درج ہیں اور دو تین مقامات پر حواشی میں بعض اشعار کا اضافہ بھی موجود ہے۔ اس کے سرورق پر سید اسد اللہ خاں کی تین مہریں ثبت ہیں اور یہ مستبعد نہیں کہ اضافے اور تصحیحات بھی انھیں کی قلم کے ہوں۔ مُہروں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ایک چھوٹی سی چوکور مُہر پر خط نستعلیق میں۔ سید اسد اللہ خاں درج ہے اور ۱۱۴۴ ک اعداد منقوش۔

۲۔ یہ مُہر بھی مربعہ ہے لیکن تقطیع میں پہلی سے بڑی۔ اس میں طغرا میں عربی کا مذکورہ بالا شعر کندہ ہے اور وسط میں اسد اللہ خاں کا نام۔

۳۔ یہ مُہر بیضاوی ہے اور تقطیع میں مُہر نمبر ۲ سے بھی کچھ بڑی۔ حاشیے میں خط نسخ میں وہی عربی شعر اور وسط میں خط نستعلیق میں سید اسد اللہ خاں غالب' اور ۱۱۵۴ کے اعداد منقوش ہیں۔

اگر راقم کا یہ قیاس غلط نہیں کہ نسخہ حیدرآباد پر انھیں اسد اللہ خاں غالب کی مُہر درج ہے تو یہ مُہر مرزا غالب کی نہیں ہو سکتی۔ وجوہ یہ ہیں۔

۱۔ مرزا غالب۔ سید نہ تھے۔ مُہروں میں سید صراحتاً کندہ ہے۔

۲۔ مُہروں میں ۱۱۴۴ھ اور ۱۱۵۴ھ کے اعداد منقوش ہیں ظاہر ہے صاحب مُہر مرزا غالب سے متقدم ہیں ورنہ اس وقت تو مرزا غالب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

۳۔ مرزا غالب سے یہ مستبعد ہے کہ وہ اپنی مُہر میں عربی کا کوئی شعر کندہ کرائے۔ عام طور پر ان کی مُہریں مختصر اور چھوٹی ہیں۔ مُہروں میں وہ لفاف کے

۱؎ نمبر اوکٹو ۱۰۰۔ فہرست فارسی کتب خانہ شاہی برلین

پتے کی طرح حشو و زوائد پسند نہ کرتے تھے ۔ پورا شعر کندہ کرانا شاید ہی انھیں مرغوب ہوتا ۔ بہ فرضِ محال وہ کسی عربی شعر کی بجائے فارسی یا اردو کا کوئی اپنا ہی شعر اس موقعہ پر انتخاب کرتے [کلیات غالب طبع اول میں جو تصویر انھوں نے شائع کرائی ہے اس پر اپنا فارسی شعر؎ ’غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ۔ ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم‘ درج کرایا ہے] پھر اس میں بھی شبہ ہے کہ وہ اس مضمون کا شعر انتخاب کرتے ۔ مرزا دنیاوی سمجھ بہت اچھی رکھتے تھے اور وہ نوابان رام پور، شہزادوں، والیان ملک اور دوسرے امراء سے اپنی مُہریں ’وللجہّال مالُ‘ لکھ کر تعلّقات خراب کرنا کبھی پسند نہ کرتے ۔ [نسخۂ مار برگ کی مُہر میں ’للجہال‘ کے بجائے للاعداء ہے اور یہی روایت مشہور ہے]

۴ ۔ ان کی طرف بہ منسوب مُہر اب تک کسی خط یا ان کی مسلّم کسی کتاب پر دیکھنے میں نہیں آئی ۔

۵ ۔ حیدر آباد میں جس نسخے پر یہ مُہر ثبت بتائی جاتی ہے وہ طب کی کتاب ہے ۔ فن طب کی کسی کتاب سے مرزا غالب کی دلچسپی دور از قیاس ہے کہ وہ مطالعہ کرتے اور اس پر توجہ سے حواشی لکھتے ۔ کلّیات کلیم سے ان کی دلچسپی ظاہر ہے بلکہ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس اس کا ایک نسخہ رہا تھا ۔ لیکن اس پر جو تحریریں ہیں وہ مرزا غالب کی شانِ خط سے دور کا بھی تعلّق نہیں رکھتیں ۔ یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ حکیم اسد اللہ خاں کے کتب خانے کی یہ دونوں کتابیں ہیں اس لئے کہ انھیں طب کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی تھی ۔ تذکروں میں ان کے طبیب اور شاعر ہونے کا تذکرہ موجود ہے ۔

۶ ۔ ہم محقّقین سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہر معاملہ کی خود تحقیق کریں اور نہ ’غالب‘ اور ’ذکر غالب‘ کے مصنّفین سے یہ ممکن تھا کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کے لئے حیدر آباد[۱] کا سفر کرتے ۔ مقرر کا فرض تھا کہ وہ صحیح حالات فراہم کرتے ۔ ظاہراً انھوں نے مُہر میں ’سید‘ کا لفظ اور مُہر کندہ ہونے کے سنین درج نہیں کئے ورنہ فاضل مصنفین کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی ۔

اگر نسخہ حیدر آباد کی مُہر، ان مُہروں سے مختلف نہیں جو مخطوط المانیہ پر ثبت ہیں اور جن کے عکس پیش کئے جا رہے ہیں اور ان میں ’سیّد‘ کا لفظ موجود ہے اور ۱۱۴۴ یا ۱۱۵۴ کے اعداد بھی منقوش ہیں تو بلا شبہ یہ مُہر مرزا غالب کی مُہر نہیں ہو سکتی ۔

مضمون کے آخر میں دو باتیں لکھنی ضرور ہیں ۔

عربی کا مذکورہ شعر ایک مشہور قطعہ کا ہے ۔

رضینا قسمۃ الجبّار فینا   لنا علمٌ و للاعداءِ مالُ
فاِنّ المال یفنی عن قریبٍ   واِنّ العلم باقٍ لایزالُ

گزشتہ سال ڈاکٹر نظام الدین صاحب (دائرۃ المعارف حیدر آباد) اور آغا حیدر حسن دہلوی کے عزیز اور خویش آکسفرڈ تشریف لائے تھے ۔ میرے استاد ہملٹن گِب نے مجھے اس بات پر مامور کیا کہ انھیں آکسفرڈ کی سیر کراؤں اور یہاں کے کالج اور ادارے دکھاؤں ۔ میں انھیں ایشمولین میوزیم کا وہ

---

[۱] مالک رام صاحب کے مضمون مطبوعہ ادبی دنیا بابت ماہ اپریل ۱۹۴۱ء سے ذیل کا اقتباس فاضل مضمون نگار (ڈاکٹر مختار الدین آرزو) کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کافی ہے ۔

اس مُہر کا ذکر سب سے پہلے جناب محمد عبد الرزاق صاحب راشد نے کیا معتمد فنانس ریاست حیدر آباد دکن نے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں کیا تھا جو وہاں کے روزنامہ ’صحیفہ‘ کی اشاعت ۲۰ فروری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اس تقریر میں جناب راشد صاحب نے کہا تھا کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گھٹی حیدر آباد) کے کتب خانے میں علم طب کی ایک قلمی کتاب ”ذخیرہ دولت شاہی“ ہے جس پر مرزا غالب کی مندرجہ صدر مہر ہے اور کتاب کے صفحات پر حاشیے میں غالب کی تحریریں بھی ہیں ......

پچھلے دنوں ایک کام سے مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا ۔ اس کتاب کو دیکھنے کے لئے میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا ۔ انھوں نے بہت مہربانی فرمائی کہ کتاب ’مشار الیہ‘ مجھے دیکھنے کو دی ۔ میں نے سرورق پر مُہر دیکھی ۔ واقعی مرزا غالب کی مُہر ہے ۔ مربع شکل ہے ۔ ارد گرد یہ شعر کندہ ہے

رضینا قسمۃ الجبّار فینا   لنا علمٌ و للجہّال مالُ

اور عین وسط میں لکھا ہے ۔ اسد اللہ خاں غالب ۱۲۵۴ھ ۔ مہر کی پیشانی پر خط نستعلیق میں ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہے اور نیچے اسد اللہ خاں دہلوی آگے ص ۲۴ پر

شو کیس دکھا رہا تھا جس میں سینکڑوں قسم کی ہزاروں انگوٹھیاں اور مُہریں قدیم ترین زمانہ سے لے کر انیسویں صدی تک کی محفوظ تھیں۔ ان میں شاہوں اور وزرا کی انگوٹھیاں تھیں۔ اور امراء و رؤساء کے ساتھ ساتھ شعراء اور ادبا کی بھی۔ یہاں ایسی مہریں بھی تھیں جو نہ جانے کتنی مرتبہ بے قصوروں کو قید و بند اور شہادت کے جواز میں سر محضر لگی تھیں اور ایسی بھی جن سے کتنی ہی مرتبہ خلعتیں اور جاگیریں بخشی گئی تھیں۔ ان کامیاب عاشقوں کی انگوٹھیاں بھی تھیں جنھوں نے پیمانِ وفا باندھتے وقت اپنی محبوباؤں کو پیش کیا تھا اور جن پر ان کے نام منقوش تھے۔ اور ایسے حرماں نصیبوں کی بھی جنھوں نے زندگی سے تنگ آکر اس کا ہیرا چاٹ لیا تھا۔ جب ہم ایسی انگوٹھیاں دیکھ رہے تھے جن سے انگلستان کے بادشاہ مُہروں کا کام لیتے تھے تو ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب نے اپنے ہم سفر کی انگلی کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے پوچھا اس مُہر کو آپ پہچانتے ہیں؟ یہ مرزا غالب کی مشہور مُہر تھی۔ عقیق پر نہایت خوب صورت حروف میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے الفاظ منقوش تھے۔ مختلف کاغذوں پر متعدد بار اس کے نقوش دیکھنے میں آئے تھے۔ اب پہلی مرتبہ جو اس مُہر کی زیارت ہوئی تو حسرتِ شوق اور تعظیم کے ملے جُلے جذبات میں میں نے اسے دیکھا۔ کتنے زمانے تک یہ مرزا کے پاس رہی ہوگی۔ کتنی مرتبہ اُنھوں نے اسے چھُوا ہوگا۔ کتابوں اور خطوں پر اس سے مُہر لگائی ہوگی۔ کتنی بار اسے اپنی انگلیوں میں پہنا ہوگا' اُتارا ہوگا اور کتنی مرتبہ شعر سوچتے وقت اسے انھوں نے اپنی انگلیوں میں گردش دی ہوگی۔

آغا حیدر حسن صاحب مرزا کے رشتہ داروں میں ہیں اور اس طرح یہ نعمت اُنھیں ہاتھ لگی ہے۔ نواب معظم علی خاں بھوپال کے پاس کہا جاتا ہے مرزا کا پیالہ موجود ہے۔ دہلی اور پٹودی میں بھی تعجب نہیں کچھ آثار موجود ہوں۔ یہ ساری چیزیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے میوزیم یا کسی اور مستند جگہ پر محفوظ ہوجائیں تو کیسا اچھا ہو۔

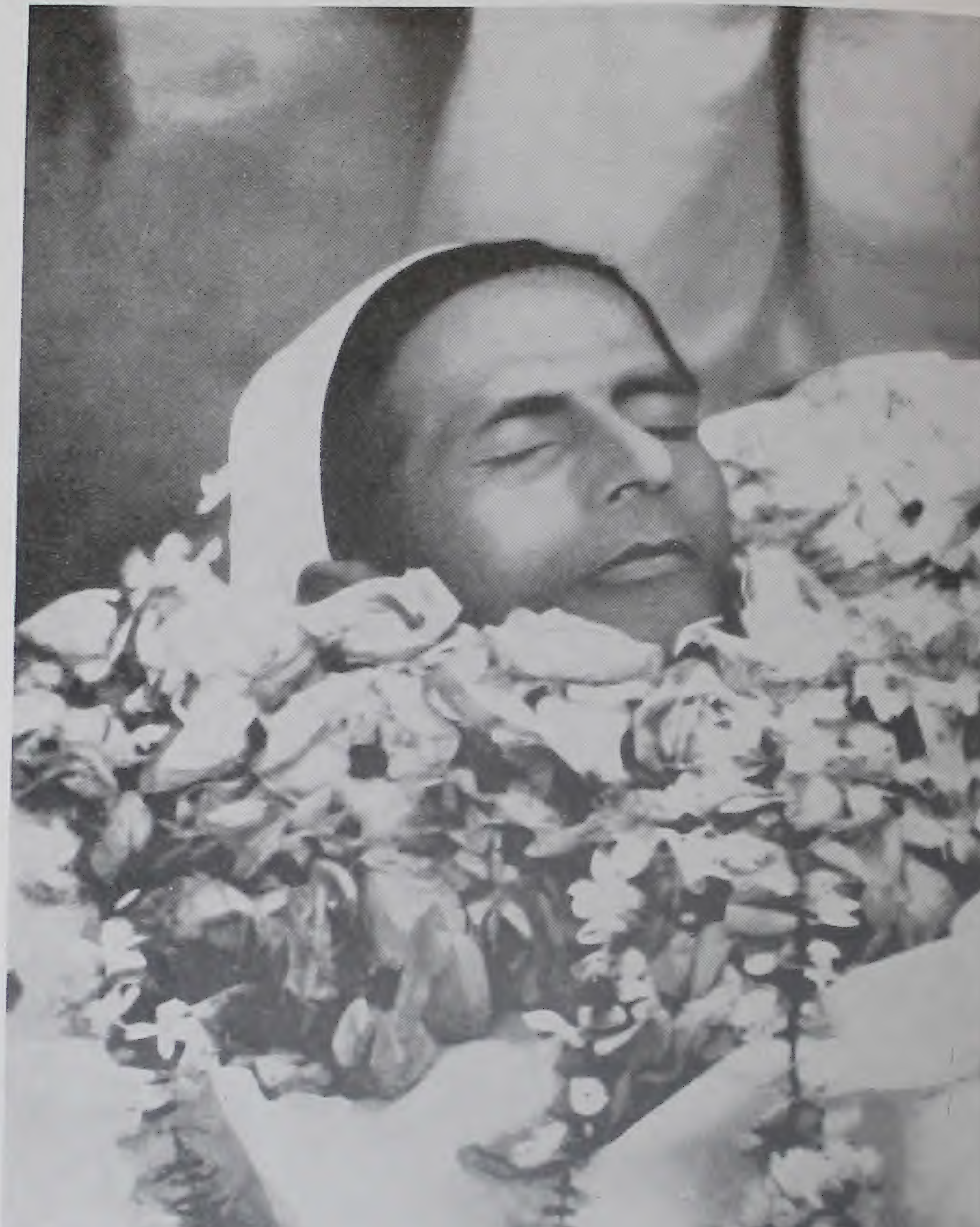
ٹیوبنگن' جرمنی ۴ر فروری ۱۹۵۵ء

بقیہ صـ۲۳ جیسا کہ جناب راشد صاحب نے فرمایا۔ کتاب میں جا بجا حاشیے پر تحریریں ہیں جو ان کے خیال میں غالب کے ہاتھ کی ہیں لیکن میں پوری ذمہ داری اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام تحریروں میں زیادہ سے زیادہ دو صفحوں کے سوائے اور کوئی تحریر مرزا کے ہاتھ کی نہیں ان دو حاشیوں کا سوادِ خط ضرور مرزا کے خط سے مشابہ ہے اور یہ غالباً انھیں کے قلم سے لکھی گئی ہیں۔ سرورق پر شعر اور اسد اللہ خاں دہلوی بھی مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ نہ یہ ان کا خط ہے اور نہ وہ اس طرح دستخط ہی کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب" (یہ مہر اور کسی جگہ میری نظر سے نہیں گزری)

ڈاکٹر آرزو صاحب نے جو مُہر دیکھی ہے وہ بیضاوی ہے اور مالک رام صاحب نے جو مُہر دیکھی ہے مربع شکل ہے۔ اول الذکر مُہر میں اسد اللہ خاں غالب سے پہلے "سید" موجود ہے۔ موخر الذکر میں "سید" موجود نہیں۔ اوّل الذکر میں ۱۱۵۴ھ ہجری درج ہے اور مؤخر الذکر میں ۱۲۵۴ھ ہجری ان اختلافات کی بناء پر یہ دونوں مُہریں مختلف نظر آتی ہیں۔ (ادارہ)

بھارت سے چاول کی برآمد

۱۹۵۵ء کے پہلے نو مہینوں کے دوران میں بھارت سے ۸۲ ہزار دو سو تینتیس ٹن چاول برآمد کئے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ جولائی ۱۹۵۴ء میں دو لاکھ ٹن چاول برآمد کرنے کا کوٹا مقرر کیا گیا تھا۔ اس کوٹا کے چاول اب تک برآمد کئے جا رہے ہیں۔ بھارت سے سعودی عرب' ماریشس' سیلون' عدن' کویت' برطانیہ' ملایا' فیڈریشن کمبوڈیا اور فجی کو چاول برآمد کئے جاتے ہیں۔



مجاز ابدی نیند میں
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد



نواب احمد بخش خاں بانی ریاست لوہارو
بہ شکریہ وکٹوریۂ میوزیم کلکتہ بوساطت مالک رام صاحب



نواب شمس الدین احمد خاں
(عطیہ مالک رام صاحب)



کریم خاں
(عطیہ مالک رام صاحب)



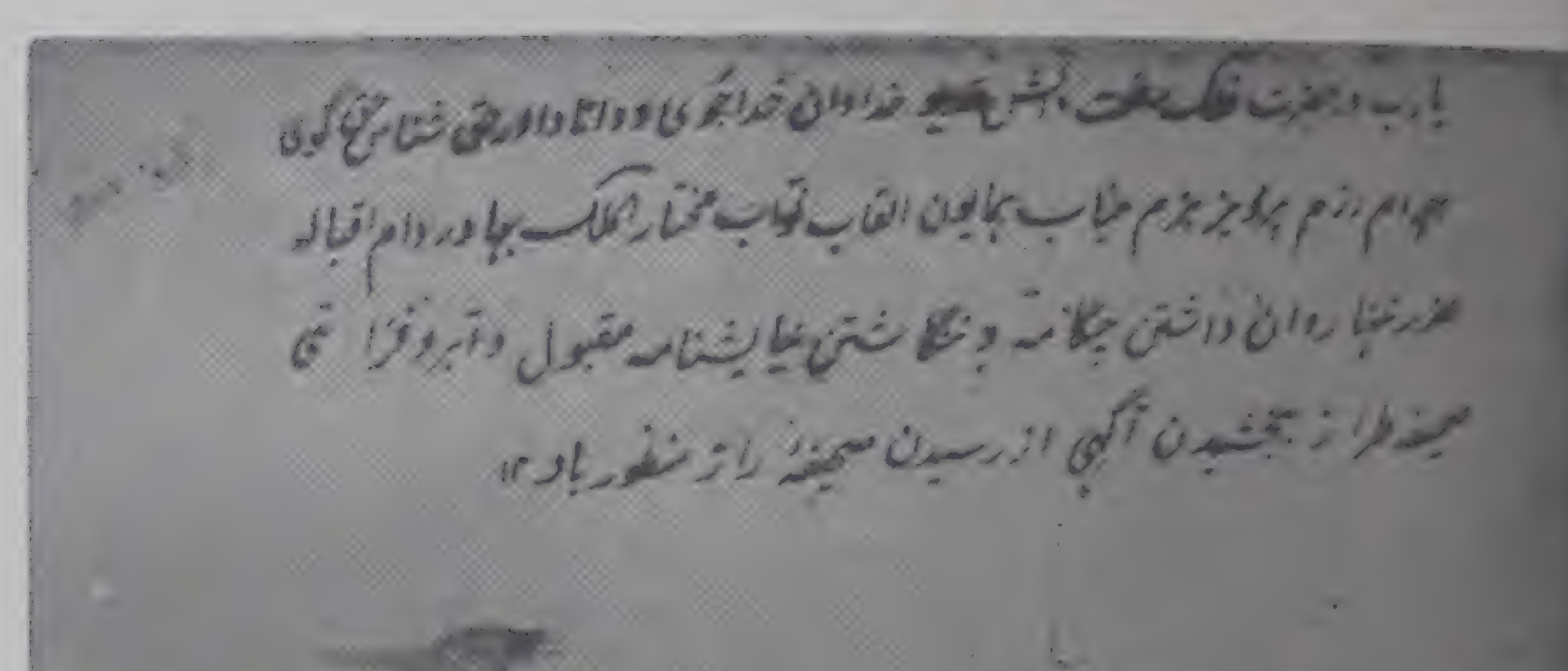
نواب ضیا الدین احمد خاں نیر رخشاں
بہ شکریۂ وکٹوریہ میوزیم کلکتہ بوساطت مالک رام صاحب



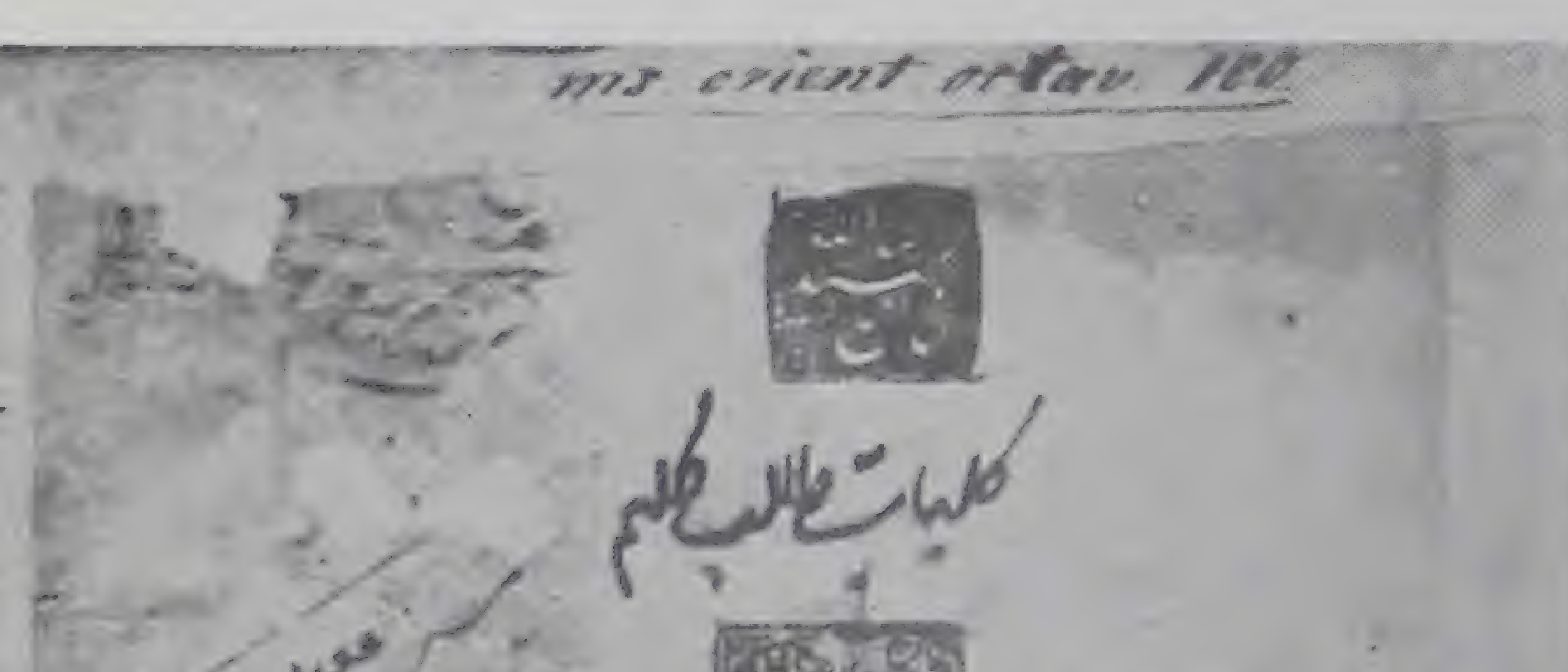
حضرت صاحب عالم مارهروي
۲۶ ربيع الاخر ۱۲۱۱ هجري
۲ محرم ۱۲۸۸ هجري
عطيه مرتضي حسين بلگرامي



صفير بلگرامي
عطيه مرتضي حسين بلگرامي



مرزا غالب نے نواب مختار الملک بهادر وزيراعظم حيدر آباد دکن کو اپنے هاتھ سے لکھ کر ايک قصيده بهيجا تها - يه عکس اسي کے ابتدائي حصے کا هے (عطيه نصير الدين هاشمي صاحب)



ڈاکٹر مختار الدين احمد آرزو کے مضمون «غالب کي ايک مهر» سے متعلقه عکس

جام جہان نما

اُردو زبان مین   نمبر ۸۱   تاریخ ۲۹ ماہ دسمبر سنہ ۱۸۲۲ عیسوی

NOTICE.

The Editor of the Jami Jehan Nooma begs leave respectfully to notify to the Public, that he has, with a view of rendering this publication more interesting, entertaining, and instructive to the European portion of its supporters, resolved to publish, in future, a Supplementary Sheet in the pure Hindoostanee or Oordoo Tongue, at the additional trifling charge of Four Annas the Number, or One Rupee per month, if taken together with the Two Persian sheets; but if taken separately, Two Rupees will be charged for it per mensem.

جی پور کی خبر

اخبار کے پڑھنے سے ذہن نشین ہوا کہ ربیع الاول کی ۲۶ تاریخ مہاراجہ سوای بہادر کی ماجی صاحبہ نے کارخانجات کے چھڑیے دارون کو تغیر تبدیل کر کے سرکنس نراین اور امرچند دیوان کو کہلا بھیجا کہ تم اب تک اُس ریاست کے انتظام سے غافل ہو ملک کا خراج سرکار کے خزانے مین داخل نہین ہوا اُسی سستی سے سرکار کے کام مین خوب نہین چاہئے کہ اجارہ دارون سے تقید کر کے باقیات کے روپے جلد وصول کرو کہ جو طرح کی رعایت منظور نہ رکھو ایک ان عرض ہوئی کہ ایک بنیا جی پور کو آتا تھا موئی زو نگری کے اُودھر ایک ٹھگ نے اسے زخمی کیا اور بارہ سو روپے کا مال چھین لے گیا حکم ہوا کہ فوجدار اُس راہزن کو مال سمیت گرفتار کر کے تس پیچھے کار فرما ہو، خاص رسالے کی جس مین پندرہ سو سوار جاگیردار ہین منا لال بخشی کو مقرر ہوئی بعد اُسکے بجی رام نے عرض کر بھیجا کہ سب پلٹنین ایسے مین یکدل ہو کر گو بندگڑھ مین ٹھہر رہی ہین کسی طرف کو وہان سے نہین جاتین مینے چاہا تھا کہ دو پلٹن نور وانی کی طرف بھیجون سب سپاہون نے کہا کہ ہم سب یکجا رہینگے اُس بات کے سنتے ہی کپتانون کے نام پروانہ اُس مضمون سے لکھا گیا کہ سرکار کے حکم سے انحراف کرنا اچھا نہین ۲۹

۲۹ دسمبر ۱۸۲۲ کے اخبار جام جہاں نما کا پہلا صفحہ

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

عکسی زیارت

حکیم سید بندہ رضا بلگرامی رضوی ساکن محلہ ملکنہ اپنی تحریر میں لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔ سید کمال الدین سادات رضوی بلگرام کے مورث اعلیٰ نے امیر ناصر الدین سبکتگین کی خدمت میں تقرب پایا تھا اور اعلیٰ عہدے پر سرفراز تھے، جب محمود غزنوی بادشاہ ہوا تو سید کمال الدین اس کے عہد میں بھی عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور تھے، اور انھیں کی تحریک سے محمود نے "عزم ہند" کیا۔ جب نویں حملے میں قنوج فتح ہوا تو کمال الدین ہمراہ تھے، باجازت بادشاہ ہندوستان کی بود و باش اختیار کر کے قنوج میں رہے، آخر اپنے قبائل کو بھی بلوا لیا۔ اور کچھ فوج لے کر "سری نگر" کو فتح کیا۔ اس وقت سے رضویوں کی بود و باش "بلگرام" میں ہے۔ اُدھر اسی وقت قاضی شیخ محمد یوسف عثمانی بھی بلگرام آ کر رہے، رعایائے شہر نے شکایت کی کہ یہاں قریب تر جنگل ملک اور نرکل کا ہے۔ وہاں "بیل دیو" رہتا ہے جو عام لوگوں کو ستاتا ہے۔ یہ سن کر دونوں بزرگواروں نے یعنی سید کمال الدین اور قاضی یوسف نے جا کر اس "دیو" کو قتل کیا اور یہ معرکہ چار دن تک رہا۔ آخر فتح ہوئی۔ اسی وقت سید صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ اس قصبہ کا نام بجائے "سری نگر" "بیل گرام" یعنی بیل کا مقام ہوتا تو کیا خوب تھا۔ اور یہ تاریخ موزوں فرمائی۔"

ہنہ د چار صد سال ہجرت تمام
سری نگر را نام شد بیلگرام

اسی طرح شیخ الدیار ثانی عثمانی بلگرامی اپنی کتاب "حدیقۃ الاقالیم" میں لکھتے ہیں کہ بلگرام کا نام زمانہ پیشین میں "سری نگر" تھا اور علامہ آزاد بلگرامی بھی اپنے رسالوں میں یہی لکھتے ہیں کہ "یہاں کے راجہ کا نام سری تھا۔ اسی سبب سے یہ مقام اس کے نام سے منسوب تھا۔۔۔" چنانچہ گرد و نواح میں اب تک لوگ بلگرام کو نگر پکارتے ہیں۔

رسالہ عمادیہ میں جو حال خواجہ عماد الدین صاحب ولایت بلگرام کا ہے اور اہل بلگرام مخصوص اہل سنت و الجماعت میں مستند و مشہور ہے۔ یوں لکھا ہے کہ "جب خواجہ عماد الدین اپنے وطن سے "کوڑہ" پہنچے وہاں چند روز انھوں نے درس دیا۔ ایک دن اپنے حجرے میں مشغول عبادت الٰہی تھے کہ "غیبی آواز" سُنی:۔

"اے عماد الدین متصل قنوج کے ایک قصبہ "نگر نام" ہے وہاں ایک دیو رہتا ہے اور لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے۔ تم وہاں جاؤ کہ وہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے گا۔"

یہی آواز تین بار آئی اور شب میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی بشارت دی کہ "جا کر دیو کو ہلاک کرو اور وہ ولایت تم کو مرحمت ہوئی۔"

غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ سری نگر یا بیل گرام عرصہ قدیم سے مرجع خلائق رہا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط بھی بلگرام کی عظمت کے قائل ہیں۔ اسی سرزمین سے علامہ عبدالجلیل بلگرامی اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جیسی پاک ہستیاں ظہور میں آئیں پھر اسی خطہ سے ٹھیک ۸۰۰ سو سال بعد ایک اور ہستی عالم آب و گل سے پیدا ہوئی جس کا اسم گرامی و نام نامی غالب جیسا رند مشرب بھی عزت و احترام سے لیتا تھا۔ اور زمانہ اب تک "حضرت صاحب" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ عجیب اتفاق کہ نانا اور نواسے دونوں سے غالب کا ایک سا رشتہ رہا۔ جو زندگی کے آخری حدوں تک باقی رہا۔ خود غالب اپنے دور کے ایک فن تھے اور اس "فن" نے اپنے کمال کو پہنچنے میں جن صلاحیتوں کو دخل دیا اس کے متعلق اتنا اور کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے اس فنِ کمال نے انھیں "یکتا"

بنا دیا۔ یکتائی کوئی جاگیر نہیں، لیکن قدرت جسے نواز دے، چنانچہ یہی یکتائے زمانہ غالب اپنے ایک خط میں چودھری عبدالغفور مارہروی کو حضرت سید صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض انتساب، جامع مدارج جمع انجمن بزم وحدت کی فرد زندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ شاہد ذات، حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے۔۔۔۔"

ایک اور خط میں رقم طراز ہیں:۔

"۔۔۔۔ چودھری صاحب آؤ! ہم تم حضرت صاحب کے پاس چلیں، اور اپنی آنکھیں ان کے کفِ پاء مبارک سے ملیں۔ میں سلام عرض کروں گا۔ تم معروض ہونا کہ غالب یہی ہے، اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔۔۔۔"

ایک بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت صاحب اور غالب کی عمر میں محض ایک سال کا فرق تھا [لفظ "تاریخ" میں حضرت صاحب اور "تاریخا" میں غالب کی سنہ ولادت مضمر ہے] اور ایک سال کا فرق مراتب کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کم از کم غالب کی زندگی میں ایک سال کے فرق کو کوئی امتیازی درجہ نہ ملنا چاہیئے تھا جب کہ وہ اپنے بڑوں اور اچھی صلاحیت والوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے ——— لیکن غالب نے پوری زندگی حضرت صاحب عالم صاحب کو پیر و مرشد اور حضرت صاحب کے لقب سے خطاب کیا۔ غالب کے اس کردار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کو حضرت صاحب سے ایک عقیدت مند کی طرح عقیدت تھی، ایک ساتھی اور ہم عمر کی حیثیت سے انھوں نے کبھی بھی نہ جانا ——— جب ہم اس کردار کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اور بھی نیا پن سا محسوس ہوتا ہے کہ کہاں ایک خراباتی اور کہاں ایک صوفی عز و شاں، کہاں مے کدے کا نگہباں اور کہاں در کعبہ کا مجاور ——— لیکن انقلاب غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ مواصلت اور موافقت شاید اس طرح بھی ہو سکتی ہے!

اسی طرح حضرت صاحب کے نواسے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی سے بھی حضرت غالب کو ایک خاص طرح کی عقیدت تھی، چنانچہ غالب ایک عنایت نامے میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"١٢ ذیقعدہ ١٢٨١ ھ

نور منظر، لختِ جگر، زبدۂ اولاد پیغمبر مولوی سید فرزند احمد زاد مجدہٗ

اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستان خیال کے ترجمہ کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک، حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور یاران نظر ان ہند پر عموماً۔۔۔۔۔"

صفیر بلگرامی کے متعلق ایک غیر ملکی مستشرق ڈاکٹر بیلی پروفیسر لندن یونیورسٹی اپنی تصنیف "ہسٹری آف اردو لٹریچر" مطبوعہ میں لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔ زندگی کا زیادہ حصہ ان کا آرہ میں گذرا۔ نظم میں ان کا کلام بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں۔۔۔۔ ایک اہم ترین تالیف "جلوۂ خضر" ہے یہ ادب اردو کی تاریخ ہے۔۔۔۔۔۔"

خواجہ عشرت لکھنوی "تذکرۂ آب بقا" میں لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے، میر صاحب نے ابتدائی سن سے اردو زبان کی خدمت کی اور بہت سی کتابیں تصنیف کر کے خود چھپوائیں، اور یورپ میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا۔۔۔۔ صفیر بہت پُرگو تھے پیام یار میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں۔۔۔۔ اب کوئی صفیر جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا رہے۔۔۔"

ان حالات کے بعد خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"ایسا شخص جس کی تمام عمر اُردو کی خدمت میں صرف ہوئی۔ اس کا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے، نہایت افسوس کی بات ہے۔۔۔"

صفیر بلگرامی کی خدمات ادب و زبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی عظمت کا قائل اور ان کی محنت کا ممنون ہونا پڑے گا۔ پھر بھی نہ تو موصوف کے حالاتِ زندگی پر سیر حاصل معلومات فراہم کی گئیں اور نہ ہی اس کی کاوش کی گئی کہ جلوۂ خضر کے مصنف کی دیگر تصانیف و کارناموں کی تلاش کی جائے اور ان کو منظر عام پر لایا جائے۔ بہر حال میں ایک طویل فہرست تصنیفاتِ صفیر بلگرامی درج کرتا ہوں، جو شیخ محمد اسمٰعیل مہرآروی کے "فسانۂ غمناک" ملقب بہ فریادِ مہر در احوال صفیر بلگرامی سے حاصل کی گئی ہے [صفیر بلگرامی نے ٢١۔ رمضان المبارک ١٣٠٧ ھ کو ١٢ بجے دن میں ٥٧ سال ٩ ماہ اور ٢٠ روز حیات رہ کر قضا کیا]

۱- صفیر بلبل مطبوعہ ۱۲۸۰ھ
۲- خم خانہ مطبوعہ ۱۲۹۶ھ
۳- دیوان صفیر ۴ جلد [بعد طبع صفیر بلبل و خمخانہ ترتیب دادہ شد]
۴- دیوانِ صفیر [در بحر مثمن سالم]
۵- دیوان صفیر ۳ جلد (فارسی)
۶- تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول (شعراء دہلی)
۷- تذکرۂ جلوۂ خضر جلد دوم (شعراء لکھنؤ)
۸- چشمۂ کوثر تذکرہ مرثیہ گویاں
۹- مثنوی در جواب گلزار نسیم
۱۰- مثنوی در معرفت
۱۱- مثنوی خوان یغما (فارسی)
۱۲- مثنوی دعوتِ احباب
۱۳- دیگر مثنویات (اُردو)
۱۴- دیگر مثنویات (فارسی)
۱۵- رشحات صفیر
۱۶- جغرافیہ بلگرام
۱۷- تاریخ بلگرام ۴ جلد
۱۸- رسالہ عروض
۱۹- رسالہ فن طبابت
۲۰- رسالہ محاورات
۲۱- مجموعہ رباعیات
۲۲- خمسہ جات
۲۳- مراثی، سلام، قطعات
۲۴- قصائد (فارسی)
۲۵- قصیدہ زمزمہ (جوبلی قیصر ہند)
۲۶- واسوخت
۲۷- ترجمہ بوستانِ خیال ۱۸ جلد
۲۸- مختصر بستانِ خیال ۳ جلد
۲۹- قصہ ہای دیگر
۳۰- جوہر مقالات (ناول بطرز مرأۃ العروس)
۳۱- جواب نصاریٰ
۳۲- ابطال ثلاثہ
۳۳- آئینہ فیصل
۳۴- بیاض اشعار
۳۵- گلستان مسرّت
۳۶- گلدستۂ اوّلین
۳۷- مناظرۂ زلف و رُخ
۳۸- تحقیق اللسان در تحقیق زبان اُردو
۳۹- خاتم
۴۰- حمایل
۴۱- نادعلی
۴۲- حسینین بند
۴۳- ہیکل
۴۴- بحر نجات
۴۵- مطلع الانوار در میلاد
۴۶- مرغوب القلوب (در حال انبیاء و ائمہ)
۴۷- صراط المستقیم
۴۸- قیامت نامہ
۴۹- شبستانِ معراج
۵۰- معراج العقول در عظمت آل رسول
۵۱- ترجمہ تفسیر منہج الصادقین
۵۲- جوش وحشت
۵۳- شور محشر
۵۴- دغدغۂ موت
۵۵- بحرِ ذخّار
۵۶- راحت طفلی
۵۷- فالنامہ موسوم بہ ترغیب
۵۸- جام کوثر

۵۹۔ پہیلی

۶۰۔ چیستاں

۶۱۔ متفرقات

ان ۶۰ تصنیفات ذکر بالا کے علاوہ اور کیا ہے؟ اس کی تلاش بھی ہونی چاہیئے۔ وہ خطوط جو صفیر بلگرامی نے لوگوں کو لکھے ہوں گے ان کی تلاش کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ صفیر بلگرامی کے وہ خطوط بھی اپنی جگہ ایک تصنیف و تالیف ہی ہیں۔ میرے پاس "بیاض صفیر" میں صفیر بلگرامی کے دست و قلم کے کئی خطوط کی نقلیں موجود ہیں جن میں داغ دہلوی اور سر سید احمد خان یا نقابہ کے نام بھی خطوط ہیں، —— تعداد تصنیفات صفیر بلگرامی کے ملاحظہ کے بعد تعداد شاگردان صفیر بلگرامی اگر معلوم کرنی ہو تو مرزا غلام حیدر محسن مرحوم عظیم آبادی کے قطعہ کے چند بند ملاحظہ ہوں:-

میر فرزند احمد آنکہ صفیر — ہست مشہور عالم ایجاد

تا مور در جہاں تلامذہ اش — بہرہ ور صاحبانِ استعداد

فیضیاب از صفیر با تمکیں — سخن، احمد، امیر، سلطان شاد

صاف و عنقا، ہما، امیر، اخلاص — ہم متیم و کلیم، طور، ارشاد

سخن، اکرام، قیصر و جاد و — ہم سلیم و وزیر، صاحب داد

آں صفیر و مطیر، تمکیں، شور — آں عنایت، کبیر، ہم فرہاد

قاصر و باقر و ثریا، مہر — دانش و ہم ذکی، عالی زاد

مخلص و شورش، اکبر و اصغر — ہاشم و محسن، خجستہ نہاد

حسن، اکھڑ، حیدر، درد، ظہیر — ہم گرامی، ضیائے، مہر شداد

احسن و جوش، حیرت و فیاض — ہم طبیب و متین، نیک نہاد

جاہ، یحییٰ، غلام، لائق نیز — آصفی و حکیم و ہم ایجاد

آں نہال و جمیل و محزوں نیز — یاد، مداح، لائق ارشاد

ان تصنیفات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ صفیر بلگرامی کے متعلق سخن شناس ایسا رجحان کیوں رکھتے تھے، اس کے بعد میں نفسِ مضمون پر آتا ہوں۔ وہ یہ کہ صفیر بلگرامی کی اب تک دو تصویریں ملتی ہیں۔ ایک وہ جسے سید وصی احمد صاحب فانی بلگرامی نے "س، ش، ص" والے بسیط مضمون کے ساتھ شائع کی تھی۔ دوسری تصویر وہ ہے جو "یادگار ضیغم" سے آرزو صاحب نے حاصل کی اور اب "احوال غالب" کی زینت ہے۔ لیکن آج کوانھ ضلع آرہ میں صفیر بلگرامی کی دو تصویریں اور بھی ہیں جن میں سے ایک تصویر جو دراصل گروپ ہے نہایت اہم ہے۔ اس گروپ تصویر کی شان یہ ہے کہ ایک جانب صفیر بلگرامی، دوسری جانب ان کے پیر اوّلین [آپ ہی کی ولادت کے موقع پر چودھری عبدالغفور سرور مارہروی نے رباعی و قطعات نظم کر کے حضرت غالب کو بغرض اصلاح روانہ کی تھیں اور غالب نے اپنے جیب خاص سے سرور کو ایک اردو قطعہ عطا فرمایا تھا۔ اور اس سلسلے میں صفیر بلگرامی کا پتہ دریافت کیا تھا، تاکہ تہنیت میں خط لکھ سکیں لیکن اس زمانے کی خط و کتابت کو قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر جیسا محقق غالب "جعلی" گردانتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ خدا بہتر جانتا ہے، لیکن اُمید کہ ماہ فروری ۱۹۵۵ء کا آج کل قاضی صاحب کے مطالعہ سے گذرا ہو گا اور اُن "جعلی" خطوط کی تصدیق ہو گئی ہو گی] سید نور احمد گرامی بلگرامی ہیں اور صفیر بلگرامی کے درمیان "محمد غنی حیدر" کی تصویر ہے[1]۔ اس تصویر کے سامنے آتے ہی صفیر بلگرامی کا یہ قطعہ تصور کے پردے میں آ جاتا ہے جس کا مطلع ہے

دیکھا چاہیے کس شخص کی قسمت ہوئی بیدار

جاگے ہوئے کس جا سے حضور آئے ہوئے ہیں

یہ قطعہ یا یہ تصویر محض تصویر نہیں۔ ایک واقعہ، ایک طویل کہانی، افسانہ اور ناول ہے —— فی الوقت اس حد تک کافی ہے کہ جو لوگ "ستارۂ ہند پریس کلکتہ" سے واقف ہیں وہ "محمد غنی" کی شخصیت سے بھی کسی حد تک واقف ہوں گے —— جیسا کہ میں نے ذکر کیا یہ واقعہ ہے اور افسانہ، لیکن اس قصہ خوانی کا یہ موقع نہیں! [وقت اور فرصت درکار ہے] اس تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر ہے، جس میں صفیر بلگرامی سر پر عمامہ لپیٹے بر میں کرتہ و اچکن ڈالے گلے میں پر پیچ پڑا ہوا ہاتھ میں چھڑی لئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں —— لیکن اس تصویر کے علاوہ ایک شبیہ اُن کی ہے جن کی زیارت کے لئے حضرت غالب تمام عمر بے چین و مضطرب رہے، جن کی تحریر کو اپنی آنکھوں سے لگانا اور سر پر جگہ دینا غالب جیسی ہستی کے لئے فخر و مباہات کا کام تھا —— بہر حال میرے علم میں اب تک حضرت صاحب کی کوئی تصویر منظرِ عام پر نہیں آئی ہے۔ میرے لئے یہ امر کچھ کم باعث فخر

[1] افسوس کہ تصویر صاف نہیں اس لئے شائع نہیں کی گئی۔ (ادارہ)

نہیں کہ حضرت صاحب؟ ہمارے نانا صفیر بلگرامی کے نانا تھے، اور حضرت صاحب کو ہمارے نانا دل و جان سے عزیز تھے۔ ملاحظہ ہوں خطوط غالبؔ صاحب عالم صاحب۔ یہ شبیہ مبارک بھی اب تک میرے "نگارخانہ" میں محفوظ تھی، لیکن اب میں شائقینِ آج کل کو آج کل کے ذریعے سے اس ہستی کی "عکسی زیارت" کراتا ہوں جو صوفی باصفا اور ایک مردِ مومن ذات تھی، جس کی شان ہے کہ سر پر شملہ باندھے، عبا زیبِ تن کئے، ہزارا تسبیح ہاتھ میں لئے، ایک صوفیانہ شان سے نورِ مجسّم متمکن ہیں۔ آپ ہی کو لوگ صاحب عالم متخلص بہ صاحبؔ سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کہتے ہیں۔

ہمارے پاس ایک تصویر سید برکات حسن صاحب مارہروی کی بھی ہے آپ کا ذکر بھی غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ بہرحال اب محوی کے اس شعر پر رخصت چاہتا ہوں ؎

جو وہ اُٹھ گئے اُٹھ گئی ان کے ساتھ
بہارِ زبان، عزّ و شانِ سخن

"ہندوستانی موسیقی نمبر"

آج کل کا اگست ۱۹۵۶ء کا شمارہ موسیقی نمبر ہوگا

مندرجہ ذیل عنوانات پر بالخصوص اور ہندوستانی موسیقی سے متعلق دیگر موضوعات پر بالعموم مضامین درکار ہیں۔ جو اصحاب یہ مضامین بہم پہنچا سکیں وہ مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں

۱۔ ہندوستانی موسیقی کی تاریخ

۲۔ ہندوستانی موسیقی کے بڑے بڑے سرپرست

۳۔ مشہور گانے والوں کے حالات و کوائف:۔ وشنو ڈگمبر، وشنو نارائن بھات کھنڈے، فتح علی، علی بخش، بندے علی خاں، فیاض خاں، رام کرشن بواوزے، کرشنا راؤ شنکر پنڈت، پنڈت رتن جانکار پرنسپل بھات کھنڈے کالج، گووند راؤ تانبے آف کولہاپور، اللہ بندے خاں، ذاکرالدین آف اودے پور، بھاسکر راؤ آف اودے پور وغیرہ

۴۔ ہندوستانی موسیقی کے ساز۔

۵۔ ساز نواز۔ بسم اللہ، شہنائی — بندو خاں، سارنگی — احمد جان تھرکوا، طبلہ۔ روی شنکر، ستار۔ عبدالعزیز، وچتر وینا۔ ولایت خاں، ستار۔ عنایت خاں، ستار۔ حافظ علی خاں، سرود۔ علاؤالدین خاں، سرود۔ اجودھیا پرشاد، مردنگ وغیرہ

۶۔ فلمی موسیقی۔ سہگل، لتا منگیشکر، طلعت محمود وغیرہ

۷۔ موسیقی کی ماہر خواتین۔ ہیرا بائی بڑودکر۔ گنگو بائی ہنگل۔ جودھ سنا بھوے۔ رسولن بائی۔ بیگم اختر۔ سدھیشوری دیوی

۸۔ لوک گیتوں کی موسیقی۔ پہاڑی، راجستھانی، اندھرا، پنجابی وغیرہ

۹۔ قوالی

۱۰۔ کرناٹک میوزک

۱۱۔ امیر خسرو۔ تان سین۔ سدا رنگ۔ ادا رنگ اور موسیقی کے بڑے بڑے موجد اور فن کار

۱۲۔ انھیں موضوعات سے متعلق نادر تصاویر کسی صاحب کے پاس ہوں تو وہ بھی مدیر رسالہ سے خط و کتابت فرمائیں (ادارہ)

بشر نواز

نیا اِنساں

لبوں پہ قوسِ قزح کا نکھار رقص کناں — جبیں سے نور چھلکتا ہے ماہتابوں کا
اسیر مٹھی میں ارض و سما کی رنگینی — خجل قدم کی صدا سے فسوں ربابوں کا
نظر کی وسعت و باریک بینیاں ایسی — کہ زُہرہ آب ہوا جاتا ہے سرابوں کا

چلے تو مشعلِ خورشید راہ دکھلائے
رُکے تو گردشِ دوراں میں فرق آجائے

قدم سے لپٹی ہوئی عظمتیں ہمالہ کی — سمندروں کی جوانی جلو میں رقصندہ
حسین ماضی کی رنگیں روایتوں کو لئے — کھڑے ہیں منتظرِ حکم خواب آیندہ
گذر رہا ہے نئے موڑ سے نیا انساں — رہوں میں نور لٹاتے ہیں عزم تابندہ

ہیں اختراعیں کئی شکوہ سنج کم کوشی
کئی علوم ہیں بے تاب بہرِ پابوسی

ضمیرِ ارض کی ہر بات اس پہ آئینہ — ہے سر بسجدہ ہر اک راز آستانے پر
ہیں کمندِ ستارے فضائیں زیرِ نگیں — فرازِ عرش بھی ہے عزم کے نشانے پر
اسی کا پرتوِ رنگیں سمک سے تا بہ فلک — اسی کی مُہر شب و روز کے فسانے پر

یہی ہے ماضی یہی حال اور آیندہ
جبینِ وقت اسی کے سبب سے تابندہ

اسی کی منظروں کے ادنیٰ سے اک اشارے پر — شرارے نرک کے جنّت میں ہوگئے تبدیل
کبھی جو دستِ عمل کو ذرا سی جنبش دی — ہزاروں خواب حقیقت میں ہوگئے تبدیل
طویل گھنٹوں نے لمحوں کا روپ دھار لیا — سمٹ کے فاصلے قربت میں ہوگئے تبدیل

بلند ارادوں نے رشتے فلک سے جوڑ لئے
بڑھائے ہاتھ ستاروں کے پھول توڑ لئے

اسی نے جلوے نکھارے نگارِ فطرت کے — یہی ہے شانہ کشِ زلفِ عالمِ امکاں
یہی ہے محورِ تہذیب و فن و علم و ادب — اسی کے گرد ہے کل کائنات رقص کناں
اسی کے فیض سے جاری ہے جوئبارِ حیات — اسی کے نور سے ہر نقشِ بحر و بر تاباں

یہ دورِ آدمِ عظمت نشان زندہ باد
نئی حیات کی یہ آن بان زندہ باد

وارث کرمانی

ہونٹوں پہ ہنسی رُخ پہ حیا یاد رہے گی

ہونٹوں پہ ہنسی رُخ پہ حیا یاد رہے گی — اے حُسن تری شوخ ادا یاد رہے گی
اظہارِ عنایات کی مخصوص فضا میں — اقرارِ محبّت کی خطا یاد رہے گی
وہ شب وہ چمن زار وہ بیہوش گھٹائیں — وہ سحر کا موسم وہ فضا یاد رہے گی
وہ مستئ رفتار وہ لغزیدہ خرامی — وہ جھوم کے چلنے کی ادا یاد رہے گی
جذبات کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے کونین — وہ بے خودئ ارض و سما یاد رہے گی
امڈے ہوئے طوفانِ محبّت کے مقابل — چھائی ہوئی ساون کی گھٹا یاد رہے گی
وہ شب ہمہ شب سلسلۂ عرضِ تمنّا — وہ شوق کی وسعت بخدا یاد رہے گی
اک خضر سمن پوش و گل اندام کے ہاتھوں — آغوش میں مرنے کی دُعا یاد رہے گی
انفاس کا جادو نہ کبھی دل سے مٹے گا — ملبوس کی خوشبوئے حِنا یاد رہے گی
احسانِ مسیحا نفسی چین نہ دے گا — آزارِ محبّت کی دوا یاد رہے گی

اک شاعرِ اقلیمِ اودھ کی یہ عقیدت
.... پہنچے پہ بھی کیا یاد رہے گی

وحید شادانی بتیادی

شگوفہ

ہر ایک ارماں تڑپ رہا ہے ہر ایک حسرت سسک رہی ہے
سکونِ ہستی کی جستجو میں حیاتِ انساں بھٹک رہی ہے
خزاں کا موسم، خزاں کے لمحے، خزاں کے دن ہیں خزاں کی راتیں
یہی ستم مجھ پہ کم نہیں تھا کہ برق بھی اب چمک رہی ہے
اگر وہ اے صبح کے ستارو! کہیں ملیں تو یہ اُن سے کہنا
زمین پہ میں سسک رہا ہوں نظر فلک پر بھٹک رہی ہے
ہمیں تو اے حاصلِ خدائی یہ بزمِ محشر نہ راس آئی
جو آگ آنسو بجھا چکے تھے وہ آگ اب پھر بھڑک رہی ہے
نہ کوئی منزل، نہ کوئی جادہ، نہ کوئی رہبر، نہ کوئی ہمدم
وحیدؔ پھر بھی رہِ طلب میں نگاہِ فطرت بھٹک رہی ہے

ستیہ وتی ملک

(ہندی سے ترجمہ)
مترجم:- ستروِن کمار دِودِیر

بُت

گونار اسٹیشن۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب موٹے کھدر کے کُرتے میں ملبوس، سفید ڈوری کا چشمہ لگائے لُو سے بچنے کے لئے کوٹھڑی کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

گاڑی سے اُتر کر سیدھا وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس گیا اور اُن سے گاؤں کا راستہ پوچھا۔

"سات کوس۔" کہہ کے وہ پھر اونگھنے لگا۔

یہ دیکھ کر اُس نے اُن کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا، اور جنگلے کے باہر نکل کر سیدھا چلنے لگا۔ راستہ ناہموار تھا اور اُس کے دونوں طرف کھیتوں میں تازہ کٹے ہوئے گیہوں کے ڈھیر سونے سے معلوم دیتے تھے

کوٹ اُتار کر اُس نے سر پر رکھ لیا تھا، ایک تو گرمی سے بچنے کے لئے اور دوسرے انگریزی ڈھنگ کے بالوں اور قمیض کے کالر کو چھپانے کے لئے کیونکہ ایسا کئے بغیر اس دیہات میں اپنے آپ کو جاٹ ثابت کرنے کے لئے اُس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور چونکہ اس طرف بنئے، برہمن وغیرہ ذاتوں کی نسبت جاٹ کہیں اُونچے سمجھے جاتے ہیں، اس لئے وہ اپنے آپ کو جاٹ ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

صبح گھر سے چلتے وقت وہ صرف چائے اور ہلکا سا ناشتہ کر کے نکلا تھا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ بھوک سے زیادہ پیاس اُسے ستا رہی تھی۔ آگے چل کر جہاں دو راستے ہو گئے ہیں، وہاں کوئی کسان ایک طرف کھلیان میں سے بچا کھچا گیہوں اُٹھوا رہا تھا۔

"یہاں سے گاؤں کتنی دُور ہے، اور کس طرف؟" اُس نے کسان سے پوچھا۔

ہاتھ کے اشارے سے کسان نے اس کا جواب دیا۔ تیز دھوپ میں پیاس کی شدّت سے وہ بے تاب ہو رہا تھا۔ قریباً آدھ میل کے فاصلے پر اُسے ایک کنواں دکھائی دیا۔ وہ دوڑا۔ کنوئیں پر ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اوک بھر کے پانی اُس سے لے کر پیا۔ پانی کھاری تھا، پیاس بجھی نہیں۔

اور اُسے یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اُسے پھر وہیں لوٹ جانا چاہیئے جہاں کہ دو راستے ہو گئے ہیں۔ لوٹا اور پھر دوسرے راستے سے سیدھا چلنے لگا۔ گرمی کی شدّت۔ پسینہ سے اس کا جسم تربتر ہو رہا تھا۔ لُو اُسے جھلسائے جا رہی تھی۔ سالہا سال شہر میں رہنے کی وجہ سے وہ آرام پرست ہو گیا تھا۔ زمین سے اُسے اتنی اُنس نہ رہی تھی۔ گویا زمین سے اُس کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ پیدل چلتے چلتے بُری طرح سے تھک گیا تھا۔

لُو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لئے اس نے سر کو اچھی طرح سے کوٹ سے لپیٹ لیا۔ اور دھوتی کو اونچا کئے سچ مچ وہ ایک جاٹ دکھائی دیتا تھا۔

اس ابلتے سمندر سے نکل کر آخر اسے درختوں کے سائے اور ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کھیلتے ہوئے دیہاتی لڑکوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اصل گاؤں جہاں اُسے "بھات" میں شریک ہونا ہے، یہاں سے دو کوس ہے۔ لیکن اب تو بنا کھائے پیئے اور آرام کئے آگے چلنے کی اس میں سکت نہ تھی۔ گلا سوکھا جا رہا تھا۔ آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔

لڑکوں میں سے ایک سے اُس نے چھا چھ والا گھر پوچھا۔ بڑے بڑے مہذّب شہروں میں جہاں اس طرح پانی مانگنا بھی سلیقے سے باہر ہے، وہاں اس شدید مہنگائی کے زمانے میں بھی ادھر دیہات میں بھینس والا گھر چھاچھ کے لئے ضرور کھُلا ہوگا، ایسا اُس کا یقین تھا۔ لڑکے نے اُنگلی سے زمیندار کے بڑے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

کچھ لوگ وہاں ڈیوڑھی میں گہری نیند سو رہے تھے۔ دوپہر کے وقت

اُن کی نیند خراب کرنا مناسب نہ سمجھ کر اُس نے لوٹ کر پھر پوچھا۔ "کوئی دوسرا چھاچھ والا گھر نہیں ؟"

اس بار لڑکے نے کونے میں کچے گھر کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ بغیر کسی جھجک کے ڈیوڑھی کے اندر چلا گیا۔ بہتری گھروں کی طرح دیہاتی گھروں میں جاتے وقت اُسے کچھ ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہاں کے قاعدے، قانون سب اس کے ہی بنے ہوں۔ ڈر تھا تو اُسے سر کے بالوں کا۔ جسے اُس نے احتیاط سے چھپا رکھا تھا۔

اس نے ڈیوڑھی کے اندر جھانکا۔ چاروں طرف شب کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی کے عین وسط میں دھوپ ایک بڑے انگارے کی مانند چمک رہی تھی۔ دالان میں ایک طرف کپڑے جوڑ کر بنایا ہوا جھولنا لٹک رہا تھا اور اس کے پاس ہی مونڈھے پر منہ سر ڈھکے ہوئے ایک بُت سا بیٹھا تھا جس کے مہندی لگے ہاتھوں اور لمبی پتلی گوری انگلیوں میں سونے چاندی کے زیور اور جھولنا جھلانے کی رسّی تھی۔ اس وقت اس کے لئے ایک لمحہ رُکنا بھی دشوار تھا۔ بولا۔ "سیبت ملے گا؟ سیبت چاہئے"؟

کوئی جواب نہیں۔ خاموش دیواریں ہی اس کا جواب دے رہی تھیں۔

"سیبت نہیں تو پانی ہی پلا دو۔ بہت پیاسا ہوں"۔ ہانپتی ہوئی آواز میں اس نے پھر کہا۔ اب بُت ہلا۔ گویا کہ احساس اس میں پہلے کسی ڈر سے سویا پڑا تھا۔ اور اب نڈر ہو کر بیدار ہو گیا ہو۔

بُت کے اُٹھ جانے پر اُسے دالان کے دوسرے کونے میں ایک اور ٹھوس پتھر کا سا بُت دکھائی دیا۔ اُپلوں کی انگیٹھی کے آگے، چہرہ ننگا۔ جس کی دونوں آنکھیں جھپکتی ہی نہیں، سیدھی گڑی سی ہیں۔

خود ہی وہ دہلیز پر بیٹھ گیا۔

وہ نوجوان عورت نہیں۔ "بُت" اب بھی اسی طرح لال رنگ کی اوڑھنی اور بھاری لہنگے وغیرہ سے سر سے پیر تک ڈھکا ہوا خراماں خراماں اس کی طرف چھاچھ کا گلاس لئے آ رہا تھا۔

چھاچھ کا بڑا سا گلاس بُت کے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے ایک غیر معمولی احساس نے اسے چونکا دیا۔ اندازہ ہوا۔ بائیس سے زیادہ نہیں، گویا دوشیزہ! نُور جس کے اندر ہی اندر سے ہاتھ پیروں کی حرکت کے ساتھ ایک نغمہ بن کر گلی گلی، چھل چھل، جھرنے سے جھر رہا ہے۔ گلاس دیتے وقت جانے کیوں ٹھٹک گئی۔

"اوہ، تم کیا چھاچھ کے لائق تھے"؟ — وہ حلاوت آمیز آواز اس گہرے سنّاٹے میں رات کی رانی کی طرح مہک اُٹھی۔ شاید بُت نے جھکتے وقت اس کے کٹے ہوئے بالوں اور چھپائے ہوئے کالر کو دیکھ لیا تھا۔

"تم کیا چھاچھ کے لائق تھے"؟ — حیرت بھری آواز پھر آئی۔

دیہات میں چھاچھ سے عام راہگیروں اور دودھ سے معزز لوگوں کی تواضع کی جاتی ہے"۔ کون ہو"؟

"جاٹ! آگے گاؤں میں بہن بیاہی ہے۔ ان کی سوتیلی لڑکی کی شادی میں بھات کے لئے مدعو ہو کر جا رہا ہوں۔ تھوڑی چھاچھ اور —"

چھاچھ کٹورے میں بھر کر پھر اسی انداز سے لائی گئی۔ گاڑھی تھی اس لئے اُس میں پانی لا کر کے بھی ڈالا گیا۔ اس طرح اس کا آنا جانا اس ماحول میں سہانے لگا۔

پانی دے کر اس نے دُہرایا — "ارے، تم چھاچھ کے لائق تھے؟ ٹھہرو، ٹھہرو۔ دودھ لاتی ہوں۔

کیسی ہمدردی! کیسا اُنس! اس نے تو صرف چھاچھ مانگی تھی بے اختیار ہو کر اس نے کہا — نہیں نہیں! بھوک، پیاس کے مارے بُرا حال تھا، تبھی یہاں چلا آیا"۔

بھوک کا نام سنتے ہی اُدھر اصرار زور پکڑ گیا۔

"کھانا کھائے بغیر جاؤ گے؟ نہیں، نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا"۔

کئی بار انکار کرنے پر بھی وہاں شنوائی نہ ہوئی۔ جھٹ سے پرات، آٹے اور گھی کا بندوبست ہونے لگا۔

"اچھا جو گھر میں بنا رکھا ہو، وہی دے دو"۔

"گھر میں تمہارے لائق کچھ نہیں۔ اس کا ایک لڑکا دوسرے بن یعنی بُڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو گیا ہے بھات میں جیمنے، اور اس کا بھائی ہے کھیت میں۔ اس لئے بناؤ نا کچھ نہیں"۔

"رہتی روٹی تو ہو گی، وہی لاؤ۔ اور تھوڑی چھاچھ"

پل بھر میں کانسی کی تھالی میں روٹی، مکھن، چھاچھ اس کے آگے رکھ کر بُت پھر اسی پیڑھے پر بیٹھ کر جھولنا جھلانے لگا۔

اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ روٹی، پانی، عزت افزائی کے علاوہ — وہ! جو کچھ اور ملا ہے؟ اس کی احسان مندی کن الفاظ میں بیان کی جائے؟ کچھ نہ سمجھا۔ رک گیا اور بولا۔ "تمھارے اپنے گاؤں کا نام کیا ہے"؟

"فلاں"۔

"اوہ! ارے میں بھی تو اسی گاؤں کا ہوں"۔

اس کے اتنا کہنے پر بُت اندر ہی اندر جنبش میں آ گیا۔ ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور وہ اسے چھپا نہ سکی۔

چاندی کا ایک روپیہ جو خوش قسمتی سے اس کی جیب میں تھا۔ نکال کر پیش کیا۔ "میرے گاؤں کی ہو۔ میری بہن ہو۔ بہن کے گھر کھایا ہے اسی وجہ سے ...."

"نہیں! نہیں! ایسا نہ کرو"۔

اور تب اُس نے دوسرے بُت سے (جو کونے میں اتنی دیر سے ویسے ہی بیٹھا تھا) گردن گھما کر اجازت چاہی۔ لیکن اس نظر میں ذرا بھی جھپک نہ آئی۔ بلکہ شدّتِ انکار اور بھی چنگاری کی طرح چمک اٹھی۔

روپیہ دھیرے سے اس کے قدموں کی طرف سرکا کر وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔

اگلے گاؤں کا خیال جو اس کی منزلِ مقصود تھا۔ آج سے ایک دن پہلے اس کے معمول میں انقلاب لا چکا تھا، اور وہ اپنے کئی ضروری کاموں کو ملتوی کر کے کڑکتی دھوپ میں بھٹکتا آ رہا تھا۔ لیکن اب وہ اس کا خاص مشتاق نہ رہا تھا۔ حالانکہ رشتے کی عورتوں نے دیہاتی رسم و رواج کی پابند ہو کر "بھائی" کے آنے کی آرتی اُتاری، ٹیکا وغیرہ کیا۔ مردوں نے ضرورت سے زیادہ استقبال کیا، اور اسٹیشن پر سواری نہ بھیج سکنے کے لئے بار بار معافی چاہی۔ لیکن اس نے جیسے راہ میں کوئی جادو بھرا قدیم کھنڈر دیکھا تھا۔ یا مسلسل بارش کے بعد سنہرا نکھرتا ہوا دن!

رات بھر اسے انہی قدموں کی گونج، وہی سُریلی آواز، وہی رعنائی، اسی مُعطّر فضا کا احساس بار بار چونکائے دیتا رہا۔

ماں کو اس نے دیکھا نہیں۔ بہن سے دُور رہنے کی وجہ سے وہ جذبہ نہیں، بہن ہونے کا محض احساس رہ گیا ہے۔ ہوسٹلوں کی رُوکھی سُوکھی فضا میں وہ پلا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے امتحان میں کامیابی، کتابوں کے ڈھیر، سندوں اور عزت کی ظاہرا پکی عمارت کے باوجود اس نے اس میں ایک چھید محسوس کیا جو آج یک لخت چلتے چلتے، ایک انجانے ہاتھوں سے اتنی قربت، اتنی غیرت، اتنا اصرار پا کر صاف دکھائی دینے لگا۔ اس کے سامنے وہ دن بھی صاف صاف نظر آنے لگا جب کہ وہ بہت چھوٹا تھا اور ضعیف العمر نانی کے مرنے کی خبر پا کر گھر جانے کے لئے رو رو کر تڑپ اُٹھا تھا۔

دوسرے دن لوٹنے کے لئے اسٹیشن کی طرف جب وہ گھوڑی پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ تو یوں ہی بغیر کسی خاص مقصد کے پھر سیدھا اسی دروازے پر آ رکا۔ اُتر کر اندر چلا گیا۔ دن کا تیسرا پہر تھا۔ لیکن خاموشی ویسے ہی چھائی ہوئی تھی۔ اور ٹھیک وہیں دالان میں پیڑھے پر بیٹھا ہوا سر سے پیر تک ملبوس وہ بُت جُھولنا جُھلا رہا تھا۔

دوسرے بُت یعنی بڑھیا یا اور کسی دوسرے کی وہاں پر پرچھائیں بھی نہ تھی۔ یہ دیکھ کر حوصلہ کر کے وہ آگے بڑھا۔

لیکن کہے تو کیا؟ اس دیہاتن کے آگے وہ کس زبان میں کیسے اور کیا گزارش کرے؟

"دیکھو، میں تمھارے گاؤں کا ہوں۔ بھائی ہوں، کل تم نے روپیہ کیوں لوٹانا چاہا؟ اس سے مجھے دکھ ہوا"۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں ایک میٹھے درد کا بہاؤ اُمڈ آیا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ بُت بھی لمحہ بھر کے لئے بے حِس رہنے کے بعد جلتی موم بتی کی مانند چھلک پڑا۔ پہلے کرب و اضطراب کے ساتھ، پھر ایسی چھما چھم بارش جس میں آواز نہیں۔ گرج بھی نہیں۔

عجیب مسئلہ ہے۔ وہ قیاس بھی نہیں کر سکتا کہ چہرہ کیسا ہے؟ رنگ کیسا ہے؟ اس نوخیز دُکھی دل سے بھاپ کے بادل کہاں کہاں پانی کی شکل اختیار کر کے ڈھلک رہے ہیں۔ جھانک نہیں سکتا۔ اور نزدیک کھڑا ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

خود ہی جھر جھر کر جب آنسوؤں کا زور کم ہوا اور ماحول میں سنجیدگی آئی۔ تو وہ بولا۔ "ایسے نہیں۔ رونے سے مجھے دُکھ ہوتا ہے۔

اس نوعمر کا زار و قطار رونا اس کے دل میں بُری طرح سے ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ گھونگھٹ کے اندر سے مُنہ پونچھ کر بُت نے

کئی بار مُجھی مجھی زندگی کو الفاظ میں باندھنے کی کوشش کی -

گونا ہونے سے پہلے وہ سُہاگ کھو بیٹھی تھی - پھر چھوٹے دیور کے ساتھ سُہاگ رچایا گیا - چھ ماہ بعد اُس نے بھی اپنے بڑے بھائی کی پیروی کی - اس سے چھوٹا کل نو سال کا تھا - جس سے قانوناً شادی نہیں ہو سکتی تھی -

اب خاندان اور جائداد کے مسئلے کی وجہ سے چچیرے بھائی کو لے کر سہاگن ہوئی - لیکن وہاں سے بھی کسی وجہ سے شبہ ہونے پر نکال دی گئی - پھر بھائی بھاوج کے پاس آئی - تو بھی .... اب اس گھر میں ایک رنڈوے کے ساتھ بیٹھ گئی - جُھولنے کا بچّہ رنڈوے کی پہلی سنتان ہے - بڑھیا رنڈوے کی مُوسی ہے -

لیکن وہ بدنصیب جوٹھری - سات پردوں سے ڈھکی رہنے کے باوجود کہیں سمائی نہیں - آنسو پھر چھاچھم' چھاچھم -

دیہات میں ایسے قصّے انوکھے اور انہونے نہیں' اور نہ شہر والوں کے لیئے ہی دلسوز رہے ہیں - پھر بھی وہ تھر تھر کانپ اُٹھا - ٹھیک ویسے جیسے ایک دن موسم سرما کی دُھوپ میں سویرے سویرے تیبر کو جاتے وقت باغ کی پُرانی دیوار سے اُٹھ کر اچانک ایک سفید خوبصورت بالوں والا نرم نرم چھوٹا سا پِلا عین اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا - اس غریب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ایک ٹوٹا ہوا پنجہ (جو کسی حادثہ سے کٹ گیا تھا) اُوپر کئے ہوئے تھا - گویا وہ انسانی تشدّد پر بہت کچھ کہنا اور دل کے زخم دکھلانا چاہتا تھا - اب وہ اُچھل کود نہیں سکتا تھا' چھلانگ نہیں لگا سکتا - تب اس نے پیار سے اسے تھپتھپایا تھا -

لیکن وہ سامنے کیا دیکھ رہا ہے؟ ڈھلکتا مٹّی کا ڈھیلا؟ ہاڈمانس؟ سونے چاندی سے ڈھکا ہوا بُت؟ موسم سرما کے وسیع آسمان کی پہلی کرن؟

بچّہ اس کا نہیں' گھر اس کا نہیں - شادی پکّی نہیں - گویا کچھ بھی نہیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا -

دُھوپ ڈھل کر باہر کھیتوں پر جا پہنچی تھی - لوگوں کے کھلیان سے لوٹنے کا وقت ہو گیا تھا - زیادہ دیر اس کے وہاں ٹھہرنے میں کوئی اور آفت آسکتی تھی -

راہ بھر قریب آتی ہوئی شام کے ہولے ہولے قدموں کی آہٹ پاکر بُت بھی پھر ابر سے گھرے آسمان میں بھولے بھٹکے ہوئے پنچھی کی مانند گھر کے کام کاج کے لیئے ہلا - اس طرح یک لخت راہ چلتے چلتے ایک راہگیر کے آگے اپنے آپ کو بے نقاب کر دینے کی وجہ سے وہ اب پشیمانی سے سمٹ رہا تھا - کسی کی موجودگی اسے اچھی نہ لگتی تھی - اور وہ اب اکیلا' بالکل اکیلا رہنا چاہتا تھا - روپیہ اُس نے لوٹا دیا اور آخری بار صرف کھلیان والے راستہ کی طرف اشارہ کیا -

فلسفہ کے پروفیسر رمیش چندر کی فطرت میں ایک عجیب تبدیلی آ گئی ہے - اس ہفتہ کالج میں اس کا خاص چرچا ہے - کلاس لیتے وقت پروفیسر صاحب اب پہلے کی طرح جوش میں بھی نہیں آتے' اور نہ ہی طلبا ر کے سامنے سے نکلتے ہوئے انھیں نظر انداز کرتے ہیں - فرصت کے وقت گپ شپ' چائے کافی کے درمیان اکثر بچّوں کی طرح وہ بھی اپنی سنانے لگتے ہیں - لیکن نہ جانے کیوں اسے واضح الفاظ میں بیان نہیں کر پاتے - پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے چہرے پر سنجیدگی چھا جاتی ہے - اور کہیں دُور نظر جمائے وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں -

دراصل یہ جہان نہایت "نازک" تاروں سے بنا ہوا ایک ساز ہے جو زندگی کے بعض لمحات میں ہوا کے جھونکے کا سہارا لے کر سرکنڈے کی طرح خود بخود بج اُٹھتا ہے - لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ایسے ہی دو لمحات پروفیسر صاحب کی زندگی میں بھی آئے' نہ جانے کتنے اُلجھے ہوئے' کتنے بوجھل -

---

ہندوستان میں ۳۰۰ ویں انجن کی تیاری

چترنجن میں ریل کے انجنوں کے کارخانے نے ۳۰۰ واں انجن تیار کر کے لوکوموٹو ورکس نے گزشتہ فروری میں ۲۰۰ واں انجن تیار کیا تھا اس کارخانے کے لئے ۱۲۰ انجن سالانہ تیار کرنے کی تعداد مقرر کی گئی تھی - لیکن اب ریلوے بورڈ نے ۲۰۰ انجن سالانہ کی تیاری کی انتہائی حد منظور کی ہے -

اطہر حسین جعفری

(شاعر محمد علی) صائب تبریزی کی پُرماجرا زندگی

رات بڑی پیاری اور سُہانی تھی۔ چاندنے اپنی شاعرانہ خواب انگیز روشنی سے (اصفہان کے دریا موسوم بہ) زایندہ رود کے منظر کو دل فریب بنا رکھا تھا۔

(نوجوان) محمد علی پُل خواجو سے ٹیک لگائے دریا کی سطح کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دریا کی کف آلود لہریں باہم دست و گریباں، شور مچاتی آگے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کچھ عرصے تک محمد علی پانی کی روانی کو دیکھا کیا۔ سنّاٹے کے عالم میں رات کے وقت کی نرم و نازک ہوا نے اپنی خوش خرامی کی صدا سے فضا میں دل نواز موسیقی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ محمد علی نے ہر چند گھر واپس جانے کی کوشش کی، مگر قدم اُس طرف کو نہ بڑھے۔ معلوم نہیں رات کی اس گہری خاموشی اور زایندہ رُود کی موجوں کے نغمے میں کیا کشش تھی کہ محمد علی کو جگہ سے ٹلنے نہ دیتی تھی۔

یوں تو دن میں محمد علی نے دریا کا شور اکثر سنا تھا اور ہمیشہ بے توجّہی کے ساتھ پُل سے گزر جاتا تھا۔ لیکن آج رات کو نسیم شب کے تازگی بخش جھونکوں نے دُور اُفتادہ دوستوں کی یاد کو تازہ کر دیا تھا۔ چاندنی کے دل کش نظّارے نے سوئی ہوئی آرزوؤں کو بیدار کر کے دل میں بے چینی اور بے قراری پیدا کر دی تھی۔ دریا کی روانی کی صدا سے وجد کی کیفیت طاری تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اس نالۂ شب گیر کا ہم آہنگ ہو کر خود بھی نالہ آغاز کر دے۔

اُس رات کو حسبِ معمول محمد علی مکان نہ گیا۔ بلکہ صبح تک زایندہ رُود کے کنارے بیٹھا دریا کی دل پذیر صدا کو سنتا رہا جس کے ساتھ اس کی دلبستگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ رہا نہ گیا، اور فی البدیہہ ذیل کے دو شعر جن کو اس کی شاعری کا دیباچہ سمجھنا چاہیئے، موزوں کیئے، اور دل فریب لہجے میں گنگنانے لگا ؎

عالم پُر است از تو و خالیست جائے تو — در ہیچ پردہ نیست، نباشد نوائے تو
یک آفریدہ نیست کہ داند سرائے تو — ہر چند کائنات گدائے درِ تو اند

الغرض چند لمحے اِس عالمِ مستی و ذوق میں گزرے تھے کہ آنکھ کُھل گئی۔ دیکھا کہ آفتاب کی ابتدائی روشنی نے آفاق کو رنگین بنا دیا ہے۔ سورج آہستہ آہستہ صاف و لاجوردی آسمان پہ بلند ہوتا جاتا تھا، اور اپنے شور انگیز تبسّم سے زایندہ رود کے کنارے والے سرسبز نہالوں کو غرقِ نشاط کر رہا تھا۔

محمد علی نے حیرت زدہ نگاہ سے چاروں طرف دیکھا۔ اسی عالم میں اُس بڑے گناہ کا خیال آتے ہی جس کا وہ گذشتہ رات میں مرتکب ہوا تھا، کانپنے لگا اور ایک آہ سرد بھری۔ گناہ یہ تھا کہ اُسے غروب آفتاب کے بعد ایک دقیقہ کے لیے بھی گھر سے باہر نہ رہنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ یہ پہلی رات تھی جو اُس نے نوائے زایندہ رود سے سرشار ہو کر صبح تک پُل خواجو پر گذاری تھی۔ خود اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں وہاں آیا تھا اور کیا کر رہا تھا۔ نیز یہ کہ اس روزانہ معمول کی خلاف ورزی پر اپنے تند مزاج اور جھگڑالو باپ کو کیا جواب دے گا، اور کس طرح ثابت کرے گا کہ گذشتہ رات اُس نے زایندہ رود کے کنارے یکّہ و تنہا بسر کی تھی۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں افسردگی کی حالت میں ان دونوں شعروں کو جو رات میں کہے تھے، زیرِ لب پڑھتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اتفاق سے مکان سے اسی طرف تھوڑے فاصلے پر باپ کی شکل نظر آئی جو افتاں و خیزاں اپنے کام پر جا رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی محمد علی نے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن افسوس کہ پیر قابو میں نہ تھے۔ بوڑھے باپ نے جھٹ سے بیٹے کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بغیر کچھ کہے سُنے اُس کے سر اور رُخ پر کئی تھپڑ رسید کیے اور کہا "دور ہو، بس وہیں جا جہاں رات میں رہا تھا۔ اب آئندہ تجھے میرے گھر آنے کا کوئی

حق نہیں ہے۔ بد نصیب محمد علی نے ہر چند خوشامد درآمد کی لیکن بے سود۔ باپ اتنا ناراض تھا کہ ایسے بیٹے کی جو ایک رات گھر سے باہر رہا ہو شکل دیکھنے تک کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ محمد علی نے اسی ناامیدی کی حالت میں زاینده رود کی راہ لی جو پچھلی رات کو اُس کے حق میں سرچشمۂ الہام ثابت ہوا تھا۔ حالت یہ تھی کہ رنج کے اثر سے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کاش اُسی طرح زاینده رود کے کنارے ہی رہ گیا ہوتا۔ آخر اس رنج سے کیا فایدہ ہے۔ کیوں نہ سمجھ لوں کہ باپ مر گیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عمر کی بیسویں منزل میں قدم رکھا ہے، فنونِ ادب میں مہارت رکھتا ہوں۔ اچھا ہو گا کہ اپنی طبیعت کو جو شعر کہنے کی جانب راغب ہے اور تقویت دوں۔ اگر اور شعرا محض اچھے اشعار کہنے پر عوام کے موردِ توجہ ہو جاتے ہیں تو مجھے خدا نے شعر گوئی کے مادّے کے علاوہ خوش گلوئی بھی عطا کی ہے جو سونے پر سہاگے کا کام دے گی۔ اس سے میری ترقی میں کافی مدد ملے گی۔" خلاصہ یہ کہ صرف ایک رات گھر میں نہ رہنا ہی محمد علی کے زبردست شاعر ہو جانے کا باعث ہوا۔ اور ایران اور ہندوستان دونوں ملکوں میں واجبی شہرت کا مستحق بنا دیا۔

محمد علی صائب اصلاً تبریزی تھے۔ ان کے والد مرزا عبدالرحیم شاہ عباس کبیر کے عہد میں عباس آباد (اصفہان) میں آ کر آباد ہوئے۔ جہاں صائب سنہ ۱۰۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحصیلات کی تکمیل اصفہان میں کی۔ بیس سال کی عمر میں اُن کے والد نے صرف ایک رات گھر سے باہر رہنے کے جرم کی پاداش میں نکال دیا۔ چنانچہ یہی بات ان کے ذوق و احساسات کی تحریک کا باعث ہوئی۔ اس کے بعد سے محمد علی کی سرنوشت صرف اُن کے دل کی مرہونِ کرم ہے۔ زاینده رود کے کنارے جا کر اشعار پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ دن میں شعر کہتے اور رات میں نیلے آسمان پر ستاروں کے روشن ہوتے ہی پُل خواجو کے قریب آتے اور اطراف کے جنگل کے تناور درختوں کی آڑ میں بیٹھ کر روح نواز لحن سے ان کو باآوازِ بلند پڑھا کرتے۔ قریب کے دہ دیہاتی جو ضرورتاً زاینده رود کے کنارے آتے، ایک جوان کے آہنگِ جاں سوز کو سُنا کرتے، جو دل نشین اشعار خوش گلوئی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ لیکن باوجود کافی تلاش کے پڑھنے والے کا پتہ نہ ملتا تھا۔

ایک زمانہ اسی نہج سے گزرا۔ آخر کار اس خوش گلو جوان کی شہرت جو زاینده رود کے کنارے اشعار پڑھا کرتا تھا سارے اصفہان میں پھیل گئی، لیکن باوجود امکانی کوشش کے اس کا پتہ نہ ملتا تھا۔ لوگوں کو بس اتنا معلوم تھا کہ ایک سانولے رنگ کا کوتاہ قد جوان پھٹے پرانے کپڑے پہنے کسی غیر معلوم راستے سے جنگل میں آتا ہے اور شعر پڑھا کرتا ہے۔

الغرض صائب شہر کی لڑکیوں کے حق میں ایک محبوب آئیڈیل بن گئے تھے۔ اس شیدائی کا دامن اتنا کشادہ ہوا کہ عاشق پیشہ لڑکیوں نے مکتب کو خیرباد کہہ کر صائب کے اشعار پڑھنا اپنا شعار بنا لیا۔ ان کے علاوہ عورتیں بھی بس صائب کے نغمہائے جاں سوز سننے کی دلدادہ تھیں۔ شہر اصفہان کی ادبی انجمن نے جو اُس زمانے میں قہوہ خانے کے نام سے موسوم تھی کافی مدّت سے صائب کو انجمن کا عضو (ممبر) بنا رکھا تھا۔ اس انجمن نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ صائب کو ہندوستان بھیج دیا جائے۔ چنانچہ بہت جلد ان کے لئے سامانِ سفر مہیّا کر دیا گیا۔

جس روز صائب (بجبر) اصفہان کو خیرباد کہنے والے تھے سارا شہر سوگوار نظر آتا تھا۔ اکثر دوست اُن کے ہندوستان جانے کے مخالف تھے، لیکن باوجود امکانی کوشش کے ان کو روک نہ سکے۔

الغرض آدھی رات کے وقت قافلہ خاموشی کے ساتھ روانہ ہوا، اور اُس عاشق مزاج اور غزل سرا شاعر کو جس کا دل اشکہائے جانان کے تصوّر سے خونین ہو رہا تھا اپنے ساتھ لے چلا۔

صائب ایک زمانے تک کابل میں رہے۔ وہاں ظفر خاں والی کابل نے ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا، اور اُن سے محبت کرنے لگا، اُسی زمانے میں ہندوستان میں شاہ جہاں کا دربار فارسی شعرا و ادبا کا گہوارہ بنا ہُوا تھا۔ چنانچہ ہر شاعر و ادیب اُسی طرف ڈھلکا چلا جاتا تھا۔ چنانچہ محمد علی صائب بھی جو کابل کے قیام سے رنجیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ ہندوستانی بادشاہ کے دربار میں چلے آئے۔ اور چھ سال کے قریب شاہجہاں کی خدمت میں گزارے۔ اس مدّت میں جب کبھی شہر اصفہان اور اُس کی زیبائیاں یاد آتی تھیں تو اُن کا دل شوق و اضطراب سے تڑپ اُٹھتا تھا۔ لیکن افسوس کہ اُن کو اپنے وطن و مولد واپس آنے کی اجازت نہ تھی۔ اتفاق سے اصفہان واپس جانے کے

خیال ہی کے زمانے میں شاہ عبّاس ثانی پسر صفی مرزا و نوادۂ شاہ عبّاس بزرگ تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ چونکہ اس نے بچپن ہی میں اہالیٔ اصفہان کی صائب کے اشعار اور ان کی خوش الحانی سے دلچسپی کا تذکرہ سُنا تھا۔ اس لئے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی صائب کے متعلق دریافت کیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ وہ تو کئی سال سے ہندوستان میں مقیم ہیں، کیوں کہ ان کو حکومت کی جانب سے شہر اصفہان میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ اس شعر شناس شاہ نے ان کو جلد سے جلد اصفہان واپس بلائے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ چونکہ صائب کو اپنے والد کے خط سے بادشاہ کے حکم کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لئے فوراً ہی سامانِ سفر درست کرکے اصفہان واپس آگئے، اور تھوڑے ہی عرصے میں شاہ عبّاس ثانی کے دربار کے ملک الشعراء کے درجے پر فائز ہوئے۔ اس قدر شناس شاہ کے حینِ حیات صائب کا زمانہ عیش و آرام سے گذرا۔ لیکن اس کے جانشین شاہ سلیمان کے بادشاہ ہوتے ہی ان کی بدنصیبی کا زمانہ آگیا۔ چنانچہ اس بادشاہ نے محض واہی خیالات کی بنا پر اس زود رنج اور حسّاس طبیعت والے شاعر کو آزردہ خاطر کرکے خانہ نشین بنا دیا۔

صائب نے آخر عمر (۱۰۸۱ھ) تک اپنے زیبا و پُرگل و شگوفہ باغ معروف بہ باغِ تکیہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ چنانچہ یہ باغ اب بھی اوقافِ شاہی کے زیرِ تصرّف ہے، اور حوالی زایندہ رود کے "خیابانِ صفا" میں واقع ہے۔ باغ کے آخری حصّے میں مٹّی کے ایک ٹیلے پر جو گویا مزار کے گنبد و رواق کی خرابی کی داستان سناتا ہے ہر سبز و پُرشگوفہ درختوں کی آغوش میں تین قبریں نظر آتی ہیں۔ ایک تو خود صائب کی ہے، اور باقی دو علی الترّتیب محمّد علی فرزند مرزا رحیم اور مرزا محسن فرزند صائب کی ہیں۔ صائب کی وفات سے ۴۵ سال بعد محمّد علی اور ۶۲ سال بعد مرزا محسن دفن ہوئے تھے۔ سالہا سال سے صائب تودۂ خاک کے نیچے سو رہے تھے اور کسی کو اس کی خبر تک نہ تھی، لیکن اب اس شاعرِ شوریدہ سر کا نیم شکستہ سنگی مزار باغِ تکیہ میں نظر آتا ہے، قبر پر یہ اشعار جلی حرفوں میں مرقوم ہیں:-

در ہیچ پردہ نیست، نباشد نوائے تو — عالم پراست از تو و خالی است جائے تو
ہر چند کائنات گدائے در تو اند — یک آفریدہ نیست کہ داند سرائے تو

در مشتِ خاکِ من چہ بود لائقِ شما — این مشتِ خاکِ تیرہ چہ دارد سزائے تو
غیر از نیاز و عجز کہ در کشورِ تو نیست — ہم از تو جاں ستانم و سازم فدائے تو
صائب چہ ذرّہ است و چہ دارد فدا کند — اے صد ہزار جانِ مقدّس فدائے تو
محو کے از صفحۂ دلہا شود آثارِ من — من ہماں ذوقم کہ می یابند از گفتارِ من

صائب نے رحلت کے وقت دو ہزار شعر، مثنوی قندھار نامہ، محمود و ایاز اور ایک رسالہ جو اپنے زمانے کے شعرا اور متاخرین کے حالات پر مشتمل یادگار چھوڑا۔ مدّت دراز سے اس شاعرِ شوریدہ کی آرام گاہ اصفہان کے نیازمندوں کی حاجت روائی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہاں کے لوگ معتقد ہیں کہ صائب صاحبِ کرامات ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ شبِ جمعہ کو اُن کے مزار پر عالمِ غیب کا ایک چراغ آپ ہی آپ روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی کرامتیں اُن سے منسوب کی جاتی ہیں جن کو ہر شخص باور نہیں کرسکتا۔

ماخوذ از مجلّۂ فرہنگِ ہند و ایران۔ جنوری ۱۹۵۲ء
و منقول از مقالۂ فارسی بقلم آقائے ناصر الدین شاہ حسینی

شعر و سخن

نگاہِ یار

افسر سیمابی احمد نگری

وہ پیچ وخم جو تری زلفِ مشکبار میں ہیں
ستم کچھ اور ستم ہائے روزگار میں ہیں

متاعِ شوق وہی عمرِ مستعار میں ہیں
خزف جو حسن و محبت کے کاروبار میں ہیں

دل و نظر کے مقامات کیا کہوں تجھ سے
ہزار شمس و قمر گردِ رہ گزار میں ہیں

خوشی آگئی ہے محبت کو بے بسی، ورنہ
تمام "جبرِ" محبت کے "اختیار" میں ہیں

خراب ہوش ہیں آسودگانِ غم یعنی
ترے اشارۂ ابرو کے انتظار میں ہیں

تمام وادیٔ امکاں ہے منتظر جن کی
وہ قافلے تو ابھی پردۂ غبار میں ہیں

خزاں کی شعلہ گری جن کو چھو نہیں سکتی
کچھ ایسے پھول ابھی دامنِ بہار میں ہیں

کسی پہ فاش نہیں تیرے غمزدوں کے سوا
وہ جنتیں جو محبت کے خارزار میں ہیں

گدازِ عشق سے کھلتے ہیں زندگی کے رموز
بہت معارفِ ہستی نگاہِ یار میں ہیں

بہار کھول چکی اپنے زرفشاں گیسو؛
ہنوز اہلِ چمن ماتمِ بہار میں ہیں

وہ راز فاش ہیں افسر ضمیرِ شاعر پر
چھپے ہوئے جو شبستانِ روزگار میں ہیں

نقوش

ارشد صدیقی ساگری

سکون مانگا ہے گھبرا کے شورشِ غم سے
یہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں کبھی کبھی ہم سے

تباہیاں مری قسمت ہی سہی مگر اے دوست
شکایتیں ہیں ترے التفاتِ پیہم سے

اٹھا ہوں لے کے تری بزم سے بنامِ خلوص
نقوشِ رسمِ وفا اور وہ بھی مبہم سے

انھیں فسانوں سے پھوٹے گی انقلاب کی لو
جو ہو رہے ہیں مرتب سکوتِ پیہم سے

زمانہ ترکِ مراسم کا ذمہ دار نہیں
خطا ہوئی ہے کبھی آپ سے کبھی ہم سے

رخِ حیات پہ سرخی ہی ہے تبسم کی
دہک رہے ہیں مگر روح میں جہنم سے

تمھارے درد کو ہم یوں چھپائے پھرتے ہیں
کہ چھین لے نہ زمانہ یہ روشنی ہم سے

کبھی ہمیں پہ بہاروں کو ناز تھا ارشد
نظر چراتے ہیں آج اہلِ گلستاں ہم سے

تو کیا ہوگا؟

حسرت شادانی بتیاوی

وہ مجھ پہ ہو بھی گئے مہرباں تو کیا ہوگا
اگر مٹا نہ غمِ جاوداں تو کیا ہوگا

نہ شب کو چین، نہ دن کو سکوں نہیں جینا
یہی رہا جو غمِ آشیاں تو کیا ہوگا

بہ جبر مجھ کو شکایت سے روکنے والے
ہوئی نہ بند زبانِ فغاں تو کیا ہوگا

ہیں خود ہی حشر میں رحمت کا امتحاں لوں گا
بروزِ حشر مرا امتحاں تو کیا ہوگا

قبول کرنے تو ہو، دولتِ الم حسرت
اٹھا نہ تم سے یہ بارِ گراں تو کیا ہوگا

غزل

بشن داس زار

داد تو داد بس اتنا ہی کہیں ہو جائے
کچھ انھیں میری محبت کا یقیں ہو جائے

فیصلہ تیرا مرا آج یہیں ہو جائے
ہاں اگر ہو نہیں سکتی تو نہیں ہو جائے

دل ہی کمبخت اڑا بیٹھا ہے ضد پر ورنہ
ہم تو جس شے پہ نظر ڈالیں حسیں ہو جائے

حرم و دیر کی تخصیص نہیں کچھ ہم کو
دل کی تسکین سے مطلب ہے کہیں ہو جائے

تم نقابِ رخِ انور تو ذرا سرکاؤ
قصۂ طور کی تفسیر یہیں ہو جائے

زار کا حال کچھ ابتر ہے خبر لو اس کی
کہیں ایسا نہ ہو پیوندِ زمیں ہو جائے

غزل

صغیر احمد صوفی

ہے وہی سلسلۂ کارِ جہاں تیرے بعد
وہ مگر گرمیٔ بازار کہاں تیرے بعد

خامشی جن کو سکھاتی رہی آدابِ جنوں
ہائے وہ راز نہ ہو جائیں عیاں تیرے بعد

کس کو ہے فکر کرے سعیٔ مداوائے الم
کون ہو طالبِ خیریتِ جاں تیرے بعد

جل بجھا شعلۂ جاں ضبط کی بیتابی سے
قلبِ احساس سے اٹھتا ہے دھواں تیرے بعد

ایک ہی حادثہ جینے کیلئے کافی ہے
اب بناؤں گا نہ شیشوں کے مکاں تیرے بعد

کیا گوارا ہے تجھے ہو مرا چرچا گھر گھر
لوگ کرتے رہیں رسوائے جہاں تیرے بعد

جن کو صوفی نے کیا واقفِ اسرارِ نہاں
کچھ وہی لوگ ہوئے دشمنِ جاں تیرے بعد

محمد عتیق

جام جہاں نما ——— اُردو کا پہلا اخبار

"جام جہاں نما" (کلکتہ) ہندوستان کا دوسرا فارسی اور پہلا اردو اخبار تھا۔ فارسی کا پہلا اخبار راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ ہی سے "مراۃ الاخبار" کے نام سے نکالا تھا۔ مراۃ الاخبار اور جام جہاں نما (فارسی) میں صرف ڈیڑھ مہینہ کی چھٹائی بڑائی تھی۔ مراۃ الاخبار کا پہلا نمبر ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا اور جام جہاں نما کا پہلا نمبر مئی ۱۸۲۲ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتے میں نکلا۔

جام جہاں نما کے اجراء کی درخواست ہری ہردت نے ۱۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو دی تھی۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ لیکن ان دونوں کا تعلق جام جہاں نما سے مالکانہ نہیں بلکہ ملازمانہ تھا۔ اخبار کی کلکتہ کی ایک انگریزی تجارتی کوٹھی "ولیم ہاپکنس پیرس اینڈ کمپنی تھی۔ اخبار نستعلیق ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اور اس کا دفتر سرکلر روڈ پر تھا۔

نیشنل ارکائوز آف انڈیا جو پہلے امپیریل ریکارڈ آف انڈیا کے نام سے مشہور تھا، وہاں جام جہاں نما کے ابتدائی دور کی گیارہ جلدیں محفوظ ہیں۔ لیکن وہاں بھی پہلے دو برسوں کی فائلیں نہیں ہیں۔ جام جہاں نما کا پہلا نمبر جو نیشنل ارکائوز میں ہے وہ ہے۔

"نمبر ۱۳۳ تاریخ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۲۳ء روز چہارشنبہ" کا۔

اخبار شروع ہوتا ہے ایک بے عنوان معذرت سے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اخبار وقت پر نہیں نکل رہا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پریس وغیرہ کے انتظامات میں کچھ "قصورے وفتورے وفتہ باشد" اور خریداروں سے یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ "بسبب فراہم نبودن متعلقات این کارخانہ اگر ہفتہ دو ہفتہ" اخبار وقت پر نہ نکلے تو "بذیل عاطفت پوشیدہ شود"۔

جام جہاں نما کے سرورق کے اوپری حصے پر دونوں طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کا سرکاری نشان چھاپا جاتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس اخبار کو کمپنی بہادر کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہے۔ سرکاری خبریں "صاحبان والاشان" کے تقرر اور تبدیلی کی اطلاعیں اور سرکاری نوٹس اخبار کے شروع میں پابندی کے ساتھ چھاپے جاتے تھے۔

اردو جام جہاں نما، فارسی جام جہاں نما کا ضمیمہ نہ تھا، بلکہ اس کی حیثیت بڑی حد تک ایک مستقل اخبار کی تھی۔ مضامین کے اعتبار سے اردو کا جام جہاں نما فارسی اخبار سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ فارسی جام جہاں نما کے اجراء کے پورے ایک سال بعد اردو کے جام جہاں نما کا اجراء ہوا۔ نیشنل ارکائوز آف انڈیا میں فارسی کی ابتدائی دو برسوں کی فائلوں کے ساتھ اردو کے بھی ابتدائی ۲۰ نمبر غائب ہیں۔ وہاں پہلا اردو نمبر جو ہم کو ملتا ہے وہ نمبر ۱۸ ہے۔ جو ۲۹۔ دسمبر ۱۸۲۳ء کا ہے۔ اس حساب سے اردو جام جہاں نما کا پہلا نمبر ۲۹ مئی ۱۸۲۳ء کو شائع ہوا ہوگا۔ اخبار صرف چار صفحہ کا ہوتا تھا، اور اس کا سائز ۲۰×۳۰ تھا۔

اخبار کی ابتداء ایک نوٹس سے ہوتی ہے۔ یہ نوٹس انگریزی میں ہوتا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جام جہاں نما (اردو) کے اجراء کا مقصد یہ تھا کہ فارسی جام جہاں نما کو "یورپین خریداروں کے لئے دلچسپ، پُرلطف اور مفید بنایا جائے"۔

اسی نوٹس سے ہم کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو جام جہاں نما اگر فارسی کے اخبار کے ساتھ خریدا جائے تو اس کی قیمت چار آنہ فی نمبر یا ایک روپیہ ماہوار ہوگی لیکن اگر صرف اردو اخبار خریدا جائے تو اس کی قیمت دو روپیہ ماہوار ہوگی۔

مسٹر ڈی کاسٹا کی شاعری

جام جہاں نما میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ جو انگریزی یا فارسی سے ترجمہ کئے جاتے تھے۔ اکثر پوری پوری کتاب کے ترجمے بالاقساط چھاپے جاتے۔ غزلیں بھی کبھی کبھی "غزل لطف افزا مسٹر ڈی کاسٹا" کے عنوان سے چھاپی جاتیں۔

مسٹر ڈی کاسٹا کا تعلق کلکتہ کے ایک کالج سے تھا، اور وہ بہت منکسر المزاج

[illegible]

[illegible]

دو متفرق مضامین

جامِ جہاں نما (نمبر ۱۸۷) مورخہ ۱۰۔ مارچ ۱۸۲۷ء میں صرف دو چھوٹے چھوٹے خبر نما مضامین ہیں۔ پہلا مضمون پولینڈ کی عورتوں کی بہادری کے بیان میں ہے۔

"وہاں کی (پولینڈ کی) عورتیں شجاعت اور دلاوری میں ممتاز ہیں۔ قیاس یہ جانتا ہے کہ شاید اور کسو ملک میں عورتوں نے ویسی دلاوری نہ کی ہوگی۔ کس واسطے کہ شجاعت کی صفت خاص واسطے مردوں کے ہے۔ مستورات کو کہ خانہ نشین رہتی ہیں اور خانگی امور کے انتظام سیوا ان کو روزگار پیشگی سے کچھ علاقہ نہیں۔ پر وہاں کی عورتوں نے بیشتر بینڈے بینڈے وقت ایسی چالاکیاں کی ہیں کہ مردوں کے کان کاٹے ہیں۔ اطلاع کے لئے دو حال لکھے جاتے ہیں۔۔۔۔"

دوسرا مضمون "خاقان عالی شان نکلس جو ان دنوں روس کا تخت نشین ہے" اُس کے حالات کے باب میں لکھا گیا ہے۔

تاریخ عالم گیری کا ترجمہ

۱۷۔ جون ۱۸۲۷ء کے جام جہاں نما سے تاریخ عالم گیری کے ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس کی آخری قسط ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو شائع ہوئی۔ یہ ترجمہ براہِ راست فارسی سے اُردو میں نہیں کیا گیا تھا بلکہ انگریزی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ ترجمہ ختم کرنے کے بعد خود مترجم نے اورنگ زیب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے، اور آج جب کہ ہمارے دماغ جدید انکشافات سے مسموم ہو چکے ہیں، یقیناً ہم کو یہ دیکھ کر ایک غیر مسلم اورنگ زیب کے متعلق اتنی اچھی رائے کیوں کر رکھ سکتا تھا۔

"اب راقم گزارش کرتا ہے کہ اورنگ زیب تیموریہ خاندان میں لائق اور فائق ہوا۔ سب علوم و فنون پر اس کو بخوبی مہارت تھی۔ رعیّت اور نصفت گستری جیسی اُس نے کی، اُس خاندان میں دوسرے سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ تیموریہ خاندان میں کسو کی نیّت میں فساد نہ تھا۔ خلق اللہ کو سب دوست رکھتے تھے۔ شاہجہاں نے بہت اچھی فرماں روائی کی۔ جہاں گیر ویسے ہی عادل تھے۔۔۔۔۔۔۔ اکبر کے صفات کہاں تک لکھے جائیں۔۔۔۔ اورنگ زیب کی محفل میں بھی سب طرح کے علماء و فضلاء و عقلاء حاضر تھے۔ پر اُس نے کبھو کسو سے انتظام کے باب میں مدد نہیں چاہی، اور اس مآل اندیشی سے ہر ایک کام کیا کہ اتفاقیہ کبھو اُس کی رائے نے خطا کی ہو۔۔۔۔۔۔ اور یہ بات کہ لوگ اُس کو خسیس کہتے ہیں، کہا کریں۔ سلطنت کا خزانہ لہو لعب میں اوڑا دینا کب دانش مندوں نے جائز رکھا ہے۔ اورنگ زیب نے تن آسانی اور عیّاشی نہیں کی۔ غریب غربا کو ہزاروں لاکھوں بخشے۔ سپاہ کو ہمیشہ انعام و اکرام سے راضی رکھا، اسراف اُس کو پسند نہ تھا۔ صرف یہ بات کہ اورنگ زیب کو مذہب کا تعصّب بہت تھا، درست مگر مذہب کی پاسداری سے (کو؟) سب علماء نے جائز رکھا ہے، بلکہ اپنے مذہب کے استحکام کا سبب جانتے رہے ہیں۔ پر ریاست کی شان کے برخلاف بادشاہ مقتدا و دولت کا آشنا چاہیئے کہ اس کی سلطنت میں کسو کو روحانی رنج نہ پہنچے۔ بہرحال حسنات بہت اور ذمائم اس کے (اورنگ زیب کے) گنتی کے ہوں گے۔ مثل مشہور ہے کہ بے عیب ذات اُسی کی ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔"

جامِ جہاں نما کا خاتمہ

یہی نمبر جامِ جہاں نما کا آخری نمبر ہے۔ اس طرح اُردو کا یہ پہلا اخبار چار سال آٹھ مہینے تک جاری رہنے کے بعد ۲۳۔ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہوگیا۔ کیوں کہ

"قدر شناس جن کی لطف گستری سے اس کاغذ نے شہرت اور رونق پائی، اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے۔ اور اہلِ ہند جنھوں کی زبان (اردو) ہے، دے فارسی تحریر چاہتے ہیں۔ بیں خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتے سے ہندی فرمان کے عوض ایک اور بھی فرمان فارسی میں لکھا جائے۔۔۔۔"

ناصر کرنولی

مدراس میں اُردو

مدراس میں اردو زبان و ادب کی خدمات کا سلسلہ مدّتوں سے جاری ہے۔ وہاں کافی تعداد میں شاعر انشاپرداز اور صحافی گزرے ہیں جو اپنی اپنی جگہ ہر لحاظ سے ممتاز تھے مگر زمانے کے انقلابات نے ان کی خدمات پر ایسے پردے ڈال دئے کہ اوروں تو اور خود اردو زبان سے قریبی ربط رکھنے والے بھی ان محسنوں کو بھلا بیٹھے۔ مدراس کے متعلق آج دوسرے صوبوں میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں انگریزی اور تامل کے سوا کسی زبان کا وجود نہیں حالانکہ آج بھی مدراس میں اردو زبان و ادب کا خاصا ذوق موجود ہے جس کا اعتراف شمالی ہند کے ان متعدد شعراء اور ادیبوں نے کیا ہے جنھیں یہاں کے مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اہل مدراس کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے تو جنوب میں اردو زبان و ادب کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ ذیل کے مضمون میں میں نے ان کوششوں اور دلچسپیوں کا سرسری نظر سے جائزہ لیا ہے جنھیں جنوب میں تاریخ ادب و زبان اردو کی اہم کڑی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جب ایرین قوم نے شمالی ہند پر حملہ کیا تو یہاں کے قدیم باشندوں نے جنوبی ہند کا رُخ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان لوگوں کی زبان "تلگو" تامل وغیرہ تھی جو کہ آج بھی صوبۂ مدراس، صوبۂ آندھرا وغیرہ میں مروّج ہے۔ فاتحین نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد زمانے کے دستور کے مطابق جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے" مفتوح قوم کی زبان پر اپنی زبان سنسکرت کی حاکمیت قائم کی۔ درباروں اور شاہی کاروبار میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس کے بعد عوام کے تلفظ اور بول چال نے ایک اور زبان کو جنم دیا۔ جس کو پراکرت کہتے ہیں جو برج بھاشا کی اصل ہے۔ اس زبان کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور یہی دفتری اور درباری زبان قرار پائی۔ اس کے علاوہ مذہبی کتب بھی اس زبان میں مرتب ہونے لگیں۔ تقریباً ۱۵ سو سال بعد راجہ بکرماجیت کے تخت نشین ہوتے ہی پھر سنسکرت زبان جادۂ ترقی پر گامزن ہوگئی۔ اس کے بعد مسلمان فاتحوں کی یلغاریں شروع ہوئیں اور عربی فارسی اور ترکی الفاظ برج بھاشا میں شامل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس امتزاج نے ایک نئی زبان کو جنم دیا جو شاہ جہاں کے زمانے میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس زبان نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے میں بہت ہی فراخ دلی سے کام لیا اور اس میں انگریزی اور پرتگالی الفاظ بھی شامل ہوگئے۔ مغلوں کا اقتدار بڑھتے بڑھتے دکن کے علاقوں تک پہنچا اور ان کے ساتھ یہ نئی زبان بھی اثر انداز ہوئی۔ اس طرح شمال اور جنوب کی تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ لیکن جب کرناٹک میں مغلوں کے اقتدار کی نیّا ہچکولے کھانے لگی تو دوسری سیاسی طاقتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ فرانس اور برطانیہ میں پہلے ہی رقابت موجود تھی اس موقع کو دونوں نے غنیمت جانا اور رفتار حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ فرانسیسیوں اور انگریزوں میں کرناٹک پر قبضہ کرنے کی غرض سے کشمکش شروع ہوگئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مدراس میں اردو کے شباب کا یہی زمانہ تھا اور اس سیاسی بحران کے زمانے میں یہ زبان ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ بہمنی دور حکومت میں اردو رواج پا چکی تھی اور چونکہ بہمنی سلطنت کا علاقہ ارکاٹ اور کرناٹک سے ملا ہوا تھا اس لئے اردو زبان کے اثرات کا وہاں تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ ملک الشعرا نصرتی (جو اسی دور کے شاعر ہیں) ان کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ ان کا وطن کرناٹک (مدراس) تھا۔ مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مدراس کے پہلے شاعر عبدالمومن مومن تھے ان کے بعد ۱۷ ویں صدی کے آخر سے ۱۸ ویں صدی کے آخر تک شعراء اور ارباب ذوق کا تانتا بندھا رہا جنھوں نے فن شاعری کے ذریعے چمن اردو کی آبیاری کی اور اس زبان کی ترقی و

توسیع کے وہ شگوفے کھلائے جن کی خوشبو سے سارا ہندوستان مہک اٹھا۔
خصوصاً حضرت ابو الحسن قربی کے شاگرد باقر آگاہ جنھوں نے فارسی کو ترک کرکے اردو نثر میں کتابیں لکھیں۔ آپ تقریباً ۳۰۰ (تین سو) کتابوں کے مصنف ہیں اور اردو نثر کے بادا آدم کہلانے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔ نیز دلی ویلوری اور ان کے شاگرد اعظم کے کارنامے بھی قابل ستائش ہیں اور ان کا اردو ادب پر گراں قدر احسان ہے۔ اس کے بعد سے اس صوبہ میں شعراء کرام کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر شاکر، بادشاہ، ابہان، انجو، ذوقی، عباسی، رزمی، قدسی، لطیف، شاکر، نیاز، کمالی، برق، مولوی محمود، شمس العلماء قاضی عبد اللہ، پیر دستگیر قطب الدین، مرزا غلام عباس، محمد صالح غنی، سید صبغت اللہ حسین وغیرہ۔ مذکورہ الصدر شعرائے کرام میں بادشاہ کی شخصیت دنیائے ادب میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ اہل دکن ان کو "حالی مدراس" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ شاطر اپنی قادر الکلامی اور فصیح البیانی کے باعث ہندوستان کی ادبی دنیا میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ ان بلند پایہ اور گراں مایہ شعرائے منتخب میں سے تھے جن کی تخلیقات نے اردو شاعری کے مردہ قالب میں ایک نئی روح پھونکنے میں بیش قرار حصہ لیا۔ مجموعی طور پر گل و بلبل کے تذکروں کے ساتھ ساتھ حب وطن کا جوش اور قومیت کے خیالات شعرائے مدراس کے کلام کی روح رواں ہیں۔ نیز صاف سلجھی ہوئی بندشوں، نفیس ترکیبوں سے اپنے کلام کو زینت دینے کا خاص خیال رکھتے ہیں، انوکھے تخیل کی پرواز اور معنی خیز مضمون آفرینی ان کی طرح عرش پیما کے جوہر ہیں۔

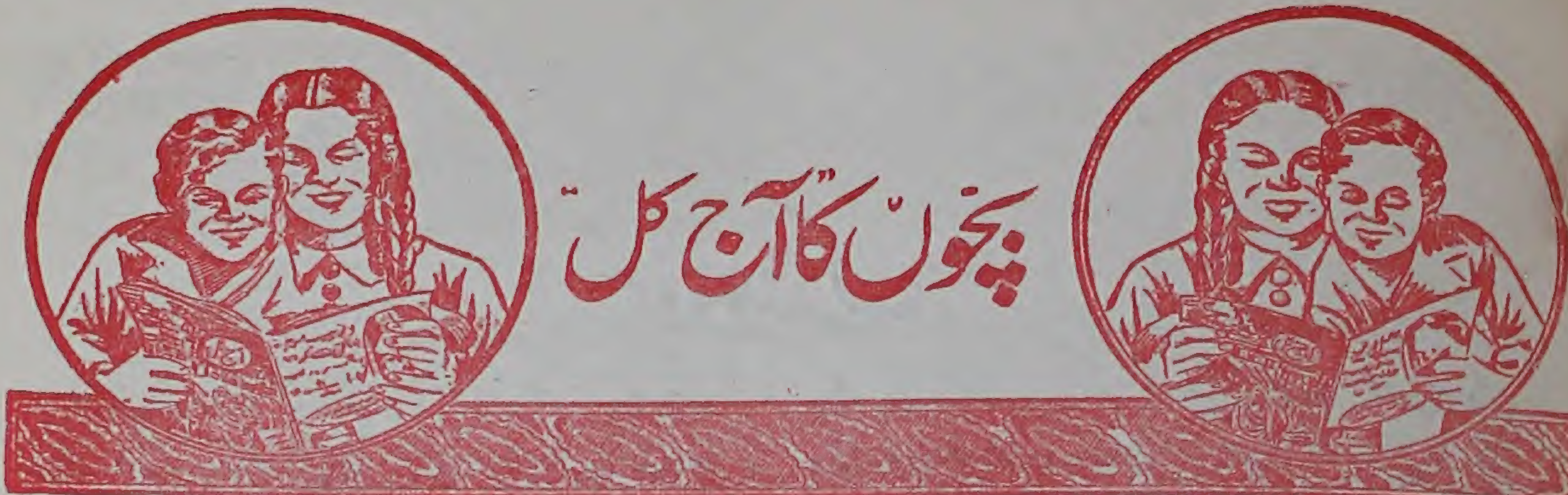
مدراس صحافتی دوڑ میں بھی دوسرے ممالک سے پیچھے نہیں رہا۔ برجموہن کیفی نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ اردو ماہ اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا ہے "اردو اخبار" کو جس کے ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر تھے اور جو دہلی سے شائع ہوتا تھا اردو کا سب سے پہلا اخبار قرار دیا گیا ہے۔ میں جناب نصیر الدین ہاشمی کے اس خیال سے متفق ہوں کہ اردو کا پہلا اخبار غالباً عمدۃ الاخبار ہوگا۔ جو مدراس سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی اجرائی کی تاریخ ہنوز زیر تحقیق ہے مگر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اس کی اجرائی عمدۃ الامراء کے زمانے میں ہوئی اور اخبار کو انھیں کے نام سے موسوم کیا گیا اس کے علاوہ ڈاکٹر مولانا عبد الحق قبلہ مدظلہ کا ایک تحقیقی مقالہ میری نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے "مدراس میں اردو صحافت کا زوال"۔ ڈاکٹر صاحب ۲۵-۳۰ سال سے مدراس میں اقامت پذیر ہیں اور مدراس یونیورسٹی کے اردو فارسی اور عربی شعبوں کی روح رواں ہیں۔ آپ اردو فارسی اور عربی کے بلند پایہ عالم اور محقق ہیں۔ ان زبانوں کی تعلیم و ترقی سے متعلق یونیورسٹی کی تمام اسکیمیں موصوف ہی کے ذہن و دماغ کی پیداوار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے وہ مقالہ بابائے اردو کی فرمائش اور اصرار پر لکھا تھا۔ اس مقالہ میں مدراس کی اردو صحافت کے بارے میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں اس کے مستند ہونے کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کی کاوش و تحقیق کا رہین منت ہے۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں وہاں اردو کافی ترقی کر چکی تھی۔ لوگوں میں ادبی ذوق موجود تھا شاعر، ادیب، انشاپرداز اور صحافی کافی تعداد میں موجود تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے جو غدر کے نام سے موسوم ہے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ اس وقت مدراس میں ذی استعداد اردو اور فارسی دانوں کی کمی نہ تھی اور اس کا دائرہ مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوؤں میں بھی بڑے اچھے اچھے فارسی اور اردو کے شعرا موجود تھے چنانچہ مدراس کی جامع مسجد جو والاجاہی مسجد کے نام سے مشہور ہے کے محراب پر فارسی قطعۂ تاریخ ایک ہندو فارسی داں شاعر کی موزونی طبع کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے کے اخبارات کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ صوبۂ مدراس میں اردو کو عام مقبولیت حاصل تھی۔ اس بنا پر بیسیوں بلند پایہ اردو اخبارات وہاں سے جاری ہوئے اور کافی عرصے تک داد قبولیت حاصل کرتے رہے۔ جن میں اتحاد، شمس الاخبار، اتفاق، طلسم حیرت، دبیر ہند، جریدۂ روزگار، الحاج مخبر دکن، نیر آصفی، آفتاب دکن قابل ذکر ہیں۔ غرض ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک کا زمانہ مدراس کے اردو اخبارات کی ترقی کے سلسلے میں منتہائے عروج کا تھا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد بجائے اردو فارسی انگریزی کا رواج، اردو اخبارات کے دلدادوں میں کمی۔ کرناٹک کا انگریزوں کے حوالے ہونا، اور ان ہندو شعرا کا جو والاجاہی حکومت کے زمانے میں فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی سے منہ موڑنا، اردو صحافت کے جمود کا باعث بنا۔ چند اخبار مثلاً شمس الاخبار، جریدۂ روزگار، طلسم حیرت اور قاسم الاخبار بیسویں صدی میں بھی جاری رہے۔ درحقیقت تعلیمی انقلاب کی بدولت جب فارسی اور اردو کی جگہ انگریزی کو ملی تو اردو اخبارات کی

مقبولیت میں کمی آنے لگی ۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی صوبۂ مدراس میں اردو صحافیوں کی صلاحیتیں کافی حوصلہ افزا ہیں ۔ یہاں سے ماہنامے' ہفتہ وار' پندرہ روزہ اور سہ ماہی پرچے شائع ہوتے رہتے ہیں جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ آج بھی اس علاقے میں اردو زبان کے فروغ اور نشوونما کی صلاحیت موجود ہے ۔

صد درجہ بے انصافی ہوگی اگر اس موقع پر ان انجمنوں کا ذکر نہ کیا جائے جنھوں نے اردو کی ترقی و توسیع میں نمایاں حصہ لیا اور اس کو مقبول عام بنانے میں پر خلوص جذبات سے سرگرم عمل ہیں ۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ جس کے صدر جناب محمد علی صاحب ایم ۔ اے اور سیکرٹری افضل العلماء مولانا سید عبد الوہاب بخاری ہیں ۔ سب سے زیادہ مبارک باد کی مستحق ہے ۔ مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی لیکچرار اردو مدراس یونیورسٹی' کبھی انجمن مذکور کے سیکرٹری رہ چکے ہیں ۔ انجمن کی قابل ستایش خدمات کے علاوہ موصوف نے نوجوانوں کے ذوق شعر گوئی اور انشا پردازی کی کامیاب رہنمائی فرمائی ۔ مولانا موصوف اگرچہ اس وقت ریٹائر ہونے کے بعد فی الحال بھوپال میں مقیم ہیں لیکن مدراس اور اس کے ملحقہ علاقوں میں ان سے فیض پائے ہوئے نوجوان سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو ہمیشہ ان کا نام روشن رکھیں گے ۔ مجھے اخبار میں یہ دیکھ کر روحانی مسرت ہوئی کہ مرکزی حکومت نے مولانا کی علمی خدمات کے صلے میں سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ہے ۔

دورِ حاضر میں اردو زبان کی خدمت کا سہرا "اردو سیمنار" کے سر ہے ۔ اراکین اردو سیمنار مدراس ان نوجوانوں پر مشتمل ہے جو افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی رہبری و سرپرستی میں سرگرم عمل ہیں ۔ اردو سیمنار کمیٹی کے صدر مولانا بخاری صاحب ہیں اور سیکرٹری اے ۔ جے ۔ جلال الدین ہیں ۔ اس نوجوان سیکرٹری کی اردو نوازی کو ادبی طبقہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔ آپ نے ایک دو منزلہ پختہ عمارت اپنے والد مرحوم کی یادگار میں اردو سیمنار کے لئے وقف کر دی ہے ۔ اس عمارت میں ایک مختصر سی اردو لائبریری اور دار المطالعہ ہے ۔ جہاں اردو کے مشہور اخبارات و رسائل باقاعدہ منگائے جاتے ہیں اور شائقین مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں ۔ اس سیمنار کے زیر اہتمام سالانہ کل ہند مشاعرہ منعقد ہوتا ہے جس میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے چوٹی کے شعرا مدعو کئے جاتے ہیں اور ان کے تمام اخراجات اردو سیمنار کمیٹی برداشت کرتی ہے ۔ نیز سیمنار کی جانب سے جلال الدین کی ادارت میں ایک شاندار سالنامہ بھی شائع ہوتا ہے جس میں سالانہ روئداد کے ساتھ ساتھ معیاری ادبی مضامین' نظمیں اور غزلیں درج ہوتی ہیں ۔

مشاعروں سے اہل مدراس کی دلچسپی بھی قابل داد ہے ۔ زمانۂ قدیم کے مشاعروں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مدراس میں دو سو سال پہلے بھی مشاعروں کا رواج تھا ۔ اس زمانے میں مشاعرے فارسی میں ہوا کرتے تھے جن سے عوام کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے ؟ ظاہر ہے اول تو فارسی بیرونی زبان تھی پھر اس کا ادبی ذوق عام فارسی دانوں میں بھی نہ تھا ۔ چہ جائیکہ فارسی سے نابلد عوام میں خاص خاص لوگ ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے تھے ۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح شاعر کی کامیابی کا مدار عوام کی پسند پر نہ تھا بلکہ شعرا کے کلام کے معیاری ہونے اور اس کی اچھائی اور برائی کو پرکھنے کے لئے دو حکم اور ایک صدر نامزد کئے جاتے جن کے فیصلے آج بھی اس دور کے ادبی شعور اور ذوق کے آئینہ دار ہیں ۔ جب دہلی میں میر اور سودا کا طوطی بول رہا تھا مدراس کے شعرا مثنوی کی طرف زیادہ مائل تھے اور غزل بہت کم کہتے تھے ۔ کیونکہ عوام کو مثنوی کے انداز سے کافی دلچسپی تھی جس کی بدولت مثنویاں غزل سے کہیں زیادہ مقبول تھیں ۔ اپنی پرانی روش کے بالکل برخلاف موجودہ دور میں غزل کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہے ۔ اگر غزل کے شعر اچھے ہوں تو داد کافی دی جاتی ہے اور اگر ساحرانہ ترنم میں پڑھی جائے تو سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے اور وہی کلام حاصل مشاعرہ کہلاتا ہے اور بار بار اسی شاعر کے کلام کی فرمائش کی جاتی ہے ۔ مجھے اردو سیمنار مدراس کے دو سالانہ مشاعروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مشاعرہ ہال کے باہر میں نے لوگوں کو پانچ پانچ روپے کے ٹکٹ کے لئے اصرار کرتے ہوئے دیکھا اور منتظمین کو افسوس ظاہر کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے "ہم مجبور ہیں اب ہال میں مطلق جگہ نہیں" ۔ اس مشاہدے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ہند و پاکستان کے کسی شہر میں اردو مشاعرے عوام میں اس درجہ مقبول نہ ہوں گے جس قدر کہ مدراس کے عوام میں مقبول ہیں اور یہ مقبولیت ان کے ذوق کی نشاندہی کرتی ہے ۔ عوام کو اس غیر معمولی دلچسپی اور ذوق و شوق کا لحاظ رکھتے ہوئے باہر کی جانب بھی لاوڈ اسپیکر نصب کر دئے جاتے ہیں تاکہ وہ کم از کم کلام سننے سے محروم نہ رہیں ۔ یہ تاثر تنہا میرا



نجم آفندی

چھوٹے بڑے

چھوٹا سا ایک بیج اگر ہے تو کیا ہُوا — کتنا بڑا درخت ہے اس میں چھپا ہُوا
دھرتی میں ڈال دیتا ہے جب وقت پر کسان — پھر دیکھنے کی ہوتی ہے اس بیج کی اُٹھان
سنسار جی رہا ہے اسی کام کاج سے — کتنوں کے پیٹ بھرتے ہیں اس کے اناج سے
چھوٹے سے تِل میں آنکھ کے اتنی بڑائی ہے — دریا ہوں یا پہاڑ ہوں سب کی سمائی ہے
پھولوں کا چاند اور ستاروں کا رنگ روپ — دو آنکھیں دیکھتی ہیں ہزاروں کا رنگ روپ
پھیلا ہے سارے گھر میں اُجالا چراغ ایک — گُن کتنے ہیں دماغ میں اور ہے دماغ ایک
مِل جُل کے ایک پانی کا دریا بہاتی ہیں — بوندیں ہیں چھوٹی چھوٹی جو ساگر بناتی ہیں
یہ میز پر تمھاری جو چھوٹی سی ہے کتاب — چھوٹی سی اس کتاب میں لاکھوں کا ہے حساب
چھوٹا سا دل ہے اس میں امنگیں بڑی بڑی — دل اور بڑھ گیا کوئی مشکل جو آپڑی

چھوٹی سی عمر میں جو ارادے رہے کڑے
دُنیا میں تم بھی کام کرو گے بڑے بڑے

دو مینڈک

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ جاپان میں دو مینڈک رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اوساکا شہر کے قریب ایک خندق میں رہتا تھا جبکہ دوسرے نے کیاٹو شہر کی صاف شفاف ندی کو اپنا گھر بنایا تھا۔ وہ اس قدر دُور دُور رہتے تھے کہ انھوں نے ایک دوسرے کی بابت سُنا تک نہیں تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بیک وقت ان دونوں کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ انھیں دُنیا کی سیر کرنی چاہیے۔ جو مینڈک کیاٹو میں رہتا تھا اس نے اوساکا جانے کا ارادہ کیا۔ اور جو اوساکا میں رہتا تھا اس نے کیاٹو جانے کے لئے کمر باندھی۔

پس ایک علی الصبح وہ سڑک پر چل پڑے جو کیاٹو سے اوساکا اور اوساکا سے کیاٹو جاتی تھی۔

سفر میں جو تکلیفیں درپیش آئیں ان کا انھیں بالکل اندازہ نہیں تھا کیونکہ بے چارے مینڈکوں نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ جب دونوں نے نصف نصف سفر طے کر لیا تو دیکھا کہ درمیان میں ایک پہاڑ آتا ہے جسے پار کرنا بہت مشکل ہے۔ جوں توں کر کے دونوں پھدکتے ہوئے چوٹی پر پہنچے اور اتفاق سے وہاں اکٹھے ہو گئے اور دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک منٹ چپ رہنے کے بعد بات چیت شروع ہو گئی اور دونوں نے سفر کا مقصد بیان کیا وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کا شہر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھیں کوئی خاص جلدی نہیں تھی اس لئے ایک ٹھنڈی اور خنک جگہ پر آرام کرنے بیٹھ گئے۔ کافی دیر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے وہ خوب جی بھر کر باتیں کرنا چاہتے تھے۔

"افسوس کی بات ہے کہ ہمارے قد بہت چھوٹے ہیں" اوساکا کے مینڈک نے کہا۔ "ورنہ ہم یہیں سے ایک دوسرے کا شہر دیکھ کر اندازہ لگاتے کہ وہاں جانے کی زحمت گوارا کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں۔"

"اوہ یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے"۔ کیاٹو کا مینڈک بولا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جائیں اور اس شہر کو دیکھیں جہاں ہمیں جانا ہے"۔

اوساکا کے مینڈک کو یہ تجویز اس قدر پسند آئی کہ وہ فوراً اچھل



کہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اپنے اگلے پنجے اپنے دوست کے کندھوں پر رکھ دئے۔

وہ یوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اوساکا کے بینڈک کا منہ کیاٹو کی طرف تھا اور کیاٹو کے بینڈک کا اوساکا کی طرف۔ مگر بے وقوف بینڈک یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سیدھے کھڑے ہونے سے ان کی آنکھیں سر کی پشت پر چلی گئی ہیں۔ ان کی ناک بے شک اس شہر کی طرف ہیں جہاں وہ جانا چاہتے ہیں لیکن دیکھ تو وہ اسی شہر کو رہے ہیں جہاں سے وہ آئے ہیں۔

"اے دوست! اوساکا کا بینڈک چلّایا۔ کیاٹو تو بالکل اوساکا جیسا ہے۔ جب اس میں کوئی نئی بات ہی نہیں تو اتنی دور جانے سے کیا فائدہ ہیں تو یہیں سے گھر لوٹ رہا ہوں"۔

"اگر مجھے بھی پہلے سے اس بات کا پتہ ہوتا کہ اوساکا بالکل کیاٹو جیسا ہے تو میں اتنی دور کبھی نہ آتا"۔ کیاٹو کے بینڈک نے مایوسی کے لہجے میں کہا اور اس نے اپنے ہاتھ دوست کے کندھوں پر سے اتار لئے اور دونوں پھر گھاس پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے گھر کی



طرف روانہ ہو گئے۔ ایک نے خندق میں اور دوسرے نے ندی میں عمر بسر کر دی اور انہیں زندگی بھر یہی یقین رہا کہ اوساکا اور کیاٹو میں کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں شہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

لطیفے

ایک مسخرہ ہر وقت اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا جب میں مرجاؤں تو مجھے کسی پرانی قبر میں دفن کرنا۔ ایک دن دوستوں نے پوچھا آخر تم پرانی قبر میں کیوں دفن ہونا چاہتے ہو؟ مسخرے نے جواب دیا کہ بھئی! جب منکر نکیر (قبر میں سوال کرنے والے فرشتے) آئیں گے اور یہ پرانی قبر دیکھیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اس قبر کے مُردے سے سوال جواب ہو چکے ہیں، اور اس طرح میں صاف بچ جاؤں گا۔

(۲)

مالک۔ کیوں ڈرائیور کیا بات ہے، موٹر چلاتے کیوں نہیں؟

ڈرائیور۔ حضور پٹرول ختم ہو گیا ہے۔

مالک۔ تو سامنے کے کنوئیں سے پانی لاکر ڈال دو۔

ڈرائیور۔ لیکن حضور موٹر پانی سے نہیں چلتی۔

مالک۔ بے وقوف ڈرائیور نئی موٹر ہے، اسے پانی اور پٹرول کا فرق کیا معلوم ہوگا۔

(۳)

باپ۔ (بیٹے سے) تم کو جھوٹ بولنے کی بہت بُری عادت ہے۔

بیٹا۔ ابا جان مجھے بڑے ہو کر وکیل بننا ہے، اس لئے ابھی سے جھوٹ بولنے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔

احمد جمال پاشا

مجاز صاحب

تم نے بچو مجاز صاحب کا نام ضرور سنا ہوگا۔ شاید تم نے انھیں دیکھا ہی ہو۔ ان کا پورا نام اسرار الحق۔ مجاز تخلص تھا لکھنؤ کے ہونے کی وجہ سے مجاز لکھنوی کہلاتے تھے۔ آج سے چھیالیس سال قبل یہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے ایک شریف اور باعزت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے امین آباد کالج سے ہائی اسکول سینٹ جانسن کالج آگرہ سے ایف اے اور مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ سے بی اے پاس کیا۔ شروع سے اچھے طالب علم اور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔ علی گڈھ سے ان کی شاعری شروع ہوئی۔ اور ایک دم سے سارے ہندوستان کی ادبی فضا پر یہ قوس قزح کی طرح چھا گئے۔

"اندھیری رات کا مسافر" "رات اور ریل"۔ "آوارہ" جیسی نظموں نے ہر طرف اُن کی دھوم مچادی۔ بی اے کرنے کے بعد مجاز لکھنؤ آگئے۔ یہاں اُنھوں نے ایک پرچہ "نیا ادب" نکالا۔ اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد سب چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو کے پرچے "آواز" کی ادارت کرنے لگے۔ ان پر دماغی حملہ ہوا، مگر جلد ہی ٹھیک ہوگئے۔ پھر دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں ملازم ہوگئے۔ مگر جلد یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔

ان کا دیوان "آہنگ" مختلف ناموں سے بار بار چھپا۔ بڑے ہوکر بچو تم بھی اُس کو پڑھوگے۔

بچو شراب بڑی خراب چیز ہے۔ مجاز صاحب کے بُرے دوستوں نے اس کی عادت اُن کو ڈلوادی، اُن کی تندرستی خراب ہونے لگی، اُن کے یہی خراب دوست اُن کو شراب پلانے لے گئے۔ پھر وہ جو واپس نہیں آئے۔ وہ شراب پی کر بے ہوش ہوگئے، اور ساری رات کھلی چھت پر پڑے رہے۔ تم جانو جاڑوں کی لمبی اور ٹھنڈی رات! وہ ساری رات اور آدھے سے زیادہ دن وہاں اسی عالم میں رہے، پھر کسی کی نظر پڑ گئی۔ فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ مگر شراب اپنا کام کر چکی تھی۔ اُن کے دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں، اور فالج اور نمونیہ کا بھی اثر تھا۔ گھر والوں کو خبر ہوئی۔ پھر یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ بہت بڑی تعداد میں بچے بوڑھے جوان ہسپتال کے اُس کمرے کے گرد جمع ہوگئے، جہاں اُن کا محبوب شاعر دم توڑ رہا تھا۔ سب رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی کش مکش کے بعد عظیم شاعر نے اپنے کو موت کے حوالے کر دیا۔

دوسرے دن بازار اور تعلیمی ادارے بند رہے۔ سب نے مل کر اُن کو اپنے ہاتھوں منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا۔

بچو مجاز صاحب ہر ایک کے دوست تھے۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ بہترین ساتھی اور دلچسپ انسان تھے۔ ایسے اچھے لوگ کم ہوا کرتے ہیں۔ میں آپ کو اُن کی کچھ اچھی باتیں بتلاؤں گا۔ تاکہ آپ کے ننھے منے معصوم دلوں میں اُن کی یاد ہمیشہ تازہ رہے۔ اور جب آپ کے اُداس دل اُن کو یاد کریں تو آپ گلاب کے پھول کی طرح کھِل جائیں۔

ایک مرتبہ اُن کے کسی دوست نے کہا "میں نے جس کو بزنس کرادی لکھ پتی بنا دیا"

مجاز صاحب نے جواب دیا "جی ہاں آپ نے بہت سے کروڑ پتیوں کو لکھ پتی بنا دیا!"

ایک مرتبہ ہزار لکھنوی سے مجاز مرحوم (افسوس آج اُن کو مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے) نے کہا۔

ہزار صاحب! آپ نے شاعری میں بھی آخر کنجوسی کی حد کر دی۔"
ہزار صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا: "آئیں میں اور کنجوسی، آخر کس طرح؟
بولے: "ارے بھائی لاکھ نہ دس لاکھ صرف ہزار۔"

کسی کے یہاں چوری ہو گئی، مجاز صاحب اُس کو بہت دُور الگ بُلا کر لے گئے، اور چپکے سے کان میں کہا ——

"بھائی ہو نہ ہو مجھے تو یہ کسی چور کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔"
اس طرح اُن کی ہر بات ایک لطیفہ ہوا کرتی تھی، اور الفاظ اُن کے مُنھ سے ایسے نکلا کرتے تھے جیسے پھُول جھڑتے ہوں لیکن بچّو! مجاز صاحب اب ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں اور اب وہ کبھی لوٹ کر واپس نہ آئیں گے۔ لیکن تمھارے معصوم دلوں میں جب بھی اُن کی یاد آئے گی تو وہ گُلاب کے پھُول کی طرح کھِل اٹھیں گے۔

الطاف حسین

معلومات

سب سے بڑا شہر لندن ہے۔
سب سے بڑا برّاعظم ایشیا ہے۔
سب سے بڑا ملک برازیل ہے۔
سب سے بڑا پُل سان فرانسسکو امریکہ میں ساڑھے آٹھ میل لمبا ہے۔
سب سے بڑا صحرا افریقہ میں صحرائے اعظم ہے۔
سب سے بڑا گھنٹہ ماسکو میں ہے، جس کا وزن دو سو ٹن اور قطر ۲۱ فٹ ہے۔
سب سے بڑا گنبد (۱۴۴ فٹ) گول گنبد بیجاپور حیدرآباد میں ہے۔
سب سے بڑی لائبریری لینن گراڈ کی ہے۔
سب سے بڑی گھڑی گول گیٹ بلڈنگ (امریکہ) کی ہے۔
سب سے بڑی عمارت اہرام مصری ہے۔
سب سے بڑی محراب آسٹریلیا میں بندرگاہ سڈنی کے پُل کی ہے،

دنیا کی وہ چند چھوٹی چیزیں جو اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔
سب سے چھوٹا اخبار میکسیکو (امریکہ) سے نکلتا ہے، جو صرف چار انچ کاغذ پر چھپتا ہے۔
ہالینڈ کی ایک عورت کا قد صرف بیس ۲۰ انچ اور عمر چھبیس ۲۶ سال ہے۔
ساؤتھ کنگسٹن کے عجائب خانے میں ایک کتّا ہے جس کا وزن ۲½ چھٹانک ہے۔
دنیا کا سب سے چھوٹا جزیرہ ایک چٹان پر واقع ہے، جہاں جہازوں کے لئے روشنی کا مینار بنا ہوا ہے۔
دنیا کی سب سے چھوٹی اور نفیس تصویر گندم کے ایک دانے پر ہے جس پر ایک چکّی کی تصویر ہے، اور چکّی والا اپنی کمر پر اناج کی بوری اٹھائے سیڑھی پر چڑھ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی چھکڑا کھڑا ہے۔ تصویر کی ہر چیز صاف نظر آتی ہے۔
سب سے چھوٹی جنگ ۱۸۹۶ء میں برطانیہ اور زنجبار کے درمیان ہوئی، جو صرف چالیس ۴۰ منٹ تک رہی۔
سب سے چھوٹا جزیرہ نما ملایا کا ایک سکّہ ہے، جو ایک بندی کے برابر ہے۔

ایس گلفام

جانوروں کی کانفرنس



منظر: - سندربن کے جنگل میں شاہ شیر کی صدارت میں ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے - جس میں انسانوں کے بین الاقوامی حالات پر غور کیا جا رہا ہے -

پارٹ: -

شیر - مابدولت اس عظیم الشان کانفرنس کا بخوشی افتتاح فرماتے ہیں -

ہُدہُد - جہاں پناہ کا اقبال تاقیامت قائم رہے کیا یہ غلام ایجنڈا پیش کرے ؟

شیر - اجازت ہے - ایجنڈا پیش کیا جائے -

ہُدہُد - ایجنڈا یہ ہے کہ اس کانفرنس میں انسانی دنیا کے بین الاقوامی حالات پر غور کیا جائے -

گدھا - ہمیں انسانی دنیا سے بھلا کیا مطلب -

شیر - چپ مردود - تو واقعی گدھا ہے -

چیتا - انسان ہم پر وحشی ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم جاہل، بے عقل اور خونخوار ہیں - لیکن واقعہ یہ کہ ہم نہیں انسان ہی وحشی اور خونخوار ہیں -

لومڑی - یہ انسان خود تو ایک دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے ہمجنس انسان کا خون بہاتا ہے ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنواتا ہے - بھلا کہیں یہ بھی سُنا گیا ہے کہ ایک ہاتھی نے ہاتھی کو یا طوطے نے طوطے کو مارا یا کھایا ہو -

شیر - ہرگز نہیں - خدا نہ کرے ایسا ہو -

لومڑی - لیکن یہ انسان اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ جن سے یہ دوستی کے معاہدے کر چکتے ہیں - خونریز جنگیں لڑتا ہے اور ان کو مار کر اپنی فتح پر خوش ہوتا ہے -

بھیڑیا - افسوس ہے ایسے انسانوں پر جو دوسروں کو مار کر خوش ہوں -

ریچھ - صاحب صدر یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم میں سے ہر جانور ایک دوسرے پر کھانے کی غرض سے حملہ کرتا ہے یا اپنی حفاظت کے لئے اس کو مارتا اور پیٹ بھرنے کے بعد اس کے آگے سے جانوروں کی ڈاریں کی ڈاریں نکل جاتی ہیں تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا -

شیر - بے شک - بے شک

ریچھ - لیکن یہ انسان محض سیر و تفریح کے لئے ہزاروں بیگناہوں کا خون کرتا ہے - اور اس شریف فن کا نام اس نے سیر و شکار رکھا ہے -

بندر - قربان جائیے اس سیر و شکار کے - بات یہ ہے کہ اس کی

طبیعت ہیں ہی خونخواری ہے - جب یہ انسان ۵ یا ۶ برس کا بچہ ہوتا ہے تو ایک خوبصورت پھول کو توڑتا ہے اور بلا وجہ اس کی پتیاں نوچ کر ہوا میں اُڑا دیتا ہے - جب ذرا بڑا ہوتا ہے - تو معصوم پرندوں کے انڈے توڑتا اور ان کے بچوں کو تڑپا تڑپا کر مار دیتا ہے - اور جب جوان ہوتا ہے تو جنگل سے بے گناہ جانوروں کا شکار کرتا ہے اور ان کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر اپنے کمروں کو سجاتا ہے اور اسے وہ اپنے مکان کی زیب و زینت کہتا ہے - یہ ہے اس انسان کی انسانیت -

چوہا - حضرات! آپ نے کہیں بھی دیکھا یا سُنا ہے کہ ہاتھی کا غلام ہاتھی - چیتے کا نوکر چیتا اور لومڑی کی باندی لومڑی ہو؟

شیر - یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو بالکل فطرت کے خلاف ہے -

چوہا - لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ انسان دوسرے انسانوں کو غلام بناتا ہے - ان کو بیچتا اور خریدتا ہے اور ان پر طرح طرح سے حکومت کرتا ہے -

گھوڑا - انسانی منطق غلط ہے ان کی ہر حکومت دوسری حکومت کے مقبوضات چھیننا چاہتی ہے - اگر یہ منطق مان لی جائے تو سانپ کا بھی یہ حق تسلیم کرنا پڑے گا - کہ وہ جس جانور کے بل پر چاہے قبضہ کرلے -

سانپ - مگر ......؟

شیر - نالائق - کمینہ - یہ یقیناً انسانی نسل سے ہے -

سانپ - غُصّہ نہ ہوں - بندر بھی انسان ہی کی ایک قسم ہے -

بندر - جُھوٹ - حضور بالکل جھوٹ - ہم ہرگز انسانی نسل سے نہیں - ہاں میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم بندر انسانی نسل سے ترقّی کرکے مہذّب اور شریف مخلوق بن گئے ہیں -

(تُرنر و رٹالیساں)

مُرغ - حاضرین! ان انسانوں کی ہر بات انوکھی ہے - جوں جوں وہ کسی انسان کو دباتا ہے اس کا غُصّہ اور انتقام بڑھتا ہے - اور پشت در پشت بدلہ لیتے ہیں اور ان کی یہ عداوت موروثی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے ہیں - بھلا کہیں جانوروں میں بھی ایسی عداوت سُنی گئی ہے -

شیر - کبھی نہیں - یہ عجیب بات ہے کہ ایک انسان دوسرے سے لڑے اور لڑ کر فیصلہ کرلے تو پھر بھی یہ عداوت سالہا سال تک خاندانوں میں جاری رہے اور برابر ایک دوسرے سے انتقام لیتے رہیں - ان انسانوں پر خدا کی مار ان رحم دل انسانوں سے تو ہم بے عقل جانور ہی اچھے ان کی انسانیت انھیں مُبارک ہو - ووٹ لئے جائیں کہ انسان وحشی ہیں یا ہم -



ہُدہُد - انسان قطعی وحشی ہیں -

شیر : حاضرین میں سے کون ہے جو انسان کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے -

بلّی - میں ہوں - کیوں کہ میں ہر جگہ - ہر گھر اور ہر .....؟

چوہا۔ بجا ارشاد ہے۔ ہر باورچی خانے میں اور ہر قصاب کی دوکان پر
بلّی۔ (غصّہ سے) میاؤں۔
چوہا۔ خدا خیر کرے۔
شیر۔ (بلّی سے) بے شک تو آدمیوں سے خبردار ہے لیکن تو بے ایمان ہے۔ اچھا کوئی اور بولے۔
گدھا۔ میں بتاؤں؟
شیر۔ مگر تو گدھا ہے۔
گدھا۔ تو پھر؟
مُرغ۔ یعنی یہ کہ تو آدمی کا اتنا ہی حال جانتا ہے کہ وہ تجھ پر بوجھ لادتے ہیں اور تجھے مارتے ہیں تو بھی ویسا ہی احمق ہے۔
ہُدہُد۔ جناب صدر کا فرمان ہے کہ ہم سے وہ بولے جو انسانوں کے حالات سے واقف ہو۔ لیکن بلّی کو بولنے کی اجازت نہیں ہے
بلّی۔ لیکن میں تو عابد و زاہد ہوں۔
مکّھی۔ آدمیوں کے حالات عجیب ہیں جو محنت کرتا ہے وہ بھوکا اور جو کچھ نہیں کرتا وہ مزے اڑاتا ہے۔
شیر۔ عجیب بات ہے۔
کتّا۔ اعلیٰ حضرت اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں۔ انسانوں کا یہی دستور ہے۔
(سب مل کر) اس پر انسانوں کا دعوےٰ ہے کہ ہم رحم دل ہیں اور سب میں عقلمند اور افضل ہیں۔

لطیفہ

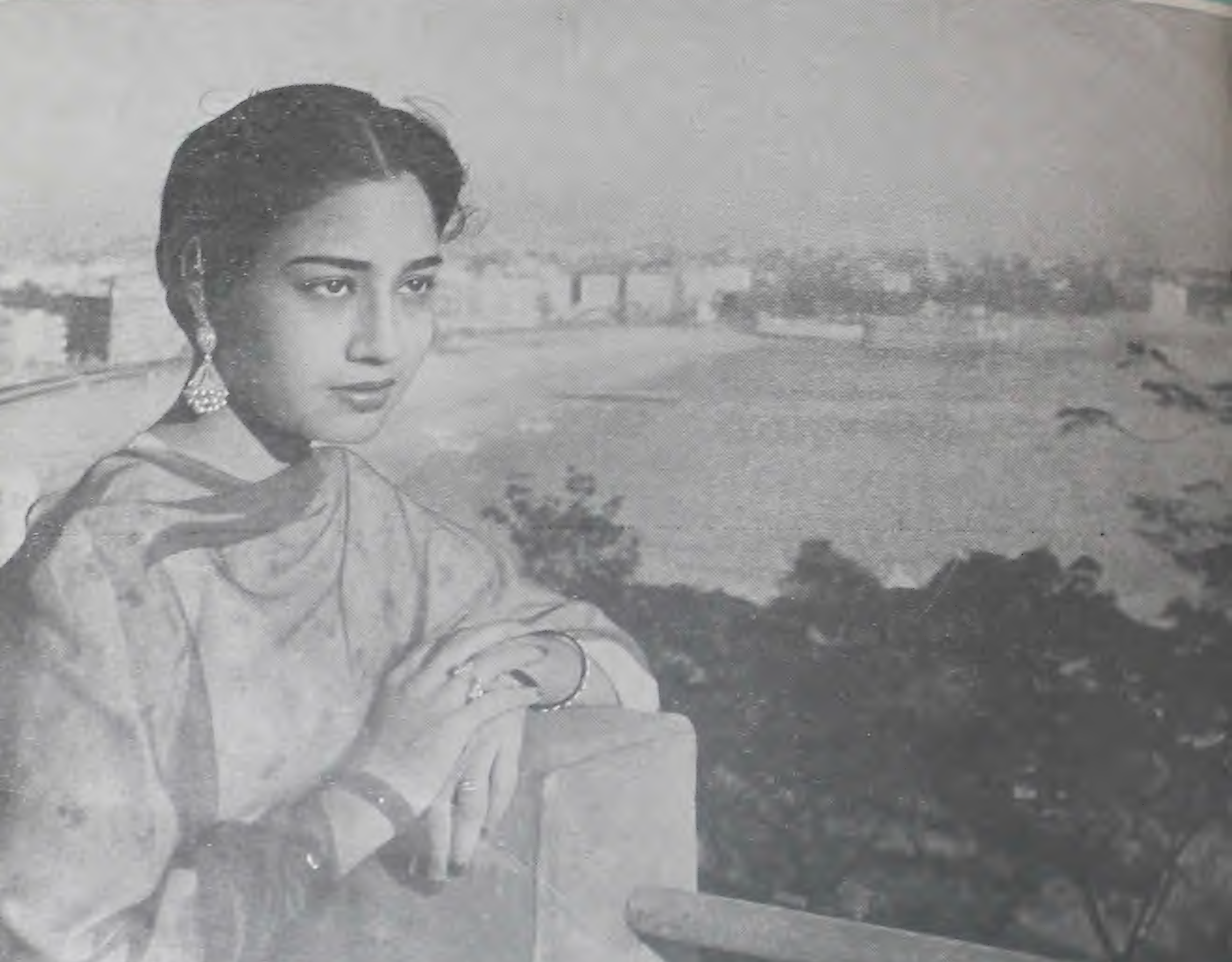
ماں۔ (بیٹے سے) بیٹے "گندہ پانی نہ پیو"۔
بیٹا۔ امّی۔ میں اسے صابن سے دھو کر پیتا ہوں۔

اقوالِ زرّیں

(۱) انسان کو جو بُری عادت پڑ جاتی ہے وہ پوری سزا بھگتے بغیر نہیں جاتی۔
(۲) آوارہ مزاج اور اوباش دوستوں سے بچو کہ یہ کسی کو گھر گھاٹ کا نہیں چھوڑتے۔
(۳) شریر انسان بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی عادت کی مجبوری سے دوسروں کو ستاتے ہیں۔
(۴) انسان کو عمل کی پاداش سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔
(۵) لڑکے اور لڑکیاں گلستانِ محبّت کے وہ خوشنما پھول ہیں جنھیں دیکھ کر والدین کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔
(۶) بنی نوع انسان کو تکلیف دے کر حاصل کی ہوئی خوشی آخر کار مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔
(۷) بعض لوگ نیک باتوں پر عمل تو کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے مفہوم کو نہیں سمجھتے
(۸) حُسنِ معاملہ کی برکت سے دُنیا بہشت بن سکتی ہے۔
(۹) سچّی عبادت سے اطمینانِ قلب پیدا ہوتا ہے۔
(۱۰) تم ہمیشہ ایک دوسرے کی بھلائی کا خیال رکھو اور بُرائی سے پرہیز کرو۔
(۱۱) بیمار ہمسایہ کی تیمارداری کرنا تمہارا فرض ہے۔
(۱۲) محلّے کی بیکس عورتوں کو وقتاً فوقتاً بازار سے سودا سلف لا دیا کرو۔
(۱۳) غیور انسان کی غیرت امداد کی ذلّت گوارا نہیں کرتی۔

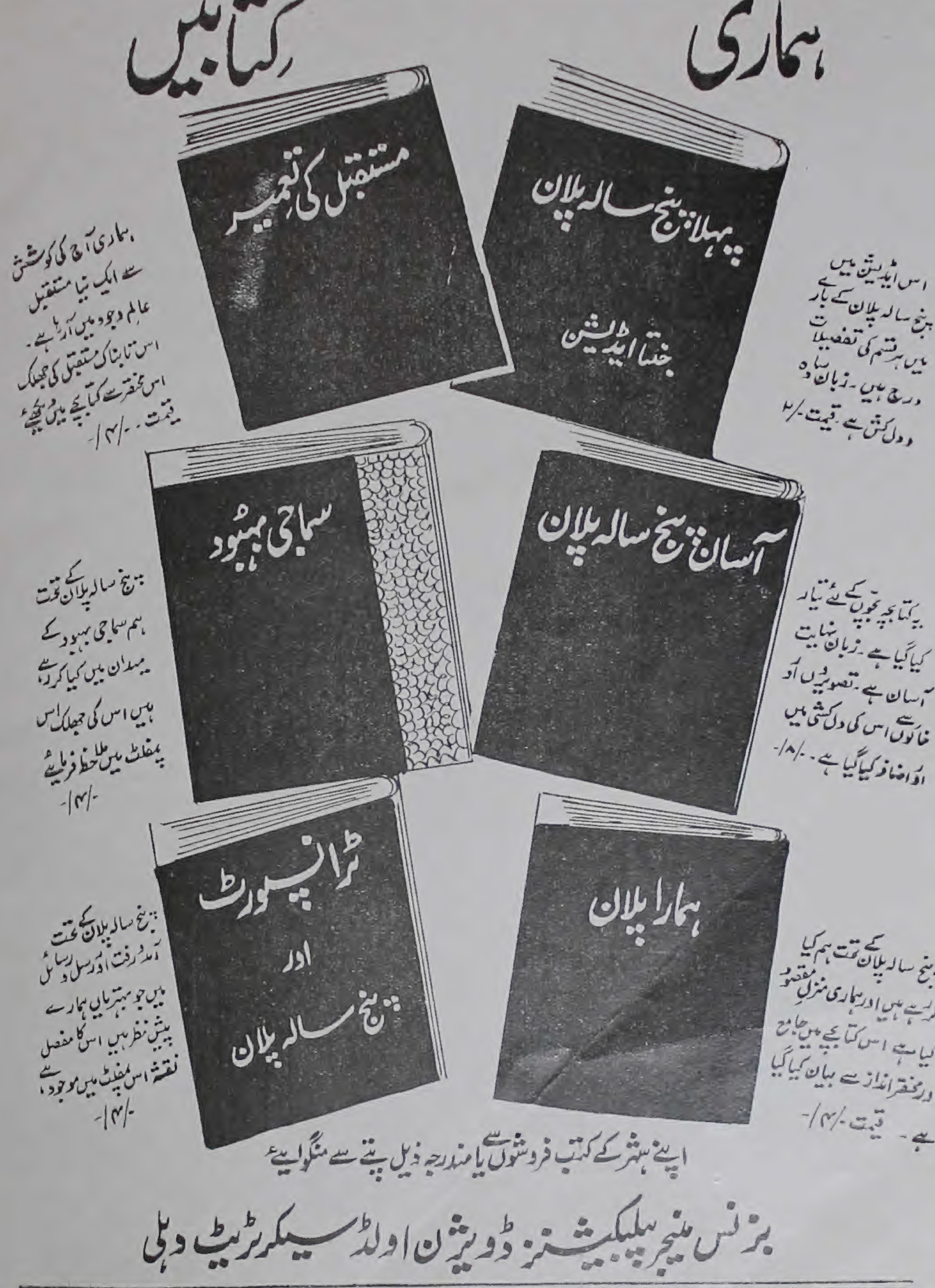
Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

آج کل



مارچ ۱۹۵۶ء

آٹھ آنے


ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
خستہ ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دل کش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے قیمت ۔ -/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دل کشی میں اور اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظہ فرمایئے -/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمد و رفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیش نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے -/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوایئے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

ترتیب

بچوں کا آج کل

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ ——— نمبر ۸

سالانہ چندہ: ——— ہندوستان میں: - چھ روپے
پاکستان میں: - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے: ——— نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ: ——— ہندوستان میں: - آٹھ آنے
پاکستان میں: - آٹھ آنے (پاک)

مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

فراق گورکھپوری

غزل

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں جی بھر آئے تو اشک بہائیں
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اے دل رو رو کے سو جائیں

جانے والا گھر جائے گا کاش یہ پہلے سوچا ہوتا
ہم تو منتظر اس کے تھے بس کب ملنے کی گھڑیاں آئیں

الگ الگ بہتی رہتی ہے ہر پرانی کی جیون دھارا
دیکھ ملیں کب آج کے بچھڑے سے ادا بڑھ کے تیری بلائیں

سنتے ہیں کچھ رو لینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے
شاید تھوڑی دیر برس کر چھٹ جائیں کچھ غم کی گھٹائیں

اپنے دل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حسن بھی ہے جس کی پرچھائیں آج وہ من کی جوت جگائیں

سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
اے دلِ غمگیں تیری کہانی کون سُنے گا کس کو سنائیں

جسمِ نازنیں میں سر تا پا بزم نور میں لہرائی ہوئی سی
تیرے آتے ہی بزمِ ناز میں جیسے کئی شمعیں جل جائیں

ہاں ہاں تجھ کو دیکھ رہا ہوں کیا جلوہ ہے کیا پردہ ہے
دل دے نظارے کی گواہی اور یہ آنکھیں قسمیں کھائیں

لفظوں میں چہرے نظر آئیں گے چشمِ بینا کی ہے شرط
کئی زاویوں سے خلقت کو شعر مرے آئینہ دکھائیں

مجھ کو گناہ و ثواب سے مطلب؟ لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ مجھے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں

چھوڑ وفا و جفا کی بحثیں اپنے کو پہچان اے عشق
غور سے دیکھو تو سب دھوکا ہے کیسی وفائیں کیسی جفائیں

حسن ہے ایک دُرِ ناسفتہ یا اک بے سونگھا ہوا پھول
ہوش فرشتوں کے بھی اُڑا دیں تیری یہ دوشیزہ ادائیں

باتیں اُس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پہ یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

ساقی اپنا غم خانہ بھی مے خانہ بن جاتا ہے
مستِ مے غم ہو کر جب ہم آنکھوں کے ساغر چھلکائیں

اہلِ مسافت ایک رات کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے
کوچ کرو تو صدا دے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں

ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں
صبح کے ست رنگے جھرمٹ سے جب وہ انگلیاں مجھے بلائیں

ایک غزالِ رم خوردہ کا منہ پھیرے ایسے میں گزرنا
جب مہکی ہوتی ٹھنڈی ہوائیں دن ڈوبے آنکھیں جھپکائیں

دیں گے ثبوتِ عالی ظرفی ہم میکش سرِ میخانہ
ساقی چشمِ سیہ کی باتیں زہر بھی ہوں تو ہم پی جائیں

موزوں کر کے سچے جذبے منڈی منڈی بیچ رہے ہیں
ہم بھی خریدیں جو یہ سخنور اک دن ایسی غزل کہہ لائیں

رات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے، دیپ بجھے، ہم بھی سو جائیں

ممتاز حسین

منشی پریم چند بہ حیثیت ناول نگار

اگر ایک طرف یہ بات صحیح ہے کہ آرٹسٹ پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ بنتا بھی ہے۔ اپنے ماحول، اپنے کسب اور اپنی ریاضت سے۔ اس تلخ حقیقت کا اعتراف چیخوف ایسے بڑے فن کار نے بھی کیا ہے، جس کی فطری صلاحیت میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جو کچھ کہ ٹالسٹائی اور ترگنیف کو فطرت سے عطیے کے طور پر ملا تھا مجھے وہ چیزیں اپنی زندگی میں حاصل کرنی پڑیں"۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس کا اشارہ صلاحیت کی طرف نہیں ہے بلکہ اس کلچر کی طرف ہے جس سے ایک انسان کے دل و دماغ، جذبات اور احساسات کی تربیت ہوتی ہے۔ وہ آرٹ کے میڈیم اور مذاقِ سخن سے آشنا ہوتا ہے۔ اس میں وہ حلم، وہ دردمندی پیدا ہوتی ہے جو بجز انسانی رشتوں کے کسی اور رشتے کو انسانوں کے درمیان قبول نہیں کرتی۔ جس طرح چیخوف نے اس کلچر تک پہونچنے میں اپنے پس ماندہ ماحول یعنی غلامی کے خون کو قطرہ قطرہ کر کے اپنے جسم سے نچوڑا۔ اسی طرح منشی پریم چند کو بھی اس کلچر کے حاصل کرنے میں نہ صرف ناقابل بیان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اپنی نچلے متوسط طبقے کی نفسیات کو بھی دھونا پڑا۔ انھیں اپنے کو آرٹسٹ بنانے میں اپنے کو ایک انسان بھی بنانا پڑا ہے۔ ہندوستانی معاشرت کے کلچر میں ایک طویل زمانے سے جاگیردارانہ عہد میں رہنے کے باعث جن اقدار پر زور دیا جاتا رہا ہے وہ بالعموم داخلی رہی ہیں نہ کہ خارجی۔ اس کلچر میں سائنس کی اہمیت کم، اخلاقیات کی زیادہ رہی ہے۔ منشی پریم چند اپنے اس کلچر سے متاثر رہے ہیں۔ وہ چیخوف کی طرح یہ نہیں کہہ سکے کہ "ایک بجلی گھر کا کھلنا انسانیت کے حق میں اس سے کہیں زیادہ مفید ہے کہ دنیا کی ساری جنتا گوشت ترک کر کے ترکاری پر زندہ رہے"۔ وہ عصمت، وفا، خلوص، ایثار، قربانی، محبت، اخوت، عالمگیر انسانی برادری اور عالمی امن پر ہی زور دینا کلچر کی اعلیٰ قدریں سمجھتے تھے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سائنس اور مشین کے مخالف تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے ان کے ناولوں میں ان چیزوں سے پریم بھی نظر نہیں آیا ہے حالانکہ تعلیم کا پریم بہت زیادہ ملتا ہے۔ بہرحال اس بات کو ابھارنے کا مقصد یہ ہے کہ دھن وادی نظام نے انھیں جس کلچر سے محروم رکھا اور جس کے حاصل کرنے اور اپنی زندگی میں برتنے میں انھیں اتنی ہمتوں سے کام لینا پڑا۔ وہ اُسے پونجی والوں کے غاصبانہ قبضے سے نکال کر عام جنتا تک پہونچانے کے حامی تھے، جس کی محنت کا وہ ثمر ہے تاکہ وہ اس سے اس طرح فائدہ اٹھائیں جس طرح کہ وہ روشنی ہوا اور پانی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ منشی پریم چند کا آرٹ انھیں معنوں میں مبلغانہ ہے۔ یوں تو اس بات کا گیان منشی پریم چند سے بہت پہلے جاگیردارانہ عہد میں بھگت کویوں اور صوفی شعراء کو بھی ہوا تھا لیکن چونکہ ہر دور کی حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ اس کا تضاد، اس کا سجھاؤ اور اس کے آگے بڑھنے کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر دور کے آرٹ میں بڑے فن کاروں کا آدرش بھی مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ کبیر کے آرٹ میں اخوت و مساوات کا اتنا ہی شدید اور انقلابی جذبہ ہے جتنا پریم چند کے آرٹ کے یہاں ہے۔ لیکن دونوں ہی اپنے آرٹ میں مختلف سجھاؤ اور مختلف راستوں کا پرچار کرتے ہیں۔ گو آئیڈیل نہ صرف انھیں کا بلکہ دنیا کے سارے ہی انسان دوست فن کاروں کا ایک ہی ہے۔ اگر کبیر حقیقت کے ادراک پر زور دیتے ہیں تو منشی پریم چند زندگی کے عمل پر۔ ایسا کیوں ہے کہ ہندوستانی سماج کے آرٹ میں عمل کا نتیجہ خواہ وہ انقلابی ہو یا اصلاحی، انگریزوں کی عملداری سے پہلے کے زمانے میں نہیں ملتا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس پر بحث کی جائے لیکن یہ اشارہ بے معنی نہیں رہے گا کہ یورپ میں بھی عمل پر زور صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی کے آرٹ میں دیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ جب ایک بار انسان

کے شعوری عمل کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو چکا ہے تو پھر اسے منظّم اور اجتماعی عمل کے مستقبل میں زیادہ یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی انقلاب نے یہ بات عام کر دی کہ عمل کا میدان رزق حاصل کرنے کی انفرادی جدو جہد تک محدود نہیں ہے اور نہ پیٹ کاٹ کر پونجی ہی جمع کرنے اور اپنے بیوپار کے بڑھانے تک محدود ہے بلکہ عمل کی ایک جماعتی صورت بھی ہے جس سے سماجی رشتوں اور سماجی اداروں کو بدلا جا سکتا ہے، نئے آئین اور نئی زندگی کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے کے زمانے سے سماجی سدھار کی جو تحریکیں چلیں اُن کے پیچھے اسی فرانسیسی انقلاب کے عمل اور خیال دونوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی عملداری نے ولایتی صنعت کی ترقّی کے نقطۂ نگاہ سے اس طبقے کو تقریباً موت ہی کے گھاٹ اُتار دیا تھا جو یہاں کی معاشرت میں ولایتی سرمایہ داروں کا حریف بن سکتا اور جو اس انقلاب کی سیاسی رہنمائی بھی کر سکتا۔ اس لئے سماجی سدھار کی تحریک اس وقت تک یہاں سیاسی روپ اختیار نہ کر سکی جبکہ اس تحریک کی رہنمائی روشن خیال راجگان، تعلقہ داران اور رؤسا کے ہاتھ سے نکل کر اس ملکی بورژوا طبقے کے ہاتھ میں نہ پہونچی جو بدیسی سرمایے کی ضرورت سے اس کی رفاقت میں اور محتاجی کے عالم میں اُبھرا اور جس نے یہاں کے متوسط طبقے کو روزگار کے ذرائع مہیا کر کے زیادہ مضبوط کیا۔ جو زمانہ اس طبقے کے پیدا ہونے کا تھا وہی زمانہ کم و بیش منشی پریم چند کے بھی پیدا ہونے کا تھا۔ یعنی اگر کانگریس کی بنیاد سنہ ۱۸۸۵ء میں پڑی تو منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور اس وقت اپنی ادبی زندگی کے سفر کا آغاز کیا جبکہ ۱۹۰۵ء میں ایشیا کی ایک نئی اُبھرتی ہوئی طاقت یعنی جاپان نے مغرب کی ایک بہت بڑی سامراجی طاقت یعنی روسی زارشاہی کو شکست دی۔ اس سے سارے مشرق کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ مغرب کی سرمایہ دارانہ امپریلزم کوئی نہ ٹلنے والی حقیقت نہیں ہے اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، اگر ہم مغرب کی سائنس سے استفادہ کریں اور اپنے اندر بھی نیشنلزم کا جذبہ پیدا کریں۔ ہندوستان میں نیشنلزم کی تحریک صحیح معنوں میں اسی زمانے سے اُبھرتی ہے جسے بنگال کی تقسیم نے اور زیادہ ہوا دے دی۔ منشی پریم چند نے اپنے ابتدائی زمانے کی کہانیوں میں بالعموم اس نیشنلزم اور حب الوطنی کے جذبے کو اُبھارا ہے اور ناولوں میں بالخصوص (ریفارمیشن) قومی اصلاح کی تحریک کی آئینہ داری اور پیشوائی دونوں ہی

کی ہیں۔ ایسا تقریباً ناگزیر تھا کیونکہ جب تک روس کے مزدوروں نے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ایک بہت بڑے ملک سے سرمایہ داری کو ہمیشہ کے لئے نہیں ختم کر دیا اور اشتراکیت کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا شروع نہیں کیا۔ مشرق کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا نہیں تھا کہ وہ مغرب کی امپریلزم سے نجات حاصل کرنے کے لئے سرمایہ داری کے راستے پر چلنا ضروری نہ سمجھے۔ چنانچہ اگر آپ راجہ رام موہن رائے اور عارف جنگ سر سید احمدؐ خاں کے زمانے کے خیالات پر غور کریں یا راجہ رابندرناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال کی سوچ کا مقابلہ انھیں کے خیالات سے جنگِ عظیم کے بعد کی سوچ سے کریں تو اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ سن ۱۹۱۷ء سے پہلے اُن میں سے کسی نے بھی سرمایہ داری کو مشرق کے لئے مسترد نہیں کیا ہے بلکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے انیسویں صدی کے روشن خیال رؤسا اور روشن خیال متوسط طبقہ دونوں ہی مشرق کے جاگیردارانہ نظام اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا کچھ ایسا امتزاج چاہتا تھا جس میں دونوں نظاموں کی اچھی قدریں محفوظ کی جا سکیں۔ لیکن جب جنگِ عظیم میں مغرب کی ہیبت کا پول کھل گیا اور اس کی بنیاد انہی کھوکھلی نظر آئی کہ فرانسیسی انقلاب کے ڈیڑھ سو سال ہی کے بعد مزدوروں نے اسے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصّے سے منسوخ کر دیا اور پیچھے لوٹنے کی بجائے آگے اشتراکی نظام کی طرف قدم اُٹھایا تو ہندوستان کے فن کاروں نے بھی سرمایہ داری کے حل کو یہاں کی معاشرت میں ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصال سے نکلنے کے لئے سرمایہ دارانہ استحصال کو قبول کرنا کسی بھی بڑے آرٹسٹ کے لئے ہمیشہ ناقابل قبول رہا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ یورپ میں اس وقت بھی جبکہ سرمایہ داری ایک بڑھتی ہوئی قوت رہی ہے یعنی نشاۃ ثانیہ کے دور میں اور اُس وقت بھی جبکہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں تھی یعنی انیسویں صدی میں وہاں کے تقریباً تمام بڑے فن کاروں ہی نے سرمایہ دارانہ استحصال کی مخالفت کی۔ غلامی کے عہد سے لے کر جبکہ کموڈٹی پروڈکشن نے سرمایہ داری کا بیج بویا۔ سرمایہ دارانہ نظام تک جبکہ وہ اپنے عروج پر پہنچی دنیا کے تمام ہی عظیم المرتبت فن کار اس کے ردِّ عمل میں ایک ایسی معاشرت کا خواب دیکھتے آئے ہیں جو زر کی اقتصادیات، غلامی اور استحصال کے رشتوں سے پاک ہو۔ ان کی آئیڈیولوجی، خواہ وہ ایپی کورس اور ڈیمو کریٹس کے مادّی فلسفے کی حامل ہو یا Stoics کے اخلاقی فلسفے کی یا Mysticism شرتیہ، تصوف اور بھگتی یا اٹوپین

نہی ہو غلامی اور استحصال کی حمایت نہیں کرتی ہے - ان کی آئیڈیولوجی یا تو منفی رہی ہے یا اٹوپین - منشی پریم چند بھی انھیں ائیڈیلیسٹ فن کاروں کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جو عہدِ غلامی سے لے کر سرمایہ دارانہ عہد تک اشتراکیت کے خواب دیکھتے آئے ہیں - اشتراکیت کا خواب انسان نے اسی وقت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جب سے اس کا سماج ظالم اور مظلوم کے طبقات میں تقسیم ہو گیا تھا اور کموڈیٹی پروڈکشن کی بنیاد پڑ گئی تھی -

منشی پریم چند نے بھی سرمایہ داری اور مہاجنی تہذیب کو رد کر کے اشتراکیت کا خواب دیکھا - لیکن اس کی طرف وہ اس زمانے میں متوجہ ہوئے جبکہ دنیا کے مزدوروں کی رفاقت سے سوویٹ روس کے مزدوروں نے دنیا کے آئیڈیلیسٹ فن کاروں اور مفکروں کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا - کیا منشی پریم چند، کیا رابندرناتھ ٹیگور اور کیا ڈاکٹر سر محمد اقبال ان تینوں ہی نے مزدوروں کے اس عظیم عمل کو سلامی دی اور اس کا خیر مقدم کیا - لیکن اس عظیم عمل کے پیچھے جو علم، جو شعور، اشتراکیت کی جو سائنس تھی اسے قبول نہیں کیا - انھوں نے اس ضرورت کو تو محسوس کیا کہ سماج کو سرمایہ دارانہ استحصال کے رشتوں سے آزاد ہونا چاہیئے - اسے اونچ نیچ اور طبقات کے امتیازات سے پاک ہونا چاہیئے لیکن اس آئیڈیولوجی کو قبول نہیں کیا جس کے عام رہنمائی کے اصولوں کو روس کے حالات پر منطبق کر کے سوویٹ روس کے مزدوروں نے وہاں غیر طبقاتی سماج کی بنیاد ڈالی - اس کے برخلاف انھوں نے اپنی اپنی غیر مارکسی آئیڈیولوجی میں کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جس سے غلامی اور استحصال کی حمایت نہ ہو سکے - یعنی اسے زیادہ سے زیادہ انسانیت نواز بنایا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی آئیڈیولوجی غیر مارکسی ہوتے ہوئے بھی انسان دوستی کی آئیڈیولوجی تھی اور سرمایہ داری کی سخت دشمن تھی - اگر منشی پریم چند کے یہاں قدیم ہندوستان کے دیہی جمہوریہ کی اٹوپین اور اخلاقی ائیڈیولوجی تھی، علامہ اقبال کے یہاں ابتدائے اسلام کے عربوں کی قبائلی جمہوریہ کی اٹوپین اور مذہبی آئیڈیولوجی تھی، لیکن چونکہ وہ عمل کے قایل تھے اور فلسفۂ عمل مغرب کے بورژوا طبقے کی دین تھا اس لئے علامہ اقبال کے یہاں بالخصوص جنھوں نے فلسفۂ عمل سے زیادہ بحث کی ہے، وہ آئیڈیولوجی بہت زیادہ مرکب اور پر تضاد ہو گئی ہے - لیکن چونکہ منشی پریم چند فلسفۂ عمل سے زیادہ صرف عمل کے قایل تھے اس لئے ان کی آئیڈیولوجی نسبتاً صاف اور سادہ ہے - لیکن چونکہ عمل کسی بھی طبقاتی سماج میں طبقاتی تصادم اور تشدد سے عاری نہیں ہوا کرتا - اس لئے عمل کے وہ نتائج منشی پریم چند کی ایڈیولوجی کی اخلاقیات سے ٹکراتے بھی ہیں - وہ اپنے جذبۂ عمل اور اخلاقیات کے اس تضاد پر اس وقت قابو پا سکتے تھے جبکہ وہ حقیقت کو خواب میں بدل دیں - لالہ سمرکانت (میدانِ عمل) استحصال کے تشدد سے عاجز آ کر استحصال کو چھوڑ دیں (منشی پریم چند کے ناولوں میں ظلم کرنے والے کرداروں میں جو روحانی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے وہ اسی طریقۂ کار یا خواب کا نتیجہ ہے - وہ جذبۂ عمل کو اپنی ائیڈیولوجی کی اخلاقیات کا پابند کر دیتے ہیں - وہ ظالم کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں لیکن اسے جسمانی طور سے ختم کرنے کے بجائے اسے روحانی طور پر زندہ کرتے ہیں - اگر منشی پریم چند کے ناقدین اسے خلافِ حقیقت بتلاتے ہیں تو یہ غلط نہیں ہے کیونکہ حقیقت کی دنیا میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے - لیکن اس سے منشی پریم چند کی حقیقت نگاری پر کوئی بڑا حرف نہیں آتا ہے - کیونکہ وہ اپنے اس طریقۂ کار میں نہ تو ظالم کے تشدد سے آنکھیں چراتے ہیں اور نہ ہی اس کے ظلم پر پردہ ڈالتے ہیں - حقیقت نگاری کا اہم ترین کام سماجی حقیقت کے تضاد کو بے نقاب کرنا ہے - ضدین کو ان کے منطقی نقطے یعنی ایک دوسرے کو نفی کرنے والے نقطے تک لے جانا ہے (ناول میں کلائمکس اس نقطے پر پہونچتا ہے ظاہر ہے کہ اس معرکے میں نفی و جود کی پرانی قوت کی ہوتی ہے نہ کہ نئی قوت کی کیونکہ قانونِ حقیقت یہی ہے - اس لئے نئے کے ساتھ فن کار کا جذباتی اتحاد Identification بہت ضروری ہے (لیکن اگر اس سے کوئی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ فن کار اس جذباتی اتحاد کی منزل سے آگے بڑھ کر باقاعدہ کسی حل کو پیش کرے تو وہ فن پر نامناسب بوجھ لادا جا رہا ہے گا - پریم چند کا جذباتی اتحاد نئی طاقت کے ساتھ ہوتا ہے کہ نہیں اس پر آگے روشنی ڈالی جائے گی - سرِ دست فی الحال تو یہ کہنا ہے کہ ان کی ائیڈیولوجی کی اخلاقیات سماجی حقیقت کے تضاد کو منطقی نقطے تک پہونچانے میں مارج نہیں ہوتی ہے - اس لئے ان کے آرٹ پر اس سمجھوتہ بازی کا الزام عاید نہیں ہو پاتا ہے جو سماجی حقیقت کے تضاد کو اس کے منطقی نقطے تک نہیں پہونچاتا ہے - ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ تضاد کے حل کرنے والے عمل کو اپنی ائیڈیولوجی کے اخلاقیات کا پابند کر دیتے ہیں اس لئے اس کا اثر ان کے عمل پر بھی پڑتا ہے - اس سے یہ نتیجہ یقیناً نکالا جا سکتا ہے کہ منشی پریم چند بھی ٹالسٹائی کی طرح اخلاقیات کی تعلیم

دیتے ہیں۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے نہ صرف اپنے ناولوں میں کیا ہے بلکہ اپنے خطبات اور تحریروں میں بھی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں کہ "اخلاقیات اور ادبیات کی منزلِ مقصود ایک ہے صرف ان کے طرزِ تخاطب میں فرق ہے"۔ اس کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ "بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے اور اس میں وہ ظالم مظلوم کا کوئی فرق نہیں نکالتے ہیں۔ ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چپکی ہوئی ہیں۔ جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری، اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے"۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پریم چند کا انسان فطری طور پر اخلاقی انسان ہے۔ اخلاقیات اور نیچرلزم کا یہ امتزاج جو کہ ہمیں منشی پریم چند کے یہاں ملتا ہے اور جو یورپ کی رومانوی تحریک کی دین تھی مشرق کے لئے بہت ہی ساز گار رہا ہے۔ یہ امتزاج مختلف صورتوں میں حالی، اقبال، پریم چند سب ہی کے یہاں ہے۔ بہرحال یہ اسی امتزاج کا نتیجہ ہے کہ اگر ایک طرف (ابتدائی دور کے قصے کہانیوں کو چھوڑ کر جبکہ وہ خرقِ عادت چیزوں کو بھی پیش کیا کرتے تھے) وہ واقعیت، مشاہدے اور محسوسات پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف اتنا ہی زور وہ عصمت و عفت، خلوص و وفا، ایثار و قربانی، ضبطِ نفس اخوت اور محبت کی قدروں پر بھی دیتے ہیں جو کہ ایک غیر طبقاتی سماج ہی میں بامعنی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک طبقاتی سماج میں جہاں انسانی رشتے مفقود ہوں اور صرف زر کے رشتے ہی انسانوں کے درمیان ہوں وہ قدریں اپنی نفی خود ہی کرنے لگتی ہیں۔ مثلاً ایک طبقاتی اور استحصالی سماج میں عورت کی وفا، ایثار اور خلوص مرد کے استحصال اور پرجا کی وفا، ایثار اور قربانی راجہ کے استحصال کا جواز بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات تقریباً ناگزیر ہو جاتی ہے کہ اخلاقی اقدار کے طبقاتی پہلوؤں کو نہ اجاگر کر سکنے کے سبب سے منشی پریم چند بہت سے امور میں قدامت پسندی اور رجعت پسندی کے حامی غیر شعوری طور پر ہو جائیں۔ مثلاً ہندوستانی سماج میں عورتوں کی جو پوزیشن رہی ہے وہ صرف انسانی رشتوں ہی کی متعین کی ہوئی نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر اقتصادیات، رسم و رواج اور دھرم شاستروں کے متعین کئے ہوئے ضوابط کی رہینِ منت رہی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں اقدار قدیم زمانے ہی سے آپس میں برابر ٹکراتی رہی ہیں۔ لیکن چونکہ جاگیردارانہ سماج میں انسانی رشتے بھی موجود رہے ہیں اس لئے

ان کا تصادم اس وقت اتنا شدید نہ تھا جتنا سرمایہ دارانہ نظام میں ہوا ہے جس نے انسانی رشتوں کو تقریباً بالکل ہی بے دخل کر دیا ہے۔ . . . چنانچہ اس سماج میں بعض حالات میں تو مردوں کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ پالتو چوپاؤں اور پنچھیوں کا بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے یعنی جوں جوں ہمارے سماج میں مغرب کی لائی ہوئی آئینی حکومت، جمہوریت، انفرادیت اور تعلیم کا اثر بڑھتا گیا عورتوں میں بھی انفرادیت اور آزادی کا تصور ابھرتا گیا۔ اس سے ان میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور وہ ان اقدار کو ٹھکرانے لگیں جو ان کی آزادی کی جد و جہد میں حائل ہوئیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انھیں مردوں سے انسانی رشتوں کی بنا پر پریم نہیں رہا اور نہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انھیں عصمت و عفت و وفا، ایثار اور قربانی عزیز نہ رہی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہوا کہ وہ ان اقدار میں مساوات کی مدعی بن گئیں۔ منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں اس کسمساہٹ اور اس تصادم کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے لیکن وہ پوری طرح سے مرد اور عورت کے درمیان مساوات کے حامی نہ ہو سکے۔ وہ عورتوں کو غلام بنا کر رکھنے یا انھیں تعلیم و ترقی سے محروم کر دینے کے دعویدار نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس معاملے میں یقیناً اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ عورت مرد کو فقط پیار ہی سے رام کر سکتی ہے۔ امرکانت "میدانِ عمل" میں سکینہ سے جو عشق کرنے لگا اس کا بنیادی سبب وہ یہی بتلاتے ہیں کہ سکھدا نے امرکانت کو اپنی سیوا سے رام نہیں کیا۔ قصہ یہ ہے کہ وہ عورت کو بنیادی حیثیت سے ماں ہی کے روپ میں دیکھتے تھے جس میں بجز ایثار و قربانی اور مجسم وفا کے کوئی دوسرا ایسا جذبہ نہیں ہوتا۔ مزید اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ مرد کی نفسیات میں کرختگی ہوتی ہے جسے نرم کرنے کے لئے ماں کے پیار کا ملنا ضروری ہے۔ منشی پریم چند کے ان کلیات میں کتنی صداقت ہے یہاں اس سے بحث نہیں کیونکہ یہ باتیں سچ کہتے ہوئے بھی اضافی ہو سکتی ہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ عورتوں کے بارے میں ان کے بہت سے تصورات قدامت پسندانہ اور کچھ رجعت پسندانہ بھی تھے۔ وہ اپنے اسی آئیڈیل کو سامنے رکھ کر اپنی تمام ہیروئنوں کو ایثار و قربانی، خلوص و وفا کی دیویوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ گو ایسا نہیں ہے کہ پیر ڈگمگاتے نہ ہوں مثلاً "بازارِ حسن" میں سمن کی بے راہ روی میں اس کی اپنی کمزوریاں بھی دکھلائی گئی ہیں لیکن انھوں نے اس کی بھاری ذمہ داری اس کے شوہر ہی کے کاندھے پر ڈالی ہے اور اسی سے سمن کے گناہوں کا پرائشچت بھی کرا دیا

ہے۔ عورتوں کے بارے میں اُن کا یہ انداز نظر "گئودان" تک میں قائم رہتا ہے۔ مسٹر مہتا ایسا روشن خیال آدمی جو سماجی سدھار کا رہنما ہے اور جس کے خیالات کے ساتھ منشی پریم چند کی کافی ہم آہنگی ہے ویسی ہی باتیں عورتوں کے بارے میں کہتا ہے جس کا اظہار منشی پریم چند کئی ایک ناولوں میں کر چکے ہیں۔

"میرے ذہن میں عورت وفا اور ایثار کی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور اپنی قربانی سے اپنے کو بالکل مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ قالب مرد کا ہوتا ہے مگر جان عورت کی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا عورت ہی سے کیوں یہ اُمید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔ وہ کسی گپھا میں جا بیٹھے گا اور نروان کا خواب دیکھنے لگے گا۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے وہ اپنے گھمنڈ میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے سیدھا خدا میں جذب ہونے کا تصور کیا کرتا ہے۔ عورت زمین کی طرح صبر و سکون اور برداشت والی ہے۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجائیں تو وہ مہاتما بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گن آجائیں تو وہ بدکار بن جاتی ہے۔"

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مسٹر مہتا طلاق کے مخالف ہیں۔ وہ شادی سے پہلے آزاد انتخاب کا تو حق دیتے ہیں لیکن شادی کے بعد طلاق کا نہیں چنانچہ انھیں خیالات سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اس ناول میں مس مالتی اور مسز کھنا کے کردار کا جو مقابلہ کیا گیا ہے اس میں برتری اور فضیلت، وفا اور ایثار کی مورت مسز کھنا کو دی گئی ہے کیونکہ اس نے اپنی خودی کو مٹا ڈالا تھا، مسٹر کھنا کے ہاتھوں پٹتی ہے پھر بھی ان سے جدا ہونے کا نام نہیں لیتی ہے۔ اس کے برعکس مس مالتی یورپ کی پاس شدہ ایک لیڈی ڈاکٹر ہے، مسٹر مہتا کے رجعت پسندانہ خیالات کے سانچے میں اپنے کو بہت کچھ ڈھالنے کے باوجود وہ مسٹر مہتا سے شادی کرنا پسند نہیں کرتی تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو مٹانا نہیں چاہتی ہے وہ سماج کو تندرست رکھنے کے لئے عورتوں کے حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور مسٹر مہتا کو یہ سمجھا کر تنہا رہنا پسند کرتی ہے کہ سماج کو مسٹر مہتا کی خدمات کی ضرورت ہے۔ اگر وہ بال بچوں کے جھمیلے میں پڑ گئے تو وہ اپنی خدمت کو پوری طرح انجام نہیں دے پائیں گے۔ قاری اس کی ان باتوں سے اتنا مطمئن نہیں ہوتا جتنا اس بات سے کہ مس مالتی کو مسٹر مہتا کے جذبۂ رقابت کی حیوانیت سے سخت نفرت تھی جو اصل میں ان کے جذبۂ ملکیت کی غمازی کرتا ہے۔ منشی پریم چند نے دو آزاد شخصیتوں کے بیاہ کو، دو خودی کے امتزاج کے مسئلہ کو اسی جگہ پر چھوڑ دیا ہے آگے نہیں بڑھایا ہے۔ کیونکہ جس نقطۂ نگاہ سے وہ عورت اور مرد کو دیکھنے کے عادی تھے اور جس قسم کا تصور وہ بیاہ اور شادی کا رکھتے تھے اس میں مالتی اور مسٹر مہتا کا کوئی حل نہیں تھا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ مس مالتی کو اس قسم کی فلسفہ بازی پر مجبور کرتے ہیں جس میں دیش بھگتوں اور مصلحان قوم کے لئے اکیلا رہنا ہی مستحسن ہے۔ اس قسم کا گریز منشی پریم چند کے یہاں کئی جگہوں میں ملتا ہے جب وہ زندگی میں عمل اور ردعمل کے قائل ہو گئے اور "میدانِ عمل" ایسی بلند پایہ تصنیف پیش کی تو اس کی امید کی جاتی تھی کہ وہ امر کانت کے جوشِ عمل کو ٹھنڈا کرنا پسند نہیں کریں گے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب وہ جیل میں جاتا ہے تو جیل کا سفر اُس کے لئے ہردوار کی یاترا بن جاتی ہے۔ جب وہ جیل میں اپنے عمل سے پیدا شدہ تشدد پر غور کرتا ہے تو اندھیرے میں بھولے ہوئے مسافر کی طرح اس کا ضمیر سر جھکا کر دعا کرنے لگتا ہے "بھگوان مجھے کچھ نہیں سوجھتا"۔ اور جب وہ دادا بابا کی کو بھی اسی جیل میں پاتا ہے اور ساتھ ہی یہ خبر بھی سنتا ہے کہ نینا انصاف کی اسی لڑائی میں ماری گئی تو امر کی "ترلی نصیب آنکھوں میں چاروں طرف مشیت ایزدی کے جلوے منڈلانے لگتے ہیں۔" یہ صحیح ہے کہ منشی پریم چند کی یہ روحانیت فراری نہیں ہے وہ جوگ بیراگ اور ترک نہیں سکھاتی لیکن جس حد تک کہ اس روحانیت کا منشاء ایک طبقاتی سماج میں عمل کے ناگزیر تشدد سے ہے وہ عمل کی گرمی کو ٹھنڈا بھی کر سکتی ہے جیسا کہ امر کانت کے ساتھ ہوا وہ اپنے پورے کنبے کے ساتھ میدان عمل چھوڑ کر ہردوار کی راہ لیتا ہے، حالانکہ اس ناول میں یہ امر کانت ہی ہے جو کہتا ہے کہ "خدا انسان نہیں پیدا کرتا۔ انسان ارتقاء کی ایک منزل کا نام ہے۔" ان ساری باتوں کے اُبھارنے کا مقصد یہ تھا کہ باوجود اس بات کے کہ منشی پریم چند کا آرٹ اخلاقیات کا پابند ہے، باوجود اس بات کے کہ وہ روحانیت کے قائل ہیں، باوجود اس بات کے کہ وہ بعض سماجی اقدار میں قدامت پسند ہیں، اُن کا آرٹ ترقی پسند ہے۔ اس منطق ہی کے تحت نہیں کہ ان کی آئیڈیولوجی سماجی حقیقت

کے تضاد کو بے نقاب کرنے میں آڑے نہیں آتی، بلکہ اس خیال کے تحت بھی کہ اُن کی آئیڈیولوجی مارکسی نہ ہونے کے باوجود (جبکہ مارکسزم اُن کے ملک میں موجود تھا) ان ترقی پسند عناصر کی حامل ہے جو جاگیردارانہ دور کی اشتراکیت اور انسان دوستی کی قدروں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی آئیڈیولوجی میں بعض رجعت پسند عناصر بھی ہیں لیکن وہ غالب نہیں ہیں منشی پریم چند کی یہ آئیڈیولوجی امپریلزم اور سرمایہ دارانہ استحصال کی حمایت نہیں کرتی ہے ان کی یہ آئیڈیولوجی ہندوستانی سماج میں اس وقت تک مارکسزم کے ساتھ ساتھ زندہ رہے گی اور دورِ غلامی کے باقیات کے خلاف جنگ کرنے میں مددگار ہوگی۔ جب تک کہ اشتراکیت کی سائنس جو اُنیسویں صدی کی پیداوار ہے مارکسزم کو ہندوستانی سماج میں ایک زندہ اور ایک ٹھوس حقیقت اور ایک تہذیب افزا تخلیقی قوت میں تبدیل نہ کردے یعنی جب تک وہ مشرق کی بہترین اقدار کو ہضم نہ کرلے۔ اس سلسلے میں اس بات کی وضاحت کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ منشی پریم چند کی آئیڈیولوجی گاندھی ازم اور اہنسا کی ائیڈیولوجی نہیں ہے۔ "گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" "میدانِ عمل" اور "گئودان" ان میں سے کوئی بھی ایسا ناول نہیں ہے جہاں ظلم کی مخالفت اور مدافعت میں انسانوں کو ہو سے تربتر نہ دکھایا گیا ہو، جہاں ظالم کو اپنی جگہ سے نہ ہٹنے پہ دھکا نہ دیا گیا ہو اور جہاں اس لڑائی میں مرنے والوں کو شہیدِ انسانیت کا لقب نہ دیا گیا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ نیکی کے جذبے کو بیدار کئے بغیر ظالم کو موت کے گھاٹ اُتارنا ناانصافی سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے ضمیرِ انسانیت کی عدالت میں دکھی انسانوں کا استغاثہ لاتے ہیں۔ ظالم کو مجرم قرار دے کر اس کو اعترافِ جرم اور استغفار پہ مجبور کرتے ہیں۔ اگر اس طریقۂ کار سے وہ ٹھیک ہوجاتا ہے تو وہ اسے اپنی برادری میں قبول کرلیتے ہیں ورنہ اس کے خلاف بندوق اور ریوالور سب کچھ استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ فلسفہ گاندھی ازم سے مختلف ہے اس میں سماجی ظلم اور ناانصافی کے خلاف اٹل جذبہ بغاوت ہے وہ انھیں فطرتاً شروع ہی سے کانگریس کے گرم دل اور سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد انقلابی جماعتوں کی طرف کھینچتا رہا ہے۔ چنانچہ "گوشۂ عافیت" میں وہ سوویٹ انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن سوویٹ روس کی اشتراکیت کے بارے میں جو صحیح اطلاعات بہت دنوں تک ہندوستان میں نہ آسکیں اور یہاں کے دانش ور طبقے میں اشتراکیت کے غلط تصورات (جو یقیناً مضحکہ خیز ہیں) پھیلے ہوئے تھے اس لئے ان کی دل چسپی اس کے فلسفے سے نہ بڑھ سکی۔ اس کا

اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ "گئودان" میں پنڈت اونکارناتھ ایسے گھٹیا صحافی کو اشتراکی خیالات کا ترجمان بنا کر پیش کرتے ہیں اور مسٹر مہتا سے اُس کے خیالات کی تردید کرواتے ہیں۔ اگر آج کی اطلاعات اور معلومات کی روشنی میں ہم اونکارناتھ کے اشتراکی خیالات کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں گے کہ شری پنڈت اونکارناتھ جہالت محض کا ایک بنڈل تھا۔ یہ عدم واقفیت نہ صرف اس زمانے میں عام تھی بلکہ آج بھی یہاں کے دانش ور طبقے کے بعض حلقوں میں موجود ہے۔ کوئی اشتراکیت کو روٹی کا فلسفہ سمجھتا ہے، کوئی اسے اٹھارھویں صدی کی میکانکی اور بھونڈی مادیت تصور کئے ہوئے ہے اور کوئی فلسفۂ عیش کوشی کو ابیکورس کے سر تھوپ کر اشتراکیت کے ہم معنی کئے دیتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل محسوس نہیں ہوتا کہ جہاں تک اشتراکیت کی سائنس یا فلسفے کے علم کا تعلق ہے منشی پریم چند کو اگر کوئی علم تھا تو وہ غلط اطلاعات پر مبنی تھا لیکن چونکہ انھوں نے گورکی کی طرح اشتراکیت کو زندگی سے سیکھا تھا اس لئے وہ مارکسٹ نہ بننے کے باوجود اشتراکی تھے۔ انھوں نے اشتراکیت کی اسپرٹ کو اپنے آئیڈیل اور اپنے تصورات میں ڈھال لیا تھا۔ جس پس ماندہ ماحول میں منشی پریم چند گھرے رہے، جن لوگوں کی صحبت سے وہ فیضیاب ہوئے اس میں رہ کر وہ اس سے زیادہ کیا کرسکتے تھے کہ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے ایک ایسی معاشرت کی ضرورت کو محسوس کرائیں جو غلامی، استحصال اور مہاجنی تہذیب کے رشتوں سے پاک ہو اور جہاں صرف انسانیت کے رشتوں کا بول بالا ہو۔ یہ نصب العین کانگریس کا کبھی نہیں رہا ہے جو کہ مہاجنی تہذیب کا ایک ستون ہے۔ کانگریس کا نصب العین سیاسی آزادی سے آگے تھا ہی نہیں اس کے برعکس منشی پریم چند کا نصب العین ہندوستان کی صرف آزادی نہیں بلکہ آزاد انسانوں کی ایک جمہوریہ کا رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس جمہوریہ کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں نہ تھا اور نہ انھیں اس جمہوریہ تک پہنچنے کا کوئی سائنٹیفک راستہ ہی معلوم تھا۔ لیکن اس سے اُن کے نصب العین پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ منشی پریم چند شروع ہی سے کسی بہت بڑے آئیڈیل کے حامل تھے یا یہ کہ وہ شروع ہی سے انقلابی تھے۔ یہ رجحان انھیں سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد پیدا ہوا ہے جس کا اظہار میں پہلے کرچکا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالنا چاہیئے کہ جب وہ اس منزل کی طرف آگے بڑھتے ہیں تو اُن کی حقیقت نگاری میں کوئی کھوٹ نہیں رہتا۔

"گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" - یہ تینوں ناول جو ۱۹۲۳ء کے بعد لکھے گئے اُن کے آرٹ کی بہت سی کمزوریوں کا پتا دیتے ہیں۔ وہ حقیقت کو جذباتی روپ میں دیکھنے کے تو عادی ہو جاتے ہیں اور پلاٹ کی سازش سے کرتے آئے گئے ہیں لیکن سماجی حقیقت کے بنیادی تضاد کو پوری طرح سے اُبھار نہیں پاتے ہیں۔ مثلاً "چوگانِ ہستی" میں سورداس کسی قابلِ کاشت زمین کو نہیں بلکہ اپنی ناقابلِ کاشت زمین کو پانچ ہزار روپے کے معاوضے پر بھی اس لئے نہیں بیچتا کہ صنعتی تہذیب بدکاری پھیلاتی ہے اور وہ اُس زمین پر مندر اور دھرم شالہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ موٹو یا محرک سورداس کے سے مذہبی اور بھکاری کیریکٹر کے حق میں تو ٹھیک ہے لیکن ہندوستانی معاشرت کے پس منظر میں جہاں زمینداری اور سرمایہ دارانہ استحصال کسانوں کو روز بروز زیادہ سے زیادہ بے کھیت اور مزدور کسانوں میں تبدیل کر رہا ہے صنعتی پھیلاؤ کم از کم اُن کے لئے روزگار بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اگر منشی پریم چند صنعتی پھیلاؤ کے کسی اور ترقی پسندانہ پہلو کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ منشی پریم چند نے حقیقت کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کیا ہے صرف ایک جانب سے یعنی صنعتی تہذیب میں اخلاقیات کی گراوٹ کے نقطۂ نظر سے صنعتی پھیلاؤ کو دیکھا ہے۔ چنانچہ "گؤدان" ایک ایسا ناول ہے جہاں وہ سماجی حقیقت کے تضاد کو اس کے مختلف روپ میں دکھاتے ہیں وہاں اُن کی گرفت زندگی پر زیادہ سے زیادہ مستحکم نظر آتی ہے۔ کسی بھی فن کار کے آرٹ کو پرکھنے کے لئے اس کی بہتر چیزوں کو دیکھنا چاہئے نہ کہ اس سے کم درجے کی۔ قبل اس کے کہ میں ناول کی تفصیلات میں جاؤں، اس متنازعہ مسئلے کو لینا چاہتا ہوں کہ آیا ہوری جو کہ اس ناول کا ہیرو ہے ایک عظیم کریکٹر ہے کہ نہیں۔ کسی بھی کیریکٹر کی عظمت اس کے کردار میں ہوتی ہے نہ کہ اس بات میں کہ فن کار نے کس ہنرمندی سے اس کے کردار کو پیش کیا ہے — ہوری منشی پریم چند کے اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے تو یقیناً عظیم ہے لیکن وہ منشی پریم چند کے انقلابیت کے نقطۂ نظر سے یا سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے عظیم نہیں ہے۔ وہ عظیم اس اعتبار سے ہے کہ وہ جن سوشل اقدار، محبت و مروت، ایثار و اکرام کا حامی ہے انھیں باوجود مصائب کے نبھاتا ہے۔ وہ مر جاتا ہے لیکن اپنی محبوب ترین اقدار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ گوبر اُن کا اُلٹا طعنہ دیتا ہے کہ جس دیش کے لوگ بھوکے ننگے ہوں وہاں یہ قدریں بے معنی ہیں لیکن ہوری اپنی ڈگر سے نہیں ہٹتا ہے وہ اس

پر قائم رہتا ہے۔ ہیرا نے اُس کی عزیز ترین آرزو یعنی اُس کی گائے کو زہر دے دیا لیکن وہ اس سے انتقام لینے کے بجائے اُسے جیل سے بچانے کے لئے ڈنڈ بھرتا ہے اور ہیرا کے بھاگ جانے کے بعد وہ اس کے کنبے کی پرورش کرتا ہے۔ ہوری منشی پریم چند کی نگاہ میں اسی معنی میں عظیم ہے کہ وہ آدمی نہیں بلکہ دیوتا ہے۔ بھگوان کی طرح رحیم و کریم ہے۔ "کون کہتا ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد میں ہارا ہے۔ یہ خوشی یہ غرور، یہ حوصلہ اس کی موت کے وقت کی تصویر ہے، کیا یہ غرور کی علامت ہے۔ انہی ہی شکستوں میں اس کی فتح ہے، اس کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار اس کی فتح کے جھنڈے ہیں، چہرے پر چمک آگئی ہے، ہیرا کی ممنونیت میں اس کی زندگی کی ساری کامیابی مجسّم ہوگئی ہے۔" پریم چند کا یہ آخری جملہ ہی ہوری کی کامیابی اور عظمت دونوں کو اُبھارتا ہے۔ ہوری کی بہترین آرزوؤں کا قاتل اپنے پاپ پر نہ صرف نادم ہے بلکہ ہوری کا ممنون ہے جس طرح کہ ایک بندۂ خدا کا ممنون ہوتا ہے، میر کا شعر ہے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا کہتے

کاش پریم چند کو بھی یہ احساس ہوتا کہ کسی کو خدا کہنا بھی شرم کی بات ہے تو وہ ہوری کی، ہیرا کے مقابلے میں دیوتا کی طرح پرستش نہ کرتے بلکہ انسان کے اس کارنامے کا گن گاتے جو ممنونیت کے اسباب کو اپنے سماج سے ختم کرتا جا رہا ہے۔ ہوری سماجی انقلابیت کے نقطۂ نگاہ سے ایک مجہول کردار ہے۔ اس میں مرجاد کے بندھن کو جو کہ قطعاً ایک رجعت پسندانہ قدر ہے، توڑنے اور اپنے حقوق کے لئے سینہ سپر ہو کر لڑنے کے لئے آن بان نہیں ہے۔ یہاں منشی پریم چند کا ہوری ٹالسٹائی کا وہ کسان ہے جو ظلم کو اخلاقی قوت کے ساتھ جھیلے اور دشمن کو اپنی اس اخلاقی قوت سے مفتوح کرنے ہی میں زندگی کی بڑائی تصوّر کرتا ہے۔ ٹالسٹائی کے اس رجحان کی مخالفت میں کسی اور کا ذکر کیا، چیخوف ایسے فن کار نے جو اُس کے فلسفے سے کسی زمانے میں متاثر تھا، اس کے رجحان کی مخالفت کی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جس زمانے میں یعنی سن ۳۰ء کے بعد کے زمانے میں جب کہ یہ ناول لکھا گیا تھا کسانوں کے درمیان سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے کوئی لڑاکا اور مثبت کردار پیدا نہیں ہوا تھا تو ایسا کہنا غلط ہوگا کیونکہ

منشی پریم چند دلیبا مشیت کردار نہ صرف ”گوشۂ عافیت“ میں ”پیش کر چکے تھے بلکہ اسی ناول میں گوبر کی شخصیت میں موجود ہے۔ پھر بھی وہ گوبر کو ہیرو نہیں بناتے ہیں اور نہ اس کے کردار کے انقلابی پہلو ہی کو پوری طرح ابھارتے ہیں۔ اسے حل سے ہٹا کر خانگی توکر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان ساری باتوں کا سبب یہ ہے کہ وہ ٹالسٹائی کی اخلاقیات سے متاثر تھے۔

(باقی)

شبیر فاطمہ

باسمہٖ سُبحانہٗ

(تہنیۃ فی قدومِ جلالۃ الملکِ السُّلطان سعود بن عبد العزیز خلّد اللّٰہ ملکہٗ و سلطنتہٗ)

اَبیاتٌ اَطیابٌ

طُوبیٰ لَنا مَقدَمُ السُّلطان ۔ اِنَّ لَہٗ ... فَضلاً جَسیماً عَلیٰ جَمعِ الاَساطِین

ہمارے لیے حضرت سلطان کی تشریف آوری ایک سعادت و مسرت کی بات ہے، کیونکہ اُن کو مشاہیرِ عالم پر ایک بڑی فضیلت حاصل ہے

بِخِدمَۃِ الحَرَمَینِ اللّٰہُ اَسعَدَہٗ ... کَفیٰ بِہٖ شَرَفاً بَینَ السَّلاطِین

اللہ تعالیٰ نے اُن کو ”حرمین شریفین“ کی خدمت بخش کر بڑی سعادت عطا فرمائی ہے، یہ شرف اُن کو سلاطینِ عالم سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے

فَغَیرُہٗ مَرکَبٌ دُنیاہُ تَرکَبُہٗ! ... وَاِنَّہٗ رَاکِبٌ دُنیاہُ بِالدِّین

کیوں کہ دیگر سلاطین تو گویا ایک سواری ہیں جس پر خود ان کی دنیا سوار ہے، اور یہ ایک شہسوار ہیں جو دین کی برکت سے اپنی دنیا پر قابو یافتہ ہیں

شَعائِرُ اللّٰہِ فِی الدُّنیا مُعَظَّمَۃٌ ... مِن عَزمِہٖ وَجَرَت شَرائِعُ الدِّین

آپ کے عزم جزم کا یہ اثر ہے کہ آج دنیا میں شعائر اللہ کی تعظیم کی جا رہی ہے، اور شرائعِ دین کا رواج عام ہو رہا ہے

وَقَلبُ کُلِّ صَبُورٍ شاکِرٍ فَرِحٌ ... بِالہِندِ زارَ وَ مَلِیکاً غَیرَ مَظنُون

ہر ”صبار شکور“ (مسلم) کا دل آج بہت ہی خوش ہے کیونکہ اُنھوں نے ہندستان ہی میں ایسے بادشاہ کی زیارت کر لی جن کے آنے کا وہم بھی نہ تھا

دُنیاہُ ما دَنَّسَت بِاللُّومِ شِیمَتَہٗ ... فَیالَہٗ مَلِکٌ فی طَبعِ مِسکِین

آپ کی دُنیا اور ملکداری، آپ کے شیم کریمہ کو پستی و دنائت سے ذرا بھی آلودہ نہ کر سکی، واہ رے بادشاہ کہ قبضہ میں سلطنت پھر بھی مزاج میں مسکنت

یارَبِّ! اَحیِہٖ مِسکِیناً ۔ اَمِتہُ کَذا! ... وَاحشُرہُ یارَبِّ فی زُمَرِ المَساکِین

(حدیث کے الفاظ میں دعا ہے کہ) اے خدا! آپ انھیں مسکین ہی زندہ رکھیے اور آخر دم تک انھیں مسکین رکھیے اور انھیں زمرۂ مساکین میں محشور فرمائیے۔ آمین

نازش پرتاب گڑھی

مرنے سے پہلے، مرنے کے بعد

(مجاز کی موت پر)

"رات اور ریل" میں لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ غزل اتنی نہیں، اور بھی گہری ہوتی
اور "نورا" کے کئی شعر بہت عریاں ہیں
وہ فلاں نظم، ذرا اور بھی تیکھی ہوتی
کتنی بے معنی و بے ربط ہے یہ "آوارہ"
ایسی کیوں ہے - یہ ذرا اور بھی ویسی ہوتی

بزمِ تہذیب میں یہ شخص ہے ننگِ محفل
باغِ اخلاق میں اک خار بنا پھرتا ہے
حلقۂ شعر و ادب میں نہ بلاؤ اس کو
میزبانوں کے لئے بار بنا پھرتا ہے
گندگی سب پہ اچھالے گا وہ شراب پی کر
اپنی اک[1] نظم کا کردار بنا پھرتا ہے

یہ — اور اس قسم کے کچھ اور بھی سطحی فقرے
لوگ کہتے رہے، کہتے رہے، کہتے ہی رہے
اور کوتاہ نگاہوں کی پہنچ سے آگے
وہ کہ خود[2] اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
بزمِ احباب میں ہر لمحہ بنا باغ و بہار
دامنِ غم پہ بناتا ہی رہا نقش و نگار

۱- مراد "آوارہ"   ۲- مجاز ہی کا مصرعہ ہے

وہ کہ اس دور میں "رسوا سرِ بازار ہے" تھا
وہ کہ اس دور کے باطل سے لڑتا ہی رہا
اپنے ہاتھوں میں لئے ساغر و مینا کے کنول
وہ کہ ظلمات کے شیطان سے لڑتا ہی رہا
وہ کہ دامن میں سنبھالے ہوئے چبھتے فقرے
تلخئ زیست کے طوفان سے لڑتا ہی رہا

خونِ دل، خونِ جگر اپنے تبسم میں لئے
رنگ تصویر میں بھرتا رہا، بھرتا ہی رہا
درد و غم جتنے بڑھے جرأتِ دل بڑھتی گئی
وہ سمٹ کر بھی گیا کہ خلوص اور نکھرتا ہی رہا
قطرۂ مے نوشی میں بھی شمعِ ذہانت نہ بجھی
وہ بگڑ جانے میں کچھ اور سنورتا ہی رہا

اور پھر ٹوٹ گئی بربطِ ہستی کی لے
(چند بے باک سی سانسوں کی حقیقت کیا ہے)
(اس المیے کا سبب کون ہے احباب کہے؟)

رشکِ[1] صد ہوش جو مستی تھی وہ مستی نہ رہی
تھی[2] جو چلتی ہوئی تلوار وہ ہستی نہ رہی
حیف وہ سادگئ زیست کی بستی نہ رہی

قوم چلائی ــــ دیوتھیں پہلے بھی چلائی ہے
اس کے مرنے سے بپا ہو گیا اک ایسا خلاء
سال ہا سال بھی پُر ہو نہ سکے جو شاید
فن کی معراج ہے اس شخص کی نظم "آوارہ"
"رات اور ریل" کے کیا کہنے کہ شہ پارہ ہے
زیست کا آئینہ خانہ ہے ہر اک شعر اس کا
اُس کی مے نوشی تو اک پردۂ محرومی تھی
اُس کا کردار بڑا پختہ، بہت اونچا تھا
کتنا بے لوث وہ انسان تھا، کتنا مخلص
عظمتِ زیست کا راز اس کے سوا کس کو ملا

جانے اس رسم کو کب دور کیا جائے گا
جانے فن کار کو کب جینے دیا جائے گا

۱؎ و ۲؎ دو شعر مجاز کی نظم "تعارف" سے مستفاد ہیں

مختار الدین احمد آرزو

مانچسٹر میں اُردو کے کچھ قدیم رقعات

جون رے لینڈ لائبریری مانچسٹر، انگلستان کی مشہور پبلک لائبریری ہے جو اپنے عربی و فارسی مخطوطات کی وجہ سے خاص شہرت رکھتی ہے۔ عربی مخطوطات کی تفصیلی اور فارسی کی دستی فہرستیں شائع بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے وہاں اردو کی بھی کچھ قلمی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں۔ ان میں فی الحال دو مجموعوں [ہندستانی: ۲۳، ۴۲] کا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں جن میں اُردو کے بعض رقعات موجود ہیں۔

ہندستانی: ۲۳ کاغذوں کا ایک رول ہے جس میں رقعات، پروانے اور مختلف قسم کی تحریریں یکے بعد دیگرے چسپاں کر کے لپیٹ دی گئی ہیں۔ یہ تحریریں زیادہ تر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا کی ہیں۔ اکثر فارسی میں ہیں۔ بعضوں پر محمد حسن خاں کا نام ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں انھیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس میں چند اردو رقعے بھی ہیں۔ رقعہ: ۱ کا متن پیش کیا جاتا ہے۔ لکھنے والا کا نام موجود نہیں۔ تحریر خوش خط ہے زبان ہندی ہے۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ رقعہ لکھنے کے لئے رسم الخط فارسی اختیار کیا گیا ہے۔

ہندستانی: ۴۲ کچھ منتشر کاغذات دو پلندوں میں بغیر کسی ترتیب کے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ زیادہ تر انگریزوں کے نام ہیں۔ کچھ فارسی میں کچھ فارسی رسم الخط میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب بہادر جب ہندستان میں تھے ان کے متعلقین اور متوسلوں نے جو رقعے انھیں لکھے تھے انھوں نے محفوظ رکھ چھوڑا اور بعد میں یہ کاغذات کچھ مزید کاغذات کے ساتھ اس لائبریری میں پہنچ گئے۔ اس میں اردو کے بھی بعض رقعات اور عرضیاں ہیں۔ بعض عرضیوں کی پیشانی پر انگریزی میں تحریریں ہیں۔

اردو کے رقعوں کے مکتوب الیہوں کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ رقعات ۲، ۳ ایک ہی قسم کے کاغذ اور ایک ہی روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور کاتب دونوں کا ایک ہے۔ رقعہ: ۱ کسی اہل کار اور متصدی کی طرف سے ہے ۲، ۴ دوستانہ اور برادرانہ رقعات ہیں (رقعات ۲، ۳) عرضی ہے جس میں ایک ماہ کی مہلت مانگی گئی ہے۔ یہ ممکن ہے کسی انگریز آفیسر کے نام ہو۔ ۳، ۴ اپنے سے کسی بڑے کو عریضانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

ان رقعات کی ادبی اہمیت تو کچھ نہیں ہے۔ لکھنے والے کم پڑھے لکھے لوگ معلوم ہوتے ہیں اور زبان و املا کی متعدد غلطیاں موجود ہیں، لیکن اس کی لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور رقعوں پر سال تحریر سنہ ۱۸۴۲ء درج ہے اور تحریروں کا زمانۂ تحریر بھی اس کے لگ بھگ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں خطوط لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عوام تو عوام خواص بلکہ اردو زبان کے شعراء اور ادباء بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ خود مرزا غالب کا کوئی رقعہ یا خط سنہ ۱۸۴۲ء یا اس سے پہلے کا اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔

اس بات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رقعہ: ۱ کے کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہندو ہیں۔ زبان ہندی ہے لیکن رقعہ نگار نے فارسی رسم الخط میں لکھنا پسند کیا ہے۔ اسی طرح رقعات ۴، ۵ کے لکھنے والے گوردیال مصل اور نرائن سنگھ ہیں۔ رقعہ ۵ کا مکتوب الیہ متحقق نہیں لیکن رقعہ: ۴ کا مکتوب الیہ یقیناً کوئی ہندو بابو صاحب ہیں۔

اس رقعے میں حسب ذیل عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

مہربان، حال، سلامت، بعد، سلام و بندگی، ظاہر، معلوم، طرح، خیر و عافیت، ہمیشہ، صورت احوال، طور، رخصت، طرف، حیران و پریشان، قصور، قسمت، ایک مرتبہ، ارادہ، دو چار، منع، سبب، امید، ذات تکلیف، آئندہ، مالک و مختار، مناسب، فقط، زیادہ، راقم شوق، بندہ۔

اب رقعات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

بابو صاحب ... سدا آنند سے ان کو رکھے شیو بھگوان

بعد چیر نخوی اور پرنام کے ظاہر کیا گیا ہیر دہ مبارک میں آتا ہے کہ یہاں چھوٹے بڑے سب ساتھ خیریت کے ہیں اور آپ کی خیر و عافیت کے واسطے نت گوسیاں کی درگاہ میں دست بدعا رہتے ہیں۔

صاحب میرے! یہاں کا سماچار ایسا ہے کہ .. بیسویں [۲۰] اکتوبر مہینہ سنہ حال کو بابو کرن سنگھ صاحب نے ایک تعلقہ پرگنہ ، سماسے (۹) ضلع بہار میں کہ جمع ر دول اس کا پانچ ہزار روپیا بہ تعداد چالیس موضع ایک کنوہ اصلی کے مقرر ہے بہ قیمت ساٹھ ہزار روپے کمپنی بہ ڈاک بنیلام میں صاحب کلکٹر کے بکچہری میں خرید کیا ہے۔ واسطے اطلاع کے لیکھا (لکھا)

ایام خوشی کا ہمیشہ ساتھ مقصد کے ہو جیو

(۲)

اللہ برتر

پیارا بھائی میرے کو خدا سلامت رکھے۔ بہت بہت دعا اور نہایت شوق کے پیچھے عزیز کو معلوم ہووے کہ بہت روز بیت گیا تمہارا خط نہ پانے سے نہایت متفکر ہوں اس لئے بڑا بے تاب ہو کر تمہاری خیریت کی خبر کے واسطے آدمی بھیجتا ہوں چاہیئے کہ اس کی معرفت اپنا احوال لے کر بھیجو گے کہ اس میں خاطر کی تسلّی اور دل کی جمعیت حاصل ہوگی۔ اس کے پیچھے خط بھیجنے میں اور غفلت نہ ہوئے کاہے کہ طرفین سے خط لکھنا حقیقت میں آدھی ملاقات ہے۔

تمہارے واسطے احمد علی سائیس کے ہمراہ یک راس گھوڑا بھیجا گیا پہنچے گا۔

فی التاریخ ۱۱ ماہ فروری سنہ ۱۸۴۲ مسیحی

(۳)

غریب پرور سلامت

آداب اور کورنش کے پیچھے معروض رکھتا ہے کہ آپ کے نوازش نامہ اس مہینے کی ۱۲ تاریخ ڈاک کی راہ پہ ہمارے گھر میں آ پہونچی۔ ہم نے ۱۸ تاریخ کو کلکتہ سے آکر حالات اس خط کے معلوم کیئے۔ یہ صاحب سرکار کے مادّے میں جو لیکھے تھے سو آج کل ہونا بہت مشکل ہے۔ کاہے کہ میری طبیعت بہت نادرست [رہے] اس لئے میں وہاں جا نہیں سکوں گا۔ خیر اور دو تین روز کے بعد وہاں ہم جاکر آپ کو عرض کریں گے۔ حضور کے اقبال سے ہمارے یہاں سب خیریت میں ہیں۔ زیادہ حد آداب۔

فی التاریخ ۱۹ ماہ فروری سنہ ۱۸۴۲ مسیحی

(۴)

بابو صاحب مہربان بہت ، ہمارے حال پر تم کو سلامت رکھے کالی جی بعد سلام و بندگی کے ظاہر کرتا ہے تم کو معلوم ہوگا۔ ہم اچھی طرح سے ہیں اور تمہارا (کذا) خیر و عافیت ہمیشہ چاہتے رہتے ہیں۔ اب صورت احوال کا ہمارے اس طور پر ہے کہ جس روز سے ہم تم سے رخصت ہو کر واسطے نوکری طرف ضلع صاحب گنج کے آئے۔ اس روز سے نہایت حیران و پریشان رہتے ہیں لیکن یہ سب قصور اپنی قسمت کا ہے بلکہ یک مرتبہ ارادہ کیا تھا کہ پھیر آویں مگر وہ چار آدمی ہمارے دوستوں میں سے منع کیا و کہا کہ دس پانچ روز اور بھی دیکھ لو، تب جانا۔ اس سبب سے رہا ہوں۔ اب امید آپ کی ذات سے ہے کہ ہمارے گھر کے آدمیں (آدمی) کسی بات سے تکلیف نہ پاویں آئندہ کو آپ مالک و مختار ہیں جیسا مناسب جانیئےگا ویسا کریئے گا۔ فقط زیادہ کیا لکھا جائے۔

راقم شوق

بندہ گوردیال لعل

(۵)

غریب پرور سلامت

یعنی یک قطعہ مکان فدوی کا بہ سبب برشگال کے شکست ہو گیا ہے و فدوی باعث تہی دستی کے تیار نہیں کر سکتا ہے۔ چناں چہ حسب نالش شیو پرشاد کے حضور سے حکم واسطے تیاری مکان مذکور کے ہوا۔ اس واسطے امیدوار فضل و کرم خداوندی کا ہے۔ واسطے تیاری کے مہلت یکم مہینے کی دیا جائے۔ بعد گزرنے میعاد کے فدوی تیار کرے گا۔ فقط

عرضی فدوی نرائن سنگھ

(۶)

دوست اور محب میرے سلامت رہو

سلام کے بعد عرض لکھتا ہے وخیریت ہمارا (کذا) تمہاری خیریت سے ہے وخوشنودی مزاج آپ کا (کذا) درگاہ میں اللہ کو بہتر چاہیے والا رہتا ہے مگر دس مہینے سے بندہ مرضی الٰہی کے بیمار رہتا ہے و مارے تپ و کھانسی کے بہت لاچار رہتا ہے اور ناقت (طاقت) اُٹھنے و بیٹھنے کا نہیں رہتا ہے۔ اس واسطے آپ کو لکھا جاتا ہے کہ آپ دس روز کے واسطے مہربانی کرکے ہمارے پاس ملاقات کرنے کے لئے آیئے گا اس واسطے کہ ہم نیم جان ہیں اور کچھ دیری مت کیجئے گا اور جس وقت آپ آیئے اس وقت کوئی حکیم کو لیتے آویں گے۔ فقط

مضمون یہ تمام ہُوا، لیکن اس مجموعے میں سُرخ تلنگی کاغذ پر خوش خط لکھا ہُوا فارسی میں ایک دعوت نامہ مجھے نہیں بھولتا جو پھلواری شریف، ضلع پٹنہ، بہار کے ایک بزرگ سید قمر علی مرحوم نے اپنے "دو ہندو دوستوں" کو آج سے ایک صدی پہلے بھیجا تھا جس سے اُس زمانے کے آپس کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

احقر العباد سید قمر علی بہ خدمت بزرگان و دوستان ملتمس مے گردد کہ بہ تاریخ نوزدہم شہر صفر روز پنج شنبہ سائے بان بندی، و بہ تاریخ بستم روز جمعہ نیاز کنند، و بہ تاریخ بست و یکم روز شنبہ روانگی برات بہ خوردار سید محمد عظیم سلمہ اللہ تعالیٰ از موضع بنجورہ سب باش بہ موضع سانڈے گشتہ تاریخ بست و ۲۲ ہم شہر مذکور بہ مقام قصبہ پھلواری داخل شدہ، بعد نماز ظہر در خانقاہ حضرت صاحب قبلہ مدظلہ العالی از صیغہ عقد نکاح فارغ شدہ۔ پس از رسیدن داناپور بہ شب بست سویم تقریب محفل نشاط، و بہ شب بست چہارم روز دو شنبہ گشت برات مقرر یافتہ۔

توقع بہ شرف قدوم میمنت لزوم محفل شادی را زینت و بندہ را مشکور منت فرمایند۔ والسلام بہ خدمت شریف پرمک (۲) سنگھ صاحب و بہ خدمت شریف بابو بشنبر صاحب

ان دونوں مجموعوں کے کچھ اردو رقعات کی نقل میں نے لی ہے اور کچھ کے مائکروفلم بنوا لئے ہیں۔ رقعات ۲، ۳ کے عکس ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مانچسٹر، انگلستان ۱۲- اپریل ۱۹۵۵ء

گنّے کے متعلق معلومات

ہندوستان میں تقریباً دو کروڑ کاشتکار گنّے اُگانے کے کام میں مشغول ہیں۔

ہندوستان میں گنّے کا زیر کاشت رقبہ تقریباً ۴۰ لاکھ ایکڑ ہے، جو دنیا میں گنّے کے کل زیر کاشت رقبے کا ۳۵ فی صدی ہے۔

ہندوستان میں گنّے کی فی ایکڑ پیداوار چودہ پندرہ ٹن ہے اور یہ پیداوار ہوائی کی ۶۲ ٹن اور انڈونیشیا کی ۵۶ ٹن فی ایکڑ پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء کی فصل میں گنّے کی پیداوار ۵ کروڑ ۶۴ لاکھ ٹن رہی، جبکہ سنہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں یہ پیداوار ۴ کروڑ ۸۳ لاکھ ٹن اور سنہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں ۵ کروڑ ۲ لاکھ ٹن تھی۔

ہندوستان میں گنّے کی کل پیداوار کا تقریباً ۵۵ فی صدی حصّہ گڑ اور کھنڈسار ی شکر تیار کرنے میں صرف ہوتا ہے اور صرف ۲۵ فی صدی حصّہ چینی تیار کرنے کے لئے ملوں میں جاتا ہے۔

آج کل ہندوستان میں ۱۶۰ شوگر ملیں ہیں جن کی موجودہ صلاحیت تقریباً ۱۳۷۰۰۰ ٹن گنّا یومیہ ہے۔

سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء میں چینی کی کل ۱۵ لاکھ نوّے ہزار ٹن پیداوار کی بدولت چینی کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ اس سال ۴۶ کروڑ روپئے کی مالیت کا ایک کروڑ ۵۹ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن گنّا پیلا گیا تھا۔

عبداللطیف اعظمی

اقبال سہیل کی سیاسی شاعری

پچھلا سال سیاسی لحاظ سے جیسا بھی رہا ہو، مگر اردو کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اس نے اتنے عظیم المرتبت اور اتنی بڑی تعداد میں اہل قلم اور صاحب تصنیف ہم سے چھین لیے جن کی مثال کسی اور سال میں شاید ہی مل سکے گی۔ غور فرمائیے، خواجہ حسن نظامی۔ بے خود دہلوی۔ دتاتریہ کیفیؔ، اقبالؔ سہیل اور مولانا اسلم جیراج پوری جیسی شخصیتیں جو کسی ملک یا قوم میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں، ایک سال کے اندر ہم سے چھن گئیں۔ ان بزرگوں کی صف میں ایک نوجوان شاعر مجازؔ بھی شامل ہے جو ایک نئی آن بان کا مالک تھا۔

ان سب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اقبال سہیل کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ اقبال سہیل اپنی زندگی میں بہت بے پروا تھے، ان کی اس عادت ہی کی وجہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت نام پیدا کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی پروا نہیں کی، بلکہ ان کے قدردان جب کبھی ان کے کلام کو جمع کرنا چاہتے تو اس کی اجازت نہ دیتے۔

اقبال سہیل اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی طرح بہت سی خصوصیات کے مالک تھے۔ مگر ان میں سب سے نمایاں اور ممتاز ان کی شاعری تھی اور اس میں ان میں وہ اپنے دور کے منفرد شاعر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قصیدہ اور غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی "پرانے شعرا میں قصیدہ گو اور غزل گو شعرا الگ الگ ہوتے تھے۔ قصیدہ گو غزل میں اور غزل گو قصیدے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ دونوں کی زبانیں الگ ہوتی ہیں۔ مگر مستثنیٰ اشخاص بھی ہیں، جو دونوں مملکتوں پر ایک ساتھ حکمراں ہیں۔ جیسے قدما میں سعدی متوسطین میں عرفی اور اخیر میں شبلی مرحوم سہیل صاحب بھی انھیں مستثنیٰ قابلیت کے لوگوں میں ہیں، جو قصیدہ اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔"

ویسے سہیل کی غزلوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو اچھی غزل کی جان ہوتی ہیں۔ مگر ان کی وہ غزلیں مجھے زیادہ پسند ہیں، جن میں سیاسی خیالات و افکار کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ تغزل میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ بقول آل احمد سرور "یوں تو حالی، چکبست، اقبال، وحیدالدین سلیم سب نے غزلوں میں سیاسی حقائق کی ترجمانی کی ہے۔ مگر اقبال سہیل کے یہاں ایک بات سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے صرف غزل ہی سے کام لیا، اور اس طرح کام لیا کہ خلافت اور ترک موالات سے لے کر اس وقت تک کے سیاسی میلانات اپنے سارے پیچ و خم کے ساتھ آ گئے۔" مثلاً یہ بات کہ انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے وہ آہستہ آہستہ اس کے حکمراں بن بیٹھے۔ سہیل نے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کرم مہماں کا ہے یا حسنِ خلقِ ناتواں میرا مرے گھر کو گھر اپنا جانتا ہے میہماں میرا
خیال ان کے سخن میرا، زباں اُن کی دہن میرا بہار ان کی چمن میرا، گل اُن کے گلستاں میرا
پُوچھتے کیا ہو دیارِ دل کی مہماں پڑ رہی جو بَلا باہر سے آئی وہ مقامی ہو گئی

یا یہ خیال کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو آپس میں لڑاتا ہے اور ہم لڑتے ہیں۔

وہ چشم فتنہ گر ہے ساقیِ میخانہ برسوں سے کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
خدا سمجھے بتِ سحر آفریں سے گریباں کو لڑایا آستیں سے
نہیں اب کارگر کوئی فریبِ حسن کا افسوں مدار اب رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر

ایسے اوقات بھی آئے ہیں کہ ہم نے آپس کی لڑائی میں وطن اور اس کی آزادی کو پس پشت ڈال دیا۔ شاعر غزل کی زبان میں کہتا ہے۔

صیاد مژدہ باد و عنادل میں چل گئی اس کش مکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں کانگریس نے حکومت برطانیہ سے

مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرے تو اس نے محوری طاقتوں کے حملے کا بہانہ کیا۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفے سے قبل ۱۹۴۲ء میں یو۔پی اسمبلی میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ اقبال سہیل بھی اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے ریزولیوشن کی تائید میں برجستہ شعر کہے۔ ملاحظہ ہوں۔

الٰہی زنجیر ٹوٹ جائے، اسیرِ غم اب تو چھوٹ جائے
چمن کو لوٹا ہے باغباں نے تو آکے گلچیں بھی لوٹ جائے
ستم بھی ہوگا تو دیکھ لیں گے، کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
یہ دوستی کا طلسم ٹوٹے، یہ مہربانی کا جھوٹ جائے
بلا سے قزاق آکے لوٹیں، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اُچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

غزل اگرچہ طویل ہے، لیکن غزل کے انداز میں سہیل کی سیاسی شاعری کو سمجھنے کے لئے پوری غزل پیش کرتا ہوں۔ اس میں بڑی خوبی کے ساتھ آزادیٔ وطن کے جذبے کو اُبھارا گیا ہے۔

اسیروں میں کبھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا   ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا
کئے ہیں چاک دل سے بوئے گل نے بال و پر پیدا   ہوس ہے تو زندگانی کی تو ذوقِ مرگ کر پیدا
یہ مشتِ خاک اگر کرلے پرو بالِ نظر پیدا   تو اوجِ لامکاں تک کر ہزاروں رہگذر پیدا
جمالِ دوست پنہاں پردۂ شمس و قمر پیدا   یہی پردے تو کرتے ہیں تقاضائے نظر پیدا
محبت تیرے صدقے تو نے کر دی وہ نظر پیدا   جدھر آنکھیں اٹھیں ہوتا ہے حُسنِ جلوہ گر پیدا
شبِ غم اپنا سائے خیر اپنے جیب و دامن کی   رہے دستِ جنوں باقی تو کرلیں گے سحر پیدا
مذاقِ سربلندی ہو تو پھر دیر و حرم کیسے   جبیں سائی کی فطرت نے کئے ہیں سنگ و در پیدا
فدا اس لن ترانی کے یہ کیا کم ہے شرف اسکا   دلِ خود دار نے کرلی نگاہِ خود نگر پیدا
دلِ برباد محرومی پہ جس کی آج ہنستے ہو   یہی ویرانہ کرتا تھا کبھی لعل و گہر پیدا
جوانو، یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے   چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا
وہ شبنم کا سکوں ہو یا کہ پروانے کی بیتابی   اگر اُڑنے کی دھن ہوگی تو ہوں گے بال و پر پیدا
دلِ آتش نوا تجھ کو قسم ہے داغِ حرماں کی   دیارِ حُسن میں ہو جائے شورِ الحذر پیدا

سہیل اب پوچھنا ہے انقلابِ آسمانی سے
ہماری شامِ غم کی بھی کبھی ہوگی سحر پیدا

وطن کی آزادی کے بعد جو قیامت ٹوٹی اور ہند و پاکستان میں جو انسانیت سوز حرکتیں ہوئیں، ان پر کون ہے جو ملول نہ ہوا ہو، بہت سے شاعروں نے اس پر نظمیں کہی ہیں۔ خود اقبال سہیل نے بھی کہی ہیں۔ مگر ذرا یہ غزل ملاحظہ فرمایئے۔

مجھ سے پوچھو نہ مزاجِ دلِ ناشاد ابھی   میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیٔ فریاد ابھی
ہے عنادل کو وہی درسِ کہن یاد ابھی   کہیں بیٹھا تو نہیں گھات میں صیاد ابھی
خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل   اور کیا چاہتی ہے نکہتِ برباد ابھی
فرشِ خاکی پہ گرا کنگرۂ عرش سے دل   اس کی قسمت میں ہے کچھ اور بھی افتاد ابھی
بجلیاں آئیں جو باہر وہ خصلت بھی تو ہیں   شعلہ افگن ہے مگر برقِ ستم زاد ابھی

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل:
ہوش گم کردہ ہیں مرغانِ نو آزاد ابھی

ایک طویل جد و جہد کے بعد وطن آزاد ہوا تو ملک کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور بڑی شان کے ساتھ جشنِ آزادی منایا گیا — اس موقع پر سبھی شاعروں نے نظمیں کہیں۔ ان کوتاہ بینوں کا ذکر نہیں جن کو آزادی نظر نہیں آئی۔ انھیں آتی بھی کیوں کر جبکہ یا تو انھوں نے اس کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی یا ان کی نظر کہیں اور تھی۔ ہندوستان سے دور کسی اور دنیا میں۔ جب ان کا خواب پورا نہ ہوا تو جھنجھلائے، خفا ہوئے اور آزادی کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا۔ جب ان کے نصیب میں مسرت آئی ہی نہیں تو یہ بھلا کہتے کیا۔ جذبہ کہاں سے لاتے اور خیالات کو پرواز کہاں نصیب ہوتی۔ البتہ جن شاعروں نے کروڑوں انسانوں کی اس خوشی کو اپنی خوشی سمجھا، انھوں نے اس موقع پر خوب کہا۔ ان خوب کہنے والوں میں ایک اقبال سہیل بھی تھے۔ ایک نظم کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔ خیالات کی بلندی اور عظمت کے ساتھ زبان کا لطف بھی آئے گا۔

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج   سرشار ہے خوشبو سے ہر اک گوشۂ چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج   ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا   بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت وہ ملی ہم کو دوبارا   روشن ہے پھر آزادیٔ مشرق کا ستارا
یہ خوش خبری لائی ہے سورج کی کرن آج

رخصت ہے شبِ تارِ غلامی کا اندھیرا   وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اُکھڑنے لگا ڈیرا   لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا

آزاد ہوا قیدِ غلامی سے وطن آج

ہندوستان کی تقسیم پر ہمارے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے غلط طور پر اپنے غصّے کا اظہار کیا ہے۔ گویا ملک کے رہنما جنھوں نے آزادیٔ وطن کی راہ میں بڑے بڑے مصائب جھیلے تھے، ملک کے ساتھ غدّاری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مگر سہیل کی بالغ نظروں سے سیاست کی اُلجھنیں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ اس لئے وہ انگریزوں کی اس چال بازی کی کامیابی کے باوجود بے حد خوش ہیں، کیوں کہ آزادی کی بے بہا دولت ملی ہے۔

ہر چند کہ تربیونت سے چُوکا نہیں صیّاد   پھر بھی تو بہر حال وطن ہو گیا آزاد
قائم ہوئی جمہوریتِ ہند کی بنیاد   اب شوق سے پھولے پھلے ہر نخلِ چمن زاد
پھر سبزۂ بیگانہ سے خالی ہے چمن آج

اس خوشی اور سرمستی میں شاعر بے حال نہیں ہوا ہے۔ ایسے موقع پر جبکہ آزادی کا جشن منایا جا رہا ہے، مجاہدینِ آزادی کا یاد آنا ضروری تھا، چنانچہ وہ ایک ایک مجاہد کو یاد کرتا ہے۔ جو شہیدِ وطن ہوئے اُن کو بھی، اور جو چمن کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں اُن کو بھی۔ کہتا ہے اور کس قدر پتے کی بات کہتا ہے۔

غالب ہوئی طاقت کے مقابل میں سچائی   صیّاد سے چھینی ہے اسیروں نے رہائی
جیتی ہے ہنتوں نے اہنسا کی لڑائی   آزاد کو تیری یک جواہر کو بدھائی
سچ ہو کے رہا دہر میں گاندھی کا سپن آج

وہ زندۂ جاوید وطن کے وہ فدائی   جاں اپنی جنھوں نے رہِ ملّت میں گنوائی
ہمّت نے اُنھیں کی ہمیں ساعت یہ دکھائی   انصاری و اجمل ہوں، تلک ہوں کہ لاجپائی
یاد آتے ہیں ہم سب کو شہیدانِ وطن آج

دنیا سے اُٹھے دادا بھی نہرو بھی نہیں ہیں   نیتا جی خدا جانے کہاں گوشہ نشیں ہیں
پھر بھی یہی کہتے ہیں جو اربابِ یقیں ہیں   جسم اُن کے کہیں ہوں، مگر ارواح یہیں ہیں
اور وہ بھی ہیں اس جشنِ مسرّت میں مگن آج

شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمّد قاسم، مملوک علی اور بھگت سنگھ وغیرہ کو یاد کرنے کے بعد شاعر آزادی کے اوّلین مجاہد سلطان ٹیپو، ظفر شاہ اور جھانسی کی رانی کو مژدۂ جاں فزا سناتا ہے۔

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے   مرحوم ظفر شاہ کے شانے کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے   پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہوں گی اُسی دنیا میں کہیں جھانسی کی رانی   وہ خالدۂ ہند وہ نوشابۂ ثانی
ہے فخرِ وطن جن کی شجاعت کی کہانی   اُن کو بھی سنا جا کے یہ پیغام زبانی
پوری ہوئی آزادیٔ قومی کی لگن آج

مولانا محمد علی برطانوی حکومت سے آزادیٔ وطن کی بات کرنے گئے تو اعلان کر دیا کہ یا تو وہ آزادی لے کر واپس جائیں گے یا وہ جان دے دیں گے۔ بالآخر دوسری بات پوری ہوئی۔ شاعر اُن کو پیغام بھیجتا ہے۔

ہے یاد ہمیں حضرتِ جوہر کا وہ ارشاد   آئیں گے نہ وہ ہند میں جب تک نہ ہو آزاد
کہہ دے کوئی اُن سے کہ ہوئی ختم وہ میعاد   اُجڑی ہوئی محفل ہے کریں اس کو پھر آباد
آ جائیں کہ پورا ہوا وہ عہدِ کہن آج

یہ سب کہتے کہتے شاعر ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ فکر کے آثار بھی چہرے پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُس کا ذہن حال سے ماضی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ آپس کے لڑائی جھگڑے سامنے آتے ہیں، سوچتا ہے مداری تو چلا گیا، مگر اس کی تخریبی کارروائیوں کے نشانات اور اُن کے اثرات لوگوں کے دلوں پر اب بھی باقی ہیں۔ فکر مند ہوتا ہے کہ کہیں ہم آپس میں پھر دست و گریباں نہ ہو جائیں اور ملک کی تعمیر جیسا جاں گسل کام یونہی دھرا نہ رہ جائے۔ اس لئے پہلے وہ راہِ تعمیر کی مشکلات اور کٹھنائیوں کو یاد دلاتا ہے، پھر مذاہب اور زبانوں کے اختلاف کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ ہر مذہب محبت کا پیغام لے کر آیا ہے اور زبانوں کا فرق وطنی اتحاد کے منافی نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اربابِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل   ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوشِ طرب میں کہیں غافل   تخریب تو آسان تھی، تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب ابھی یک جا   اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں یک جا
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں یک جا   ہم سب کا خدا ایک ہے، ہم سب کا نشاں یک جا
پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ چشمِ فسوں گر ہے نہ وہ دورِ شبانہ   کل جو بھی ہوا آج بھلا دو وہ فسانہ
ہر روز نیا رنگ بدلتا ہے زمانہ   اچھا نہیں سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا

لہ پنڈت موتی لال نہرو مرحوم

جائز نہیں آپس میں جبینوں کی شکن آج

وہ دھوم ہو ہندو کا کہ ہو مذہبِ اسلام   جو دیں بھی ہو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام   گھل شیر و شکر ہوں، یونہی کُل ہند کی اقوام

سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ و جمن آج

آخری بند ہے ۔

گو تم نے چراغاں کیا کل ملک میں یکسر   روشن کرو اُلفت کا دیا دل کے بھی اندر
کیوں حرفِ سہیل آج نہ ہر پھیل کے دفتر   اک شاعرہ تھی، ہے صوبے کی گورنر

اُٹھے دلِ شاعر سے نہ کیوں موجِ سخن آج

آزادی کے بعد جو طوفانِ بدتمیزی اُٹھا، اس سے ہر ہندوستانی کی گردن جُھک گئی۔ مگر یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہا جائے۔ بلکہ ضرورت تھی کہ فرقہ پرستی کی ہر طرف جو آگ لگی ہوئی تھی اُس کو بجھانے میں سب ایک جان ہو کر لگ جائیں۔ ایسی باتیں کہنے کے بجائے کہ جس سے عوام کی ہمتیں کمزور ہوں، ایسے پیغام کی ضرورت تھی جس سے لوگوں میں بُرائی کا مقابلہ کرنے کا عزم راسخ پیدا ہو۔ بجائے اس کے کہ حکومت اور قومی رہنماؤں پر جا و بیجا تنقید کی جائے، ضرورت تھی کہ ان کا ہاتھ بٹایا جائے اور تعمیر کا جو بھی کام ہو رہا ہے، اس کو خوب سے خوب تر کیا جائے۔ آزادی کے بعد بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے بڑی بہکی بہکی باتیں کی ہیں اور حکومت کی کمزوریوں کی اس مبالغے اور اس زور شور کے ساتھ تشہیر کی ہے کہ اس کی مثال کسی اور ملک میں نہ مل سکے گی۔ مگر ہمارا شاعر ان باتوں کا ذکر ضرور کرتا ہے اور بڑی ناپسندیدگی کے ساتھ، مگر وہ ان سب کو آثارِ غلامی سے تعبیر کرتا ہے، اور اُمید ظاہر کرتا ہے کہ تاریکی کے یہ بادل چھٹیں گے اور سحر نمودار ہوگی۔ ملاحظہ ہو۔

یہ مانا آج بھی ہر چیز کی بیحد گرانی ہے!   وہی خود غرضیاں ہیں پولیس کی سیوا زبانی ہے
دلوں میں کھوٹ ہے لب پر صفائی کی کہانی ہے   سبق برطانیہ کا ہے، زباں ہندوستانی ہے

نظامِ کہنۂ سرمایہ داری اب بھی قائم ہے
غریبوں کا غمِ بے روزگاری اب بھی قائم ہے

ہنود و پست میں اب تک بھی باہم سرگرانی ہے   زبانوں پر ابھی تک داستانِ پاسبانی ہے
ابھی تک مسلم و ہندو میں کچھ کچھ بدگمانی ہے   زباں کی کشمکش اب تک حجابِ درمیانی ہے

مگر آثار ہیں یہ سب اسی دَورِ غلامی کے
نتیجے ہیں یہ سودائے وطن خواہی کی خامی کے

دھوئیں سے جنگ کے مسموم ہی آب و ہوا اب تک   غبارِ مغربیت سے مکدّر ہے فضا اب تک
دلوں میں زخمِ تقسیمِ وطن کا ہے ہرا اب تک   کئی صدیوں کا کوڑا کچھ نہ کچھ ہی بچ رہا اب تک

مگر یہ سب اندھیرا جلد ہی اب مٹنے والا ہے
اور اس کے بعد صدیوں تک اُجالا ہی اجالا ہے

ذرا یہ بند ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بارے میں شاعر کی یہ پیشین گوئی کہ "تو دنیا بھر میں آزادی کا میرِ کارواں ہوگا" کس قدر صحیح ثابت ہوئی۔

ہمارا دورِ آزادی ہے طفلِ شیر خوار اب تک   کہ دیکھی ہے جہاں میں ایک ہی فصلِ بہار اب تک
رہے حالات گرد و پیش گو ناسازگار اب تک   مگر پھر بھی ترقی ہی پہ ہے یہ ہونہار اب تک

خدا رکھے یہ بچّہ کچھ دنوں میں جب جواں ہوگا
تو دنیا بھر میں آزادی کا میرِ کارواں ہوگا

اسی طرح تیسرے جشنِ آزادی کے موقع پر کہتے ہیں۔

اور آزادی کو گذرے ہیں ابھی تک دو ہی سال
عہدِ ماضی سے کہیں بہتر ہے پھر بھی حالِ ہند
اب عزیزانِ وطن، کوشش یہ ہونی چاہیئے
حال سے بہتر ہی ہوتا جائے استقبالِ ہند
آیئے اب صدقِ دل سے سب کریں مل کر دعا
روز افزوں ہو الٰہی حشمت و اجلالِ ہند
بغض و نفرت سے وطن والوں کے سینے پاک ہوں
دمبدم شاداب تر ہو گلشنِ آمالِ ہند
ایشیا کو اس کے سائے میں حیاتِ نو ملے
ہو نشانِ امن و راحت پرچمِ اقبالِ ہند

آخری شعر میں شاعر نے جو دعا کی تھی، بالآخر قبول ہوئی۔ ہندوستان آج ایشیا کی عزّت و آبرو ہے اور دنیا کے امن کے قیام میں اس نے جو کامیاب کوششیں کی ہیں اُن کا اعتراف دوست دشمن سبھی کو ہے۔

غرض سہیل کی شاعری ایک جاندار اور حیات بخش پیغام کی حامل ہے، وہ خود عزم اور ولولے کی دولت سے مالا مال ہیں، اور ملک کے ہر نوجوان کو اس سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔ مایوسی ان پر بھی آتی ہے۔ تنگ نظری

---

۱ مسز سروجنی نائیڈو

اور فرقہ پرستی سے وہ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ مگر فوراً بول اُٹھتے ہیں۔

سہیلؔ اس چلتی پھرتی چھاؤں سے دل گیر ہونا کیا
یہ دُنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

غرض پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں "اُردو شاعری میں عام طور پر جو ماتمی لے، جو شبنمی نظر، جو فریاد و فغاں، جو مایوسی اور ناکامی ہے، اس کے پیشِ نظر وہ شعراء یقیناً زیادہ احترام کے قابل ہیں، جو عزم و ہمت، سرفروشی و جگرداری، اعتماد و یقین کی دولت رکھتے ہیں، جن کا کلام زندگی اور اس کی چمن بندی کا ایک رجز ہے، جو نہ خود مایوس ہوتے ہیں، نہ پڑھنے والے کو مایوس کرتے ہیں، جن کا لہجہ باوقار اور جن کی آواز پرشکوہ ہے۔ اقبال اور جوش کے علاوہ اس لحاظ سے دو اور شاعر قابلِ ذکر ہیں ـــــ ایک وحیدالدین سلیم دوسرے اقبال احمد سہیل۔"

رُوح افزا بیگم صدیقی

قصیدہ[1]

در تہنیتِ ورودِ مسعود جلالت الملک سلطان سعود خلّد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

لِلّٰہ الحمد کہ آئی ہے وہ پُرکیف بہار
سبزہ و شاداب نظر آتے ہیں دشت و کہسار

قوتِ نامیہ کی باغ میں ہے افزائش
گُل و اثمار سے بھرپور ہیں نجم و اشجار

تختہ بندی و چمن کی ہے کہ سبحان اللہ
باغبانوں کی لیاقت پہ ہیں گلچیں بھی نثار

قمریاں ہیں کہیں شمشاد پہ کوکو میں مگن
ہے کہیں نغمہ سرا طوطیِ شیریں منقار

کہیں گلبُن پہ نواسنج عنادل کا ہجوم
شورِ طاؤس کہیں ہے کہیں پی پی کی پکار

کیا عجب گر ہے یہی مبداءِ فیّاض کا فیض
ہوں جوانانِ چمن جوش میں گرمِ رفتار

ہاتفِ غیب سے آتی ہے یہ کانوں میں نوید
جہتِ قبلہ سے آئی ہے وہ پُرکیف بہار

جس کا نظارہ ہے ہر دیدۂ مومن کو بہشت
جس کے دیدار سے ہر قلبِ مسلماں سرشار

جس سے سیراب ہے یکسر چمنستانِ نبیؐ
جس سے ہے عالمِ اسلام سراپا انوار

اُس شہنشاہ کے مسکن کا ولی آیا ہے
نافۂ نافِ زمیں جس سے ہے فردوسِ تتار

وہ سراپائے تقدس متشرع سلطان
وہ فقیہہ متبحّر وہ امام الابرار

پیکرِ زہد و ورع یعنی وہ سلطان سعود
جس کے ہر پرتو جاں بخش سے ایماں بیدار

جس کی ہر شان سے شاداب شریعت کا چمن
جس کی ہر آن سے آئینہ محمدؐ کا شعار

میرے آقا کے وہ مامن کا مقدس والی
میرے مولا کے وہ مولد کا معظم سرکار

جس کی تقدیس پہ حاشا کہ ہیں دل سے قرباں
جس کی تعظیم کو باللہ ہیں سو جاں سے نثار

فرطِ بہجت سے وہ اب مطلع رقم کر رُوحی
جس پہ قاآنی بھی اَحْسَنْتَ کہے زیرِ مزار

میکدے کی کئے دیتی ہیں ہوائیں سرشار
بے پئے مست ہوئے جاتے ہیں سارے میخوار

ہند پی کر مئے وحدت ہوا ایسا سرشار
سر میں باقی نہ رہا نشۂ نخوت کا خمار

اللہ اللہ وہ سلطانِ حجازی کا وُرُود
ہو گیا غنچۂ دل جس سے گلستاں بکنار

اللہ اللہ وہ ہر گام پہ فردوس نگاہ
سرو و شمشاد و گُل و لالہ و صحنِ گلزار

اللہ اللہ وہ انوارِ تجلّی پیہم
اللہ اللہ وہ رحمت کی مسلسل بوچھار

اللہ اللہ وہ کعبے سے ملائک کا وُرُود
اللہ اللہ وہ قبلہ سے نزولِ اخیار

اللہ اللہ وہ وہ گُلریزیِ مژدانِ ولا
حیدرآباد نظر آتا ہے جس سے گلزار

اللہ اللہ وہ مہمانِ گرامی کا قدوم
میزبانوں کے لئے گلشن و گُل باغ و بہار

عرب و ہند کی اللہ رے ہم آہنگی
اللہ اللہ وہ جذباتِ محبّت کا اُبھار

چمنِ ہند کی بلبل کا ترانہ ہے آج!
فیضِ سلطان سے دیں نخلِ تمنّا اثمار

دوستی ایسی ہو ہند اور عرب کے مابین
جس میں اخلاص و عقیدت کی نہ حد ہو نہ شمار

دونوں قوموں میں اِخوت ہو عداوت کے بجائے
دونوں ملکوں سے محبّت کے رواں ہوں ابحار

فرسِ خامہ کی اب موڑ عناں اے رُوحی
ختم کر نظم کو اب لکھ کے دعا کے اشعار

روشنی دن میں ہو تاریکی ہو شب میں جب تک
صبح اور شام کے جب تک ہیں جہاں میں آثار

قاف تا قاف ہو سلطاں کے قدم سے مسعود
چشمِ بد کا نہ ہو تا حشر قریب اس کے گزار

---

[1] سلطان سعود کے ورودِ حیدرآباد کے موقع پر لکھا گیا۔

یحییٰ اعظمی

آہ اقبال سہیل

اے سہیل اے محفلِ شبلی کی شمعِ آخریں — اے چراغ افروزِ اسلاف و فروغِ باستاں
تابش آموزِ کمال و جلوہ اندوزِ ہنر — آئینہ دارِ سلف گنجینہ دارِ رفتگاں
فیضِ شبلی تھا کمالِ نغز گفتاری ترا — اے نقیبِ نعت! اے روح القدس کے ہم زباں
تھا رہینِ خامۂ استاذ ہر نقشِ قلم — تھی وہی رنگیں طرازی، تھا وہی حسنِ بیاں
تیرے دم سے زندہ تھے دانش کے اسرارِ کہن — تازہ تھی تجھ سے ہنر کی داستانِ باستاں
تیرے لب تھے اور جوشِ بادۂ شیراز تھا — گرچہ می بود آب و گِل از خطۂ ہندوستاں
وہ دبستانِ ادب تھی بارگہ تیری جہاں — سعدی و سلماں نظر آتے تھے سر بر آستاں
تیرے نغموں پہ فدا تھے نغمہ گویانِ عجم — اے گلستانِ وطن کے بلبلِ شیوا بیاں
خاکِ اعظم گڑھ تھی تیرے فیض سے شیراز ہند — ہم سخن حافظ کے عرفی کے حریف و ہم بیاں
نوکِ خامہ سے ترے جاری تھے چشمے شعر کے — صفحۂ قرطاس جس کے فیض سے تھا گل فشاں
اے ازل سے مست و سرشارِ رحیقِ منقبت — موجِ کوثر میں ہمیشہ تر رہی تیری زباں
عمر بھر شیخین کی سرکار میں یہ نذرِ مدح — سرورِ کونین کے دربار میں یہ ارمغاں
مغفرت کے واسطے تیری ہے کافی اے سہیل — کیا عجب بخشے تجھے پروردگارِ دو جہاں
ہے ادب کا نیّرِ اعظم تہِ خاک آہ آج — حشر تک اس کی شعاعیں اب نہ ہوں گی ضو فشاں
فیضِ تابش سے ترے اب ہو گئے محروم ہم — آہ اے خورشیدِ دانش اے سہیلِ نکتہ داں
تھا حریمِ شعر تیرا مرجعِ اہلِ کمال — تشنگانِ فیض تیرے ہوں گے حاضر اب کہاں

یہ نہیں تنہا ترے فیضانِ تابش کا غروب
بلکہ ہے اک آفتابِ شعر و دانش کا غروب

اثر لکھنوی

"حرفِ تمنّا" پر ایک سرسری نظر

"حرفِ تمنّا" حضرت میکش اکبرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے آخر میں چند رباعیاں بھی شامل ہیں۔ موصوف "نقدِ اقبال" کے مصنف ہیں جو ان کی وسعتِ مطالعہ و تبحرِ علمی کی آئینہ دار ہے۔ اقبال پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر جس غائر اور بے لاگ نظر سے حضرت میکش نے اقبال کے کلام و فلسفہ کا تجزیہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حرفِ تمنّا میں ان کے پہلے مجموعے "میکدہ" کا انتخاب بھی شامل ہے حرفِ اوّل یا پیش لفظ میں اُنھوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔

"میرے سامنے ادب کے کئی رجحانات اُبھرے اور مٹے ہیں۔ سیاست اور تہذیب نے کئی پلٹے کھائے ہیں۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کیا ہے ایک تماشائی کی طرح نہیں بلکہ ایک فریق کی طرح اور اس میں سے مجھے جو بھی بہتر معلوم ہوا اسے اپنے ذہن میں سمونے کی کوشش کی ہے.... مختلف زبانوں اور ان کے ادبیات مختلف مذاہب اور فلسفے اور ان کے نظریات کے مطالعے نے مجھے ایک ایسی نظر اور ایک ایسا دل عطا کیا ہے جو سب کے ساتھ ساز کر سکتا ہے اور سب سے ہمدردی رکھتا ہے۔

میرا نظریہ اور عقیدہ وحدتِ کائنات ہے.... جو تمام کائنات سے محبت سکھاتا ہے (اور) کائنات کو حسین تر بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر کا خلاصہ ان کے اس شعر میں ہے ؎

بزمِ جہاں میں کوئی تجلّیٔ دلنواز   بچ کر کبھی گئی نہ ہماری نگاہ سے

مجھے اتنا اضافہ کرنے دیجئے: "تاہم انھوں نے ماضی کی شاندار روایات کو حقارت سے ٹھکرایا نہیں بلکہ ان کا احترام کیا ہے اور فخریہ کہا ہے ؎

میکش کے دم سے تازہ اگلی شرافتیں ہیں   اب آدمی کہاں ہیں اس دل کے اس نظر کے

اسی قدیم و جدید کے امتزاج نے ان کے کردار میں دلکشی اور ان کے کلام میں رعنائی بھر دی ہے۔ ایسا ہی صاحبِ نظر و عالی ظرف ہر بات میں فضا کی وسعت دیکھ سکتا اور خاموشی کو سخن طراز پا سکتا ہے ؎

رات اس محفل کا عالم کیا کہوں   بات افسانہ تھی خاموشی فسوں

ایسا ہی شخص خونِ دل ہونے کے باوصف لالے کی طرح اپنی رعنائیاں نہیں کھوتا بلکہ دعوتِ نظر دیتا ہے کیونکہ اس کا دلِ داغ داغ سہی خوں "نظرگاہِ حیا" نہیں بلکہ شبستانِ محبت ہے ؎

ہم نے لالے کی طرح اس دور میں   آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

صفحہ ۱۴ پر جو غزل ہے اس میں خیال کا تسلسل اور ماضی و حال کا تقابل ہے مگر اس تضاد سے جو درس حاصل کیا گیا ہے اس ماضی کا ماتم نہیں بلکہ ؎

خود سے زیادہ اب مجھے اوروں کی فکر ہے   جب خود ہی گم تھا میں وہ زمانہ گزر گیا

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان عیش و عشرت میں پڑ کر بھول جاتا ہے کہ زمانہ گردش بدلے گا یا نئی آسانی کے علاوہ سماج کے بھی کچھ حقوق اس کے ذمے ہیں۔

ایسا شخص زمانے کا شکوہ سنج نہیں ہوتا بلکہ اس طرح اپنے دل کو تسکین دیتا ہے ؎

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں   ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں

وہ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور کسی کو چشمِ حقارت سے نہ دیکھنے کی اس طرح تعلیم دیتا ہے ؎

غبار آلود چہروں پر نہ جانا   انھیں میں کیقباد و جم بہت ہیں

ایسے شخص کا غیور ہونا لابد ہے ؎

مجھے کچھ ساز ہے نشتر سے ورنہ   مرے زخموں کے یاں مرہم بہت ہیں

وہ مخالف ماحول میں بھی ہمت نہیں ہارتا اور مایوس نہیں ہوتا کیونکہ اسے اعتماد ہے کہ ایک بہتر زمانہ آنے والا ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ "افسوس

ہم نہ ہوں گے" بلکہ اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتا ہے ؎

خزاں میں آئے بیٹھے خاک گل پر سوئے کانٹوں پہ
سلام اپنا بھی کہہ دینا جو گلشن میں بہار آئے

وہ خیالی انقلاب کا قائل نہیں جس کے بیشتر زعمائے عصر مرید ہیں۔ اور وہ ہنکارتے یا بغلیں بجاتے ہیں بلکہ میٹھے بولوں میں کہتا ہے ؎

یہ کہنہ جام و ساغر کیسے بدلیں۔ ہاں مگر ساقی
تری محفل میں آئے انقلاب اور بار بار آئے

یعنی یہ انقلاب کے خیر مقدم کو تیار ہے مگر حالات حاضرہ کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرنا اور ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے دوسرے ملکوں کے خواب نہیں دیکھتا۔

ایسے شخص کی محبت میں (وہ کسی فرد کی ہو یا جماعت کی ہو) ذاتی غرض یا خواہشات کا لگاؤ نہیں ہوتا بلکہ شان سپردگی و ایثار پائی جاتی ہے ؎

یہ جبر و اختیار عشق ہے تم اس کو کیا سمجھو
رہے گا دل پہ کب قابو جو تم پر اختیار آئے

ایسی پر مغز اور اشاراتی شاعری میں ترشے ہوئے ہیرے کی طرح کئی پہلو ہوتے ہیں۔ غالباً اس شعر سے اندازہ ہوگا جو ہر لحاظ سے ایک شاہکار ہے ؎

ہزار صبحیں شب انتظار میں دیکھیں
کہ جو چراغ جلایا وہی بجھا ڈالا

یہ اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اس کی لطافتیں بیان کرنے کو دفتر درکار ہے۔ چراغ کا گل ہونا سحر کی علامت ہے۔ جب چراغ بار بار جلایا اور بجھایا تو ہر دفعہ ایک نئی صبح طالع ہوئی مگر شب انتظار بدستور قائم رہی۔ اگر چراغ جلانے اور بجھانے سے سعی و تدبیر کے پہلو بدلنا مراد لیجئے اور شب انتظار کو مصیبت اور محرومی کی رات سمجھئے تو اور ہی سماں پیش نظر ہوتا ہے۔

ایسا ہی نغز و نازک یہ شعر ہے ؎

ایسا بھی انقلاب جہاں میں ہوا نہیں
دن ہو گیا ہے اور اندھیرا گیا نہیں

یا یہ شعر لیجئے ؎

آج اپنے آشیانے میں بلبل ہے بے وطن
صیاد کے بھی عہد میں ایسا ہوا نہیں

یہ اشعار آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ؎

بغیر گریۂ بلبل ہنسا نہ گل کوئی
بغیر جہد کے بدلا گیا نہ کوئی نظام
کوئی یقین کبھی محکم نہ بے عمل کے ہوا
کہ بے عمل کے یہ سارے یقین ہیں اوہام

زبان شعر و نغمہ میں کیسے کیسے رموز و نکات بیان ہوئے ہیں اور کیسی جینے کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ پھر جو کچھ ہو بربنائے محبت و آشتی ہو۔ اس کے بغیر محض نمائش و ریاکاری رہ جاتی ہے ؎

اگر جنون محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر و فکر یہ صوم و صلوٰۃ یہ احرام

زمانے پر حکیمانہ نظر رکھنے اور لکیر کا فقیر نہ ہونے کی تعلیم ؎

کوئی اور ترانہ لے مطرب اب ان گیتوں کو کیا گانا
وہ دھن بھولی وہ سُر بدلے وہ ساز ہٹے وہ گیت گئے

وحدت کائنات کی مثال دیکھئے جس کی طرف حضرت میکش نے حرف اوّل میں اشارہ کیا ہے ؎

اتنے فاصلے سے تو موج بھی ہے دریا بھی
ڈوب کر کوئی دیکھے موج ہے نہ دریا ہے

اس میں "ڈوب کر" کی بلاغت قابل داد ہے۔

ابھی "حرف تمنا" کے گیارہ صفحے بھی تمام نہیں ہوئے۔ بقول غالب سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے۔

اب مختلف موضوعات پر چند شعر سن لیجئے۔

تم مضطرب نہیں مرے حال تباہ سے
دیکھو ذرا نگاہ ملا کر نگاہ سے

وہی ناقدری ارباب صفا آج بھی ہے
دار و زنجیر صداقت کا صلا آج بھی ہے
اٹھ گئے غیر کبھی کے تری محفل سے مگر
رنگ محفل کا ہمیشہ سے جو تھا آج بھی ہے
میں نے گلشن کے لئے آپ کو بدلا لیکن
مجھ سے بدلی ہوئی گلشن کی فضا آج بھی ہے

جو کسی پہ آپ نہ کر سکے مجھے اس جفا کی تلاش ہے
رہے جس سے آپ بھی بے خبر مجھے اس ادا کی تلاش ہے

جس نامے کو لکھا تھا تمنا نے عمر بھر
خود تھا ہی کیا وہ حسرت پیغام کے سوا

چمن میں سب سے ملی اور گزر گئی سب سے
لئے ہوئے تھی مری خو نسیم مست خرام

فقیہہ! ہیچ ہے میکش سے تیری ہر حجت
وہ آپ اپنا مقلد ہے آپ اپنا امام

نہیں وقت کے مطابق یہ مزاج منعمانہ
تو بدل دے اپنی خو بھی کہ بدل گیا زمانہ

نہیں تیرا زعم رندی ابھی معتبر کہ تیری
نہ نگاہ عارفانہ نہ مزاج باغیانہ

حسن ہو گیا آخر عشقِ رائگاں اپنا
بن گیا نشان ان کا مٹ کے ہر نشاں اپنا

تلخی جو مرے دل میں غم عشق نے گھولی
وہ میں نے تمنا کی حلاوت میں سمو لی

تیری خاموشی نے خودداری سکھائی ہے مجھے
ورنہ درد عشق سر سے پاؤں تک پیغام تھا

افتادِ طبع اہلِ محبت نہ پوچھئے
وہ مسکرائے بھی تو یہاں جی دہل گئے

عجیب طرح محبت میں انقلاب ہوا
نگاہ شوق ہوئی شوق اضطراب ہوا

ترے شباب نے یوں دی مری نگاہ کی داد
ستارہ چاند ہوا، چاند آفتاب ہوا

رنگِ شفق میں جیسے ڈوبا ہوا ہو دریا
وہ ان پہ سر سے پا تک چھایا ہوا تبسم

کیوں نگاہِ مہر کی تو نے دلِ ناکام پر
ایک منظر یاس کا تھا وہ بھی ویراں ہو گیا

جس طرح ترے لب پر عنوانِ بہار آیا
اس شان سے گلشن میں کس روز بہار آئی

(عنوانِ بہار تبسم کی تاویل ہے)

میں ہوں یوں زیبِ خانہ ویرانی
ہو شفق جس طرح پہاڑوں میں

چند ابتدائی مشق کے نمونے

اب نہ بولوں گا جو مرضی نہیں تیری لیکن
بات کرنی مری تمہید شکایات نہ تھی

لحد میں ساتھ لئے جا رہا ہوں اے میکش
گلے لگانے کی حسرت گلے لگائے ہوئے

پھر رہی ہے وہ بزم آنکھوں میں
یادِ صحبت بھی خوب صحبت ہے

غایت قرب ہوا وجہِ حجاب
کاش کچھ دور وہ ہم سے ہوتا

تیور چڑھے ہوئے ہیں نظریں جھکی ہوئی ہیں
زلفیں کھلی ہوئی ہیں آنچل ڈھلا ہوا ہے

سب کی نظر بچا کر میں اس کو دیکھتا ہوں
میری نظر بچا کر وہ مجھ کو دیکھتا ہے

دل میں پہلے تمنا کی خلش کچھ کم نہ تھی
اور آفت ہو گئے تم مہرباں ہونے کے بعد

یہ محض سرسری انتخاب ہے۔ ایسے ایسے نہ معلوم کتنے جواہر پارے اس مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں مگر بقول عشرتی ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ جن بحروں میں آج کل کے بعض نامور شعراء موزوں شعر نہیں کہہ سکتے میکش صاحب نے عروض سے کامل واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک غزل صفحہ ۷۶ پر ہے جس کا مطلع ہے ؎

میں ہوں لازم الفت کو مجھ کو لازم الفت ہے
میں ہوں اپنی ضرورت سے مجھ سے میری ضرورت ہے

اس بحر کے مقررہ اوزان ہیں۔ فاع فعولن فاع فعولن فاع فعولن فعلن فع (فاع فعولن کی جگہ فعلن فعلن بسکون عین بھی آتا ہے۔ اور کتنے ہی زحافات ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ آٹھ شعر کی غزل ہے۔ میکش صاحب نے قریب قریب سبھی زحاف صرف کئے ہیں) انھوں نے بحر کی تقسیم اس طرح کر دی ہے۔ فاع فعولن فعلن فع فاع فعولن فعلن فع اور یہ قواعد عروض کی رو سے بالکل درست ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ فانی مرحوم کے سوا اس بحر میں کسی نے طبع آزمائی نہیں کی۔ اُن کی غزل جس کا یہ مصرع ہے اسی بحر میں ہے "دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے"۔

مجھے صرف تمنا میں جستہ جستہ زبان کے مسلمہ اصول سے انحراف بھی ملا۔ مثلاً "تمنیٰ بے انتہا" بجائے تمنائے بے انتہا "علحدہ" (بلا الف) بجائے علیحدہ۔ اس قسم سے بحث بے کار ہے کیونکہ حرف اول میں میکش صاحب کا اعلان ہے کہ وہ الفاظ کے ترک و اختیار میں کسی کے مقلد نہیں۔ ان کی زبان ان کی اور ان کے شہر کی زبان ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایسی اپج عام ہوئی تو زبان بھانت بھانت کی بولیوں کا مجموعہ بن کر اپنی لطافت کھو بیٹھے گی۔

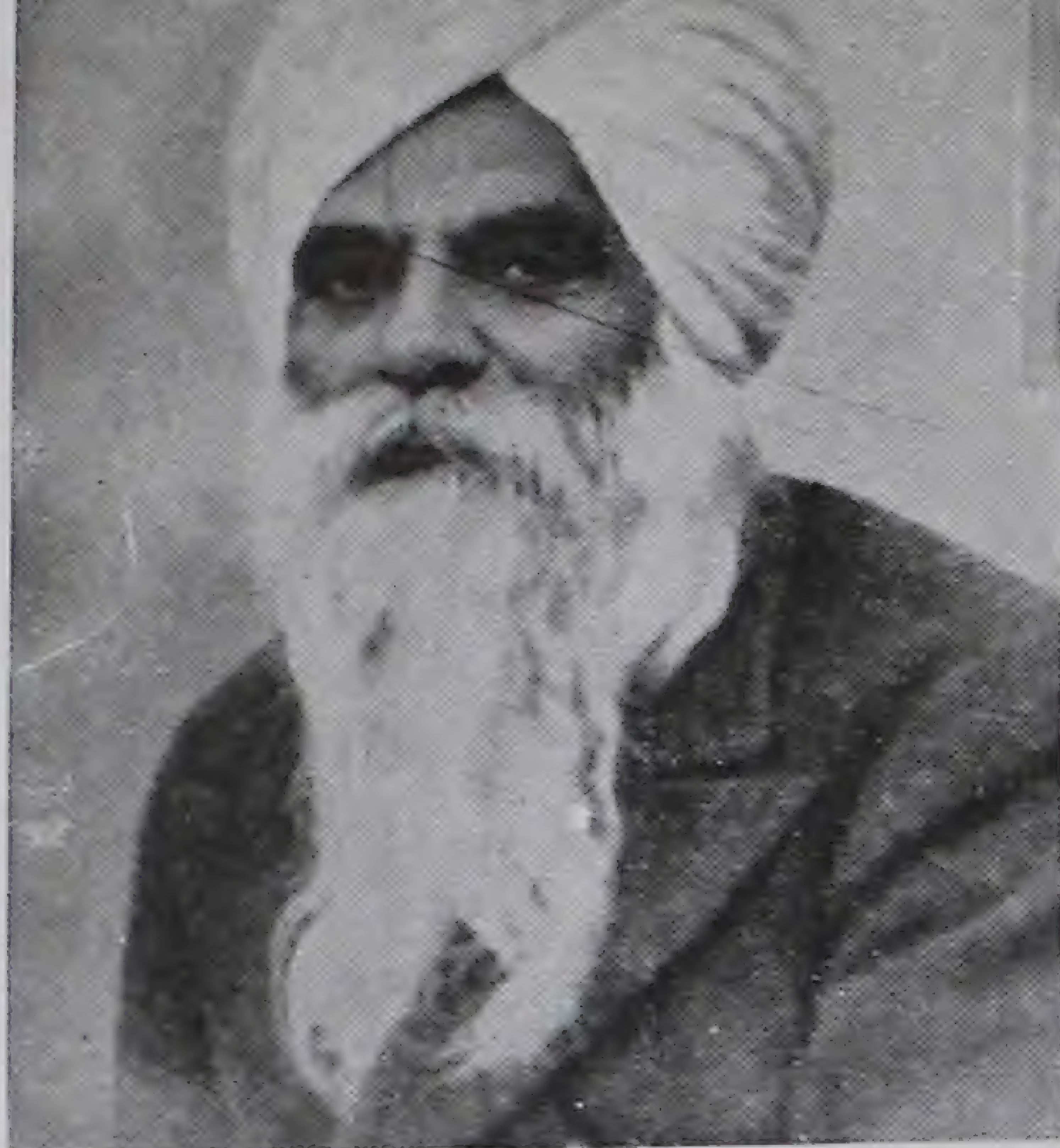
اگر زندگی نے مساعدت کی اور صحت نے اجازت دی تو نظموں کے متعلق علحدہ مضمون لکھوں گا۔

معلومات اور اعداد و شمار

۱۔ فصل رواں میں ۱۵ لاکھ ۸۶ ہزار ٹن چینی کی پیداوار کی بدولت ملک میں چینی کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ اس سال کی پیداوار ۵۲-۱۹۵۱ء کی ریکارڈ پیداوار سے بھی ۸۷ ہزار ٹن زیادہ رہی۔

۲۔ کنٹرول کی تنسیخ کے بعد ملک میں صرف کے لئے سفید چینی کی مانگ ۱۹۵۲ء کے اخیر میں دس لاکھ ٹن تھی۔ جو ۵۴-۱۹۵۳ء میں ۱۸ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن تک بڑھ گئی ہے۔

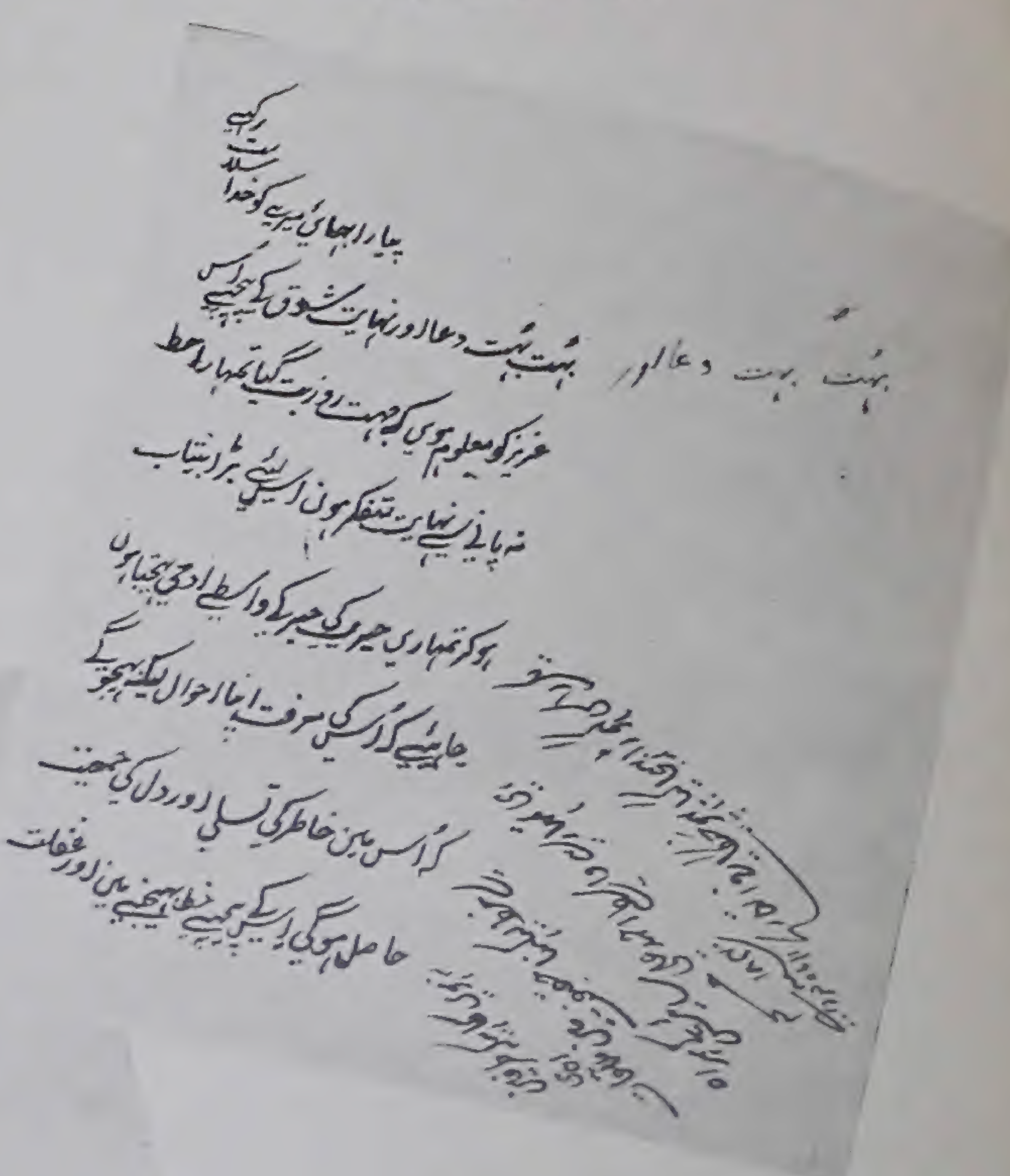
۳۔ گزشتہ سات سال کے دوران میں بحالیات کی مالی تنظیم نے مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے رفیوجیوں کو ۲ کروڑ ۵۷ لاکھ ۸۷ ہزار روپے کے قرضے دئے۔ مغربی پاکستان سے آنے بے گھر لوگوں کو ۶ کروڑ ۹۳ لاکھ ۷۵ ہزار روپے کے قرضہ جات دئے گئے۔



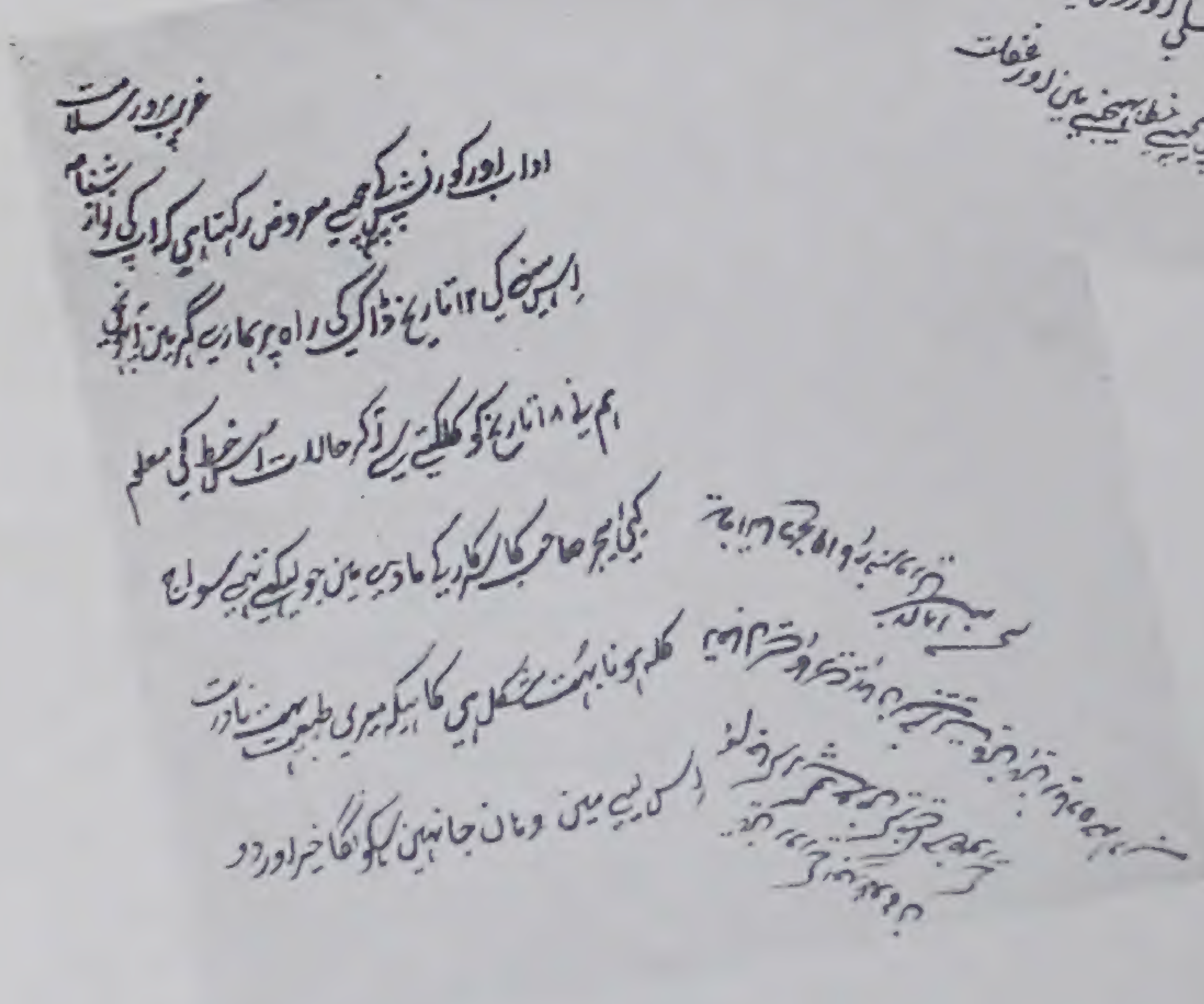
بھائی ویر سنگھ

پنجابی کے مشہور شاعر آپ کو حال ہی میں پدم بھوشن کا اعزاز ملا ہے

جان رائی لینڈ لائبریری مانچسٹر میں ۱۸۴۰ کے لکھے ہوئے
اردو خطوں کے نمونے



بہت بہت دعا اور
پیارا بھائی میرے کو خدا سلامت رکھے
بہت بہت دعا اور نہایت شوق کے پیچھے اس
عزیز کو معلوم ہوئی کہ بہت روز بیت گیا تمہارا خط
نہ پایا نہایت متفکر ہوں اس لیے بڑا بیتاب
ہو کر تمہاری خیر کی خبر کے واسطے آدمی بھیجتا ہوں
چاہیے کہ اس کی معرفت اپنا احوال لکھ بھیجو گے
کہ اس میں خاطر کی تسلی اور دل کی جمعیت
حاصل ہوگی اس کے بھیجنے میں اور غفلت



عزیز برادر سلامت
ادا اب اور کورنش کے پیچھے معروض رکھتا ہے کہ آپ کی آواز شام
اس مہینے کی ۲۱ تاریخ ڈاک کی راہ پر ہمارے گھر میں آ پہنچی
ہم نے ۱۸ تاریخ کو کھلا کے پڑھ کر حالات اس خط کی معلوم
کی ہم صاحب کا کار کا مادہ میں جو لکھے ہیں سو لکھ
کلہ ہونا بہت مشکل ہے کاہے کہ میری طبیعت بہت نادرست
اس بیچ میں وہاں جا نہیں سکوں گا خیر اور دو



اقبال احمد صاحب سہیل

آپ کی سیاسی شاعری پر عبداللطیف اعظمی کا مضمون
اسی شمارے میں شامل ہے



کنچن جنگا دارجیلنگ سے



نینی تال

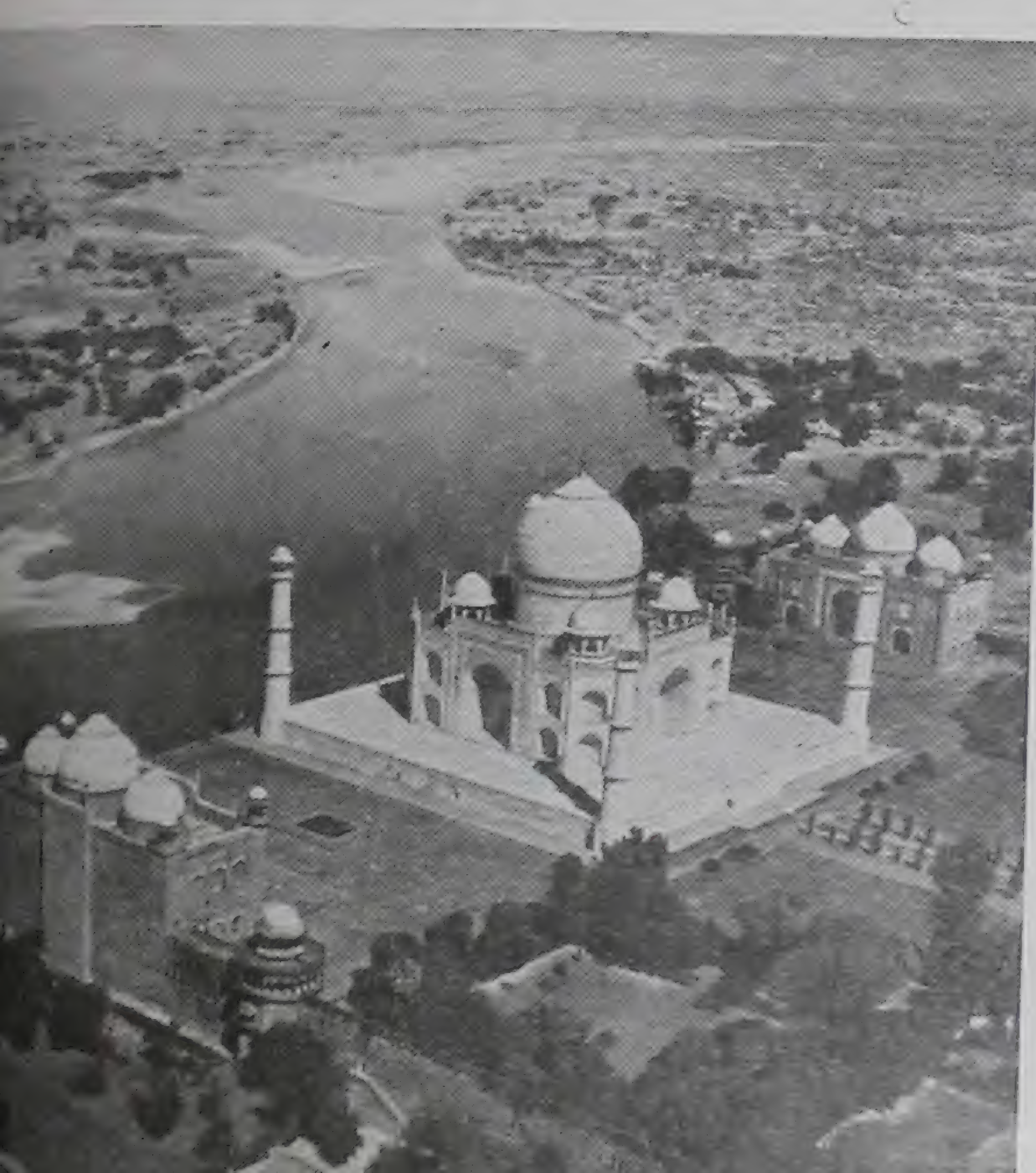
گلمرگ کشمیر

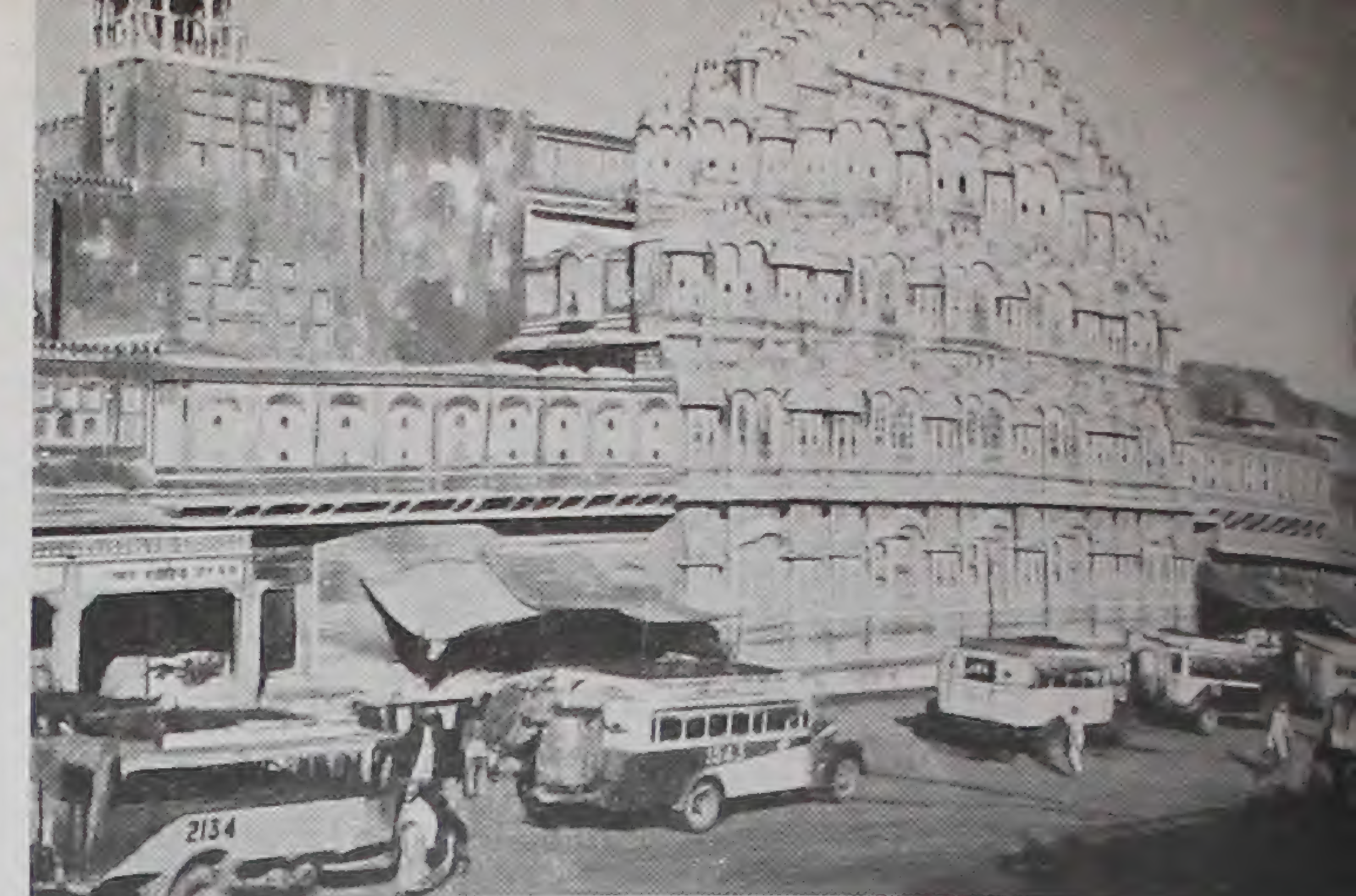


انا اودے پور کے محل سے جل محل اور پچھولا جھیل کا منظر



تاج محل





جے پور کا هوا محل



قطب مینار دهلی



کونارک مندر میں گھوڑے کا بت



کیلاش مندر
ایلورا

بمبئی کا منظر سمندر سے





اوٹاکمنڈ



تنجور کا مشہور مندر

تنویر احمد علوی

کرۂ ارض

یہ فضاؤں میں معلق ہوا خاکی ذرّہ
ماہ و انجم کی طرح جس میں درخشانی ہے
اور یہ قوس و قزح کا متلوّن نقطہ
جس میں خود قوس و قزح کی سی گل افشانی ہے

مادّہ کا یہ فسوں جوہرِ ہستی کا طلسم
جس میں بے جان عناصر نے نمو پایا ہے
خام تھی خوشۂ انجم میں جو صہبائے حیات
پختہ ہونے کو جہاں اس نے سبو پایا ہے

صدفِ کون و مکاں کا یہ شہابی قطرہ
جس کی تقدیر میں تھا گوہرِ غلطاں ہونا
کشتِ آفات میں سویا ہوا یہ تخمِ حیات
جس کی طینت تھی سمن زار و گلستاں ہونا

یہ جمادات و نباتات کی کثرت یہ ہجوم
اور یہ انسان یہ حیوان یہ طائر یہ وحوش
ارتقاء کا یہ تسلسل یہ تغیّر کا عمل
زیست کے سلسلۂ لامتناہی کے نقوش

جس میں صحراؤں کی وسعت تھی وہی ذرۂ خاک
جس میں کہساروں کی عظمت تھی وہی نقطۂ نور
جس کے سینہ میں سمندر تھے وہی قطرۂ آب
ہاں وہی تخم کہ خود جس میں تھے خرمن مستور

اس کی یہ فطرتِ آزاد یہ روحِ معصوم
ذہن کو جس نے فرشتوں کا تصوّر بخشا
اس کے سینے میں مچلتے ہوئے شیریں چشمے
جس نے انساں کو بہشتوں کا تصوّر بخشا

یہ حسیں چاک کہ مے خانۂ ہستی کے لئے
جس پہ صورت گر صانع نے تراشے ہیں ایاغ
اور یہ رقص یہ گردش یہ سفر یہ رفتار
جس میں ہر گام پہ جلتے ہیں ستاروں کے چراغ

ہاں یہ سیّارۂ سیمینِ نظامِ شمسی
جس کی قسمت پہ ستاروں کو بھی رشک آتا ہے
دامنِ موجِ ہوا میں یہ مہکتا ہوا پھول
جس پہ جنّت کی بہاروں کو بھی رشک آتا ہے

کہیں ایسا نہ ہو یہ جنّتِ ارضی اے دوست
ایٹمی عہد کے شعلوں سے جہنم بن جائے
امن کی گود میں تہذیب کے گہوارے میں
زندگی سر بسر اک سلسلۂ غم بن جائے

حبیب الرحمٰن غزنوی

گجراتی زبان و ادب

پر

عربی فارسی اور اردو کے اثرات

(۱)

گجراتی زبان و ادب پر اُردو، فارسی کے اثرات کا ذکر ہم اُس مسافر کی طرح کر رہے ہیں جو زبان و ادب کی شاہراہ کے اُس سنگِ میل پر کھڑا ہو جہاں سے گذری ہوئی منزلوں کے نشان بھی نظر آتے ہوں اور آنے والی منزلیں اُسے اپنی طرف کھینچتی بھی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نئی چیز میٹھی ہوتی ہے، لیکن پکا آم اور پُرانا چاول بھی ذائقہ میں کچھ کم نہیں ہوتا۔ جدّت، تنوّع اور ترقّی کے اس دور میں گڑے مُردے اُکھاڑ کر اُن کا معائنہ اور مشاہدہ کرنا بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ صرف حال کے آئینے میں مستقبل کی پیش پا اُفتادہ خیالی صورت دیکھ کر ہی مگن ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ کے اُن کِرم خوردہ اوراق کا مطالعہ نہیں کرتے جس میں تمدّن، زبان اور ادب کی وہ قدریں محفوظ ہیں جو ہماری موجودہ معاشرت اور مدنیت کی سر بفلک عمارتوں میں بنیادی اینٹوں کی طرح جمی ہوئی ہیں۔

دراصل دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زندگی کے آخری مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں، یہ سمجھے بغیر کہ انھوں نے صحیح معنوں میں ابھی تک جینا بھی شروع نہیں کیا ہے! ان سے اگر پوچھا جائے کہ "ہمارے آنے سے پہلے دنیا کیسی تھی؟" تو وہ یہی جواب دیں گے کہ "جیسی وہ ہمارے چلے جانے کے بعد ہوگی"___ ان کے نزدیک جینے کے معنی ہیں ___ "یہ بھول جانا کہ کبھی ہمیں مرنا ہے ___" اور مرنے کے معنی ہیں ___ "یہ بھول جانا کہ کبھی ہم جئے تھے!" ___ ہو سکتا ہے کہ زندگی کا یہ مطمحِ نظر بادی النظر میں دلچسپ اور خوش گوار نظر آئے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل زندگی کی سچی خوشی کا سرمایہ اُس کی پُرانی یادوں میں پنہاں ہوتا ہے۔ زندگی کی گذرنے والی گھڑی سے ہم کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ البتہ خوشی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ گھڑی گذر جاتی ہے، اور اس کی دیرپا یاد باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں مستقبل عدمِ محض ہے، اور ماضی ایک زندہ حقیقت! چنانچہ جو زندہ ہے وہ ہمیشہ سے زندہ تھا، اس کی زندگی لامتناہی ہے کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ البتہ زندگی کا مستقبل کسی نہج پر منتج ہوگا، اس کا دارومدار حالات و حوادث کی اُن کروٹوں پر منحصر ہے جو بطنِ مستقبل میں پوشیدہ ہیں جن کے متعلق ہم کوئی صریح حکم اُس وقت نہیں لگا سکتے۔

دو ہزار سال قبل

گجراتی زبان و ادب کی تعمیر و ارتقاء میں جن حالات و حوادث نے اہم رول ادا کیا ہے ان کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں دو ہزار سال پیچھے جا کر کچھ گڑے مُردے اُکھاڑنے ہوں گے۔ کیونکہ ہم خود جو عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں اس کا کوئی واضح اور مکمل نقشہ جب تک ہمارے سامنے نہ ہو، اُس وقت تک تعمیر و تخلیق کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے قبل گجراتی زبان کا تجزیہ کیا جائے، اور اس کے ارتقائی مدارج کو سامنے لایا جائے۔ ایک عربی مقولہ ہے "کُلُّ شَیْءٍ یُعْرَفُ بِاَضْدَادِهَا" یعنی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اور جہاں تک ہمارا خیال ہے ہر شے کا پس منظر ہی اس کے حق میں ضد اور عکس کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس مسئلے کی ابتدا گجراتی زبان کے اُس پس منظر سے کر رہے ہیں جس میں اس کے صحیح خد و خال نظر آ سکیں۔

قوم خزر

قرآنِ کریم کے پندرھویں پارے میں یاجوج و ماجوج کا ایک قصہ بیان ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سکندر (متوفی ۳۲۳ ق م) جب بحرِ خزر کے قریب پہنچا تو وہاں کی ایک قوم نے اس کے دربار میں آکر فریاد کی کہ یاجوج و ماجوج ہر سال ٹڈی دل کی طرح ہمارے علاقے پر حملہ بول دیتے ہیں اور ہمارے کھیت اور بستیاں پامال کر کے ہمیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سکندر نے یاجوج و ماجوج کی گذرگاہ کے درمیان ایک آہنی دیوار بنوا دی تاکہ وہ وحشی اور خونخوار لوگ اس طرف نہ آسکیں۔ یہی دیوار تاریخ اور افسانوی ادب میں سدِ سکندری کے نام سے موسوم ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ سکندر ذوالقرنین تھا فیلقوس یونانی کا بیٹا سکندر نہ تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو تاہم کردار کے ناموں کی تبدیلی سے نفسِ واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سکندر ذوالقرنین ہو یا فیلقوس یونانی کا بیٹا سکندر ہو، بہرحال جس واقعہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ اپنے اندر صحت ضرور رکھتا ہے۔

نظامی گنجوی نے بھی اس واقعہ کو سکندر نامہ میں اس طرح نظم کیا ہے۔

دریں پاسگہ رخنہائے کہ ہست — عمارت کنند تا شود سنگ بست
مگر ز آفت آں بیابانیاں — بہ راحت رسد کار خزرانیاں
بہ فرمود شہ تا گذرہائے کوہ — بہ بندند خزرانیاں ہم گروہ[1]

ان اشعار میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ نیز ان اشعار میں جو لفظ "خزرانیاں" آیا ہے، اس سے وہی قوم مراد ہے جو بحرِ خزر کے قرب و جوار میں آباد تھی۔ اور ممکن ہے اسی بحرِ خزر کی مناسبت سے یہ قوم خزرانی کے نام سے موسوم ہو گئی ہو — بحرِ خزر دراصل وہی سمندر ہے جسے ہم آج کاسپین کے نام سے جانتے ہیں — اس کا محلِ وقوع ترکستان کا وہ شمالی علاقہ ہے جو ایران کی حدود میں واقع تھا اور اس وقت روس کے ماتحت ہے۔

خزر سے گُرجر

خزر قدیم فارسی (سکزی) زبان کا لفظ ہے۔ یہی لفظ عربی کا جامہ پہن کر جزر بنا۔ اور پھر عربی سے فارسی میں منتقل ہوتے وقت "ج" "گ" سے بدل کر گزر بن گیا۔ آج بھی بحیرۂ کاسپین کی مغربی سمت کوہ قاف کے دامن میں جارجیا نامی جو علاقہ آباد ہے اُسے گرجستان بھی کہتے ہیں۔ اس علاقے کا یہ نام اُسی قوم خزر یا گزر کی مناسبت سے مشہور ہوا جو یہاں آباد تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہی نام گزر سے گرجر بن گیا۔

گجراتی زبان کی بنیاد فی الحقیقت یہیں سے دستیاب ہوتی ہے۔ کیونکہ گجراتی آج سے کچھ عرصہ قبل گرجری کہی جاتی تھی۔ اب سوال رہ جاتا ہے گجرستان اور گجرات کے باہمی تعلق کا؛ تو اس کا جواب تاریخ کے اُن ابواب سے مل جاتا ہے جن کا لب لباب ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اسی جواب میں گجراتی زبان کے ارتقائی مدارج کا حال بھی ضمناً شامل ہے۔

آریوں کی ابتدائی ہجرت

نسلی اعتبار سے گرجروں کا تعلق اُن آریہ اقوام سے پایا جاتا ہے جو تین ہزار سال قبل مسیح دریائے جیحون و سیحون کے اُس پار آباد تھیں۔ اُن علاقوں میں آریوں کا وجود زمانۂ قبل از تاریخ میں بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن تین ہزار سال ق م میں یہ قومیں انتقالِ سکونت کر کے جیحون و سیحون کے وسطی علاقہ میں آ بسیں، اور پھر ان کے بعض قبیلے افغانستان اور ایران کی طرف آگے بڑھے، اور رفتہ رفتہ خیبر اور قندھار اور بلوچستان کی راہ سے سرزمین ہند پر آ پہنچے۔ مؤلف تاریخ افغانستان اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"در ازمنۂ قبل التاریخ نژاد سفید (آرین) در آسیائے وسطی زندگی میکرد۔ و در ۳۰۰۰ ق م اراضی واقعہ مابین جیحون و سیحون را مسکن قرار دادند۔ و بعدہا رختِ سفر بافغانستان کشیدہ، نخست در ولایت باختر (بلخ) اقامت اختیار کردند۔ و متعاقباً از جہت کثرتِ نفوس و قلتِ جائے از راہ ہائے شمال و مشرق، و شمال و مغرب بہ سائر وادی ہائے افغانستان از قبیل آریانہ (ہرات) اپارتیا (خراسان و غور) اورکیشیا (بلوچستان) اراکوسیا (قندھار) تخارستان (بدخشان و قطغن) بولورستان (چترال) گندھارا (پشاور و کابل) پاکتیا (ولایات جنوب و مشرق) اندس (سندھ) ژت گوش (پنجاب) و کشمیر پراگندہ و منقسم گردیدند۔"
(تاریخ افغانستان صفحہ)

---

[1] سعدی نے بھی لکھا ہے ع سکندر بدیوار روئین و سنگ — بکرد از جہاں راہ یاجوج تنگ (ادارہ)

آریوں کی اس ابتدائی ہجرت اور انتقالِ سکونت میں گوجر شامل نہ تھے، بلکہ وہ تو بدستور اپنے علاقے میں آباد تھے۔ البتہ جب آرین قبائل ایران، افغانستان اور ہندوستان میں آکر بس گئے اور یہاں انھوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ اس سے کم وبیش ۳½ ہزار سال بعد گرجروں نے اپنے وطن سے انتقالِ سکونت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جب یہ لوگ آگے بڑھے تو جو لوگ ان سے صدیوں قبل آکر ایران، افغانستان اور ہند میں آباد ہو گئے تھے وہ نسلی اعتبار سے آرین ہونے کے باوجود گرجروں کے لئے غیر اور اجنبی تھے۔ ہر جگہ اُنھوں نے ان گرجروں کا مقابلہ کیا۔ بعض اوقات اُنھیں پسپا بھی کیا اور بعض اوقات ان سے مغلوب بھی ہوئے۔ یہ لوگ گرجستان سے اپنی قدیم زبان کو ساتھ لے کر چلے تھے۔ مگر جن جن ممالک میں پہنچے وہاں کی زبانوں سے اُن کی زبان متاثر ہوتی گئی۔

گرجستان سے گجرات تک

ایران کی سرزمین پر یہ قوم سب سے قبل ساسانی نسل کے بادشاہ قباد (سنہ ۴۸۸ء لغایت سنہ ۵۳۱ء) کے عہد میں نمودار ہوئی۔ مگر ایرانیوں نے ان کا یہ حملہ پسپا کر دیا۔ البتہ جب نوشیرواں نے ترکوں کی مدد سے سنہ ۵۶۵ء میں ہُنوں کی قدیمی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تو ہُن اور ان کے حلیف گرجروں کے لئے دوسرے راستے کھل گئے۔ ایران کے مختصر دوران قیام میں گرجروں کی زبان پر کئی ایک قدیم فارسی زبانوں کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ ایران سے گرجروں اور ہنوں نے ہندوستان کا رُخ کیا اور یہاں کے سرسبز و شاداب میدانوں میں ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ گرجر قوم ہُنوں کی معیت میں پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے درمیان ہندوستان پہنچی تھی۔ یہ لوگ ابتداءً شمالی مغربی سرحد اور پنجاب ہی میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں ان کی بود و باش اگرچہ زیادہ عرصے نہیں رہی۔ تاہم تاثرات کے لحاظ سے پنجاب اور سرحد میں ان کا قیام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ پنجاب کے گوجرانوالہ اور گجرات نامی شہر انھیں کی یادگار ہیں۔

سرحد و پنجاب میں قیام کے بعد یہ لوگ آگے بڑھے اور چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں مشرقی راجپوتانہ، مالوہ اور آبو کے اطراف میں پھیل گئے۔ یہاں انھوں نے اپنی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا اور پھر رفتہ رفتہ دریائے نربدا اور سوراشٹر تک کا تمام درمیانی علاقہ اُنھوں نے فتح کر لیا۔ ساتویں سے نویں صدی عیسوی تک بھن مال (آبو کا شمالی مغربی علاقہ) گرجر علاقے کے نام سے موسوم تھا۔ مشہور چینی سیاح ہیوآن سانگ نے ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں اس علاقے کی سیاحت کی تھی۔ چنانچہ اُس نے بھی اس علاقے کو گرجر علاقے کے نام سے یاد کیا ہے۔

نویں اور دسویں صدی کے عرب مسلمان سیاحوں کے سفرناموں میں بھی "جُزر" لفظ ملتا ہے۔ دراصل یہ اسی لفظ گرجر کا معرب ہے۔ اُس زمانے میں مارواڑ کی شمالی سرحد سے لگا کر لاٹ کی شمالی سرحد تک کا علاقہ "گرجر پردیش" کے نام سے مشہور تھا۔ رفتہ رفتہ یہی گرجر دیس آگے چل کر "گجرات" کے قالب میں ڈھل گیا۔

گرجروں کی زبان

گرجر— اپنے ساتھ سکزی اور ہروی زبان بھی لائے تھے۔ جو اُن دنوں عام طور پر سیستان، ہرات اور ترکستان کے بعض علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ گجرات پہنچتے پہنچتے اس زبان پر کئی ایک غلاف چڑھ چکے تھے۔ گرجروں نے اس طویل سفر میں جہاں جہاں قیام کیا اُن علاقوں کی مروجہ زبانوں سے ان کی زبان متاثر ہوتی گئی، اور اسی طرح ان کی زبان نے وہاں کی زبانوں کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ گجرات میں ان کی آمد کے بعد ان کی زبان گرجری کے نام سے مشہور ہوئی۔ گجرات کی یہ گرجری کوئی خالص زبان نہ تھی، بلکہ اردو کی طرح متعدد زبانوں کا ایک مرکب بن گئی تھی، اور پھر گجرات کے مقامی باشندوں کے ساتھ ساتھ اختلاط اور روزمرہ کی ضرورتوں نے گرجروں کی زبان کو ایک مرتبہ پھر اپنی وضع قطع اور تلفظ میں متعدد تبدیلیوں پر مجبور کیا۔ حتیٰ کہ یہ زبان کافی حد تک بدل کر ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوئی جسے آج ہم گجراتی زبان کہتے ہیں۔ پنجاب کے دورانِ قیام میں وہاں کی مقامی بولی سے مخلوط ہو کر گرجری نے ایک نئی شکل اختیار کی تھی جو آج بھی پنجاب کے بعض مقامات اور کشمیر کے بعض کوہستانی علاقوں میں رائج ہے۔ اسی طرح راجستھان میں بھی یہ زبان وہاں کی مقامی زبان سے گھل مل کر نیا قالب اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ آج بھی راجستھان اور مارواڑ کے بیشتر علاقہ جات کی زبان گجراتی سے ملتی جلتی نظر آتی ہے۔

گجراتی میں ایسے فارسی الفاظ ملتے ہیں جن کی صورتیں مسخ ہو جانے کے باعث پہچانے نہیں جاتے کہ یہ الفاظ کس زبان سے منتقل ہو کر یہاں آئے ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے الفاظ سنسکرت اور ہندی زبان ہی کے ہیں، جو امتدادِ زمانہ اور مقامی زبانوں اور لوگوں سے اختلاط اور تلفظ کے تنوع کے باعث اپنے اصلی خدوخال بدل چکے ہیں۔ گجرات کے مشہور ریسرچ اسکالر پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے ان امور پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ گجراتی داں اہلِ علم حضرات کو آپ کی تصانیف کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔

عربوں کی گجرات میں آمد

گجراتی قوم اور زبان کی مندرجہ بالا مختصر تاریخ و تمہید سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ گجراتی زبان کی بنیادیں اور جڑیں وسطی ایشیا کی اُن زبانوں سے جا کر مل جاتی ہیں جو ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح میں دریائے جیحون و سیحون کے اُس پار اپنی ابتدائی شکل میں رائج تھیں جنھیں ماہرین آریہ آرین زبانوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زبان کے اس سلسلے کی دوسری کڑیاں ملانے سے قبل اگر ہم عربوں کی گجرات میں آمد کا ذکر نظر انداز کر دیں تو عہدِ حاضر کی گجراتی زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔ چنانچہ نہایت اختصار کے ساتھ تاریخ کے اُن اوراقِ پارینہ کو یہاں پیش کیا جاتا ہے جو اس مسئلے کے سمجھنے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔

گرجر قوم اس علاقے میں آ کر ہنوز متمکن ہوئی ہی تھی کہ عربوں کی آمد کا سلسلہ یہاں شروع ہوا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ آغازِ اسلام سے تقریباً چھ سو سال قبل عربوں کا وجود گجرات کی سرزمین پر پایا گیا ہے۔ عرب تاجروں نے سنہ عیسوی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر آمد و رفت شروع کر دی تھی۔ اصطخری کی کتاب الاقالیم اور دوسری مستند تاریخیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ سنہ عیسوی کے اوائل میں چیمل، کلیان اور سوپارہ کے ساحلی علاقوں اور مالابار کے کنارے بہت سے عرب تاجر مقیم تھے۔ کلیان اور سوپارہ تو بمبئی کے اطراف میں آج بھی موجود ہیں۔ البتہ چیمل کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مقام کس جگہ آباد ہے۔ ممکن ہے یہ وہی سیل بندر ہو جو سوراشٹر میں ریاست جوناگڈھ کی حدود میں مانگرول کے قریب واقع ہے۔ بہرحال یہ عرب تاجر اپنے ملک سے یہاں آتے تھے، اور پھر یہاں سے نادر اشیاء اور ضروری چیزیں لے کر افریقہ اور چین کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ اس تجارتی تعلق کے باعث نیز موسم کی خرابی اور سمندر کی طغیانیوں کے باعث بسا اوقات انھیں چھ چھ ماہ تک یہیں قیام کرنا پڑتا تھا، اور انھیں عوارض کے پیشِ نظر انھوں نے یہاں کے متعدد ساحلی علاقوں میں اپنی مستقل قیام گاہیں بنا لی تھیں۔

سلیمان سیرافی، ابن حوقل بغدادی، مسعودی وغیرہ کے سفرناموں میں اور سید سلیمان ندوی کی تصنیف "عربوں کی جہاز رانی" میں ان امور پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

چونکہ عرب تاجروں کا زیادہ تر تعلق گجرات کے مندرجہ بالا ساحلی علاقوں ہی سے تھا اور اندرون ملک ان کو جانے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہوتا تھا، لہٰذا اُس دور میں گجرات کے ساحلی علاقوں کی زبان ہی کسی حد تک عربی زبان سے متاثر ہوئی تھی۔ گرجروں کے جو بعض خاندان ان علاقوں میں بس گئے تھے صرف وہی عربوں سے متعارف ہوئے تھے۔ البتہ جو قبائل اندرونی علاقوں میں آباد ہوئے تھے اُن کی زبان پر صرف انہی علاقوں کی مقامی زبانوں کا رنگ چڑھنے لگا تھا عربی کا چنداں اثر نہ تھا۔ عرب تاجروں میں ہندوستان کے اندرونی علاقوں کے متعلق قسم قسم کی روایات رائج تھیں، جن میں سے زیادہ تر روایات کی بنیادیں تو صرف توہمات ہی پر قائم تھیں۔ البیرونی اپنی کتاب الہند میں، ابوالفدا نے اپنی تاریخ کے مخصوص باب البراہمہ میں اور اصطخری اور ابن حوقل نے ہندوستان کے اندرونی علاقہ جات کے متعلق جو بعض باتیں پیش کی ہیں وہ موجودہ دور میں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال انہی روایات کے باعث یا دوسرے اسباب کی بنا پر اوائل سنہ عیسوی میں یا اس کے بعد کافی عرصے تک عرب تاجروں کا زیادہ تر تعلق گجرات کے ساحلی علاقوں ہی سے رہا ہے۔ مزید معلومات کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "ہزار سال پہلے" ملاحظہ فرمائیے۔

عرب حملہ آوروں کا ورود

عرب تاجروں کے علاوہ گجرات میں عرب حملہ آوروں کی آمد بھی ایک جداگانہ موضوع رکھتی ہے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حکم بن ابوالعاص ثقفی نے ۶۳۶ء میں بمبئی کے قریب تھانہ پر سب سے پہلی مرتبہ حملہ کیا، اور اس جنگ سے فارغ ہو کر واپس لوٹ گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہی حکم بن ابوالعاص دوسری مرتبہ بھڑوچ پر حملہ آور ہوا، اور پھر یہاں سے وہ مکران کی طرف روانہ ہو گیا۔ حکم ثقفی کے ان دو حملوں کے بعد تیسرا حملہ یعقوب مدنی اور اس کے نائب اسماعیل نے ۷۷۶ء میں گھوگھا کاٹھیاواڑ

پر کیا۔ اُس وقت سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) میں ولبھی پتی راجہ شیلادتیہ حکمراں تھا، اور شام میں امیر معاویہ برسرِ اقتدار تھے۔ یعقوب مدنی کا یہ حملہ ناکام رہا حتیٰ کہ وہ خود مع اپنی تمام فوج اور سرداروں کے گھوگھا میں کھیت رہے۔

اُموی خلیفہ ولید بن عبد الملک ــــــــ کے عہدِ خلافت میں محمد بن قاسم نامی ایک ۱۷ سالہ سپہ سالار نے سندھ پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۷۱۱ء کا ہے، اور پھر ۷۲۵ء میں جنید بن عبد الرحمٰن مری کے ہاتھ میں سندھ کا اقتدار آتے ہی اُس نے گجرات پر فوج کشی کی۔ وہ مانڈل (ویرگام کے قریب) اور دھینوج (پٹن کے قریب) کے علاقے فتح کرتا ہوا بھروچ جا پہنچا، اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد مارواڑ ہوتا ہوا سندھ کی طرف لوٹ گیا۔ جنید کے بعد تمیم عتبی اور حکم بن عوانہ علی الترتیب سندھ کے عامل مقرر ہوئے۔ مگر یہ لوگ گجرات اور مالوہ کے مفتوحہ علاقوں پر قابض نہ رہ سکے۔

۷۵۷ء میں بہ عہدِ خلیفہ منصور عباسی گجرات پر ایک حملہ اور بھی ہوا تھا۔ اُس وقت ہشام بن عمر تغلبی سندھ کا عامل تھا۔ اُس نے عمر بن جمل کو فوج دے کر سمندری راستے سے گجرات پر بھیجا۔ عمر براہِ راست بھاڑبھوت پہنچا، جو بھروچ کے نواح میں واقع ہے۔ لیکن اس مہم میں عمر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کی واپسی کے بعد ۷۶۰ء میں خود ہشام تغلبی گجرات پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے گندھار کو نشانہ بنایا جو سوراشٹر کے گوگھا بندر اور جزیرہ پیرم کے عین سامنے واقع تھا۔ اس فوج کشی میں ہشام کو عظیم الشان فتح نصیب ہوئی۔ یہیں اس نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو سرزمینِ گجرات پر سب سے پہلی مسجد کہی جاتی ہے۔ اس مہم میں کامیابی کے بعد جزیہ اور خراج کے معاملات طے کرنے کے لئے ہشام کو کافی عرصے تک یہاں قیام کرنا پڑا، اور آخرکار ان امور کا تصفیہ ہو جانے کے بعد عرب فوج واپس روانہ ہو گئی، اور پھر کافی عرصے تک اُنھیں شاہانِ گجرات سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

۷۷۶ء میں خلیفہ المہدی عباسی (۷۷۵ء۔۷۸۵ء) نے عبد الملک بن الشہاب المسمعی کو ایک جرّار فوج دے کر گجرات روانہ کیا۔ عبد الملک ۷۷۶ء میں بھاڑبھوت پہنچا۔ اس فوج میں مشہور تابعی حضرت ابو بکر ربیع بن صبیح البصری بھی تھے۔ مسلمانوں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فنِ حدیث میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، اور جن کے متعلق کشف الظنون میں چلپی نے لکھا ہے، هُوَ اَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ فِی الْاِسْلَامِ۔ عبد الملک کو اس مہم میں کامیابی تو ملی مگر بعض عوارض کی بنا پر اُسے کافی عرصہ یہاں قیام پذیر رہنا پڑا۔ اسی دورانِ قیام میں وہاں ہندوؤں کا ایک بڑا میلہ لگا جو ہر اٹھارہ سال بعد لگا کرتا تھا۔ موسم کی خرابی اور بے شمار افراد کے اژدہام کے باعث وہاں ایک وبا پھوٹ پڑی۔ ہزارہا افراد دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل ہو گئے جس میں اسلامی فوج کے بیس سپاہی بھی چل بسے۔ اس وبا کا شکار ہونے والوں میں ربیع بصری بھی تھے، جن کا مزار آج بھی وہاں موجود ہے۔

(ان تمام واقعات کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فتوح البلدان (بلاذری) معجم البلدان (یاقوت حموی) ابن خلدون۔ کامل (ابن اثیر) تاریخ ابو الفدا عربوں کی جہازرانی (سلیمان ندوی) یادِ ایام (عبد الحی) وغیرہ وغیرہ)

عرب حملہ آوروں کی ان یلغاروں، صلح، جزیہ اور خراج سے متعلق گفت و شنید اور متعدد عرب خاندانوں کی بود و باش نے براہِ راست گجراتی زبان کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سات سو سال کے طویل عرصے میں عرب تاجر اور سپاہی تھانہ، کلیان، سوپارہ، چھایم، چیمبور، سورت، کھمبایت، بھروچ، بھاڑبھوت، دیو۔ گھوگھا اور گندھار وغیرہ ساحلی مقامات پر پھیل گئے تھے۔ ابنِ بطوطہ۔ بزرگ بن شہریار۔ ابن حوقل۔ نور الدین عوفی۔ ابن زبیر صیرافی۔ ابن سعید اور ابو اسحٰق اصطخری وغیرہ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ان عربوں کے حالات اور اہلِ گجرات سے ان کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

پارسیوں کی آمد

جس طرح گُرجر قوم وسطی ایشیا سے آ کر گجرات میں آباد ہو گئی تھی، اسی طرح سرزمین ایران سے پارسی بھی گجرات میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اہلِ ایران ابتداءً سمندر کی لہروں سے خوفزدہ رہتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے ادوار میں سمندری سفروں اور سیاحتوں سے ان کی زندگی معرّا نظر آتی ہے۔ مگر پارتھو عہد میں انھوں نے جہازرانی کی ابتدا کی، اور پھر تو رفتہ رفتہ یہ لوگ خلیج فارس سے تھانہ بندر تک تجارتی سفر کرنے لگے۔ چنانچہ ساسانی عہد میں بھی ہندوستان کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

۶۳۹ء اور ۶۵۱ء میں شہنشاہ ایران یزدجرد کو علی الترتیب قادسیہ اور نہاوند میں عربوں نے شکست دے کر سرزمین ایران پر اپنا علم کامرانی

ٹھہرادیا تھا۔ اسی زمانے میں زرتشتی پارسیوں کے چند قبیلے سرزمینِ ایران کو الوداع کہہ کر گجرات کی طرف سمندری راستے سے روانہ ہوئے۔ عہدِ حاضر کے مشہور ایرانی شاعر آغا پورداؤد نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چہ باک از زکولاک آید ستیز — بہم بشکند کشتی از آب خیز
فروں رفتن اندر دہانِ نہنگ — بہ ، از تازیاں کُشتہ گشتن بہ ننگ
اہورا بود یارِ آوارگاں — بہ دریا دروں لنگر کشتیاں

پارسیوں کا پہلا قافلہ ۷۵۲ء میں سوراشٹر کی مشہور بندرگاہ دیو پر لنگر انداز ہوا (جو اس وقت پرتگیزیوں کے قبضہ میں ہے اور اس کی واگذاری کے لئے عوامی تحریک چل رہی ہے) یہ لوگ دیو میں ۱۹ سال قیام پذیر رہے۔ مگر یہاں کی آب و ہوا خلاف طبیعت ہونے کے باعث یہ لوگ اپنے جہازوں میں لد کر سورت کے قریب سنجان جا پہنچے۔ اور "ما ہمہ ہندوستان ما یار بشیم" کہتے ہوئے مستقل طور پر یہیں متمکن ہو گئے۔ یہیں انھوں نے آتش کدۂ بہرام کی تعمیر کی اور کم و بیش تین سو سال تک سنجان ہی کو اپنا وطن بنائے رکھا۔ ۱۱۴۲ء میں کچھ پارسی خاندان نوساری (سورت کے قریب) پہنچے، اور پھر رفتہ رفتہ گجرات کے دریاؤ، بھروچ، انکلیشور اور کھمبات نامی شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے۔ یہ لوگ ابتداءً شراب اور تاڑی کی تجارت کرتے تھے، ان کے کچھ خاندان پارچہ بافی اور جہاز سازی کا کام بھی کرنے لگے تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ لوگ سورت پہنچے، اور پھر ۱۶۹۱ء میں بمبئی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو جانے پر پارسیوں نے بمبئی کو اپنا مستقر بنا لیا۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

بہر حال —— گرجروں کی آمد کے بعد یہاں گجراتی نامی جو نئی زبان رائج ہوئی تھی اُس پر عربوں کی آمد اور مستقل بود و باش نے کسی قدر عربی کا رنگ چڑھایا، اور بہت سے عربی الفاظ اس زبان میں داخل ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عرب اور پارسی جو جو نئی اشیاء اپنے ساتھ لائے تھے ان کے لئے گجراتی میں پہلے سے مخصوص الفاظ و اسمار نہ ہونے کے باعث یہ تمام چیزیں اُنہی عربی اور فارسی ناموں سے موسوم ہوتی گئیں جو ان کے اصلی نام تھے۔ رفتہ رفتہ ایسے تمام عربی، فارسی الفاظ گجراتی زبان کا جزو لاینفک بن گئے۔ (باقی)

مینا کاشی

رام اور رحیم

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اور سروج سونے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ باہر دروازے پر لگی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی "ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب!" کسی کی بہت ہی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ کون آمرا؟ کم بخت رات کو بھی تو چین نہیں لینے دیتے!" سروج جھنجھلا سی پڑی، اور پھر "جو ہنہ!۔۔۔۔۔۔ کیا زندگی ہے ڈاکٹروں کی بھی! نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام۔ بس مشین کی طرح ہر وقت مریضوں کا کام!۔۔۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے!۔۔۔" نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگی۔ ڈسپینسری میں میری بے پناہ مشغولیت اُسے بے طرح اکھرتی تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر مجھ پر بگڑتی کہ مجھے نہ تو اپنا خیال ہے اور نہ ہی اُس کا، اور اگر رات کو کوئی مجھے بلانے آتا تو وہ میرے ساتھ اُسے بھی آڑے ہاتھوں لیتی، اور اُس سے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیتی کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

"کوئی ضرورت مند ہی ہوگا!" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا، اور قریب تھا کہ اٹھ کر دروازہ کھولنے جاؤں، کہ وہ فوراً اٹھ کر بولی۔

"ٹھہریئے! میں دیکھتی ہوں کہ کون ہے۔"

"لیکن دیکھو، اگر کوئی مجھے بلاتے ہیں تو اُس سے یہ مت کہنا کہ۔۔۔"

"آپ چپ رہیئے جی!" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا، جیسے کہنا چاہتی ہو "کیوں فضول باتیں کر رہے ہیں۔"

دروازہ کھول کر اندر واپس آنے میں اُسے تھوڑا وقت لگا، اور جب وہ آئی تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان ہو گئی ہے۔ اندر آ کر وہ بڑبڑانے لگی "اب کیا کیا جائے؟ لوگ تو کمال کرتے ہیں! یہ لوگ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ڈاکٹر انسان نہیں؟ کیا اُسے بھوک پیاس مٹانے اور آرام کرنے کی ضرورت نہیں؟ کیا وہ مشین ہے کہ کہیں سے بلاوا آتے ہی بھاگ کھڑا ہو؟"

میں نے پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟ کوئی مجھے بلانے آیا ہے کیا؟"

"اور نہیں تو کیا؟" اُس نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا "میں نے اُس سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سو رہے ہیں۔ پھر بھی بھلا آدمی جانے سے انکار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ آپ کو ساتھ لئے بغیر ہرگز نہیں جائے گا۔ چاہے اُسے صبح تک ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے۔ اب بتایئے کہ کیا کیا جائے؟"

"جھوٹ ہمیشہ ہی کامیاب نہیں ہوتا!" میں نے ہنس کر کہا "اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو اب اُسے سچ بات بتا کر آئندہ کے لئے جھوٹ بولنے سے توبہ کر لینی چاہیئے اور ڈاکٹر صاحب کو فوراً اس کے ساتھ چل دینا چاہیئے۔"

میرا خیال تھا کہ یہ مزاحیہ الفاظ سُن کر وہ ہنسنے لگے گی۔ لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ میں نے پھر کہا "اُس سے کہہ دو کہ ڈاکٹر صاحب ابھی چل رہے ہیں۔"

"نہیں جی!" وہ نہایت سنجیدہ ہو کر بولی "کوئی اور آدمی اس وقت آپ کو بلانے آتا تو شاید میں آپ کو نہ روکتی، لیکن اس آدمی کے ساتھ میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔ اُس کے بھائی کو تیز بخار چڑھا ہے، اور وہ مر جائے تو بھی ہرج نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ اپنے بھائی کے ساتھ اگر وہ بھی مر جائے تو اور بھی اچھا ہو!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں انگشت بدنداں سا ہو گیا "تم کتنی کٹھور ہو کہ۔۔۔۔۔!"

"جی ہاں، میں کٹھور ہوں!" اُس نے بھنویں چڑھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے قطع کلام کیا "جانتے ہو کہ آپ کو بلانے کون آیا ہے؟ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو آپ بھی وہی کہتے جو میں نے کہا ہے!"

"کون ہے وہ؟"

"رحیم! ابھی سال بھر ہوا کہ پانچ سال کی سزا کاٹ کر جیل سے لوٹا ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کو سرکار عمر قید کی سزا کیوں نہیں دے دیتی۔

بڑا بھیانک غنڈہ ہے وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھول گئے کیا اُسے ؟"

بھلا اُسے میں کیسے بھولتا ؟ ہمارے شہر اور دیہات کا بچّہ بچّہ اُس کے نام سے واقف تھا۔ اُسے ہی نہیں رام کو بھی سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ دونوں ہی شہر کے نامی غنڈے تھے۔ دونوں بہت ہی حوصلہ مند تھے، اور اپنے اپنے مذہب کی خاطر جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اپنی قوم پر دونوں کا گہرا اثر تھا۔ رام کے احکام کی تعمیل کرنے کے لئے ہزاروں ہندو اور رحیم کے فرمان کے سامنے سر جھکانے کے لئے ہزاروں مسلمان ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ہندو دھرم کی حفاظت کرنے کی ذمّہ داری رام اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اور اسلام کا محافظ رحیم خود کو تصور کرتا تھا۔ دونوں ہی شہر کے اتنے طاقتور غنڈے لیڈر تھے کہ میونسپلٹی کے انتخابات سے لے کر گورنر صاحب کو ایڈریس پیش کرنے تک کا کوئی بھی کام انھیں خوش رکھے بغیر کر سکنا ناممکن تھا۔ مارکاٹ اور دنگا فساد کرنے میں اُنھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ دونوں کے آگے پیچھے دن رات دو چار سو پہلوان رہا کرتے تھے۔ پولیس کپتان، ڈپٹی کمشنر وغیرہ تمام اعلیٰ سرکاری افسران کے مارے پریشان تھے۔ دسہرہ، دیوالی، ہولی یا عید اور محرّم جیسے تہواروں پر اکثر دونوں فرقوں میں مارکاٹ ہوا کرتی تھی۔ ایک بار ایک مندر میں بھجن ہو رہا تھا۔ بس اُسی کو لے کر خوفناک فساد شروع ہو گیا۔ دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی زخمی ہوئے، اور کتنے ہی جان سے مارے گئے۔ دونوں پر سرکار نے مقدمے چلائے۔ اور رام اور رحیم دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے جُرمانے کے ساتھ پانچ سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

مجھے پچھلی تمام باتیں یاد آگئیں۔ اس لئے میں نے سروج سے کہا —

"نہیں میں بھولا نہیں ہوں۔ اس رحیم کے بچّے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"جانتے ہو تو پھر میری بات مانئے!" وہ سنجیدگی سے بولی: "اس کے ساتھ ہرگز نہ جائیے! آج تک جس نے سوائے غنڈہ پن کے کچھ بھی نہیں کیا، شہر کے امن و امان کو تباہ کیا، ہزاروں انسانوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالیں۔ اس کی مدد نہ کرنے سے آپ کو کوئی پاپ نہ لگے گا۔"

اُس کا کہنا بہت ٹھیک تھا۔ لیکن اُس وقت مجھے اُس کی بات پسند نہ آئی۔ کوئی بھیانک بیماری پھیل جاتی ہے تو ایک فرض شناس ڈاکٹر کے لئے اچھے بُرے اور بڑے چھوٹے کی کوئی بھی تمیز نہیں رہتی۔ جہاں کہیں بھی بیماری ہو وہیں اُسے ختم کر ڈالنا، اور بیماری کے نرغے میں پھنسے ہوئے دکھی انسانوں کی مدد کے لئے بلا تاخیر پہنچنا، ایک ڈاکٹر کا فرضِ اوّلین ہے۔ ان خیالات کے علاوہ دوسرے کسی بھی طرح کے خیالات کا، چاہے وہ کتنے ہی خوبصورت فائدہ مند اور سکون آگیں کیوں نہ ہوں، ڈاکٹر کے دل و دماغ پر اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے میں نے کہا: "نہیں سروج! مجھے جانا ہی چاہیئے!"

"کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں؟" وہ قدرے چڑ کر بولی: "رحیم دس نمبری بدمعاش ہے، غنڈہ ہے اور اس کے ساتھ آپ کا جانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن تم یہ نہ بھولو کہ اِس وقت وہ میرے گھر، رحیم غنڈے کے روپ میں نہیں، بلکہ بسترِ مرگ پر تڑپتے ہوئے کسی دُکھی اور بدقسمت انسان کے بھائی کی حیثیت سے آیا ہے!"

"لیکن یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ سچ مچ اُس کا بھائی بیمار ہے؟ کیا ثبوت ہے اس کا؟" اس نے اور بھی تیز ہو کر کہا۔

"سروج!" میں سنجیدگی سے مسکرا کر بولا "تمھارا یہ شک اور خوف دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آرہی ہے!"

"کچھ بھی ہو، لیکن میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی!"

اُسے سمجھانا مشکل تھا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح اسے سمجھا بجھا کر راضی کیا، اور کپڑے پہن کر رحیم کے ساتھ ہو لیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ رات کی تاریکی کی وجہ سے ہر طرف ایک بھیانک سکوت مسلط تھا۔ اور میں سہما سہما سا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

راستے میں میری اُس سے بالکل بات چیت نہیں ہوئی۔ رام مندر کے سامنے سے جب ہم گزرنے لگے تو مجھے یاد آیا کہ یہی وہ بھیانک جگہ ہے جہاں چھ سال پہلے ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں رام اور رحیم کے بھڑکانے سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس میں مارکاٹ شروع کی تھی، اور آخر میں پولیس نے گولیاں چلائی تھیں۔

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکائے تیزی سے چل رہا تھا، اور اُسے اسی حالت میں دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی۔ مندر میں ہری کیرتن ہو رہا تھا، اور باجے طبلے کے ساتھ سب لوگ گا رہے تھے ؂

"ایشور، اللہ تیرے نام — سب کو سُمتی دے بھگوان"

کتنے شیریں اور بامعنی تھے یہ سنجیدہ الفاظ! اور جس مندر میں صرف آج

ہی نہیں بلکہ پچھلے کئی برسوں سے یہ بھی گایا جاتا تھا۔ اُسی میں اِن لوگوں نے کتنے ہی انسانوں کا خون بہایا تھا۔ اس خونناک اور قابلِ نفرت واقعے کے لئے کون ذمہ دار تھا؟ رام یا رحیم، یا پرماتما اور اللہ، یا دھرم اور مذہب سے متعلقہ غلط فہمیاں اور بُرے خیالات؟ —— اور یہی سب سوچتے سوچتے ایک مرتبہ پھر میری نظریں اس پر جم گئیں۔ اب اُس کی گردن پہلے سے زیادہ جھک گئی تھی، اور وہ اور بھی تیز چل رہا تھا۔

مسلم بستی کے شروع ہوتے ہی مجھے یکایک خیال آیا کہ اس کا مکان یہیں کہیں ہے۔ اس لئے میری چال قدرے آہستہ ہو گئی۔ لیکن اُس نے کہا "ابھی بہت دور جانا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"لیکن تمہارا مکان تو اِسی بستی میں ہے!" میں حیرت و سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے کہ وہ سامنے ہی تو ہے تمہارا مکان"؟

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیا، "کسی زمانے میں وہ میرا تھا، لیکن اب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ خاموش رہا۔

اُس کی خاموشی مجھے عجیب سی محسوس ہوئی، اور سروج نے اس کے ارادے کے بارے میں جو شک ظاہر کیا تھا اس کی بھی یاد آئی لیکن مجھے بالکل ڈر نہیں لگا، اور میں نے پھر اُس سے پوچھا "تو اب کہاں ہے تمہارا مکان؟"

"مزدور بستی میں!"

اُس کا جواب بہت ہی حیرت کُن تھا۔ کچھ لمحوں تک تو میں یقین ہی نہ کر سکا۔

دس منٹ کے اندر ہم مزدور بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک مکان کے سامنے رُک کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور زور سے آواز دی، "سُکھیا!"

یہ نام سن کر تو میری حیرت بے انتہا ہو گئی اور میں سوچنے لگا "مسلمان رحیم کے گھر ایک ہندو عورت سُکھیا کیسے؟ کسی غریب ہندو عورت کو اِس نے اغوا کر کے تو نہیں رکھا ہوا ہے؟" سوچتے سوچتے میں ڈگمگانے لگا، اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ سروج ٹھیک ہی کہتی تھی، غنڈہ آخر غنڈہ ہی ہوتا ہے۔ شاید یہ مجھے مارنے ہی کے ارادے سے ...... یکایک مکان کا دروازہ کھُلا اور میں نے چونک کر خود کو سنبھالا۔

اُس نے کہا۔ "آیئے ڈاکٹر صاحب!"

میں کانپتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہو گیا۔

ایک مصیبت زدہ مزدور کا مکان جیسا ہوتا ہے وہ مکان بھی ویسا ہی تھا۔ ایک طرف ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا، جو روشنی کی بجائے دھواں ہی زیادہ دے رہا تھا۔ کوئی بھی چیز صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی، اور پھر دیکھنے لائق وہاں چیز بھی کیا ہو سکتی تھی۔ ایک طرف کمبل پر مریض پڑا تھا، وہ مجھے اُس کے پاس لے گیا سُکھیا چراغ اُٹھا لائی۔

لیکن جب میں نے مریض کو دیکھا تو میں مجسّم حیرت و استعجاب بن کر رہ گیا۔ وہ مریض کوئی اور نہیں بلکہ وہی انسان تھا جس سے اُس کی ایک عرصے تک دشمنی چلتی رہی تھی، یعنی ہندو غنڈوں کا لیڈر رام!....

"یہ کیا!" عالمِ حیرت میں میرے منہ سے نکلا: "تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا بھائی بیمار ہے۔ لیکن یہ تو رام......؟"

"ٹھیک ہی تو کہا تھا میں نے ڈاکٹر صاحب!" اُس نے نہایت سنجیدہ اور کومل لہجے میں جواب دیا: "یہ میرا بھائی ہی تو ہے!" اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب مخلصانہ چمک تھی جو اُس کے دلی جذبات کی صحیح ترجمان تھی۔

اب تک کے عجیب واقعات نے مجھ پر جو حیرت آمیز چوٹیں کی تھیں اُن سب سے یہ چوٹ کہیں زبردست تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" مجھے حیرت میں ڈوبے دیکھ کر اُس نے کہا: "رام کو دیکھ لیجئے اور اسے دوا دے دیجئے۔ پھر اگر وقت رہا تو میں آپ سے کچھ عرض کروں گا۔"

میں نے رام کو اچھی طرح دیکھا۔ بخار کی تیزی کی وجہ سے وہ اپنے آپے میں نہیں تھا۔ تاہم میرے سبھی سوالوں کا اس نے خاطر خواہ جواب دیا۔ اور اُسے دوا پلانے کے بعد جب میں اُس کے جسم پر چادر ڈالنے لگا تو وہ کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب شاید میں نہ بچ سکوں۔ اگر ایسا ہوا تو..... تو...... میری گھر والی اور بھائی کا خیال رکھنا!"

"کون ہے تمہارا بھائی؟" میں نے اُسی طرح حیرت سے پوچھا:

"رحیم!"

"لیکن یہ تو تمھارا دشمن ہے!"

"نہیں نہیں! اب نہیں" وہ تڑپ سا اٹھا۔ "پہلے کبھی رہا ہوگا۔ یہ میرا دشمن۔ لیکن اب تو میں اُس کا اور وہ میرا بھائی ہے۔ ہاں میرا بھائی" بشکل تمام یہ کہہ کر اُس نے سر پر چادر اوڑھ لی۔

تھوڑی دیر بعد رحیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! رام اور رحیم جو کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اب بھائی بھائی بن گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ کو تعجب ہو رہا ہے۔ بات بھی کچھ عجیب ہی ہے۔ آدھی عمر تک ہم نے دشمنی نبھائی۔ مذہب کے پیچھے پاگل تھے ہم دونوں! رام سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے بنا ملک کی حالت اچھی نہیں ہو سکتی اور مجھے بھی یقین تھا کہ ہندوؤں کو بالکل ختم کرنے میں ہی اسلام کی سچی خدمت ہے۔ ہم نے دنگے فساد کئے۔ گلے کاٹے، خون بہائے، اور اگر ہمیں موقع ملا ہوتا تو ہم ایک دوسرے کو بھی جان سے مار ڈالتے۔ ہمیں سزا دی گئی اور دونوں کو ایک ہی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں دو تعلیم یافتہ جوان ہمیں ملے۔ انھوں نے ہمیں بار بار سمجھایا، نصیحت کی، اور ہمیں انسانیت اور اس کے اصلی روپ کو پہچاننے کے قابل بنا دیا۔ مذہب کے پیچھے ہمارا دماغ بگڑ گیا تھا، ہوش ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ لیکن اُنھوں نے ہمیں سکھایا کہ ہندوؤں کے اصل دشمن مسلمان یا مسلمانوں کے اصل دشمن ہندو نہیں ہیں۔ اس باہمی تفرقہ کی حقیقی وجہ روپیہ اور غریبی ہے۔ روپے کی کمی اور غریبی کی وجہ سے لوگوں میں جو بے چینی ہے، اسی کی وجہ سے لڑائی اور جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اگر لوگ خوش حال اور پڑھے لکھے ہوں تو مذہب کے حقیقی روپ کو پہچان سکیں گے اور کہیں کوئی دنگا فساد بھی نہ ہوگا۔ جیل سے یہ سب سیکھ کر ہم دونوں گھر لوٹے۔ ہمارے دوستوں نے آتے ہی ہمیں گھیر لیا۔ لیکن اب ہمیں اُن سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس لئے ہم نے کسی کو بھی منہ نہ لگایا۔ پیٹ بھرنے کے لئے ہم نے مزدوری کرنا اور رہنے کے لئے مزدوروں کی بستی ہی کو ٹھیک سمجھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ جب تک مذہب کے نام پر ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنا نہ چھوڑیں گے تب تک کوئی بھی امن و امان سے نہیں رہ سکتا۔ ہم دونوں جھگڑا کر مر جائیں، مٹ جائیں، اسی میں تیسری طاقت کا فائدہ ہے۔ جو غریبوں کے درمیان باہمی نفرت و تفرقہ پھیلا کر، انھیں ہندو اور مسلمان کہہ کر دو قطاروں میں بانٹ کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور پھر غریبوں کی لاشوں پر اپنی خود غرضی کے محل تعمیر کرتی ہے۔ ہم غریب لوگ کٹ کر مر جاتے ہیں لیکن اُن کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ اُن کی خود غرضی اُسی طرح برقرار رہتی ہے۔

میں گھر واپس آیا تو دیکھا سروج انتظار میں پاگل ہو رہی تھی لیکن جب میں نے رام اور رحیم کی محبت کا ذکر کیا تو اپنے مخصوص انداز میں بولی:

"آپ ڈاکٹر کیوں بن گئے، آپ کو تو افسانہ نگار بننا چاہیے تھا۔

حکومتِ کشمیر کا دوسرا شاندار ترقیاتی پنج سالہ پلان

بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت کشمیر ریاست میں تعلیم کو وسعت دینے اور طبّی امداد کے کاموں اور رفاہ عامہ کے ایسے ہی دوسرے کاموں پر اپنے بجٹ کا نصف حصّہ صرف کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے دوسرے پانچ سالہ پلان میں اکیاون کروڑ روپے خرچ کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس میں سے ۲۳ کروڑ روپے کی رقم جموّں کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ تاکہ صوبہ جموّں کے پس ماندہ علاقوں کو ہر لحاظ سے تعمیری ترقی کے کاموں میں مناسب حصّہ مل سکے۔

انھوں نے کہا کہ پہلے پانچ سالہ پلان میں ریاست کشمیر میں عوام کا رہن سہن اونچا کرنے کے کئی مفید کام کئے گئے ہیں۔ رسل و رسائل کے نئے ذرائع کو وسعت دینے کی خاص اسکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ بانہال سُرنگ کی کھدائی تسلّی بخش طریقہ پر آگے بڑھائی جا رہی ہے۔ کسانوں کو آب پاشی کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ بجلی کے نئے مرکز قائم کئے جا رہے ہیں اور دُور افتادہ علاقوں کو عام شاہراہوں کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ جس سے ریاست کی تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوگا۔

ایس - ایم - ایس - کوہلی

پنجابی کا ٹیگور ــــ بھائی ویر سنگھ

کون ایسا پنجابی ہے - جسے بھائی صاحب ڈاکٹر ویر سنگھ جی کے نام سے واقفیت نہ ہو - پنجابی زبان میں آپ کو وہی درجہ حاصل ہے - جو کہ کالیداس کو سنسکرت - شیکسپیئر کو انگریزی اور گورو دیو ٹیگور کو بنگالی میں ہے دراصل عنوان میں بھائی صاحب کو گورو دیو ٹیگور سے نسبت دینے سے میرا مدعا آپ کی بلند پایہ شاعری کے علاوہ آپ کی روحانی فضیلت کو بھی ظاہر کرنا ہے - آپ بلا شبہ جدید پنجابی نظم و نثر کے جنم داتا اور پنجابی کے ملک الشعراء ہیں -

ضلع جھنگ (مغربی پنجاب) میں "گڑھ مہاراجہ" کے نام کا ایک خاص شہرت کا قصبہ ہے - اسی قصبہ میں میر منو کے وقت (۱۷۵۲ء) ایک مشہور ہستی دیوان کوڑا مل نامی ہو گزری ہے - قصبہ "گڑھ مہاراجہ" کا نام بھی آپ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے - دیوان کوڑا مل جنہیں ان کی شیریں کلامی اور پاک کارناموں کے باعث 'مٹھا مل' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں - میر منو کے دیوان تھے اور بعد میں ملتان کے حاکم مقرر کیے گئے -

بھائی ویر سنگھ جی اسی نامی گرامی ہستی کے خاندان سے ہیں - آپ کے دادا بابا کاہن سنگھ جی "گڑھ مہاراجہ" سے آکر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے - ویر سنگھ کے والد بزرگوار ڈاکٹر چرن سنگھ جی کا ادبی معیار بہت بلند تھا - آپ کا شکنتلا ناٹک کا پنجابی زبان میں ترجمہ اس کی زندہ مثال ہے اور ڈاکٹر صاحب کی ادبی یادگاریں علم و ادب کے دائرے میں نہایت ہی ممتاز درجہ رکھتی ہیں - بھائی صاحب ویر سنگھ کا جنم ۵ دسمبر ۱۸۷۲ء کو امرتسر میں سازگار فضاؤں میں ہوا - اونچا خاندان ادبی جیون اور روحانیت کا رجحان ورثے میں ملا - اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے ان خوبیوں کو چار چاند لگائے -

ویر سنگھ کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو ادبی اور دھارمک تھا - باپ اور دادا کی پاکیزہ عملی زندگی سے رہنمائی لینے کے علاوہ آپ کو اپنے نانا گیانی ہزارہ سنگھ جی سے کافی گیان حاصل ہوا بلکہ ان کے بچپن کا کافی سے زیادہ حصہ انہیں کی سرپرستی میں گزرا - گیانی ہزارہ سنگھ جی خود سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور آپ کی صحبت عام طور پر علم پرستوں اور سادھو سنتوں سے رہتی - جس کا اثر ہونہار ویر سنگھ پر ہونا لازمی تھا - شاید یہی وجہ ہے کہ ہم "شاعر ویر سنگھ" اور "سنت ویر سنگھ" میں امتیاز نہیں کر سکتے -

ابتدائی تعلیم اپنے نانا جی سے پائی اور ۱۸۹۱ء میں مشن ہائی سکول امرتسر سے میٹرک پاس کیا - ضلع امرتسر میں اول رہے اور امرتسر ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے آپ کو سونے کا تمغہ انعام کے طور پر ملا -

آزاد طبیعت ہونے کے باعث آپ نے نوکری کرنی پسند نہ کی - حالانکہ چند ایک جگہ سے آپ کو پیشکش بھی ہوئی - ۱۸۹۸ء میں سردار وزیر سنگھ کے ساتھ مل کر وزیر ہند لیتھو پریس کھولا - جو کہ امرتسر میں پنجابی زبان کا سب سے پرانا چھاپہ خانہ ہے

بھائی ویر سنگھ ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھے جہاں خدا پرستی اور دھرم کا دور دورہ تھا - اس کے عین متوازی وقت کی حکومت کے ایما پر ایک مذہبی لہر نہایت ہی زوروں سے چل رہی تھی جس کو دھارمک الفاظ میں عیسائیت کا پرچار کہا جا سکتا ہے - ڈر تھا کہ اگر ہندوستان کے پرانے مذہبوں نے اپنی اندرونی کمزوریوں کو دور نہ کیا اور ان کے پرستاروں کا معیار اخلاق بلند نہ کیا - تو سب کے سب مغرب کی اس دھارک رَو میں بہہ جائیں گے - چنانچہ جہاں ہندو سماج میں آریہ سماج - برہمو سماج

اور دیگر دھارمک ہیروں کا آغاز ہوا۔ سکھ سماج کے دھارمک پرچار کا بیڑا نوجوان ویر سنگھ نے اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اور سنگھ سبھا کی لہر کی رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پنجابی زبان کا پرچار بھی شروع کیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ بھائی ویر سنگھ نے پنجابی زبان کا پرچار لفظوں سے نہیں بلکہ زبان میں ادب کا اضافہ کر کے کیا۔ اور آج اسی ادب کی بدولت دریاؤں کی دھرتی پنجاب کی بھاشا فخر سے سر اونچا کرنے کے قابل ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بھائی صاحب نے جدید پنجابی زبان کو "بولی" کی بجائے شائستہ اور ادبی "زبان" کہلانے کا مستحق کر دیا ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

ابتدائی تصانیف میں اردو لغات۔ جغرافیہ ہند کا پنجابی میں ترجمہ اور بچوں کے لئے چند کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۸۹۴ء کا سال آپ کی زندگی میں ایک نہایت ہی اہم سال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی سال نوجوان ویر سنگھ نے اپنی شہرت کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کی بدولت آج انھیں ادب اور اخلاق کی دنیا میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ شہرت کا یہ سنگ بنیاد خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی کا آغاز تھا۔ جو کہ آج تک بدستور چل رہی ہے۔ آج تک سوسائٹی نے بارہ مضامین پر علیحدہ علیحدہ ٹریکٹوں کی صورت میں ۷ لاکھ سے زیادہ جلدیں اور تقریباً دو درجن کے قریب کتب شائع کی ہیں جن میں سے بیشتر آپ ہی کی تصنیف سے ہیں۔ لیکن آپ نے اپنا نام ان میں سے کسی تصنیف پر نہیں دیا۔ علاوہ ازیں تقریباً ۴ ہزار ٹریکٹ سندھی زبان میں بھی شائع کئے جا چکے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں آپ نے گورمکھی لپی میں پنجابی زبان کا ایک ہفت روزہ اخبار "خالصہ سماچار" کے نام سے نکالا۔ جو کہ آج بھی پنجابی زبان کا نہایت ہی سنجیدہ اخبار سمجھا جاتا ہے۔

آپ کی شادی ۱۸۸۹ء میں ہو گئی تھی اور آپ کے گھر دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔

۱۹۰۵ء میں آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر چرن سنگھ رحلت فرما گئے جس کی وجہ سے گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی آپ کے کندھوں پر آ گئی۔

آپ کی ادبی زندگی تین دوروں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب آپ نے زبان اور دھرم کے پرچار کی خاطر لکھا۔ دوسرا دور اور سب سے اہم دور وہ ہے جب آپ کے قلم نے قدرت کے رنگین نظاروں کو روحانیت کے جامے میں پیش کر کے جدید پنجابی شاعری کو امر کر دیا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے شعروں میں نئی اور چھوٹی بحروں میں سنگیت بھرے۔ الفاظ اور اچھوتے خیالات کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ تیسرا دور ۱۹۴۹ء کے بعد آج تک کا ہے۔ جب کہ بھائی صاحب اس پیری کی عمر میں محض روحانیت کے پجاری ہو چکے ہیں۔ شری پربندھ ناتھ چھٹو پادھیائے ممبر پارلیمنٹ نے جو کہ انگریزی کے ایک برگزیدہ شاعر ہیں۔ آپ کی علمیت اور شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کو پانچ دریاؤں کی سرزمین میں چھٹا دریا کہہ کر پکارا ہے۔ آپ نے اس خطے کے لوگوں کو تہذیب اور ادب کے دھارے سے سالہا سال سیراب کیا ہے۔ اور آپ کی زندگی ہمیشہ ہی ادب کی روح رواں رہی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی نے آپ کی ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے سال ۱۹۴۹ء میں آپ کو ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ کی آنریری ڈگری پیش کی۔ جب بھائی صاحب نے ڈگری لینے کے لئے کسی دوسری جگہ جانے سے بھی انکار کر دیا۔ تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈگری پیش کرنے کی رسم بھی امرتسر میں آپ کی کوٹھی پر کی گئی۔

آپ نے جدید پنجابی ادب کو نہ صرف جسم ہی دیا ہے بلکہ اس میں روح بھی پھونکی ہے۔ پنجابی کے مشہور شاعر بابا ہدایت اللہ نے کسی موقعہ پر آپ کے متعلق یہ رائے زنی کی تھی۔ "یہ پہلے پنجابی شاعر ہیں جن میں انفرادیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے"۔ اور یہ انفرادیت ہی بھائی ویر سنگھ کو دوسرے پنجابی شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو بھی ان کی نظم "بیبل کا درخت" نہایت ہی پسند تھی۔ آپ کی شاعری میں زندگی اور جہد و جہد کے آثار بڑی فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔

زندگی یا "جیون" کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آپ نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

"جمنا۔ پھلنا۔ پھلنا تے مرجانا"

جیسے پھولوں کی کلیاں چٹک کر کھلتی ہیں اور پھول بن کر خوشبو دیتی ہیں۔ پھر پھول مرجھا جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس "جیون" میں "کھیڑے" (خوشی) کا ہونا نہایت ہی لازمی ہے۔ اس کے بغیر زندگی کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

چھڈیا جد کھڑناں اساں — رنگ۔ رُوپ۔ رس نال
پھلنا۔ پھلنا چھڈیا — رہے رہن دا مال
ندوں کُہاڑا آ گیا — وڈیا شاخو شاخ
جڑ ہُولوں وڈ ڈیگیا — ڈھیری کیتا خاک

جب نخل سے پھولوں کی شگفتگی دُور ہو جاتی ہے اس کی شاخ شاخ اور تنے کو کُلہاڑے سے کاٹ کر گرا دیا جاتا ہے اور لکڑی کو جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے لکھتے ہیں۔

کھیڑا جندڑی اک ہُن — اک دوہاں دی چال

جس نے زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے اصلیت کو حاصل کر لیا ہے۔

کھیڑا بھریا ہر رُتے ہے — ہر حلے ہر جائی
کھیڑا چھڈیا جس نہ اسدا — رمز اسے نے پائی

(بجلیاں دے ہار)

ہجر کے درد میں بھی بھائی ویر سنگھ کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق دردِ ہجر میں وصل یار سے بھی زیادہ مزہ اور خوشی ہے۔ کیونکہ محبوب کے پیار میں عاشق اتنا مست ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات میں بھی محبوب نظر آنے لگتا ہے۔

ہیں لیلیٰ۔ ہیں لیلیٰ۔ کوکے مجنوں لیلیٰ ہو یا
آپے پریتم بن گیا پریمی۔ ٹیک جاں اندر پائی

(بجلیاں دے ہار)

ان اشعار میں بُلّھے شاہ کی کوِتا کا کچھ کچھ رنگ ملتا ہے۔

رانجھا۔ رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدو نی مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھیو کوئی

(کافیاں بُلّھے شاہ)

مگر دونوں کے کنفن میں ایک فرق نمایاں ہے۔ جہاں بُلّھے شاہ کے عشق میں سوز و درد ہے وہاں بھائی صاحب کے اشعار میں شکر اور کھیڑا (خوشی) ہے۔ شکوہ نہیں۔

راہ گزرتے ہوئے کسی نے ٹہنی سے پھول توڑ لیا اور سونگھ کر پھینک دیا۔ پھول پنکھڑی پنکھڑی ہو کر پاؤں کے نیچے روندا گیا۔ مگر اس نے شکوہ نہیں کیا۔ لیکن مس نازنین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھول نے کہا۔

تُسی توڑیا۔ اسی ٹُٹ پئے۔ وچھڑ گئے ساں ڈالوں
تساں سُنگھ۔ سینے لاسُٹیا۔ وچھڑ گئے تُساں نالوں
پیراں ہیٹھ لتھاڑ لنگھواں۔ کیتا کھنڈری کھنڈری
پر شکرانہ چھونیری دا۔ اجے نہ بھلدا سانوں

یہ ہے بھائی صاحب کا پیغام زندگی۔ خوشی اور پیار ہی زندگی کا اصلی راز ہے۔

"بھائی" اور "ویر" دونوں کے معنی برادر کے ہیں۔ بھائی ویر سنگھ نام اور کلام دونوں حیثیتوں سے انسانیت کے "بھائی" ہیں۔ جذبۂ برادری اور تکرار لفظی دونوں کے لئے شعر ملاحظہ ہو۔

"دنیا دا دکھ دیکھ دیکھ۔ دل دبدا دبدا جاندا"

بھائی صاحب کی شاعری میں کلاسکی عنصر بہت پایا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے الفاظ اور محاورے استعمال میں لاتے ہیں جن میں روحانی تقدس اور مذہبی روایات موجود ہوں۔ ان کے الفاظ میں جذبۂ عشقِ حقیقی اور اسلوبِ بیان میں ایک آہنگ پایا جاتا ہے۔ اور غالباً یہی ایک سبب ہے۔ کہ آپ کے حلقے کے لوگ آپ کو مذہبی پیشوا تصور کرتے ہیں۔ اور آپ کی شاندار شخصیت سے متاثر ہیں۔

بھائی ویر سنگھ کے کلام میں ان کی بصیرت اور عمیق مطالعے کا ثبوت ملتا ہے۔ جہاں آپ نے ہندو مذہب کی خوبیوں کا کُلّی طور پر مطالعہ کیا ہے وہاں اس غیر فانی شاعر نے اسلام کی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

مذہبی نقطہ نظر سے بھائی ویر سنگھ کی شاعری کا درجہ بہت بلند ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی جہاں تک خالص شعریت کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے حسنِ بیان کے محل کھڑے کر دئے ہیں۔ آپ کی ذہنی صلاحیت قابلِ رشک ہے اور تخلیق شدّتِ خلوص کا نتیجہ ہے۔

پھولوں سے خاص طور پر آپ کو پیار ہے۔ اپنی کوٹھی میں نرگس اور گل داؤدی کے پھول بڑے شوق سے لگوا رکھے ہیں۔

ایک سال زیادہ بارش کی وجہ سے گل داؤدی کے پھول نہ کھلے تو آپ نے ان لفظوں میں خیالات کا اظہار کیا۔

"گل داؤدیاں نہی آئیاں 'اندر' مار مُکائیاں"

کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں۔

رکھڑے ہستے تسی سجنوں۔تسی ہستے وٹ نہ پائیے

شاعر کو پتھروں میں بھی زندگی نظر آتی ہے۔کشمیر کی سیر کے دوران میں جب اوانتی پور اور مارتنڈ کے کھنڈروں کو دیکھا تو کوی کا نازک دل لرز اُٹھا۔

مار پئی جد مارتنڈ نوں - پتھر رو کرلانے
"پتھر توڑیں" دل پئے ٹٹدے! دل کھیڈ یانے

(مٹک ہلارے)

یعنی حملہ آور نے مارتنڈ کے مندروں میں پوجا کے بتوں کو بے رحمی سے توڑ دیا۔ اور بُت پرستی کو ختم کرنا چاہا۔ شاعر کی بصیرت اس سے آگے جاتی ہے۔ اور وہ بُت توڑنے والے سے پوچھتا ہے۔ تم پتھر توڑ رہے ہو۔ مگر اس پتھر کے بُت کے پیچھے اس کو بنانے والے کا دل چھپا ہوا ہے۔ اور یہ وہ دل ہے جو کہ خدا کا گھر ہے۔ لہذا یہ پتھر نہیں۔ دل توڑے جا رہے ہیں۔

پھر لکھتے ہیں۔

گھٹ گھٹ دے وچ وسدا جیہڑا تو کیہنوں رب پچھانے

خدا تو ذرے ذرے میں ہے لیکن بھلا بتا۔ تو کون سے خدا کو خاطر میں لاتا ہے۔

شاعر کشمیر کے ایک دریا کے کنارے بیٹھا ہوا قدرت کے بیرنگ نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور اچانک بہتے ہوئے دریا سے سوال کرتا ہے۔ اے بہتے ہوئے دریا تو دن رات چلتا رہتا ہے۔ کیا تو تھکتا نہیں؟ نازک خیالی ملاحظہ ہو دریا جواب دیتا ہے۔

سینے کھچ جنہاں نے کھادی	اوہ کر آرام نہیں بہندے
نہاں والے نیناں کی نیندر	اوہ دنے راتیں پئے وہندے
اکو لگن لگی لئی جاندی	ہے ٹور انت اُنہاں دی
وصلوں اُرے مقام نہ کوئی	سو چال پئے رات دن وہندے

(بجلیاں دے ہار)

جس دل میں پیار کی لگن ہو وہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اور محبت کی مستی سے بھری ہوئی آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہ ہر وقت محبوب کے فراق میں رواں رہتی ہیں (روتی رہتی ہیں)۔ اس دل میں ایک ہی لگن ہے محبوب کے پاس جانے کی۔ لہذا اس کی چال کبھی ختم نہیں ہوتی آخری منزل مقصود وصل یار ہے۔ اس لیئے وہ (یعنی دریا) دن رات چلتا رہتا ہے۔

پھل دار درخت ہمیشہ نیچے کی طرف جھکتا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود بھائی صاحب ڈاکٹر ویر سنگھ میں ذرا بھی انانیت نہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کی کسی تصنیف میں کسی جگہ بھی لکھنے والے کا نام نہیں لکھا ہوا۔ اور یہ لکھا ہے۔

ہیرے چھپے رہن دی چاہ۔ تے چھپ مُڑ جان دی
ہائے پوری ہندی ناہ۔ میں ترلے سے رہیا

اور آپ کی تمام زندگی اسی طرح تنہائی میں گزری ہے

۱۹۵۲ء میں آپ کی قابلیت کے پیش نظر آپ کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے اپر ہاؤس کا ممبر نامزد کیا گیا۔

آپ نے نظم اور نثر دونو میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:۔

نثر:۔ سُندری (ناول) کلغدھر چمتکار۔ گورو نانک چمتکار۔ ستونت کور وغیرہ
نظم:۔ مٹک ہلارے۔ بجلیاں دے ہار۔ رانا سُورت سنگھ۔ پریت وینا وغیرہ

اظہر علی فاروقی

بنگلا کا وشنوی ادب

مذہبی تحریکیں اُبھرتی ہیں اور دب جاتی ہیں - اور بنگال میں وشنویت کے ساتھ بھی یہی ہوا - ایسے تو وشنو کی پرستاری عہد قدیم سے چلی آتی ہے - مگر بودھ اور جین دھرموں نے اسے نیم جان بنادیا آچاریہ رامانج نے ۱۲ ویں صدی میں ایک بار پھر وشنویت کی سسکتی روح میں قوت پیدا کرنے کی کوشش کی - لیکن بودھ دھرم کی سہجیائی تحریک نے عوام کے رجحانات اپنی طرف کچھ اس طرح مبذول کر لیے تھے کہ وشنویت جان بر نہ ہوسکی - ادھر جب سوامی شنکر اچاریہ نے ویدانتی دھرم کا صور ایک بار پھر پھونکا جس سے بودھ اور جین دھرم مُردہ ہوتے نظر آنے لگے - مگر بودھ دھرم کے مہایانی اور سہجیائی نظریات عوام کے دلوں میں ایسے جاگزین ہو چکے تھے کہ مٹانے سے نہ مٹ سکے اور بودھ دھرم کا مہایانی مبلّغ ناگارجن ان کا مقابلہ کرتا رہا کہنے کو تو ہم اسے مقابلہ کہہ سکتے ہیں مگر ہوا یہ کہ ویدانتی مبلغوں کی دیکھا دیکھی ناگارجن کے مقلّدوں میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوگیا جس نے عوام کی تسکین کے لیے ویدانتی دیوتاؤں کے برابر اپنے دیوتا لا کر کھڑے کر دئے -

مہایانیوں نے اب لوکیشر، منجاشری جیسی دیویاں اور دیوتا گڑھ لیے - سمجھ دار مہایانیوں کے دلوں میں یہ بات کھٹکنے لگی اور انھوں نے جب "اب لوکیشر" پر غور کیا تو انھیں واسدیو کا دوسرا روپ نظر آیا اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے رستے سے الگ ہٹتے جا رہے ہیں اور اس طرح ایک بڑی تعداد ناگارجن کے اس رویے پر شبہ کرنے لگی - مگر دشواری یہ تھی کہ ایسے لوگ ہندو سوسائٹی سے نکالے جا چکے تھے اور ان کے لیے دوبارہ اس جگہ پہنچنا ناممکن سا تھا اور انھیں اپنے لیے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی - ادھر یہ بھی ہو رہا تھا کہ نرسنگھ داس اور بھگتی رتنا کر کے ذریعے وشنو کی کرامانیں عوام تک بالکل اسی طرح پہنچ رہی تھیں جس طرح مہاتما بدھ کے کراماتی کارنامے چینی سیاح یوانگ سانگ کے سفرنامے کے ذریعے پہنچ رہے تھے یا کوسی نگر اور بنارس کے بیانات پڑھ پڑھ کر لوگ مہاتما بدھ کی کرامانوں سے واقف ہوتے تھے -

بودھی بھکشو اور وشنوی ویراگی' اب لوکیشر اور واسدیو بظاہر ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں اگرچہ بنیادی طور پر بودھیت اور وشنویت ایک دوسرے سے جداگانہ نظریات رکھتی ہیں جبکہ ایک گیان اور دوسری بھگتی پر زور دیتی ہے - مگر ایسے لوگوں کے لیے جو بودھیت سے غیر مطمئن ہو چلے تھے اور ہندو دھرم انھیں اپنانے کے لیے طیار نہ تھا - بودھ دھرم کے ساتھ وشنویت کی یہ ادنیٰ مماثلت اکسیر کا کام کر گئی اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنی - اور انھیں وشنویت کا سہارا لینے ہی میں نجات کی صورت نظر آئی - خصوصاً جب انھیں اس کا یقین ہو گیا کہ کوئی دھرم ایسا بھی ہے جو بھگتی کے لیے گیان کی شرط نہیں لگاتا سچ پوچھئے تو دیپالائی تاریخ کا یہ انقلاب محض برائے نام تھا ہمرے کہ شیلا بھدر اور مہاویر سے لے کر گورکھ ناتھ، کالوپا بلکہ رائے پنڈت تک کی تلقینوں کا اب لباب بے ثباتی عالم اور روحانی تقوے ہی رہا ہے - نالندا کی تعلیمی خانقاہوں سے اُبھری ہوئی آوازیں ندیا ٹول کی بدولت نشاۃ ثانیہ کے روپ میں بدل چکی تھیں - بودھیت نفس کشی کی وہ منزلیں دکھا چکی تھی - جن کی بدولت انسان شہوانی کش مکش پر قابو پا سکتا تھا - ادھر سولھویں صدی میں مسلمان مبلغوں سے زیادہ فرماں رواؤں کی بدولت اسلامی نظریات بھی کچھ نہ کچھ پھیل چکے تھے - اور ویدانتی' بدھی' مہایانی' سہجیائی مقلدوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر چکے تھے - مشرقی بنگال ان سب نظریات کا صدیوں سے جولاں گاہ

رہ چکا تھا۔ انقلابی قدریں اپنا اپنا کام کرتی رہیں۔ کچھ نظریات اُبھرے کچھ مسخ ہوئے۔ کچھ نئے پیدا ہوئے کچھ مٹے مگر ویدانتیوں کا کٹرپن۔ ذات پات کی اونچ نیچ، چھوت چھات، باہمی نفرت اور تذلیل اپنے حال پر قائم رہی اور لوگوں کے دلوں میں کھٹکتی رہی۔ مہاتما بدھ کی رحم کی تلقین، گیان اور بھگتی کی تبلیغ کے درمیان عشق بسوزد و بسازد کی ایک آواز اُبھری اور لوگوں نے اس پر لبیک کہا اور یہ آواز تھی ویشنویت کی جسے سوامی چے تنیہ دیو نے اُبھارا۔

ویشنوی شعر و ادب کا ڈھانچا اُن انقلابی قدروں سے بنتا ہے جو بنگال میں تقریباً چار سو سال سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ اور خصوصیت سے سولھویں صدی عیسوی کے اُن رجحانات کو بہت بڑا دخل ہے جو برسوں سے ان انقلابی قدروں سے تاثر قبول کر رہے تھے۔

ویشنوی ادب سے پیشتر بنگلا میں جو ادب ملتا ہے وہ دیومالائی ادب ہے۔ چنڈی، منسا، منگل کی عقیدت کے ترانے ہیں یا پھر پال خاندان کے راجاؤں کے تعریفی ترانے ہیں، جہاں حقیقت کا فقدان ہے اور جنھیں ہم قصے کہانیوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دے سکتے۔ بودھی ادب نے بھی دیومالائی روپ اختیار کیا۔ اور بنی نوع انسان کی طرف کوئی اعتنا نہ کی۔ مختصر یہ کہ ویشنوی شعر و ادب سے پیشتر بنگلا کا پوتھی ادب مائی تھالوجی پر مبنی ہے۔ ویشنوی ادب کی زبردست خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مبالغہ سہی مگر تاریخی صداقت کا بڑا عنصر موجود ہے۔ اور اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری نظر اس سوانحاتی ادب پر پڑتی ہے جسے سوامی چے تنیہ دیو کے چیلوں نے نظم کیا۔ ایسے ادب میں سب سے اہم کرشن داس کوی راج کی چے تنیہ امرت ہے۔ کہنے کو تو یہ سوامی جی کی سوانح عمری ہے مگر ہم اسے ویشنویت کی انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ سماجی۔ معاشرتی اور کلچرل زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ چھوت چھات اور ذات کا بھید بھاؤ کس طرح مٹ رہا تھا۔ کالی داس نامی ایک شخص نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا کہ وہ ڈوم، چنڈال اور دوسرے نیچ ذات کے لوگوں کے کھانے کے پتلوں کا پس خوردہ اپنے ہاتھ سے ضرور چھوا کرے گا۔ ترہری چکرورتی ایک دوسرا برہمن شاعر ہے جس نے ایک شوعد نروتم کے سوانح حیات نظم کئے۔ سوامی چے تنیہ دیو کا نوکر ایک لوہار گووند داس ہے جس نے سوامی جی کے دکن کے دورے اور سیاحت کے حالات نظم کئے۔ جو کرڑچا کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ رپورتاژ معاشرت کے بڑے اچھے اچھے مرقعے پیش کرتا ہے "سوامی جی کی ماں خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی تھیں۔ جو کچھ پکتا پہلے کرشن بھگوان کی مورتی پر چڑھایا جاتا۔ گھر کے لوگ اسے متبرک اور پرشاد سمجھ کر بڑی خوشی بیتے ....." کھانا کیا پکتا تھا وہ اس طرح بیان کرتا ہے "گوشت مچھلی گھر میں نہیں آسکتی تھی ساگ بھاجی، بھنی ترکاریاں، دودھ دہی، پھل پھلاری، حلوا، پوری پسٹی، لڈو وغیرہ ....." تعجب ہے کہ اس نے چاولوں اور بھات کو کھانے کی فہرست میں داخل نہیں کیا۔

ورندابن داس ایک دوسرا شاعر ہے جس نے سوامی چے تنیہ دیو کے سوانح زندگی نظم کئے۔ اس کے سوانحی منظومات تاریخی حیثیت سے لائق ستائش ہیں۔ وہ تاریخوں کے ساتھ دن اور وقت تک بیان کرتا ہے۔ ویشنوی مرکز ونو دیپ، چٹگانگ، سلہٹ، راڈھا، اڑیسہ وغیرہ کے جغرافیائی بیانات بڑی خوبصورتی سے دیتا ہے۔ لوچن داس اور جے نند کے چے تنیہ منگل بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں معاشرہ اور کلچر کی تصویروں کے علاوہ حسین شاہ حاکم بنگال کی بدعنوانیوں اور پچھتاوے کا ذکر بھی ہے۔ چے تنیہ پد اور دیو گوشٹھا ویشنوی ادب کی دو اور شاخیں ہیں۔ چے تنیہ پدوں میں کرشن جی کی زندگی کے اجاگر خاکے پیش کئے گئے ہیں اور اس طرح یہ شعری ادب سور داس، رس کھان، میراں کے بھجنوں سے بہت کچھ مماثلت رکھتا ہے ہندی کے ویشنوی کویوں نے اپنا تخیل ان کے بچپن کے لہو و لعب، جوانی کی رنگ رلیوں تک ہی صرف کیا۔ میراں کے بھجنوں میں کرشن جی کی زندگی سے زیادہ خود اس کی آپ بیتی، فراق کے غموں اور وصل کی آرزوؤں کے خاکے ہیں مگر چے تنیہ پدوں میں راجا کنس، باسدیو، دیوکی، گوالوں کے لڑکوں، چراگاہی منظروں کی بڑی دلکش تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ کالی دمن، کالی سرودر، باکا بھنی وغیرہ کی کہانیاں بڑے لطیف پیرایے میں بیان کی گئی ہیں۔

ویشنوی شعری ادب ہمارے تمدن اور تہذیب کا ایک ایسا ورثہ ہے جس سے کسی حالت میں بے اعتنائی نہیں کی جا سکتی۔ جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہندی زبان پر اس کا براہ راست اور اردو ادب پر بہت کچھ اثر ہے۔

ایش کمار

معلوم ہے ہی آپ کو بندے کا ایڈریس

آج صبح سے ہی گھر میں شور تھا - کہ آپ ناشتے پر کیا کھائیں گے - حیران تھا کہ ایں چہ معنی - کہیں چھوٹو کی ٹانگ تو نہیں ٹوٹ گئی جو آج چولھا گرم نہیں کرے گا - کچھ سمجھ میں نہ آیا - دن کے تمام کھانوں میں صبح کا ناشتہ ہی تو مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے - اور خاص کر جب سردی ہو - ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہو - ایسے وقت میں میں ناشتہ بستر پر ہی کیا کرتا ہوں - میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں - کہ خدا نے دو ہی چیزیں بنائی ہیں - ایک رضائی - دوسرے چائے - رضائی کا مزا بھی بارش میں ہوتا ہے - اور بارش کا مزا پہاڑوں پر - معلوم نہیں پہاڑوں پر لوگ بارش سے گھبراتے کیوں ہیں - بارش کے بغیر پہاڑ کس کام کے - میدانوں میں تو بارش چند ہی منٹ کے لئے ہونی چاہئے - ورنہ چھتیں جواب دے دیتی ہیں - مکان گر جاتے ہیں - سڑکوں پر کیچڑ - گلیوں میں پانی - اور بارش ہو چکنے کے بعد وہ سڑن ہوتی ہے - کہ توبہ ہی بھلی - اور پھر بارش کے "پس ماندگان" ہیں مچھر - نام لینے سے ہی جی گھبراتا ہے - اک چاک ہو تو سی لوں - یہاں برساتی اور چھاتا تو پوشاک کا حصہ بن ہی چکے ہیں - بس پھر کیا ہے رضائی میں بیٹھے تھک گئے - تو گھومنے چلے جایئے - بارش سے جی گھبرائے تو کاد کا کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی موٹروں کے بیسیوں اڈے ہیں - جہاں ارزانی بھی ہے اور "خنک سالی" بھی - عام طور پر یہ دو نعمتیں اکٹھی نہیں ملا کرتیں -

ہاں تو صحبت مونس ہو - بارش ہو - رضائی ہو - بجلی کی روشنی ہو - اور چائے کی بلوریں پیالی - کیا آپ سمجھتے ہیں - کہ میں جنت کا نقشہ کھینچ رہا ہوں - کونسی جنت - وہ آدم بابا کی ابتدائی جنت نہیں - اس وقت خداوند کریم کار جہاں بانی میں شاید ناتجربہ کار تھے آدم کو تو بنا دیا - اسے علم و عقل سے محروم رکھا - اسی لئے تو جنت جنت معلوم ہوتی تھی - ورنہ ع

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

رضائی کی تاریخ ایجاد کا تو مجھے علم نہیں - چائے کی پتی اور بجلی کی روشنی علم و عقل کی باتیں ہیں - جو انسان کو حضرت عزازیل کی وساطت سے نصیب ہوئیں - ورنہ اللہ تعالیٰ تو جنگل و بیابانوں کو ہی جنت کا نام دے کر ہمارے بزرگ کو ورغلا رہے تھے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

آدم کی جنت بھی کوئی خوشگوار جگہ تھی - کہ اس کا نقشہ کھینچا جائے - کیا کشش و دلچسپی تھی وہاں - صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے والا معاملہ تھا - تعجب نہیں - کہ بابا آدم کا دل اکتا گیا - اور التجا کی کہ جی بہلانے کا سامان مہیا ہو - اور جہانبانی کی ستم ظریفی دیکھئے - کہ کیا سامان مہیا کیا - اور اس سے کتنے فتنے برپا ہوئے - اس کا پھر کبھی ذکر کروں گا اتنا کہہ دوں - کہ آخر کار آدم کو ایسی جنت میں عمر بھر بسر کرنا ناگوار گزرا اور ہماری خوش قسمتی تھی - کہ اس نے اسے خیرباد کہہ دیا -

موجودہ جنت یہ ہے - کہ شملے کی پہاڑیاں ہوں - ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہو - پلنگ کی اوٹ ہو اور ساٹن کی رضائی - بجلی کی روشنی ہو چائے کا بلوریں پیالہ - اور ہاتھ میں ادب لطیف کی کوئی کتاب میں اکثر بانگ درا پڑھا کرتا ہوں اور سوچا کرتا ہوں - کہ علامہ اقبال نے "کوہ ہمالیہ" ڈلہوزی میں لکھی تھی یا شملے میں - بادلوں کا جو نقشہ علامہ نے کھینچا ہے وہ ڈلہوزی سے نسبت رکھتا ہے ؎

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر — فیلِ بے زنجیر کی صورت اٹھا جاتا ہے ابر
بن کے گیسوئے رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں — شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
ہوا کے زور سے ابھرا۔ بڑھا۔ اڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا۔ لو برس پڑا بادل

یہ تمام نظارے شملے کی بہ نسبت ڈلہوزی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ بادلوں کی جو پُرکیف اٹکھیلیاں میں نے ڈلہوزی میں دیکھی ہیں اور کہیں نہیں دیکھیں۔ شملے میں بارش تو خوب ہوتی ہے۔ مگر نہ وہ ہوا ہوتی ہے اور نہ "ہوا کے زور سے ابھرا۔ بڑھا۔ اڑا بادل"۔ اور نہ ہی وہ کنجِ عزلت جس کا اقبال شیدائی تھا۔ "گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں"۔ دامنِ کہسار کا جو سکوت ڈلہوزی کی وادیوں میں ہے شملہ کے "آباد ویرانے" میں نہیں۔ بکروٹہ کے کنجِ تنہائی میں ہی بانگِ درا لکھی گئی ہوگی۔ تبھی تو اقبال بادلوں کے دلفریب خرام ذہن نشین کرا سکا۔ بادل کی دھیمی دھیمی پھوار اور ٹین کی چھت پر گڑگڑاہٹ دونوں سے گھبراتا ہی رہا۔

موجودہ جنت کا خاکہ کھینچ رہا تھا۔ بانگِ درا ہاتھ میں ہو۔ یا اوتھیلو یا کیٹس کی کوئی اوڈ کیا کہنا۔ ساتھ رفیق ہو۔ اور ہلکی ہلکی باتیں ہو رہی ہوں۔ کچھ پیار کی باتیں۔ کچھ پرانی یادوں کو تازہ کرنے والی باتیں۔ نرم نرم اکساہٹ کی باتیں۔ کچھ دماغی اور روحانی باتیں اچھا تو منظور ہے۔ کچھ فاصلے پر سہگل کی گائی ہوئی غزل "بنائے نہ بنے" دھیمی سی سنائی دے۔ جو باتوں میں لطافت تو پیدا کرے۔ مخل نہ ہو۔

کہاں کا کہاں جا پہنچا ہوں۔ صبح سے گھر میں شور تھا۔ کہ آج آپ ناشتے پر کیا کھائیں گے۔ آخر سمجھ میں آیا۔ کہ آموں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ ایک ٹوکرا لدھیانے سے لایا تھا۔ ایک پیٹی دہلی سے آ گئی تھی۔ لیکن یہاں ٹوکرے اور پیٹیاں کیا کر سکتی ہیں۔ سال میں دو ماہ صبح آموں کا ہی ناشتہ کیا کرتا ہوں۔ آم نہ ہوں تو مشکل پڑتی ہے۔ بازار میں آم یہاں بھی بکتے ہیں۔ مگر میں سیروں میں خریدنے کا عادی نہیں۔ ترازو میں رکھے ہوئے آم مجھے کچھ بھدے سے لگتے ہیں۔ ٹن کا پیمانہ جو اب کوئلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ آموں کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ غالب مرحوم سے جب پوچھا گیا۔ کہ آپ کو کیسے آم مرغوب ہیں۔ تو فرمانے لگے۔ میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ معلوم نہیں مرزا کی میٹھے آموں سے کیا مراد تھی۔ دہلی میں چونسہ آم بہت کھایا جاتا ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ میٹھا تو مالدہ کی طرح ہوتا ہے۔ مگر خوشبو میں اس سے بہتر۔ پنڈت جواہر لال الفانسو کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں اور پیٹیاں کی پیٹیاں ہر سال یورپ بھیجا کرتے ہیں۔ غالباً الفانسو ہی پچھلے ماہ روس لے گئے تھے۔ مجھے تو لنگڑا پسند ہے۔ خالص بنارس کا لنگڑا۔ الفانسو اور چونسہ بہت نہیں کھائے جا سکتے۔ لنگڑا بہت کھایا جا سکتا ہے۔ اور میٹھا بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ آم کو ہونا چاہیے۔

الفانسو سے ایک واقعہ کی یاد تازہ ہو آتی ہے۔ معلوم نہیں کس طرح میرے شاگردوں کو علم ہو گیا ہے۔ کہ مجھے آموں کا بے حد شوق ہے۔ ایک دن چند طالبات[1] نے آ کر میری میز پر الفانسو کا ایک آم رکھ دیا۔ اور لگیں میری حاشیہ آرائی کا انتظار کرنے۔ میں نے مذاقیہ کہا۔ کہ میں ایک آم کو کیا کروں گا اکیلا ایک آم تو میں نے عمر بھر کبھی نہیں کھایا۔ وہ بولیں۔ یہ ایک خاص آم ہے۔ اس پیٹی میں سے ہے۔ جو ان میں سے ایک کے منگیتر نے بمبئی سے بھیجی ہے۔ اگر آپ ٹھیک قیاس آرائی کریں۔ کہ وہ خوش قسمت کون ہے۔ تو ہم ایک ایک آم آپ کو دیں گی۔ ورنہ آپ ہم سب کو ایک ایک آم دیں۔ سودا کچھ کھرا سا تھا۔ میں نے شرط مان لی۔ اور لگا ان کے چہروں کا جائزہ لینے۔ کہ شاید کچھ سراغ مل جائے۔ کچھ ہچکچاہٹ یا حیا کی علامت نظر پڑے۔ لیکن حیا تو آج کل کا فیشن ہی نہیں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ اور آخر یونہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔ جو غلط نکلا۔ اس لڑکی کا چہرہ کچھ ایسا بے علامت سا تھا کہ حیرانی ہوئی۔ اب دس آم میرے ذمے ہیں۔ اور قرضہ ابھی تک بے باق نہیں ہو سکا۔

ہاں تو ہمارا آموں کا ذخیرہ کل ختم ہو گیا تھا۔ آج کی صبح تو جوں توں کاٹی۔ کل کا فکر دامنگیر تھا۔ کہ دوپہر کی ڈاک میں ایک اور بلٹی آ گئی۔ جان میں جان آئی۔ فوراً جا کر اسٹیشن سے بلٹی لے آیا۔ اور آدھ گھنٹہ لگا کر اسے کھولا۔ اور قطاروں میں لگا دیا۔

---

[1] صاحبِ مضمون گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں مقتدر پروفیسر ہیں (ع۔م)

کسی کو کیا معلوم - کہ کھانے کے علاوہ آموں کی محبت کئی طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے - میز پر دھرے ہوئے آم تو ہر ایک کھا سکتا ہے اور ویسے تو جسے پوچھو آموں کا عاشق بنا پھرتا ہے چاہے طوطا پری اور دسہری میں تمیز نہ کر سکے - مجنوں دراصل تھوڑے ہی ہوتے ہیں - جو منڈی میں جا کر دیکھیں، چکھیں اور خریدیں - اور پھر ٹوکرے کو کھول کر پختگی کے مطابق نہیں لگائیں یا الماری میں سجائیں - کہ کونسی نہ یا قطار کل تیار ہوگی اور کونسی پرسوں ؎

ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں   پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجیے

کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے ٹھنڈے پانی یا برف میں لگائیں - اور پھر ایک خاص طریق سے کھائیں - یہ تمام تکلفات میں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں - کسی کی کیا مجال کہ دست اندازی کرے - کاٹنے کی نسبت مجھے چوسنا زیادہ پسند ہے - ایک تو ہاتھ منہ آلودہ نہیں ہوتے - اور دوسرے زیادہ کھانے میں مدد ملتی ہے - اگر آم کھانے کا طریقہ سیکھنا ہو - تو کبھی میرے ساتھ کھائیے - مقابلے میں کبھی گھاٹے میں نہ رہئے گا -

ابھی حضرت آدم کی جنت کا ذکر کر رہا تھا - بار بار خیال آتا ہے - کہ ہمارے بزرگ اول کو کیا سوجھی کہ سیب ہی کی خاطر حکم عدولی کا مرتکب ہوا - آم ہوتا تو کچھ بات بھی تھی - لیکن ہاں - آم کے بغیر جنت بھی کونسی رہنے کے لائق جگہ تھی - اور شاید باتوں باتوں میں حضرت عزازیل نے حوا اماں کے کانوں میں پھونک دیا ہو - کہ زمین پر آم اگتے ہیں - پھر کیا تھا - کامیابی یقینی تھی - آم کے بغیر جنت بھی جنت نہیں - اور آم کے ساتھ ہر گوشہ جنت ہے - اور ہندوستان تو جنت عظیم - اور یہ سال تو آموں کا ہی ہے - ہر سال میں کوئی خصوصیت ہوتی ہے جس سے وہ موسوم ہوتا ہے ۱۵۲۶ء مغلوں کی فتح کا سال تھا - ۱۷۵۷ء پلاسی کی لڑائی کا - ۱۸۵۷ء آزادی کی پہلی جنگ کا - ۱۹۴۷ء ہماری فتح کا - ۱۹۵۵ء آموں کا سال ہے - بہترین لنگڑے کا ٹوکرا اس دن میں نے ساڑھے پانچ آنے سیر خریدا - اب بتائیے کھانے کی کونسی چیز ساڑھے پانچ آنے سیر ملتی ہے - بھنڈی بارہ آنے سیر - کدّو میاں بھی چھ آنے سیر بکتے ہیں - بی چنے کی دال بھی اتنی ارزاں نہیں - علم اقتصادیات بھی عجب چیز ہے - کہ لنگڑا تو ساڑھے پانچ آنے سیر بکے اور بھنڈی بارہ آنے سیر -

یہ کہنا تو بھول ہی گیا - کہ آج کی بلٹی کے ساتھ معذرت درج تھی کہ فضلی آم بھیجے جا رہے ہیں - کیونکہ اور کوئی قسم اب دستیاب نہیں - سلسلہ گفتگو میں جب موسم کا ذکر آنے لگے - تو مفہوم ہوتا ہے - کہ گفتگو بند کر دی جائے - آموں میں بھی جب فضلی آم کی نوبت پہنچے - تو کھانا بند کر دینا ہی بہتر ہے - عاقبت کی خبر خدا جانے -

آپ کو کہتے ہوئے سُن رہا ہوں ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

فسانے میں آپ کی نیند تو اڑ گئی - کیا آپ کے کان پر جوں بھی رینگی یا نہیں - اگر نہیں رینگی - تو اپنی تنگدلی اور سنگدلی کی دوا کے لئے دعا کیجیے - اور اگر رینگی ہے - تو

معلوم ہے ہی آپ کو بندے کا ایڈریس

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱ - ۱۹۵۵ء کے آخر تک بحالیاتی مالی ادارہ نے پوربی اور پچھمی پاکستان کے بے گھر لوگوں میں نو کروڑ پچاسی لاکھ تناسی ہزار روپے بطور قرض دئے ہیں -

۲ - اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت چار سو باون ہیلتھ سنٹر مختلف مقامات پر کھولے گئے ہیں -

۳ - بھارت سرکار نے ۵۶-۱۹۵۵ء کے دوران میں کھادی اور دیہاتی صنعتوں کی ترقی کے لئے پانچ کروڑ روپے کے عطیے اور ڈھائی کروڑ روپے کے قرضے آل انڈیا کھادی اور دیہاتی صنعتوں کے بورڈ کو دئے ہیں -

۴ - جزائر انڈمان اور نکوبار میں اس وقت اکتیس پرائمری اسکول، دو مڈل اسکول، اور ہائی اسکول ہیں -

اطہر پرویز

کرنوں والا

"برلن کے ایک سائنس داں، ہر آٹو فاوسٹ نے ۲۰ دن کے اندر ایک ایسا ریڈیو بنایا ہے جو سورج کی کرنوں کی گرمی سے کام کرتا ہے۔ اس میں بجلی کی بیٹری یا تار کی تار برقی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ریڈیو کا پچھلا حصّہ کھول کر اُس کو دھوپ میں رکھنا پڑتا ہے۔ دھوپ جتنی تیز ہوتی ہے آواز بھی اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے۔ اس میں سورج کی گرمی اکٹھا کرنے والی مشین ہے جو سگار کے بکس کے برابر ہے۔"

روزنامہ قومی آواز" مورخہ ۲۔ فروری سنہ ۱۹۵۵ء

آپ نے یہ خبر پڑھی۔ سورج کی روشنی کا ایک بڑا کارنامہ —— بڑا کارنامہ میں نے اس لئے کہا کیونکہ سورج کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ دنیا ہے۔ سچ پوچھئے تو سُورج ہی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہماری آپ کی یہ خوبصورت دنیا۔

ہم کوئلہ یا لکڑی، کھانا پکانے کے لئے جلاتے ہیں۔ یہ لکڑی یا کوئلہ کہاں سے آتا ہے؟ پرانے درخت جب کاٹ ڈالے جاتے ہیں تو اُن کا ایندھن ہی بنایا جاتا ہے۔ اگر سُورج نہ ہو تو یہ درخت کبھی نہ اُگیں۔ آپ اگر اپنے باغ کے پودے کو دھوپ سے ہٹا کر کسی اندھیری جگہ پر رکھ دیں، ایسی جگہ جہاں سُورج کی روشنی نہ پہنچ سکے۔ تو پھر آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوگا یہی کہ آپ کا لہلہاتا ہوا ہرا بھرا سبز پودا مُرجھا جائے گا۔ اس سے پتہ چلا کہ پودوں کی زندگی سورج کے دم سے ہے۔ اب اگر پیڑ پودے نہ ہوں تو آگ کیسے جلے، ہم آپ کھانا کیسے پکائیں۔ پھل پھلاری کہاں سے لائیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بجلی کا زمانہ ہے۔ ہم بجلی جلائیں گے اور بجلی کے چولہے سے اپنا کھانا پکائیں گے۔ لیکن بھائی بجلی کہاں سے آتی ہے؟ اگر سُورج نہ ہو تو بجلی بھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ سورج کی روشنی اور گرمی سے ہی تو سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے اور اوپر اُڑ کر بادل کی شکل میں ہمیں نظر آتا ہے اور یہی بادل رِم جھم مینہ برساتے ہیں، اور پھر یہ پانی کہاں جاتا ہے؟ یہی پانی بہتا ہوا دریا میں چلا جاتا ہے، اور اسی پانی سے بجلی پیدا ہوتی ہے، اور اگر پانی نہ ہو تو بجلی بھی نہ پیدا ہو، اور یہی نہیں، یہ ہوا جس سے ہم سانس لیتے ہیں

یہ خود بھی سورج کی دھوپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر سورج ختم ہو جائے تو یہ ہوا بھی ختم ہو جائے گی، اور ہماری آپ کی یہ دنیا بالکل ٹھنڈی، اندھیری اور مردہ دنیا ہوگی۔ جہاں نہ پھل پھول اور پودے ہوں گے، نہ آگ، پانی اور ہوا ہوگی اور نہ جانور، کیڑے، مکوڑے اور انسان ہوں گے۔ پھر یہ دنیا کیسی ہوگی ——؟ بہت بُری —— یا جہاں زندگی نہ ہو وہاں کیا ہو سکتا ہے نہ اچھا نہ بُرا۔

آپ نے غور کیا کہ یہ سورج جس کو ہم دن بھر چمکتا دیکھتے ہیں، کتنا اہم ہے۔ اسی کے دم سے سارا ظہور ہے، اور جب یہ اتنا اہم ہے تو آیئے اس کے بارے میں اور باتیں معلوم کریں۔

لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ ایسا ہی ایک ستارہ جو آپ رات کے وقت آسمان پر ہزاروں لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں کی تعداد میں دیکھتے ہیں، لیکن آپ کہیں گے "نا بھائی، سورج اگر ستارہ ہے تو پھر اتنا بڑا کیوں —— ستارہ تو ننھا منّا سا ہوتا ہے"!

آپ کا خیال بھی ٹھیک ہی ہے۔ لیکن بھئی ننھا مُنّا تو یہ اس لئے نظر نہیں آتا کیونکہ دوسرے ستاروں کے مقابلے میں اس کا فاصلہ زمین سے بہت کم ہے۔ آپ یہ سن کر اور بھی چونک پڑیں گے کہ آسمان پر ان گنت ستارے تو ایسے ہیں جو سُورج سے بھی بڑے ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ زیادہ دُور کی چیز چھوٹی نظر آتی ہے، یہاں تک کہ اگر فاصلہ زیادہ ہو تو چھوٹا ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے، اسی لئے تو آپ کو سُورج کے مقابلے میں وہ ستارے زیادہ

چھوٹے نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ سورج کے فاصلے سے بھی کئی لاکھ گنا زیادہ فاصلے پر ہیں۔ ہاں تو سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ ستارے کی خصوصیت کیا ہے۔ ستارے کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ وہ روشنی کے لیے کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ اور ستارے اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں اور سیارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہماری زمین، جو ایک سیارہ ہے۔ ہماری زمین بھی اور دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے اردگرد چکّر کاٹتی رہتی ہے، اور اس کا آدھا حصّہ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا ہے۔ جس آدھے حصّے پر روشنی پڑتی ہے وہاں دن ہوتا ہے، اور دوسرے حصّے میں رات۔ چونکہ سیّاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی اس لیے یہ سورج کی روشنی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہماری زمین کو ملا کر کُل نو سیارے ہیں جو سورج کے اردگرد ہماری زمین کی طرح چکّر لگاتے ہیں۔

سورج کی کہانی جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی عجیب و غریب بھی۔ اب کون آسانی سے یقین کرے گا کہ ہماری زمین سے اس کا فاصلہ ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ یہ فاصلہ ہمارے خیال میں بھی نہیں سماتا۔ لیکن بھئی یہ بات سچ ہے، سورج کا فاصلہ واقعی نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ آیئے ذرا اس فاصلے پر اور زیادہ غور کریں۔ یوں سمجھئے کہ اگر ہم چار سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑنے والے جہاز سے سورج کی طرف جائیں اور ایک لمحے کے لیے بھی جہاز کی رفتار کو کم نہ کریں، تو ہم سورج کے پاس تیس سال کے عرصے میں پہنچ سکتے ہیں، اور رات کے وقت جو ستارے ہمیں نظر آتے ہیں وہ اس سے ہزاروں گنا زیادہ فاصلے پر ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اتنے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور بعض تو ہمیں نظر بھی نہیں آتے۔ اُنھیں ہم بہت بڑی اور طاقت ور دُوربین کے ذریعے ہی دیکھ سکتے ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر تو سُورج سے بھی بڑے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ سُورج ہم سے کتنا دور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم کو کافی بڑا نظر آتا ہے۔ تو بھئی اس کا وزن کیا ہوگا۔ وزن —— ارے بھائی اس کا وزن منوں اور ٹنوں میں تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے وزن کا اندازہ یوں سمجھئے کہ ہماری زمین کتنی بڑی ہے۔ اگر ہماری زمین جیسی تین لاکھ تیس ہزار (۳۳۰،۰۰۰) زمینیں رکھ دی جائیں تو پھر کہیں جا کر سورج کے وزن کے برابر ہوں گی۔

ساغر بُرہان پوری

غزل

اے آتشِ غم اتنا تو بتا، کیا تجھ سے بھی سوزش ہیں ہے سوا
وہ آگ، جسے پی کر چشمِ مے خوار سے شعلے اُٹھتے ہیں

ہر گُل ہے دہکتا انگارہ، ہر غنچہ بہاروں کا مارا
ہائے یہ سلگتا نظّارہ، گُلزار سے شعلے اُٹھتے ہیں

احساس بھڑک اُٹھتا ہے کبھی، اشکوں کی جھڑی میں یوں جیسے
اِلہام کی بارش میں خُلدِ افکار سے شُعلے اُٹھتے ہیں

خود پھول برسنے لگتے ہیں اُس وقت بقدرِ ذوقِ طلب
جس وقت محبت کی راہِ پُرخار سے شعلے اُٹھتے ہیں

میں ایک نظر میں کیا دیکھوں جنّت کہ جہنّم اُف یہ ستم!
زُلفوں میں گھٹاؤں کا عالم، رُخسار سے شعلے اُٹھتے ہیں

اُفوہ! کتنا بڑا ہے، اور دیکھیے تصوّر کیجیے، مئی جون کے مہینے میں کتنی گرمی پڑتی ہے۔ اچھا ہی ہے جو یہ سورج ہم سے اتنے فاصلے پر ہے۔ اگر قریب ہوتا تو پھر ہم آپ زندہ بھی نہ رہتے، اسی دُھوپ میں جل کر مر جاتے۔ آپ جانتے ہیں کہ سُورج خود کتنا گرم ہے، اس کا درجۂ حرارت ۱۱۰۰۰ ڈگری ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جب کبھی کسی شہر کا درجۂ حرارت ۱۱۵ ڈگری ہو جاتا ہے تو وہاں موتیں شروع ہو جاتی ہیں، تو پھر بتایئے کہ گیارہ ہزار ڈگری کی حرارت میں کون زندہ رہ سکتا ہے۔

کتنا! اف کھا ہے یہ سورج ہمیں تو چکا چوندی ہونے لگی۔

ظفر علی سیّد

ایگزیلیری کیڈٹ کور

رسکن نے جو کہ نوع انسان کا سچا پرستار تھا، ایک کتاب میں بار بار دہرایا ہے کہ خوش حال اور تندرست لوگ ہی ملک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ کسی ملک کی اصلی طاقت، اُس کے مادّی خزائن میں پوشیدہ نہیں بلکہ عوام میں مضمر ہے —— اور قوم کا صحیح سرمایہ اس کے بچّے ہیں۔ آج کے بچّے کل کے قائد ہوں گے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ بچّوں کی صحیح تربیت ہی ملک و قوم کی تعمیر ہے۔

اس لئے دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں اور ماہرینِ تعلیم نے بچّوں کی تعلیم و تربیت ہی پر زیادہ توجّہ دی ہے۔ جان لاک، اور روسو نے بچّوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر اپنے افکار کے مطابق کافی روشنی ڈالی ہے۔

جان لاک کے خیال میں تعلیم کے تین اہم پہلو ہیں (۱) جسمانی (۲) اخلاقی (۳) دماغی۔ جن میں سے جسمانی تعلیم کو وہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم خیال کرتا ہے۔ اپنی کتاب Thoughts on Education میں اُس نے لکھا ہے۔

"ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہی اس دنیا میں خوش حالی کی مختصر مگر جامع تشریح ہے۔ جسے یہ دونوں میسّر ہوں، اُسے شائد ہی اور کسی چیز کی خواہش ہو، اور جس میں ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو وہ ناقص ہے"

دماغی اور جسمانی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"جسم کو مضبوط اور توانا رکھو تاکہ وہ دماغ کا حکم ماننے اور اس پر عمل کرنے کے قابل ہو"

روسو نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف Emile میں کہا ہے۔

"تمام شر و فساد کمزوری سے پیدا ہوتے ہیں"

ہمارے ملک کے مُدبّرین نے بھی اِن تمام باتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے جسمانی تربیت کو بچّوں کی تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار دے دیا ہے۔

اور اِسی مقصد کے لئے کئی تحریکیں مثلاً بوائے اسکاؤٹ، گائیڈز، بالکان جی باڑی، این سی سی وغیرہ جاری کی گئیں، مگر چند وجوہ کی بنا پر یہ بچّوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچانے میں قاصر رہیں، اس لئے ہند سرکار نے ملک میں ایک نئی تحریک "آگزیلری کیڈٹ کور" کے نام سے جاری کی۔ جسے اے۔ سی سی" بھی کہتے ہیں۔

اس کا مقصد "دیش سیوا" ہے، اور ذیل کے نظریات، اس کے بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ بچّوں کو اخلاقی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تربیت دینا، انھیں ایک عمدہ شہری بنانا اور اُن میں قیادت کا جذبہ پیدا کرنا۔

۲۔ ان میں حبِّ وطن کے جذبات کو بڑھانا۔

۳۔ خود اعتمادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا کرنا اور انھیں سماج سیوا کے لئے تیار کرنا۔

۴۔ ان میں ایسے خیالات پیدا کرنا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں شرم اور جھجک محسوس نہ کریں۔

یہ تمام ہائی اسکولوں میں جاری کی گئی ہے۔ اس میں بارہ سال سے زیادہ عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل کئے جاتے ہیں۔ میڈیکل امتحان (طبّی معائنہ) کے بعد ان سے حلف لیا جاتا ہے کہ وہ دیش اور قوم کی سیوا کے لئے ہمیشہ تیار رہیں گے۔ پریڈز میں باقاعدگی سے حاضر ہوں گے اور تمام احکامات کی حتی المقدور پابندی کریں گے۔

چونکہ طلبار اور اساتذہ میں محبّت و شفقت کا رشتہ ہوتا ہے وہ ایک دوسرے سے بڑے قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کام فوجی اشخاص کے سپرد نہ کرتے ہوئے موزوں اور صحت مند اساتذہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ چونکہ فوجی افسروں کے زیرِ نگرانی اسی غرض سے ٹرینڈ کئے گئے ہیں، ان کو اے۔ سی۔ سی آفیسر کہتے ہیں۔

بچوں میں Esperit-Corps کا جذبہ، ڈسپلن، جوش اور امنگ پیدا کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے یونی فارم دیا جائے گا، طلبا و اساتذہ کے یونی فارم میں نیکر، شرٹ، کینواس شوز اور موزے شامل ہیں اور لڑکیوں کے لئے۔

ا۔ سفید شلوار اور سفید قمیص۔

ب۔ سفید بلاؤز اور سفید سکرٹ۔

ج۔ سفید بلاؤز اور سفید یا سکرٹ چوڑی نیلے حاشیے والی ساری اور کینواس شوز ہیں۔

ٹریننگ کا نصاب حسب ذیل ہے۔

۱۔ ماس فزیکل ٹریننگ۔
۲۔ ماس ڈرل
۳۔ روٹ مارچ
۴۔ ٹیم گیمس
۵۔ فرسٹ ایڈ
۶۔ صفائی اور حفظانِ صحت
۷۔ آگ بجھانا
۸۔ تیراکی اور ڈوبتے کو بچانے کے طریقے
۹۔ بھیڑ کی روک تھام
۱۰۔ شہریت

کیمپ

اس کے علاوہ شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر کھلی فضا میں کیمپ ہوں گے۔ یہ کیمپ کسی تاریخی جغرافیائی یا کسی مشہور مقام پر ہوں تو بہتر ہے، ہر ماہ ایک ایک روز کا "آخر ہفتہ کا کیمپ" ہوگا، اور ہر اکیڈیمک ٹرم کے اختتام پر تین روز کا کیمپ ہوگا۔

بنیادی تنظیم

آگزیلری کیڈٹ کور کی اکائی "ایک سیکشن" ہے جس میں پچاس کیڈٹ (طلبا) ہوتے ہیں۔ ان کو ٹریننگ دینے والے استاد "سیکشن لیڈر" کہلاتے ہیں۔ آسانی کے لئے سیکشن کو دو "سب سیکشن" میں تقسیم کیا جاتا ہے جس میں ۲۴ کیڈٹ اور ایک "سب سیکشن سارجنٹ" ہوتا ہے۔ یہ سارجنٹ کیڈٹ ہی ہوتا ہے۔

ایک مدرسے میں لڑکوں کی تعداد کے مطابق کئی سیکشن ہو سکتے ہیں۔ یہ سب مل کر آگزیلری کیڈٹ کور کا "گروپ" کہلاتے ہیں جس کی کمان "گروپ کمانڈر" کرتا ہے، جو کہ سینیئر مدرس ہوتا ہے۔ اُن کی مدد کے لئے ایک دوسرے مدرس "ڈپٹی گروپ کمانڈر" کہلاتے ہیں۔

ہر کیڈٹ اور آفیسر اے، سی، سی" کریسٹ لگائیں گے۔ اس کے علاوہ ذیل کے بیج ہوں گے۔

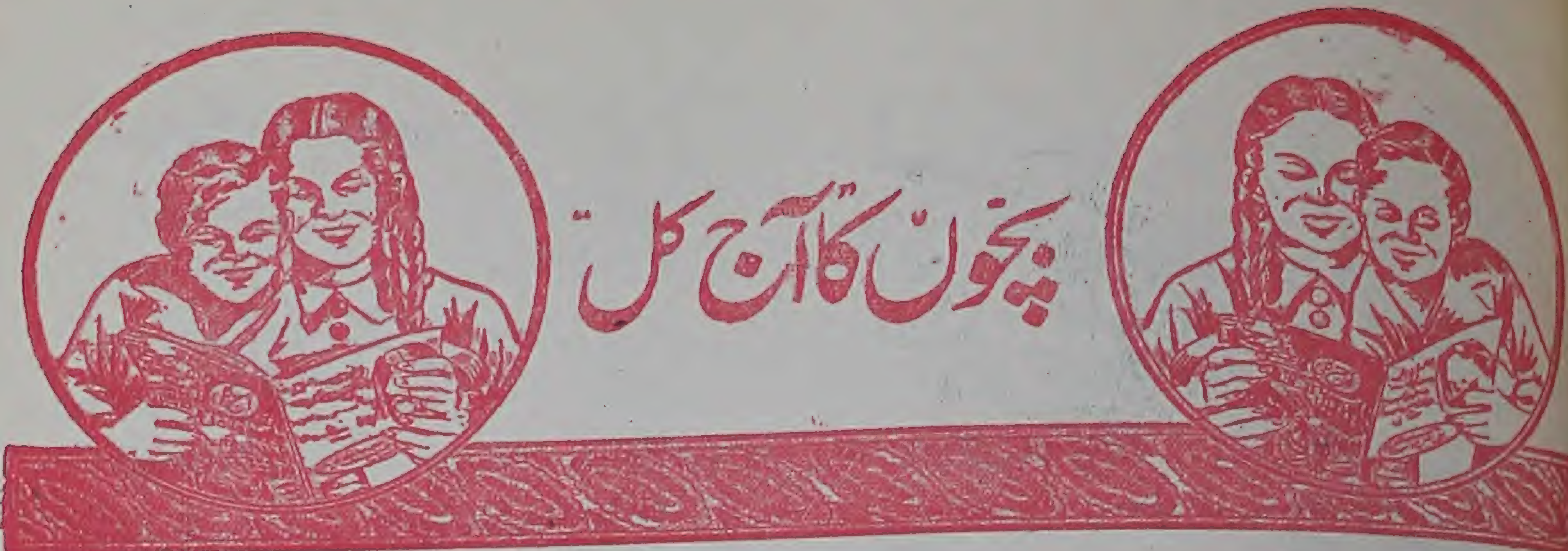
۱۔ سب سیکشن سارجنٹ	۱	اشوک چکر
۲۔ سیکشن لیڈر	۲	" "
۳۔ ڈپٹی گروپ کمانڈر	۳	" "
۴۔ گروپ کمانڈر	۱	اشوک کا شیر

ڈیفینس منسٹری (وزارتِ دفاع) کے ایما پر نیشنل کیڈٹ کور ڈائرکٹر این، سی، سی کے تجربات کی روشنی میں آگزیلری کیڈٹ کور کو چلاتے ہیں۔ انسٹرکشنل اسٹاف، ٹریننگ پروگرام کی ترتیب، این سی سی کا اسٹاف کرتا ہے۔ جسے گورنمنٹ آف انڈیا آسانیاں مہیا کرتی ہے۔

اے۔ سی سی مختلف کمیونٹی پروجیکٹ علاقوں، ڈیولوپمنٹ بلاک میں بھی کام کرے گی جس کے انتظامات کمیونٹی پروجیکٹ کے منتظمین اور این، سی، سی کے افسر کریں گے۔

حالات اور تجربات کے پیش نظر نصاب میں تبدیلیاں کی جائیں گی۔ جیسے پارسال لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹریننگ میں کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا گیا تھا۔ مگر امسال کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں —— روٹ مارچ، تیراکی، بھیڑ کی روک تھام کو لڑکیوں کے نصاب سے خارج کرکے ذیل کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

۱۔ ہوم نرسنگ
۲۔ چائلڈ ویلفیر
۳۔ آگ بجھانے کی نظری تعلیم
۴۔ لوک ناچ اور لوک گیت
۵۔ باغبانی، کشیدہ کاری، ڈرائینگ، مصوری اور ایسے مضامین جو لڑکیوں کے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہوں۔



نجم آفندی

بھارت دیس

بھارت سب کی آنکھ کا تارا — گنگا جمنی دیس ہمارا
ہندو ہو یا مُسلم کوئی — اپنا گھر ہے سب کو پیارا
سب نے کی ہے سیوا جس کی — سب نے مل کر جس کو سنوارا
جس کے کارن گاندھی جی نے — تن بھی وارا، من بھی وارا
گرمی نیاری سردی پیاری — برکھا جیسے امرت دھارا
کھیتوں والا، باغوں والا — آشاؤں کا پالن ہارا
پُورب پچھم اُتّر دکّھن — چاروں اور بسے اُوجیارا
میٹھے پھل اور پُھول سجیلے — آم ہے میوہ خاص ہمارا
اونچا سب سے ہمالا پربت — تن سنگھ جس پر چڑھ کے پُکارا
اِک دن اپنا دیس بنے گا — سارے جگ کا پریم سہارا

امر چند قیس جالندھری

انوکھا شیر



کردار :-

اورنگ زیب —— مغلیہ شہنشاہ

جس ونت سنگھ —— ایک سردار

پرتھوی سنگھ —— جس ونت سنگھ کا لڑکا

درباری —— دربان ——

شکاری —— حاضرین ——

[مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا دربار آراستہ ہے امیر وزیر قرینے اور ادب سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ دربان احترام کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے —]

دربان ۔ جہاں پناہ! جنگل کے کچھ باشندے جنگل کے بادشاہ کو پنجرے میں قید کر کے لائے ہیں۔ اسے وہ آپ کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

اورنگ زیب ۔ انھیں اپنے نذرانے کے ساتھ ابھی پیش کرو۔

[دربان جاتا ہے۔ شکاری اور شیر کا داخلہ]

— اُف! کتنا خوف ناک، تُند اور دلیر ہے۔ یہ شیر تو اس سے بھی زیادہ خوں خوار ہے جسے ہم نے نماز پڑھتے وقت شمشیر کے گھاٹ اُتارا تھا۔

ایک درباری ۔ عالی جاہ! واقعی ہماری نظر سے تو اتنا بڑا خطرناک جانور آج تک نہیں گزرا۔

دوسرا ۔ ہم بھی تو کئی دفعہ حضور کے ساتھ شکار میں شریک ہوتے ہیں — لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا شہ زور شیر کبھی نظر سے نہیں گزرا۔

تیسرا ۔ دیکھیے تو پنجرے میں کس شان سے گرج رہا ہے۔

چوتھا ۔ گویا ابھی پنجرے کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئے گا۔

پہلا ۔ اُف! کس قدر غضب ناک ہو رہا ہے۔ آنکھوں سے شعلے برستے ہیں۔

اورنگ زیب ۔ یہ شیر کہاں سے پکڑا بھئی! تم نے؟

شکاری ۔ عالم پناہ! اس نے جنگل میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اب کی بارش نہ ہونے کی وجہ سے پانی کی تلاش میں پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔ اس کی مادہ بھی ساتھ تھی۔ اُسے ہم نے ہلاک کر دیا۔ یہ ہے اس کی کھال۔

اورنگ زیب ۔ مادہ کا قد بھی بہت بڑا ہے کتنی شان دار ہے یہ کھال —۔ علاقے میں کوئی نقصان تو نہیں ہُوا؟

شکاری ۔ کچھ نہ پوچھیے عالی جاہ! اس نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ گھر سے باہر نکلنے کی جرأت کسے ہوتی تھی؟ بہت سی انسانی زندگیوں کے علاوہ مویشیوں

کی جانوں کا بھی نقصان ہوا ہے ۔
اورنگ زیب - ٹھہرو - تمھیں شاہی خزانے سے انعام دیا جاتا ہے .... لیکن تم ابھی تک خاموش ہو ؟ جس ونت سنگھ ! کیا بات ہے ؟
جس ونت سنگھ - کچھ نہیں ان داتا !
اورنگ زیب - آخر یہ سکوت ؟ کیا تمھیں ہم سب سے اختلاف ہے ؟
جس ونت سنگھ - کیا عرض کروں ۔
اورنگ زیب - کیوں ؟ کچھ تو کہو - کیا تمھیں ایسا خوف ناک درندہ آج سے پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ؟
جس ونت سنگھ - کیوں نہیں ؟ حضور ! یہ کیا چیز ہے ؟
اورنگ زیب - اچھا ! کب اور کہاں ؟
جس ونت سنگھ - غریب پرور ! اب بھی وہ میرے پاس ہے ۔
اورنگ زیب - اب بھی وہ تمھارے پاس ہے ؟ ہم نے تو کبھی دیکھا نہیں اور نہ ہی سنا ہے کہ تمھارے پاس بھی کوئی شیر ہے ۔
جس ونت سنگھ - میرا شیر اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے ۔
ایک درباری - حضور ! یہ محض گپ ہے ۔
جس ونت سنگھ - گپ ہے ؟ ابھی آزمائش ہو جاتی ہے .... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ؟
.... دونوں شیروں کی کشتی دیکھ لی جائے ۔
اورنگ زیب - ہم ابھی تماشا دیکھیں گے ۔ لیکن اگر تمھارے شیر کو شکست ہو گئی ؟
جس ونت سنگھ - یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے ؟ میرا شیر اسے یقیناً پچھاڑ دے گا ۔ لیکن بہ فرض محال اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں اُسی وقت اس دربار میں اپنی گردن کاٹ کے رکھ دوں گا ۔
اورنگ زیب - (اُمرا سے) ابھی وسیع میدان کا انتظام کرو جنگلہ وغیرہ تیار ہو جائے ۔ احتیاط کے ساتھ تمام حفاظتی تدابیر عمل میں لاؤ ۔ ہم ابھی کشتی دیکھیں گے ....
[جس ونت سنگھ سے] سردار ! تم جا کر اپنے شیر کو لا سکتے ہو ۔
جس ونت سنگھ - جہاں پناہ ! میرا شیر ہر وقت تیار ہے ۔ آپ مناسب انتظامات کی تکمیل کرا لیں ۔ یہاں کوئی دیر نہیں ۔

[وسیع میدان کے درمیان لمبی لمبی سلاخوں کا مضبوط جنگلہ ۔ جس میں صرف دو دروازے ہیں ۔ ایک دروازے کے ساتھ جنگلی شیر کے پنجرے کا دروازہ کھلتا ہے ۔ دوسرا دروازہ دوسرے شیر کے داخلے کے لیے ہے ۔ حاضرین حیرت سے تک رہے ہیں]
اورنگ زیب - جس ونت سنگھ ! کہاں ہے تمھارا شیر ؟ لاؤ اب اسے
جس ونت سنگھ - ابھی وہ میدان میں کود پڑے گا ۔ شیر کے پنجرے کا دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرمائیں ۔ حضور !
اورنگ زیب - مگر تمھیں شرط کا بھی خیال ہے ؟
جس ونت سنگھ - مجھے اپنی زبان کا پاس ہے ۔ میں پھر اپنے الفاظ اس دربار میں دہراتا ہوں کہ اگر خدا نہ خواستہ میرے شیر کو شکست کا منہ دیکھنا نصیب ہو تو میری گردن کاٹ کر جسم سے الگ کر دی جائے ۔ مجھے کوئی عذر نہ ہو گا ۔
اورنگ زیب - شکاری ! پنجرے کا دروازہ کھول دے ۔
شکاری - بندہ نواز ! مقابلے پر تو ....
جس ونت سنگھ - تجھے اس سے کیا ؟ تو اپنے فرض کی طرف توجہ دے ۔ شاہی فرمان کی تعمیل ہی تیرا کام ہے ۔

[شکاری پنجرے کا دروازہ کھول دیتا ہے]

—— بیٹا پرتھوی! اب نکل تو میدان میں ذرا - دیکھ تیرا حریف کس طرح گرج گرج کر تجھے للکار رہا ہے -

[شیر کی گرج]

اورنگ زیب - یہ ہے تمہارا شیر؟ اب ہم سمجھے -

سرگوشیاں - اس کم سن بچے کو موت کے منہ سے بچاؤ -

ایک مدھم آواز - ابھی تو اس کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ہے -

دوسری آواز - اُف! باپ کا کلیجہ!

جس ونت سنگھ - پرتھوی! دیکھتا کیا ہے بیٹا! اس موذی کو ایسی نیند سُلا دے جس سے کوئی آنکھ بیدار ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی -

پرتھوی سنگھ - [تلوار میان سے سونت کر] اس تلوار کے ایک ہی ہاتھ سے ابھی اس کا کام تمام کر دوں گا -

جس ونت سنگھ - کیا کرتا ہے؟ اسے میان میں ڈال - جنگ کے اصولوں سے بھی واقف نہیں؟ ہوش کر نہتے دشمن پر ہتھیار کے ساتھ حملہ کر دینا کہاں کا دھرم ہے؟

پرتھوی سنگھ - بھول گیا - پتاجی! معاف کر دیجئے -

[تلوار پھینک دیتا ہے]

جس ونت سنگھ - ہاں - راجپوتی آن پر آنچ نہ آئے - شاباش -

[شیر پرتھوی سنگھ کی طرف لپکتا ہے - مگر پرتھوی سنگھ جبڑوں کو پکڑ کر چیر دیتا ہے - شیر دم توڑتا ہوا درد سے کراہتا ہے - سہمے ہوئے حاضرین کے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے ہیں اور وہ بے اختیار نعرے لگاتے ہیں]

ایک - سردار جس ونت سنگھ کی ——

باقی - جے

دوسرا - کمار پرتھوی سنگھ کی ....

باقی - جے

پرتھوی سنگھ - [قدموں میں جھک کر] پتاجی! پرنام

جس ونت سنگھ - شاباش - آ بیٹا! تجھے سینے سے لگا لوں -



اورنگ زیب - [دل ہی دل میں] کتنا من چلا ہے یہ کم سن لڑکا... یہ راجپوت تو موت کو کھلونا سمجھتے ہیں - اپنی آن کے لئے جان پر بھی کھیل جانا ان کے بائیں ہاتھ کا لٹکا ہے... کاش!

[پرتھوی سنگھ تعظیم کے لئے اورنگ زیب کے تخت کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے]

—— زندہ باش - پرتھوی! ہم تیرے دلیرانہ کارنامے سے بہت خوش ہوئے ہیں - عزیز! کیا انعام دیا جائے تجھے؟

پرتھوی سنگھ - مَیں نے پتاجی کے ارشاد کی تعمیل کی ہے - فرض کسی انعام کی تمنا نہیں رکھتا - وہ ایسی توقعات سے بے نیاز رہتا ہے - آپ کی ہر طرح نوازش ہے - شکریہ!

اورنگ زیب - اچھا - آج شام ہمارے محل میں آنا ...

[دل ہی دل میں] یہ راجپوت لڑکا غضب کا دلیر تو ہے ہی - اخلاق کے زیور سے بھی اس کی طبیعت خوب آراستہ ہے - [پردہ]

وحید قیصر

نادان خرگوش



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نادان خرگوش رات کے وقت جنگل میں ادھر اُدھر پھر رہا تھا۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے اُڑتے پھرتے تھے۔ چاند کی روشنی میں جنگل کی ہر چیز نُور میں ڈھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خرگوش کو یہ سماں بڑا پیارا لگ رہا تھا اور وہ مست ہو ہو کر چھلانگیں لگا رہا تھا کہ اچانک اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔

جوں ہی وہ ناریل کے ایک درخت کے نیچے سے گزرا درخت سے ایک ناریل ٹوٹ کر اس کے سر پر آ لگا۔ اس پر دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ چاند کے رُخ پر بادل آ جانے کے سبب جنگل میں گھُپ اندھیرا ہو گیا۔ خرگوش نے سمجھا کہ شاید آسمان سے چاند ٹوٹ کر اس کے سر پر آ لگا ہے۔ جبھی تو ہر طرف اندھیرا ہو گیا۔

بس اب کیا تھا۔ وہ سر پر پیر رکھ کر وہاں سے چیختا چلّاتا بھاگ کھڑا ہوا۔ راستہ میں ایک جگہ گلہری سے اس کا سامنا ہو گیا۔ گلہری نے اسے اس بدحواسی سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو وجہ پوچھی۔

"اے بہن کیا پوچھتی ہو"! وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولا۔ "تم نے دیکھا ابھی تھوڑی دیر پہلے چاند آسمان پر چمک رہا تھا"۔

"ہاں ہاں۔ چاند کو چمکتے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا"۔ گلہری نے اس کی بات کی تائید کی۔

بس وُہی چاند ٹوٹ کر ابھی ابھی میرے سر پر آ لگا ہے۔ یقین نہ ہو تو دیکھ لو۔ میرا سر بھی زخمی ہو گیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سر ثابت ہی رہا پھوٹ نہیں گیا۔

خرگوش کی باتیں سُن کر گلہری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اُسے وہاں سچ مچ ورم سا معلوم ہوا۔ ادھر آسمان پر چاند بھی غائب تھا۔ چنانچہ اسے خرگوش کی بات کا پورا پورا یقین آ گیا اور اُس نے خرگوش کو زندہ بچ رہنے پر مبارکباد دی۔

"ہمیں جلد از جلد یہ خبر جنگل کی برادری کے ہر فرد تک پہنچا دینی چاہیے"۔ گلہری نے اسے مشورہ دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور" خرگوش نے کہا اور دونوں یہ خبر لئے سب سے پہلے اُلّو کے پاس پہنچے۔

"بوڑھے فلسفی! بوڑھے فلسفی!" گلہری اُلّو کے قریب جاتے ہی چلّائی "کچھ سُنا تم نے؟ یہ جو آسمان پر چمکتا ہے نہ چاند۔ یہ ابھی ابھی ٹوٹ کر میرے دوست خرگوش کی کھوپڑی پر آ لگا ہے۔ جبھی تو تمام جنگل میں یکایک اندھیرا ہو گیا ہے"!

"ہائیں۔ کیا کہا؟ کیا سچ کہتی ہو!" اُلّو یہ خبر سُن کر چونک اُٹھا

"ہاں ہاں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ چاند میرے سر پر آ لگا ہے۔ میرا سر ابھی تک درد کر رہا ہے"۔ خرگوش نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اگر تمہاری خبر درست ہے تب تو بہت بُرا ہوا ہمیں جلدی سے سب کو اکٹھا کر کے سوچنا ہوگا کہ کس طرح دوبارہ چاند کو اس کی اصل جگہ پر لگایا جائے"؟ اُلّو نے پریشان ہوتے ہوئے کہا اور ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

تینوں چلتے چلتے چوہے کے گھر تک پہنچے اور اسے بھی یہی خبر سُنائی۔ چُوہا یہ خبر سُنتے ہی ایک دم اپنی جگہ پر اُچھل پڑا اور بوکھلاتے ہوئے بولا۔

"کیا تم سچ کہتے ہو؟ کیا ایسا کبھی ہو سکتا ہے"؟

آخر جب جنگل کی تمام برادری اکٹھی ہو گئی تو اُنھوں نے ناریل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ ٹوٹے ہوئے چاند کو دوبارہ آسمان پر کس طرح لگایا جائے کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ اگر چاند کو آسمان پر واپس نہ لگایا جا سکا تو ان کی راتیں کبھی جگمگا نہ سکیں گی۔

ابھی وہ سب بیٹھے سوچ بچار کر ہی رہے تھے۔ کہ تیز ہوا چلی اور درخت سے چند ناریل ٹوٹ کر ان کے سروں پر آ لگے۔

"خرگوش کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ ضرور وہ بھی ناریل ہوگا جو اس کے سر پر لگا ہے"۔ سب نے بیک آواز کہا۔

نہیں میں اتنا احمق بھی نہیں کہ چاند اور ناریل کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں۔ خرگوش غصّہ سے تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔



"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کیا تمہاری نظر میں ہم سب جُھوٹے ہیں"؟ تینوں کرخت آواز میں بولے اور چوہے کو مجبوراً ان کی بات کا اعتبار کرنا پڑا۔

اسی طرح وہ باری باری جنگل کے تمام جانوروں کے پاس یہ خبر لے کر پہنچے۔ ہر ایک نے اس خبر کو تعجب سے سُنا اور خرگوش سے رسماً ہمدردی کا اظہار کیا۔

عین اسی وقت چاند کے رُخ پر سے بادل ہٹ گئے اور چاند پھر پہلے کی طرح آسمان پر چمکنے لگا۔

یہ دیکھ کر تمام جانوروں نے خرگوش کی حماقت پر ایک قہقہہ لگایا۔ اور خرگوش شرم سے مُنہ چھپا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

سچ ہے بے سوچے سمجھے بات کرنے والوں کو آخر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

محمد اسلم خواجہ

دروازہ بند کر دو

چند کام کرنے والے

رامو - ایک کسان   آشا - رامو کی بیوی

جگو - ایک حجام   وقت - سہ پہر شام

منظر - رامو اور آشا دونوں دن بھر کھیت میں کام کرنے کے بعد تھکن سے چُور ہو کر آگ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں - آشا توے پر سے آخری روٹی اُتار رہی ہے، رامو بھوک کے مارے بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہے - اور آخرکار بھوک سے بے قابو ہو کر جلدی جلدی اپنے آپ ہی کچے سالن کی دیگچی اُتار کر روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ کر کھانے لگا - کھانا کھا چکنے کے بعد پانی پی کر آشا سے کہتا ہے

رامو - آشا! ذرا دروازہ بند کر دو -

آشا - تم ہی بند کر دو۔ میں ذرا تھکی ہوئی ہوں -

رامو - نہیں تم ہی اُٹھ بیٹھو میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں -

آشا - مجھ میں اس وقت ذرا سکت نہیں - ہلنے کو بھی جی نہیں چاہتا -

رامو - (اپنی بیوی سے لڑنا نہیں چاہتا تھا - اس لئے فوراً بولا) اچھا دیکھو! تھکے ہوئے تو دونوں ہیں - لیکن اب جو پہلے بولے گا اُسی کو اُٹھ کر دروازہ بند کرنا پڑے گا -

اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہو گئی - خاموش رہنا بظاہر مشکل نہیں اس لئے اس پر دونوں شدت سے عامل نظر آتے تھے - شام ہو گئی رات ہو گئی اور دونوں بدستور مُنہ سے کچھ نہ بولے اور خاموشی سے اپنے اپنے پلنگوں پر جا کر لیٹ رہے - دروازہ اُسی طرح کھلا رہا - آدھی رات کے قریب گھر میں ایک کُتا گھس آیا - اور ساری روٹیاں ایک ہی مُنہ میں دبا کر چلتا بنا - کُتے کی آہٹ سے برتنوں کے کھڑکھڑانے سے آشا کی آنکھ کھل گئی - آشا اس کے پیچھے بھاگی اور اسے بھگا کر پھر واپس اپنے پلنگ پر آ گئی - مگر مُنہ سے کچھ نہ بولی - اس طرح صبح ہو گئی -



آشا اپنی پڑوسن کے پاس آٹا پینے چلی گئی - رامو ایک مونڈھے پر دُھوپ کھانے کے لئے گھر کے سامنے بیٹھ گیا - اتنے میں جگو حجام آ گیا -

حجام - حضور! بال بنا دوں؟

مگر رامو خاموش بیٹھا رہا اور مُنہ سے کچھ نہ بولا - جگو نے خود ہی بال کاٹنے شروع کر دئے اور پھر پوچھا -

حجّام - کیا انگریزی بال بناؤں یا سب کاٹ دوں -

رامو - پھر بھی چُپ رہا تو حجّو نے خود ہی سب بالوں کا صفایا شروع کر دیا رامو نے گردن بھی نہ ہلائی، اور غمگین صورت سے بالوں کا یہ عبرتناک حشر دیکھتا رہا، اتنے میں حجّو پھر بول اُٹھا -

حجّام - حضور! کیا آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے؟

رامو پھر بھی خاموش رہا مگر یہ سوچنے لگا کہ واقعی اس کی طبیعت خراب تو نہیں - اُدھر حجّو کو شرارت سُوجھی تو اس نے چُولھے کی راکھ پانی میں گھول کر اُس کے سر سے مل دی، اور ساتھ ہی بولا -

حجّام - اس سے سر ہلکا ہو جائے گا سب جُوئیں مر جائیں گی - پھر وہی راکھ بھرے ہاتھ مُنہ پر مل کر کہنے لگا -



حجّام - چہرے کی چھائیاں بھی اس سے دُور ہو جاتی ہیں!

حجّام کی آواز سُن کر آشا بھی آگئی اور بے اختیار مُنہ سے نکل گیا -

آشا - ارے یہ کیا تماشہ ہے ـــــ حجّو یہ کیا کر رہا ہے؟

رامو - (خوشی سے اُچھل کر) دروازہ بند کر دو! (پردہ)

کام کی باتیں

(١) ہر وقت ایک خوشگوار خیالی نقشہ اپنے پیشِ نظر رکھّو -

(٢) کسی دیانت دار بال بچّوں والے مزدور کو تنگ حال پاؤ تو چُپکے سے اُس کی مدد کرو -

(٣) کسی کو غمگین دیکھو تو اس کا غم دُور کرنے کی کوشش کرو -

(٤) سادہ لوح لوگوں کو عیّاروں کے خطرات سے بچاؤ -

(٥) جو دُنیا میں لوگوں کی خدمت نہیں کرتا - وہ آخرت میں اجر نہیں پاتا -

(٦) کبھی کبھی کی ملاقات بہت خوشگوار ہوتی ہے -

(٧) جس آدمی کا سلوک بیوی بچّوں سے اچھّا نہ ہو - اس کی عبادت کس کام کی -

(٨) جس باپ کو اپنے بھُوکے بچّوں کی فریاد سُنائی نہیں دیتی - وہ بہرہ ہے -

(٩) آوارہ مزاج اور اوباش دوستوں سے بچّو کہ یہ کسی کو گھر گھاٹ کا نہیں چھوڑتے -

(١٠) لوگوں کی خیالی امداد میں مصروف رہنے سے بھی انسان کے دل کو ایک سرور سا حاصل ہوتا ہے -

(١١) افسوس ہے ان لوگوں پر جنھوں نے پیغمبروں کو مانا لیکن اُن کی تعلیم سے انکار کیا -

(١٢) غریبوں سے محبّت کا برتاؤ کرو -

(١٣) خدمتِ خلق مذہب کی جان ہے -

یہ کتابیں پڑھیئے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجئے۔
اور اس تعمیر و ترقی میں اپنا حصّہ ادا کیجئے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے! سوالات و جوابات کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی ہے وہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم امور بیان کر دئے گئے ہیں۔

قیمت ۴ ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارِ نمایاں میں حصّہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر بلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیرِ تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب کیجئے یا براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندُستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراقؔ گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکہ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوشؔ ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطّلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسینؔ



" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ داروں کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسینؔ

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو رنگین اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمّت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمد فاروقیؔ

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509

آج کل



آٹھ آنے

اپریل ۱۹۵۶ء

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

" رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔ "

فراق گورکھپوری

" رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "

جوش ملسیانی

" میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلق ہے آج کل کے صفحات پر چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔ "

ممتاز حسینؔ



" تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خدوخال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بےچینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ "

اشفاق حسینؔ

" میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمّت افزائی بھی کی ہے۔ "

خواجہ احمد فاروقی

" آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچّوں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔ "

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

قیمت سالانہ چھ روپے

ترتیب

بچوں کا آج کل

سرورق:۔ بہاراں

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ نمبر ۹

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں: چھ روپے
پاکستان میں:۔ چھ روپے (پاک)،
غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا ایک ڈالر
فی پرچہ:۔ ہندوستان میں:۔ آٹھ آنے
پاکستان میں:۔ آٹھ آنے (پاک)

اپریل ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

عبدالمجید حیرت

غزل

سب کہاں منتقل سفینوں میں — لے گئے لوگ راز سینوں میں

ہم ہیں، یا آپ سوچئے تو سہی — کون ہے کس کے خوشہ چینوں میں

کی نہ تھی، آہ بھی، ابھی کہ وہاں — شکنیں پڑ گئیں جبینوں میں

جب ملے تھے، تو ہم یہ سمجھے تھے — مے بھی ہو گی اِن آبگینوں میں

بات اکثر سمجھ نہیں پاتے — ہیں غبی بھی بہت ذہینوں میں

جوہری ہی نکال سکتا ہے — فرق اچھے بُرے نگینوں میں

یا مکاں ہی نہیں قرینے کے — یا سلیقہ نہیں مکینوں میں

اس قدر ربط و ضبط تھا جن سے — نظر آتے ہیں اب ہمینوں میں

دلق پوشوں کو کم نہ سمجھیں آپ — کیا نہیں اُن کی آستینوں میں

ذہن ہوتا ہے، دل نہیں ہوتا — آج کے نکتہ آفرینوں میں

حیرت آساں نہیں غزل کہنا
اس قدر مختصر زمینوں میں

چندر کرن سون رکسا

تہذیب کی راہ پر

سمیرو کی بہو کا دل بہت دنوں سے کڑھی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ لیکن یہی سوچ کر چپ رہ جاتی کہ ڈیڑھ پاؤ تیل اور تین پاؤ بیسن اگر وہ کڑھی میں خرچ کر دے گی تو مہینے کے باقی آٹھ دن بنا چھونکی دال ترکاری ساس کے سامنے کیسے رکھے گی۔ کہنے کو تو اپنے کنبے میں وہ دو ہی ہیں ۔ سمیرو تو دلّی کی کپڑا مل میں نوکر ہے ۔ کبھی چھٹے چھماہے گھر آتا ہے ۔ گود کا بچّہ جو ابھی دودھ پیتا ہے۔ لیکن اس سے کیا ؟ چکّی میں تازہ بیسن پیس کر ملائین کے گھر سے بڑا لوٹا بھر مٹھا مانگ کر وہ کڑھی بنائے گی تو کیا ۔ کٹورا بھر کڑھی من بھری کاکی کو نہیں دے گی ؟ مانا کہ کاکی پرسوں ہی اس کی ساس سے لڑ کر گئی ہے ۔ تو کیا ہوا وہ رشتے میں اس کی چچیا ساس لگتی ہے ۔ بڑوں کی لڑائی میں چھوٹوں کے بولنے کا کیا کام ؟ جو اگر کسی سے کاکی نے سُن لیا کہ کڑھی بنائی اور اس کے گھر نہیں بھیجی تو کتنا بُرا مانے گی ۔ کڑھی بنائی تو کٹورا بھر اندھی کو بھی دینا ہوگی ۔ روٹی تو سبھی اسے دے دیتے ہیں ۔ لیکن اس محتاج کو کڑھی کہاں نصیب پھر دیوان جی ہیں ۔ اپنے للّا کو کتنا پیار کرتے ہیں ۔ انھیں تو اس کے ہاتھ کی کڑھی پکوڑی بہت ہی بھاتی ہے ۔ کٹورا بھر کڑھی کے ساتھ چار پُھلکے تو انھیں گھر بُلا کر ہی کھلائے گی ۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ دیوان جی کسی ریاست کے منیجر ہیں یا کبھی ہوا کرتے تھے ایسا نہیں ۔ اس چھوٹے گاؤں کا تو کوئی شخص کبھی داروغے کے رتبے تک بھی نہیں پہنچا ۔ بس دیوان جی ہی ایسے خوش نصیب نکلے کہ ساری نوکری میں کبھی دو مہینے ہیڈ کانسٹبل رہے تھے ۔ اب تیرہ روپے ماہوار پنشن پاتے ہیں ۔ پھر بہو سُسر کو کیسے بھول جاؤں ۔ گاؤں کے ناتے وہ سمیرو کے تاؤ ہیں اور بہو کے سُسر ۔ کڑھی بنے گی تو نائن ہے' دھوبن ہے کہاری ہے انھیں بھی تو ایک ایک کٹوری دینی ہی ہوگی ۔ یوں سمیرو کی بہو کے پاس آتنا تیل ساوں سے نہیں ہے کہ وہ نائن سے سر دبوا لے ۔ نہ ہی دو کے علاوہ تیسری دھوتی کہ دھوبن کو دُھلنے دے ۔ ان دونوں کو کھینچ کھینچ کر پہنتی رہتی ہے ۔ جب وہ بالکل میلی چکٹ ہو جاتی ہیں تب وہ انھیں باری باری سے دُھلنے دیتی ہے ۔ جمنا دھوبن انھیں ریہہ مٹی اور بکری کی مینگنیوں سے رگڑ ندی سے دھو کر لا دیتی ہے بمشکل سے چار آنے مہینے کی دُھلائی بیٹھتی ہوگی ۔ کہاری تو کبھی اس کے سسر کے وقتوں میں ہی لگی ہوگی ۔ اب تو خود ہی اندھیرے مُنہ اٹھ کر گھونگھٹ کاڑھ ۔ چار گھڑے پانی مصر کے کنوئیں سے کھینچ لاتی ہے ۔ تب بھی وہ ہے تو ان سب کی ججمان ہی ۔ آج بھی یہ سب اس کی ساس کو "ٹھکرائن اماں" کہہ کر پاؤں لگتی ہیں ۔ پھر بتائیے ایک اچھی چیز بنائے گی تو بھلا انھیں چکھائے بغیر اپنے پیٹ میں کیسے رکھ لے گی ؟ اور ہاں ۔ جمادارن چاچی کو تو بھول ہی گئی ۔ وہ تو اس کے گھر کا نرک دھوتی ہے ۔ ایک بار سمیرو کی بہو خود روکھی روٹی بھلے ہی کھا لے ۔ جمادارن کو روزانہ چور روٹیاں دی جاتی ہیں ۔ ان پر دال' سبزی یا کچھ نہ ہو تو ایک آدھ اچار کی پھانک ضرور ہی رکھ دیتی ہے ۔ اسے تو وہ دو بڑی کڑچھی سے کم کڑھی دے ہی نہیں سکتی ۔ اس کے بعد رہ جاتی ہے بھولی اس کی گائے ۔ جاڑوں میں اس کا چندن (لڑکا) جب بہت بیمار ہوا اور شہر کے ڈاکٹر نے بغیر نقد پیسے کے دوا دینے سے انکار کر دیا ۔ تب بھولی کو لالہ رام دھن کے ہاتھ بیچ دینا پڑا ۔ وہ آج پرائی ہے ۔ پھر بھی کڑھی بنے گی تو دو روٹی اور کٹورا بھر کڑھی اسے بنا کھلائے اس کا دل کیسے مانے گا ؟ بیچ دینے سے دودھ پینے کا حق جاتا رہا ۔ کھلانے کا حق تھوڑے ہی چلا گیا ۔ پھر محلّے کے رکھوالے اس کالو کتّے کو بھی جسے وہ بلا ناغہ صبح شام دو موٹی روٹیاں ڈالتی ہے ایک چمچ کڑھی تو ضرور دے گی ۔ بھگوان نے جانے کن گناہوں کے سبب اسے کتّا بنایا ۔ ورنہ بہو کا عقیدہ ہے کہ پچھلے جنم میں وہ انسان رہا ہوگا کتنا اصیل کتّا ہے ۔ اب آپ ہی بتائیں' بنا آدھ سیر تیل اور سیر بھر بیسن کے وہ کڑھی کیسے بنائے ۔ اب کے جب سمیرو آئے گا ۔ تو اس سے ایک

روپیہ الگ سے مانگ کر وہ اپنی خواہش کو پورا کرے گی - سمیرو اگلے پکھواڑے میں آئے گا - کل دس گیارہ دن ہی تو رہ گئے ہیں -

کڑھائی بھر کڑھی کی تفصیل سُن کر سمیرو نے قدرے مسکرا کر کہا۔ "اچھا کڑھی تو تُو نے ایک انمول نعمت بنائی ہے - ایسے محلے بھر میں دے گی ہی - پر آٹا بھی دو سیر سے کم نہیں گوندھا ہے - کیا آج تیری کاکی' چاچیوں کے گھر توا بھی نہیں چڑھے گا؟"

اس پر بہو نے تھوڑا جھنجھلا کر جواب دیا - کیسی باتیں کرتے ہو؟ شہر جا کر تو تم ایک دم ہی صاحب بن گئے ہو - کیا وہاں کوئی کُتّے بلّی کو بھی ٹکڑا نہیں ڈالتا؟ ارے بابا! تین جنے تو ہم خود ہی کھانے والے ہیں - دو روٹی جمادارن چاچی کی ہوئیں - دو روٹی اندھی کو دینی ہوتی ہیں - ایک روٹی گئو گراس کی نکالی - دو روٹی کالو کو ڈالنی پڑیں گی - پھر دو چار روٹی فالتو بھی بناؤں گی - پتہ نہیں کب کوئی مہمان آجائے - اور نہیں پڑوس کے بچے ہی کھیلتے آجائیں اور انھیں ہی ٹکڑا ٹکڑا پکڑا نا ہو تو کیا اسی وقت چولھا جلا کر توا چڑھاؤں گی؟ سمیرو چپ ہو گیا اور بالٹی رسی اُٹھا کر کنوئیں پر نہانے چل دیا اور بہو توا رکھ کر روٹی سینکنے لگی - وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شہر کیا گئے کہ سارے ناتے بھلا بیٹھے؟ شادی کے پورے نو سال بعد تو میرے چندن ہوا ہری ہر آئے تو بڑی خوشی خوشی بولے - ہم تو لڈو بانٹیں گے - اور لڈوؤں کے نام کل آٹھ روپے نکالے - بھلا چار سیر لڈو میں کس کس کو دیتی - کس کو چھوڑتی! کہنے لگے - یہاں چار گھر اپنی برادری کے ہیں' دو گھر لالہ اور نمبردار کے - اور دو دو لڈو دھوبی اور بھنگی کو - بتاؤ جس گاؤں میں پیدا ہوئے - جس محلے میں کھیل کر بڑے ہوئے - وہاں کیا برادری اور کیا غیر - رمضان جولاہے کے ہاں پوتے کا ختنہ ہوا تھا تو کیا اس نے چھوہارے' مصری نہیں بھیجی تھی؟ ہم کیسے انھیں چھوڑ دیتے! رگھو ماچھی' بھلوا کمہار' نتھوا تیلی کیا للّا کے ہونے کی آس نہیں لگائے تھے؟ یہ بھی کتنے نرموہی ہو گئے ہیں - کہنے لگے - کیا رگھو ترکاری کے پیسے نہیں لیتا؟ بھلا گھوڑا گھاس سے یاری کرے تو کھائے کیا؟ اپنی چیز اور محنت کے پیسے نہ لیں تو ان کا گزر کیسے ہو؟ پر اس سے کیا محبت کے ناتے ختم ہو گئے - یہ تو شہر میں رہتے ہیں - ادھر امّاں سدا بیمار رہتی ہیں - رگھو ہی دونوں وقت وید جی سے دوائی لا کر دیتا ہے - نتھوا کی بہو تو میرے چندن کے سُکھ دُکھ میں اپنے گھر کا کام چھوڑ کر دن رات یہیں بیٹھی رہی ہے - مسجد کے امام میر - یہ تو سگے ماں باپ سے زیادہ ہیں - بیچارے دونوں وقت للّا کو پھونک ڈال جاتے تھے - پھونک ڈلوائی کا کبھی دھیلا بھی نہیں لیا - شیخو بہشتی اماں کو دیکھتے ہی سلام کرتا ہے - بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی تھی تو کیا انھیں بھول جاتے؟ میں نے اسی لیے تو اماں سے کہہ دیا - ادھار لے کر لڈو بانٹنے کو میں نہیں کہتی چاہے بتاشے بانٹو - پر دو نگی میں سب کو - اس پر کتنی مشکل سے بتاشے لا کر دئے تھے -

"بہو! باہر سے دیوان جی کھانستے ہوئے داخل ہوئے - سچ کہتا ہوں تیری کڑھی کی خبر سُن کر تو میرا ایک چُلّو خون بڑھ گیا - کہاں ہے چندن؟ اس کے لیے جھُنجھنا لایا ہوں -

بہو نے گھونگھٹ کھینچ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "سو رہا ہے للّا تو - آپ نہا آئے ہوں تو تھالی پروسوں"؟ نہا تو آیا ہوں - پر سمیرو کو بھی آ جانے دے تبھی پروسنا - اتنے میں للّا اُٹھ گیا - دیوان جی نے اس کو بڑے پیار سے گود میں اٹھا لیا اور لگے باتیں کرنے -

دھوپ چڑھتی جا رہی تھی - سمیرو رہ رہ کر جھنجھلا اُٹھا - نو دس بجنے کو آئے - چھ کوس بیل گاڑی پر چل کر نجف گڑھ پہنچنا ہوگا - تب کہیں دلّی جانے والی بس ملے گی - اور بہو ہے کہ دھر اُٹھائی' پیروں لگائی اور گلے ملائی سے فرصت ہی نہیں پاتی - کل بھی مل کا ناغہ ہوا - آج بھی شاید ٹائم سے نہ پہنچ سکے گا - ناحق دو روپے کا نقصان ہو جائے گا - نہ اماں مرتی - نہ اسے بہو کو ساتھ لے جانا پڑتا - کوٹھڑی کے اندر عورتیں اس کی بہو کو شہر میں رہنے اور بچّے کی سار سنبھال کے بارے میں نصیحتیں دے رہی تھیں - لڑا کا من بھری کاکی بھی آج سب جھگڑے بھول للّا کے لیے ڈبیا بھر نیا کاجل بنا کر لائی تھی -

باہر آنگن میں مرد چندن کو کھلونا بنائے پیار کر رہے تھے - رگھو کاچھی اپنی باڑی سے اس کے لیے ایک بڑا خربوزہ اور کئی تازہ ککڑیاں توڑ کر لایا تھا - بھلوا مٹّی کا گھوڑا - ہاتھی اور گڑیا تھامے چلا آ رہا تھا - دیوان جی نے اپنی پرانی اچکن کٹوا کر دو کرتے سلوائے تھے - للّا کو پیار کر کے بھرے گلے سے بولے - "بدمعاش! مجھے چھوڑ کر شہر جا رہا ہے! اے یہ اپنے بابا کی نشانی - کرتہ پہن کر میری ہی طرح بوڑھا ہوتا - سمجھا بے - اور بوڑھے نے سب کی نظر بچا کر وہ آنسو پونچھ ڈالے جو اس کی سفید مونچھ پ

کے کنارے ڈھلک آئے تھے۔ رمضان چندن کے لئے کھٹولے کی چھوٹی سی دری دے گیا۔ بھلے ہی وہ میلے روگڑ (پرانی روئی) کی تھی۔ بندو مالی کا چھوکرا اپنی بھوجی کے اچار ڈالنے کے لئے باغیچہ سے کچے آم ہی توڑ لایا بہو روتی جاتی تھی اور سب چیزیں گٹھڑی میں باندھتی جاتی تھی۔

"بہو! او بہو! ننھوا کی بہو ایک بوتل میں تیل لئے اندر داخل ہوئی۔ بولی کے مرے کان میں ڈالنے کو تیل رکھ لو۔ شہر میں تو مشین کا تیل بکے ہے۔ وہ تو کھُسکی کرے ہے۔ بہو نے آگے بڑھ کر پاؤں چھوئے اور بوتل لے کر گٹھڑی میں ایک طرف ٹھونسنے لگی۔ سمیرو سے اب چُپ نہ رہا گیا۔ بولا "گٹھڑی میں دس بیس من گیہوں بھی گاؤں کے ہی باندھ لے چل۔ شہر کے گیہوں میں تو بھوسا ملا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں تیری گٹھڑی مُٹھڑی کے دن میں بندھے گی؟"

اتنے لوگوں کے سامنے بہو کیا بولتی۔ گھونگھٹ کاڑھے اپنے کام لگی رہی۔ دروازے پر لالہ رام دھن کی گاڑی آ لگی۔ بیلوں کی گھنٹی سُن بہو دہاڑیں مار کر رونے لگی۔ آج وہ ساس سسر کی مقدس دہلیز میں ناتا ڈال کر شہر جا رہی ہے۔ نہ ساس مرتی اور نہ یہ دن ہوتا۔ وہ ایک بار پھر سب سے ملی۔ مردوں کو دُور سے ماتھا زمین سے لگا آداب بجا لائی اور روتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ دیوان بھی بہت دُور تک چندن کو گود میں لئے گاڑی کے ساتھ ساتھ گئے۔ پھر بھرے دل سے اسے سمیرو کو دے کر دوسرے لوگوں کے ساتھ گاؤں لوٹ گئے۔

گٹھڑی کو ہاتھوں میں "تول" سمیرو نے بیوی سے کہا۔ "دنیا بھر کا کباڑ باندھ لائی۔ دیکھ لینا بس میں اس کا کرایہ ضرور لگے گا۔ یہ خام خربوزے ککڑی کیا دلی میں نہیں ملتے؟

بہو کو کہنا ہی پڑا۔ ان لوگوں نے پریم سے سوغات دی تو کیا وہیں پھینک آتی؟ تم تو جانے کیسی باتیں کرتے ہو"۔

ایک دوسری بڑی پوٹلی اٹھاتے ہوئے سمیرو نے پوچھا۔ اور اس میں کیا ہے؟ "پوریاں ہیں"۔

اتنی ساری پوریاں! وہاں کون سی تیری کاکی۔ تائی یا اندھی بیٹھی ہیں جو یہ تیل کی پوریاں کھائیں گی؟

بہو بڑے تعجب سے بولی۔ "ارے۔ پانچ، چھ برسوں سے وہاں بستے ہو محلے والیاں یہ نہ کہیں گی کہ پہلے پہل بہو آئی تو کسی کے گھر چار پوری بھی نہ دیں"۔

اس کے بھولے پن پر ہنس کر سمیرو بولا۔ "اور کہیں کی۔ شہر میں اتنا سگا نہیں ہوتا۔ برسوں پاس پاس رہ کر بھی لوگ ایک دوسرے کا نام نہیں جانتے سب کو اپنے کام سے کام ہے۔ بہتیرے تو بنا مطلب 'جے رام جی' نہیں کرتے۔

ہائے رام! بہو چونک کر بولی۔ تب تو کسی کے دُکھ میں کوئی کاہے کو شامل ہوتا ہوگا۔ چاہے کوئی مر بھی جائے"۔

"مر کیسے جائے؟ سمیرو نے سمجھایا، سینکڑوں ڈاکٹر ہیں۔ بس پیسہ پاس میں ہونا چاہئے۔ پھر کچھ فکر نہیں۔ پیسہ ہوگا تو محلّہ تو بھی بات پوچھیگا۔

اور جو کوئی غریب ہو؟ اپنی اندھی کی طرح اکیلی ہو تو؟

تو کیا؟ ان کے لئے خیراتی ہسپتال ہیں۔ جا کر پڑ جائیں۔ یہ سُن کر بہو تو خاموش ہو گئی۔ دھیرے سے بولی۔ نہ سہی محلے میں۔ بھنگی، دھوبی نائی کو تو پوریاں دینی ہی ہوں گی"۔

"بھاگوان میں تیرے ہاتھ جوڑوں۔ سمیرو نے کہا۔ نہ تو تُو جا کر بھنگی کو اپنا جیٹھ سمجھیو اور نہ دھوبی کو تاؤ۔ بھنگی کو وہاں منوا کہتے ہیں اور دھوبی کا نام سندر لال ہے۔ شہر میں کسی کو روٹی دینے کا فیشن نہیں ہے۔ دو آنہ کپڑا دھوبی لیتا ہے۔ اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ بھنگی۔ پھر کاہے کو کوئی روٹی دے گا"۔

"ڈیڑھ روپیہ؟ باپ رے! جمادارن چاچی کو تو ہم چونی دیتے تھے تمہاری دلی تو بہت مہنگی ہے"۔

"مہنگی وہنگی نہیں ہے۔ تیری سمجھ کا پھیر ہے۔ دو روٹی روز کے حساب سے تو دو روپے سے بھی زیادہ بیٹھتا ہے۔ پیسنے، پکانے کی محنت الگ۔

بہو روٹیوں کی اس تفصیل سے دنگ رہ گئی۔ جمادارن کی چونی کو چھ آنے میں بدلنے کی درخواست پر اس نے چاہے اس سے دو گھنٹے بحث کی۔ لیکن بے انتہا مہنگائی کے دنوں میں بھی یہ اس نے کبھی نہیں کیا کہ اس کی دو موٹی روٹیوں کو ہلکا کر دیا ہو۔ گیہوں مہنگا ہونے پر اس نے مہینوں پیچھے کھائی اور وہی بھنگن، اندھی اور کاکو کو کھلائی۔ لیکن یہ کسی دن نہیں سوچا کہ ان لوگوں کو دینا بند کر دے۔ تو وہ اکیلی اتنے پیسوں میں گیہوں کھا سکتی ہے۔ وہ بے تابی سے شہر پہنچنے کا انتظار کرنے لگی۔

بیلوں نے چھ کوس کا راستہ تین گھنٹوں میں طے کیا۔ ایک بجے کی بس چھوٹ چکی تھی۔ گٹھڑی مٹھڑیوں پر نظر ڈال سمیرو بڑبڑایا۔ یہاں پڑے پڑے دوپہر ہی بھر میں چاند گنجی ہو جائے گی۔ ڈیوٹی کا ناغہ ہوگا سو الگ۔ بہو کیا بولتی۔ چپ چاپ آنچل سے بچے کو ہوا کرتی رہی۔

تین بجے دوسری بس چلی۔ 'لوٹر' کے مسافروں میں وہ بھی ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھ گئے۔ سمیرو نے پوریوں کی پوٹلی کھولی اور پوریاں نکال کھاتے ہوئے بولا "دیکھو ایک گھنٹے میں دلی پہنچ جائیں گے۔ تجھے 'کواٹر' پہنچا کر میں سیدھا مل چلا جاؤں گا۔ تو گھر جھاڑ بُہار لینا۔ گلی میں نل ہے پانی لے لینا۔ میں رات کو نو بجے لوٹوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں چاروں طرف بستی ہے۔ سمجھی"۔

للاّ بھوکا ہے۔ اس کے لئے پاؤ بھر دودھ دے کر جانا۔ بہو بولی
"لگائی نہ تو نے جھنجھٹ۔ بازار کے نکڑ پر حلوائی ہے تو آپ ہی لے لیجیو۔ شہر میں کوئی پردہ نہیں کرتا"۔

بھری ہوئی بس میں بہو کیا کرتی۔ گھونگھٹ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ بس رُکی۔ سمیرو نے جھٹ سے اُتر کر سبزی منڈی کا تانگہ کیا۔ بھیّا ذرا تیزی سے ہانکنا"۔

ابھی پہنچے چلتے ہو جی۔ چل میرے بادشاہ۔ ہاں ہاں بیٹا قدم بڑھا۔ گھوڑا جیسے ہوا ہو گیا۔

گھونگھٹ کے پیچھے سے بہو تعجب کے ساتھ اس بڑے شہر کو دیکھتی رہی۔ گلی میں بہت سی عورتیں صاف کپڑے پہنے اپنے کاموں میں لگی تھیں۔

"اوہو سمیرو بہو لے آئے"۔ ایک بھاری بھرکم بڑھیا نے لوکی کترتے ہوئے پوچھا۔ اس کے پاس اس کا دس سالہ پوتا کھڑا پتنگ کے لئے اکنّی مانگ رہا تھا۔

"ہاں اماں جی! لے آیا۔" تالا کھول، سامان اندر پٹک، وہ لمبے لمبے قدم رکھ مل کو چل دیا۔

بھوک اور گرمی سے پریشان بچے کو کندھے لگائے ہوئے بہو نے آماں جی کے پاؤں چھوئے۔ پھر "بن دھرتی" والے بھوت کے ڈیرے جیسے گھر کے آنگن میں پڑی چھوٹی کھاٹ پر رمضان جولاہے کی ہی چھوٹی دری بچھا چندن کو لٹا دیا۔ اندر سے ایک گلاس تھامے ان آماں جی کے پاس پہنچ التجا سے بولی۔ آماں جی حلوائی کی دکان سے ہمیں پاؤ بھر دودھ منگا دیتیں"؟

آماں جی کا منہ لٹک گیا۔ پوتے کو گانٹھ سے اکنی کھول دیتی ہوئی بولیں۔ کس سے منگا دوں ہمارے تو کوئی نوکر ہے نہیں"؟

بچے کو اکنی مل گئی تھی وہ پتنگ لینے بھاگ گیا۔

لاچار ہو کر بہو گلاس لے روتے بچے کو گود میں اٹھا۔ گلی پار کر جیسے تیسے حلوائی سے دودھ لے کر گھر کو بھاگی۔ بچے کو دودھ پلایا تو وہ سو گیا۔ پھر بہو نے کوٹھڑی، آنگن صاف کر ڈالا۔ گھڑا اٹھا کر گلی کے نل پر پانی لینے آئی۔

بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ گلا سُوکھ رہا تھا۔ صبح تو اس سے باپ دادا کی دہلیز کو چھوڑنے اور گاؤں والوں سے جدا ہونے کے رنج میں کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔

نل پر دو تین عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اپنے سے کچھ بڑی عورت سے بہو نے بڑی منت سے کہا۔ اے جیجی! مجھے ایک گھڑا پانی بھر لینے دو۔ دھار کے نیچے سے بالٹی سرکا، بڑا کلسا رکھتے ہوئے جیجی نے اطمینان سے کہا۔ بھر لینا گھڑا۔ نل کہیں بھاگا تھوڑے ہی جاتا ہے۔ سمیرو تو نو بجے رات کو لوٹیگا۔ ہمارے تو اب لوٹنے والے ہوں گے۔ بہو من مارے کھڑی رہی۔ ابھی رسوئی میں چوکا لگانا ہے۔ چولھا بھی نہیں ہے۔ ایک ٹوٹی انگیٹھی پڑی ہے۔ گھر میں یا باہر کہیں بھی اُسے چکنی مٹی نظر نہیں آتی تھی۔ (ویسے گلی میں خاک بہت تھی) چولھا کس سے بنائے گی۔ ہمت باندھ کر اس نے پھر کہا۔ جیجی یہاں مٹی کہاں ملے گی۔ چولھا بنانا تھا"۔

یہ کوئی گاؤں تو ہے نہیں کہ ہر جگہ سے مٹی کھود لو"۔ جیجی نے مہربانی فرما کر بتایا۔ مٹی والا دوسرے چوتھے بیچنے آتا ہے۔ دو آنے ٹوکرا دینا ہے۔ آئیگا تو میں تمھیں بنا دوں گی"۔ دوسرے چوتھے؟ بہو سوچ میں پڑ گئی۔ تب تک کیا بغیر چوکا لگائے روٹی بنائے گی؟ گلی بھری پڑی ہے عورتوں سے۔ یہ چھ سال سے یہاں رہتے ہیں۔ جان پہچان بھی ہے ہی۔ پر کسی نے اس سے ایک گلاس پانی کے لئے بھی نہیں پوچھا شربت تو دُور کی چیز ہے۔

نل خالی ہوا تو اس نے گھڑا بھرا اور گھر چلی گئی - اس نے ہاتھ مُنہ دھویا دو بتاشے گلاس بھر پانی میں گھول کر شربت پیا - جب کچھ ہوش آیا - تب اسے پھر مٹی کا فکر سوار ہوا - بنا انگیٹھی پوتے تو وہ اس پر کھانا بنانے سے رہی - ہمت کر کے وہ مٹی مانگنے نکلی - ہنگا پہنے - گھونگھٹ کاڑھے سمبرو کی بہو کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تقریباً گلی کی سبھی عورتیں اپنے گھروں سے جھانک رہی تھیں - پاس ہی ایک نوجوان عورت انگیٹھی سلگا رہی تھی - بہو نے اس سے کہا - اے جیجی! ہمیں تھوڑی مٹی دے دو، چولہا پوتنے کو چاہئے۔ جیجی بن کر وہ عورت کچھ خوش تو نہیں ہوئی، لیکن لمحہ بھر رک کر اندر مٹی لینے چلی گئی - آدھ پاؤ گڑ کی ڈلی جتنا مٹی کا ڈھیلا بہو کے ہاتھ پر رکھ کر بولی - بہن جی یہاں تو مٹی بھی مول آتی ہے - سمبرو کو چاہیئے تھا کہ تمہیں لانے سے پہلے یہ چھوٹی موٹی چیزیں لے کر رکھ لیتا۔"

بہو کبھی مٹی کی ڈلی کو تاکتی تھی اور کبھی اپنی ہمسائی کو -

چوتھے دن وہی پڑوسن اپنی مشین اٹھائے سمبرو کے گھر پہنچی - "بہن جی" شہد گھلی آواز میں پڑوسن نے مخاطب کیا - دس پانچ دن ہماری مشین اپنے گھر رکھ لو تو بڑی مہربانی ہو گی"۔

مسالہ پیسنا چھوڑ کر بہو نے اس کے لئے پیڑھا بچھاتے ہوئے جواب دیا - "بیٹھو جیجی - پیر دل پڑول - کیا کہیں جا رہی ہو کچھ دنوں کو جو مشین رکھو گی؟ رکھ دو" - جیجی بیٹھی نہیں - مقفل مشین کو احتیاط سے کوٹھڑی میں رکھ کر چلتے ہوئے بولی - جانا کہاں ہے بہن جی - کل تمہارے سے میری جٹھانی آ رہی ہے - مشین دیکھ لی تو اس کی خیر نہیں - رات دن اس کے بچوں کے کپڑے سینے پڑیں گے - تمہیں بتاؤ اب سب کے کپڑے سینے لگی تو میری مشین چار دن میں ختم ہو جائے گی - سات سال ہو گئے آج بھی نئی سی چمکتی ہے - بابا میں ایسے سگے پن سے باز آئی کہ میری چیز ہی ٹوٹ جائے - یہ کہہ کر پڑوسن چلی گئی -

بہو سوچتی رہی - جٹھانی اتنی غیر ہے - کل ہی تو بڑے بابو کی لڑکی کے دو فراک انھوں نے سی کر بھیجے ہیں - وہ دفتر کے بڑے بابو جو ٹھہرے"۔

بہو مسالہ پیس کے سِل دھو رہی تھی کہ سامنے والی بھاری بھرکم دملا کی ماں سر پر ایک چھوٹی میز رکھے اندر گھسی -

"نمستے بہن جی"۔ اپنی لڑکی کے برابر بہو سے بولی - ایک تکلیف دینے آئی ہوں - بہن جی، ہماری وہ کرسیوں اور اس میز کو کچھ دنوں کو اپنی کوٹھڑی میں جگہ دے دو - یوں رکھنے کو تو گلی بھر میں کسی کے بھی گھر میں رکھ دیتی - پر سچ کہتی ہوں، بہن جی مجھے کسی محلے والی کا اعتبار نہیں پرائی چیز کو تو سب مفت سمجھتے ہیں - بس مجھے تو تم ہی بھلی دکھائی دیتی ہو - رکھ لو گی نا"؟

اپنی تعریف سن کر بہو نے فوراً ہامی بھر لی - رکھ دو بہن جی! ہمارے تو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا - کیا کہیں جا رہی ہو"؟

"ارے نہیں - میری نند آ رہی ہے دس پندرہ دن کے لئے - ان کے کئی بچے ہیں - کود کود کر سب کی پالش خراب کر دیں گے اور منع کروں گی تو نند رانی کو برا لگے گا - سو میں بھلی سے بری کیوں بنوں - نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بنسری - گھر میں رکھوں گی ہی نہیں - تو کس پر چڑھیں گے"۔

بہو پر تو جیسے سکتہ چھا گیا -

لیکن اس کے ایک سال بعد ٹھیک اسی دن دملا کی ماں نے سمبرو کے گھر آ کر کہا - بہن جی! آج ہمارے کیرتن ہے - اپنی ڈھولک تو دے دو - وہ موا مندر کا پجاری تو مندر کی ڈھولک کی جوتی مانگ رہا ہے - میں نے کہا - رہنے دے - میں تو اپنی بہن جی سے مانگ لوں گی"۔

تو بہو نے ڈالڈا سے چپڑی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کرتے ہوئے فکر آمیز لہجے میں کہا - ہائے بہن جی! ڈھولک تو آج ہی مڑھنے دی ہے - ایک پڑے میں چندن نے سوئی مار کر چھید کر دیا تھا - بڑا شیطان ہو گیا ہے للا ہمارا -

بے اعتباری کی سانس بھر کر جب دملا کی ماں لوٹ گئی تب بہو نے جھٹ پٹ دروازے کی کنڈی لگا دی - اچھی بھلی کپڑے میں بندھی ڈھولک کھونٹے سے اتارا - اپنے نئے پائدان سے پاؤں پونچھ نئی کرسی پر چڑھ اسے مچان کے پیچھے رکھ دیا - اور پھر کیرتن میں جانے کے لئے ساڑھی بدلنے لگی -

---

ابر احسنی گنوری

غزل

آہ کس شے کی طلب تھی اور کیا پاتا ہوں میں
ڈھونڈنے نکلا تھا ان کو گم ہوا جاتا ہوں میں

درد سے، حسرت سے، غم سے دل کو بہلاتا ہوں میں
ابرؔ ہر پتھر سے اس شیشے کو ٹکراتا ہوں میں

عیش و غم راہِ طلب میں کرتے ہیں آ کر سلام
اور ہنس کر ان دو راہوں سے گزر جاتا ہوں میں

باوجود ترکِ اُلفت اب بھی اتنا ربط ہے
جب کوئی نام اُن کا لیتا ہے تڑپ جاتا ہوں میں

تم مری خاطر نقابِ رُخ اُٹھا سکتے نہیں
آپ ہی بن کر نقابِ رُخ اُٹھا جاتا ہوں میں

دوستوں کے لطفِ بے حد نے کہاں پہنچا دیا
کوئی لفظِ دوست کہتا ہے تو گھبراتا ہوں میں

اور ضبطِ غم کی تاکید یں مجھے فرمایئے
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جاتا ہوں میں

ہے اسی کا نام اگر دُنیا تو دُنیا کو سلام
اہلِ ساحل ہنس رہے ہیں ڈوبتا جاتا ہوں میں

بزمِ جاناں طور ساماں بھی جناں بر دوش بھی
ابرؔ اس جنّت میں اپنی ہی کمی پاتا ہوں میں

ممتاز حسین

منشی پریم چند بحیثیت ناول نگار

(۲)

ہوری کے کریکٹر کے ایک اہم پہلو پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ لیکن چونکہ پورے ناول کو اس کے کریکٹر کے صرف ایک ہی پہلو سے سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کے کریکٹر کے اس پہلو کو بھی سامنے لائیں جس کے پس منظر میں رائے صاحب اگر پال سنگھ تعلقہ دار اور ان کے احباب کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں کسانوں کی زندگی میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ زمین کے اسی بندھن اور اس کی ملکیت کے جذبہ کے گرد ان کی نفسیات کا تانا بانا بنتا رہتا ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے کھیت مزدور تو موجود تھے لیکن کھیتہر (کھیت والے) کسانوں کو بے دخلی کا کوئی خوف نہ تھا یہ بات انگریزوں کے لائے ہوئے زمیندارانہ نظام میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی خوف سے ان میں غلامی کا وہ جذبہ زیادہ پیدا ہوا جو کہ سرمایہ دارانہ رشتوں کے لائے ہوئے حق انفرادیت اور مساوات کے جذبے سے ٹکراتا ہے۔ ہوری کی زندگی کا آغاز ہمارے ناول میں تیس پینتیس برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نفسیات گوبر کی نفسیات کے مقابلے میں نسبتاً پرانے رشتوں ہی سے متعین ہوتی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ رشتے دیہاتوں میں زیادہ جگہ نہیں بنا پائے تھے اور وہ زرعی اقتصادیات سے نسبتاً محفوظ تھے چنانچہ ایک ہی ماحول میں رہتے ہوئے ہوری اور گوبر کی نفسیات میں جو فرق دکھایا گیا ہے وہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ گوبر کی نفسیات زرعی اقتصادیات سے متعین ہو رہی ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام کا حق انفرادیت یا روزگار کمانے والی آزادی کے جذبے سے متاثر ہو رہی ہے اور ہوری کی نفسیات زمیندارانہ نظام ہی کے رشتوں سے متاثر رہی ہے۔ رائے صاحب کی چاپلوسی اور خوشامد کرنے پر جب گوبر ہوری کو ٹھوکا دیتا ہے "جب ہم سے زمین کی لگان لی جاتی ہے تو پھر ہمیں رائے صاحب کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔ تو ہوری اس کا جواب دیتا ہے کہ "اسی سلامی کی برکت ہے کہ دروازے پر جھونپڑی بنائی اور کسی نے کچھ نہ کیا۔ گھورو نے دروازے پر کھونٹا گاڑا تھا۔ اس پر کارندے نے دو روپے تاوان لے لیا تھا۔ ہم نے کتنی مٹی کھودی کارندے نے کچھ کہا؟ جو دوسرا کھودے تو نذرانہ دینا پڑے۔ اپنے مطلب سے سلامی کرنے جاتا ہوں"۔

کسانوں کی زندگی میں یہ غلامی اور یہ تحقیر نفس اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہ اپنی زمین کا مالک نہ تھا۔ اسے بے دخلی کی دھمکی اور خوف توہین آمیز عاجزی مل سکتی'۔ خوشامد اور چاپلوسی سکھاتی اور نذرانہ دینے پر مجبور کرتی۔ ان حالات میں کسانوں کا اپنی زمین کو دانت سے پکڑنا فطری صرف اس بات سے نہ تھا کہ وہی ان کا ذریعہ معاش تھا بلکہ اس لئے بھی کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ زمین بالعموم زمینداروں کی تھی کسی کسان کا شکمی ہونا یا موروثی زمین کا مالک ہونا کسی بڑی نعمت سے کم نہ تھا ہوری کی زندگی کا بڑا کارنامہ اس تین بیگھے کھیت کو بچانا تھا جو کہ موروثی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہوری کی اصلی جدوجہد یہی تھی۔ اگر وہ اپنے دھرم پر اٹل رہ سکتا تو بھی کچھ اشک شوئی ہو جاتی مگر یہ بات نہ تھی۔ اس لئے نیت بھی بگڑی اور ادھرم بھی کمایا۔ کوئی ایسی برائی نہ تھی جس میں پڑا نہ ہو پھر بھی زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہوتی۔ اچھے دن سراب کی طرح دور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اب ان سے وہ دھوکا بھی نہ رہ

گیا تھا۔ جھوٹی امید کی ہریالی اور چمک بھی اب دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہارے ہوئے راجہ کی طرح اس نے خود کو اس تین بیگھے کھیت کے قلعے میں بند کر دیا تھا اور اسے جان کی طرح بچا رہا تھا۔ ہوری کے بارے میں منشی پریم چند کی یہ تفسیر اس کی زندگی کے ان آخری دنوں کی ہے۔ جبکہ بے دخلی کے مقدمے کی تاریخ کے صرف پندرہ دن رہ گئے تھے اور اسی سوال پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا۔ ہوری نے کھیت کو بچا لیا۔ باپ دادا کی نشانی کو بچا لیا لیکن اپنی روپا کو دو سو روپے میں بیچ کر۔ ہوری کی شکست اصل میں کیا تھی کہ اس نے کھیت کی خاطر اپنے دھرم کو بیچ دیا۔ ہوری نے روپے لئے تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ گویا ذلت کے گہرے سمندر میں گر پڑا ہو اور گرتا چلا جا رہا ہو۔ آج تیس سال کی زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا ہے اور ایسا ہارا کہ گویا اسے شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور جو جاتا ہے وہ اس کے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے بھائیو میں رحم کا مستحق ہوں۔ میں نے نہیں جانا کہ جیٹھ کی لو کیسی ہوتی ہے اور ماگھ کی برکھا کیسی ہوتی ہے۔ اس بدن کو چیر کر دیکھو تو اس میں کتنی جان رہ گئی ہے وہ کتنی چوٹوں سے چور اور ٹھوکروں سے کچلا ہوا ہے۔ اس سے پوچھو اس نے کبھی آرام کے درشن کئے ہیں کبھی چھاؤں میں بیٹھا ہے اس پر یہ ذلت اور وہ اب بھی جیتا ہے نامرد، لالچی، کمینہ۔ اس کا سارا اعتقاد جو بہت گہرا ہو کر ٹھوس اور اندھا ہو گیا تھا گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگر ہوری کوئی عظیم یا منشی پریم چند کا ایک آئیڈیل کیریکٹر ہوتا تو وہ جذبۂ خود تحقیر میں اس سے اپنے کو نامرد، لالچی اور کمینہ نہ کہلواتے وہ زمین سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن وہ اپنا دھرم نہ گنواتا۔ پھر اسے منشی پریم چند نے اپنے ناول کا ہیرو کیوں بنایا۔ اس لئے کہ وہ اس حق کے سختی سے حامی تھے کہ زمین اس کی ہے جس کا ہل اس پر چلتا ہو۔ کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کا حق ختم ہونا چاہیئے۔ کسانوں کے اس بنیادی حق کے تحفظ ہی کے لئے انھوں نے ہوری کو تخلیق کیا لیکن ہوری ہمارے سامنے صرف ایک فریادی کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کا کام بغاوت کے علم کو بلند کرنا نہیں ہے بلکہ اعلیٰ طبقے کے دانشور اور روشن ضمیر افراد میں انصاف اور حق کی حمایت کے جذبے کو پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ اس کے حقوق کے لئے لڑ سکیں۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ وہ رائے اگر پال سنگھ کو جو کہ ہوری کا زمیندار ہے بھرپور طور سے ظالم کے روپ میں پیش نہیں کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ خود غلام ہیں لیکن اس سے ظلم کی نوعیت دوہری ہو جاتی ہے نہ کہ ہلکی۔ رائے اگر پال سنگھ اگر ایک طرف بیگھہ کے موقع پر بڑے بڑے نذرانے لیتے ہیں۔ بیگار کے معاملے میں کڑے ہیں اور اپنے کارندوں کو کسانوں کے لوٹنے کی پوری آزادی دئیے ہوئے ہیں تو دوسری طرف کانگریس کی پہلی ستیہ گرہ میں کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل کی یاترا بھی کر آئے تھے۔ وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں "صرف افسروں کے آگے دم ہلا ہلا کر کسی طرح انھیں مہربان کرنا اور ان کی مدد سے اپنی رعایا پر رعب جمانا ہی اپنا کام ہے چاپلوسوں کی خوشامد نے ہمیں اتنا مغرور اور تنک مزاج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت عاجزی اور خدمت سب رخصت ہو گئی ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہمیں روزی کے لئے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو۔ اور یہ تو یقین ہے کہ اب سرکار ہماری حفاظت نہ کرے گی اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹنے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ ایشور وہ دن جلد لائے وہ ہماری نجات کا دن ہوگا۔ ہم موجودہ حالتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں وہی ہمارا ستیاناس کر رہی ہیں۔ جب تک پونجی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ کٹیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ اور ہم انسانیت کا درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا مقصد ہے"۔

رائے صاحب ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو کہ امپیریلزم کے لئے ہندوستانی سماج میں سماجی بنیاد کا کام دیتا ہے ایسی صورت میں رائے صاحب کا یہ سوچنا کہ اب ہم سے سرکار کا کوئی مطلب نہیں نکلتا ہے کہاں تک صحیح ہے پھر بھی اس میں سچائی موجود تھی۔ جوں جوں آزادی کی تحریک کا دباؤ سرکار پر پڑتا تھا وہ کسانوں کے حق میں بعض چھوٹی چھوٹی مراعات دینے اور قانون کاشتکاری پر ترمیمات کرنے کے لئے مجبور ہوتی جاتی تھی۔ رائے صاحب اندر سے غالباً اس کے لئے بھی تیار نہ تھے لیکن چونکہ انھیں اپنے طبقے کی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ عام بیداری کی وجہ سے انسانیت کے دھرم کی باتیں کرنے لگے ہیں لیکن اس کا فعل ایک

ظالم ہی کا رہتا ہے ۔ لیکن اس ظالم کی بدنامی مختاروں اور کارندوں کے سر تھی ۔ وہ تو بقول پریم چند صرف ضابطے کے غلام تھے ۔ رائے صاحب قوم پرست ہوتے ہوئے بھی حاکموں سے میل جول قائم رکھتے تھے ۔ ان ساری باتوں پر منشی پریم چند نے رائے صاحب کی زندگی کی دو رخی کی تصویر جو صرف انھیں کی نہیں بلکہ ان کے طبقے کی بھی ہے پیش کی ہے ۔ اس طرح نہ صرف اس امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا ہے کہ یہ طبقہ پوری طرح قوم پرست بھی ہو سکتا ہے ۔ بلکہ اس چیز کی ضرورت بھی محسوس کرائی ہے کہ یہ ایک فضول درمیانہ طبقہ ہے جس کا پیداواری عمل میں کوئی حصّہ نہیں ہے ۔ اس کی موت ہی میں سماج کی بھلائی ہے ۔ لیکن منشی پریم چند نے جس طرح رائے صاحب کو پیش کیا ہے ۔ اس میں طبقاتی شعور اتنا واضح اور صاف نہیں ہے وہ ان کی اخلاقیات سے مل کر پیچیدہ ہو گیا ہے ۔ رائے صاحب کا ستارہ اقبال پر تھا وہ کانگرس کی تحریک میں حصہ لینے کے باوجود انگریزی راج میں صوبے کے ہوم ممبر ہو جاتے ہیں ۔ مقدمہ جیت کر جائیداد میں اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح سے اتنے متمول ہو جاتے ہیں کہ مسوری نینی تال اور کئی جگہ کوٹھیاں کھڑی کروا لیتے ہیں ۔ مگر جب اپنے صاحب زادے رُودر پال کی آزادروی اور اپنی بیٹی میناکشی کی تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں، جسے بدقسمتی سے ایک عیاش شوہر ملا تھا تو وہ اتنا دکھی ہوتے ہیں کہ روحانیت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ۔ اس طریقِ کار میں پریم چند نے عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور زمیندارانہ نظام کی ٹوٹتی ہوئی شکل کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ دھن اور مایا کا جھوٹی چمک دکھا کر رائے صاحب کے دل میں نیکی اور روحانیت کے جذبے کو بیدار کیا ہے ۔ رائے صاحب نے سکھوں کی جو بہشت بنائی تھی ۔ اسے اپنی ہی زندگی میں غارت ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ اب دنیا سے مایوس ہو کر ان کی روح اندر کی جانب متوجہ ہو رہی تھی ۔ اب ادھر کا راستہ بند ہو جانے پر ان کا دل خود بخود عبادت کی طرف جھکا جس میں خواہشات سے کہیں زیادہ سچائی تھی جس نئی جائیداد کے بھروسے پر قرض لیا تھا وہ جائیداد ادائی کئے بغیر ہی ہاتھ سے نکل گئی ۔ اور وہ بوجھ سر پر لدا ہوا تھا ۔ ہوم ممبری سے ضرور اچھی رقم ملتی تھی مگر وہ سب کی سب اس عہدے کا وقار قائم رکھنے ہی میں صرف ہو جاتی تھی اور رائے صاحب کو اپنے شاہانہ شان و شوکت نباہنے کے لئے دیہی اسامیوں پر خاصا اضافہ اور بے دخلی کرنا اور ان سے نذرانہ لینا پڑتا تھا جس سے انھیں دلی نفرت تھی ۔ وہ رعایا کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے ان کی حالت پر رحم آتا تھا مگر اپنی ضروریات سے مجبور تھے مگر موہ انھیں نہیں چھوڑتا تھا اور اس کشمکش میں انھیں سکون نہیں ملتا تھا ۔ وہ موہ کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر موہ انھیں چھوڑتا نہ تھا ۔ اور اس کشمکش میں پڑ کر انھیں ذلت ۔ افسوس اور اضطراب سے چھٹکارا نہ ملتا تھا ۔۔۔ ان کی روح کے اونچے سنسکاروں کی بربادی نہ ہوئی تھی ظلم، مکاری بے عزتی اور تکلیف رسانی کو وہ تعلقہ داری کی زینت اور شان و شوکت کا نام دے کر اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکتے تھے ۔ یہی ان کی سب سے بڑی شکست تھی ۔

قصہ مختصر یہ کہ منشی پریم چند رائے صاحب کو بھی قطعاً ایک اخلاقی انسان ہی بتلاتے ہیں ۔ وہ تو صرف حالات کے شکار تھے ۔ جس سے نکلنے کے لئے خود ان کے پاس کوئی نسخہ نہ تھا ۔ بلکہ سرکار کے پاس تھا وہ اگر ان سے تعلقہ چھین کر انھیں محنت کرنا سکھا دے تو وہ خوش تھے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی سے ہوری کا کوئی بڑا تصادم نہیں ہو سکتا تھا ۔ کیونکہ وہ سب کے سب غلامی کی ایک ہی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے وہ زنجیر مہاجنی تہذیب اور سرمائے کی غلامی تھی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رائے صاحب کے طبقے کا وہ فیوڈل کیریکٹر ابھرنے نہیں پاتا جو امپیریلزم کو سہارا دئے ہوئے ہے گو اس کی طرف اشارہ موجود ہے ۔ جس طرح ہوری بے بس و بےکس ہے اسی طرح رائے صاحب بھی بے دست و پا ہیں ہوری پہ ظلم تو صرف ضابطے کی کارروائی کا نتیجہ ہے ۔ ان حالات میں منشی پریم چند ان دونوں ہی پر رحم کھاتے ہیں اور اس طبقے کی طرف روشنی اور عمل کی تحریک کے لئے بڑھتے ہیں جسے درمیانہ طبقہ کہیں گے جو کہ سوشل ریفارم اور آزادی کی جدوجہد کی حمایت کرتا رہا تھا ۔ اس طبقے کے بہترین عناصر کی نمائندگی مسٹر مہتا کرتے ہیں جو کہ یونی ورسٹی میں پالیٹکس یا اقتصادیات کے نہیں بلکہ فلاسفی کے پروفیسر ہیں ۔ اور جن کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ ہے ۔ مسٹر مہتا کی رہنمائی صرف رائے صاحب تعلقہ دار، مسٹر کھنا سرمایہ دار ۔ نئی روشنی کی آزادی چاہنے والی ولایت کی پاس شدہ لیڈی ڈاکٹر مس مالتی اور ایڈمنٹ کردار کی دیوی مسز کھنا ہی قبول نہیں کرتی ہیں بلکہ مزدوروں کی جماعت بھی انھیں اپنا لیڈر بناتی ہے ۔ جس وقت شکر مل میں مزدوروں کی ہڑتال

چلتی ہے تو مسٹر مہتا ہی مزدوروں کی آئیڈیالوجی کو قبول کئے بغیر ان کی جماعت کے صدر اور رہنما سے نظر آتے ہیں اور اس جماعت کے سکریٹری مرزا خورشید ایسے پرانے کھلاڑی ہیں جو سب کچھ کھو چکنے کے بعد بھی ایسے رئیس ہیں کہ جوتے کی ایک دوکان سے چار پانچ سو روپے روز کی بکری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریفارمیشن اور آزادی کی جد و جہد میں متوسط طبقے کا ایک اہم رول رہا ہے۔ اس لئے خیالات کو عوام میں پھیلایا ہے اور یہ رول آج بھی انجام دے رہا ہے۔ لیکن جب تک اس طبقے کی حدود اور خصوصیات کو اجاگر نہ کیا جائے اور آزادی کی جد و جہد میں مزدوروں اور کسانوں کے رول اور مزدور تحریک کے وجود میں آنے کے بعد مارکسزم کے رول کو بھی اجاگر نہ کیا جائے۔ اس طبقے کی خدمات اس کی پیشوائی کے حدود متعین نہیں ہو پاتے ہیں۔

چونکہ متوسط طبقے کی نفسیات بیٹی بورژوا کی ہوتی ہے یعنی وہ اپنی طبقاتی پوزیشن کی نوعیت سے پرولتاری اور بورژوا طبقے کے درمیان ہوتا ہے اور حالات کے اعتبار سے کبھی اوپر چڑھتا ہے تو کبھی نیچے سرکتا ہے اس لئے صحیح حقیقت نگاری کا کام اس وقت انجام پا سکتا ہے۔ جب ہم اس کی اس نفسیات اور اس کی طبقاتی پوزیشن کو بے نقاب کریں۔ منشی پریم چند نے مسٹر مہتا کو اسی نفسیات کے ساتھ اس کے اس طبقاتی کردار کو پیش نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا یہ سبب ہو کہ ان کے زمانے میں جس حد تک کہ رائے صاحب کے طبقے کا نفاذ ظاہر ہو چکا تھا اس حد تک مسٹر مہتا کے طبقے کا نفاذ ظاہر نہ ہوا ہو۔ بہر حال اگر مسٹر مہتا مزدور طبقے کی طرف اتنا جھک سکتے تھے کہ وہ اس کی جماعت کے صدر بن جائیں اور ہڑتال کی رہنمائی کریں تو اس کی توقع کی جاتی ہے کہ انھیں اس طبقے کی آئیڈیولوجی سے بھی متاثر دکھایا جاتا۔ پریم چند نے ایسا نہیں کیا ہے۔ مسٹر مہتا اصل میں منشی پریم چند کے آئیڈیلسٹ خیالات کے ترجمان ہیں گو وہ ایک آدھ جگہ ان کے خیالات پر تنقید بھی کرتے ہیں مثلاً مسٹر مہتا کا آزادانہ عیش کوشی کا فلسفہ منشی پریم چند کو پسند نہیں ہے لیکن بیشتر چیزوں میں وہ انھیں کے خیالات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مسٹر مہتا اگر ایک طرف نام نہاد اشتراکی پنڈت اونکار ناتھ کے غلط سلط خیالات کی تردید کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ مس مالتی کے اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ اس طرح مسٹر مہتا منشی پریم چند کے آئیڈیلسٹ خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں جو ایک طرف میکانکی اور دیگر فلسفہ اشتراکیت کے خلاف ہے تو دوسری طرف بعض سماجی اقدار میں قدامت پسندانہ یا رجعت پسندانہ بھی ہیں۔ لیکن اس ناول میں منشی پریم چند اتنا آگے ضرور بڑھے ہیں کہ وہ مس مالتی کے ترقی پسندانہ خیالات کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اسے مٹاتے نہیں ہیں۔ مس مالتی کی یہ فلسفہ بازی کہ مسٹر مہتا کو سماجی خدمت کے لئے اکیلا ہی رہنا چاہئے اسی بات کا اشارہ ہے کہ وہ مس مالتی کی شخصیت کو ختم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس طرح منشی پریم چند اپنے اس خیال میں متشکک ہو جاتے ہیں۔ کہ ازدواجی زندگی میں عورت کو اپنی شخصیت شوہر کی شخصیت میں کھو دینا چاہئے۔ پریم چند کی یہ طرز اصل میں ان کے لئے آرٹ کی جیت ہے لیکن یہ جیت ہمیں سرمایہ دار مزدور کے تضاد کو پیش کرتے وقت نہیں ملتی ہے۔ وہ مسٹر کھنا کے طبقاتی مفاد اور مزدوروں کے طبقاتی مفاد کے تصادم کو تو دکھلاتے ہیں لیکن اس تصادم کے پیچھے جو تضاد ہے اس کی مادی بنیاد کو ابھار نہیں سکے ہیں۔ وہ تضاد سوشل پروڈکشن اور انفرادی نفع اندوزی کا تضاد ہے اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس آشیانے ہی کو آگ لگا دی جائے یعنی مل ہی کو جلا دیا جائے جس سے یہ تضاد اور یہ تصادم پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس تضاد کو اس منطقی انتہا تک پہنچایا جاتا ہے جہاں انفرادی نفع اندوزی کی نفی ہو اس کا حل نظر آتا نہیں یعنی جہاں سوشل پروڈکشن سوشل تصرف کے ساتھ ایک نئی وحدت اختیار کرنے کے لئے مضطرب نظر آتا۔ اس کے برخلاف جب منشی پریم چند شکر مل میں آگ لگوا دیتے ہیں تو باوجود اس بات کے کہ ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ موجود رہتا ہے۔ آپ کا یہ عمل رجعت پسندانہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے آپ کا یہ عمل شاید اس لئے تھا کہ وہ مسز کھنا کی زبان سے مسٹر کھنا کو یہ اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ تم اتنا دل کیوں چھوٹا کرتے ہو۔ دھن کے لئے جو سارے پاپوں کی جڑ ہے اس دھن سے ہمیں کیا سکھ تھا۔ اور جب مسز کھنا دھن جمع کرنے کی تپسیا کی طرف اس کا دھیان دلانے کی بات اٹھاتی ہوئی کہتی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ دھن کے لئے تھوڑی تپسیا کرنی نہیں پڑتی ہے مگر پھر بھی ہم نے اسے زندگی کی جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے اتنی وہ نہیں ہے میں تو خوش ہوں کہ تمہارے سر سے یہ بوجھ ٹلا۔ اب تمہارے لڑکے انسان بنیں گے۔ خود غرضی اور غرور کے

تُلے نہیں - زندگی کا سکھ دوسروں کو سکھی کرنے میں ہے - انہیں لُوٹنے میں نہیں - بُرا نہ ماننا اب تک تمھاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش پرستی - ایشور نے ہمیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمھارے لئے زندہ بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے - اس کے حصول پر اگر کچھ تکلیف بھی ہو تو اس کا خیر مقدم کرو - اسے مصیبت سمجھتے ہی کیوں ہو یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تمھیں بے انصافیوں سے لڑنے کا موقع ملا ہے میرے خیال میں تو ظالم ہونے سے مظلوم ہونا کہیں بہتر ہے - دھن کھو کر اگر ہم اپنی آتما کو پا سکیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے - انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے"

میں شروع میں اس بات پر کافی زور دے چکا ہوں کہ منشی پریم چند نے اشتراکیت کے نصب العین اور اشتراکیت کی انسان دوستی کو قبول کیا تھا نہ کہ اشتراکیت کی سائنس کو - ایسی صورت میں ان کے نصب العین کے درمیان اور ان کے سجھائے ہوئے اس آدرش تک پہنچنے میں تضاد کا پیدا ہونا لازمی ہے - لیکن جو لوگ کہ تنقید کے اصول سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ فنکار کی سماجی تنقید اور اس کا نصب العین اس کے سجھائے ہوئے راستوں سے زیادہ اہم ہوا کرتا ہے - جب مرزا خورشید نے مسٹر مہتا کے سامنے طوائفوں کی ناٹک منڈلی کی تجویز رکھی تو مسٹر مہتا نے ان کی اصلاحی کوششوں پر طنز کرتے ہوئے کہا "جب تک سوشل نظام اوپر سے نیچے تک بدل نہ ڈالا جائے اس طرح کی منڈلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا" - تو یہاں پریم چند کا انقلابی جذبہ اُبھر آتا ہے یہ انقلابی جذبہ مسز کھنّا کے اس جملے میں بھی ملتا ہے "انصاف کے سپاہی بن کر لڑنے میں جو عظمت اور راحت ہے کیا اسے اتنا جلد بھول گئے" - اور یہ جذبہ گوبر کے اس جملے میں بھی پایا جاتا ہے جب گوبر ہوری سے اس کے آخری دنوں میں یہ کہتا ہے کہ "جسے دو وقت کی روٹی میسّر نہ ہو اس کے لئے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبایا ہوتا ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے - تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا یہ اس کا ڈنڈ ہے - تمھاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پر لٹکا ہوتا" - پریم چند کا یہ انقلابی جذبہ ماتا دین کے کردار میں بھی اُبھرا ہے - ایک چمارن کے رکھ لینے پر ماتا دین کو برہمنوں نے گائے کا پیشاب اور گوبر کھلایا۔ ماتا دین اس رکیک عمل کے سامنے تو جھک گیا لیکن جتنا ہی وہ جھکا اتنا ہی زیادہ وہ اُبھرا بھی - اسے دھرم سے چڑھ ہو گئی - اس نے پر دہتی کو گنگا میں ڈبو دیا اور یہ کہہ اٹھا "میں چمار ہی رہنا چاہتا ہوں جو اپنے دھرم کو پالے وہی باہمن ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پریم چند ایسے ہی انقلابی تھے تو انھوں نے ہوری کے بجائے گوبر کو کیوں نہیں ہیرو بنایا - یا اس کے کردار کو کیوں نہیں پوری طرح تعمیر کیا - پہلی بات تو یہ ہے کہ ناول میں ایک کا تصور پرانا ہو چکا ہے - جب سے سماج کی زندگی پیش کی جاتی ہے تو اس میں کوئی ایک شخص اہم نہیں ہوا کرتا ہے بلکہ لاکھوں آدمی مل کر سماجی ترقی کے ایک رجحان کو تقویت پہنچاتے ہیں ہم اس ناول گئودان میں صرف ہوری کی شخصیت یا اس کے ذاتی افسانے میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں بلکہ پورے گاؤں کی زندگی سے دلچسپی لیتے ہیں جس کی پرانی وحدت زرعی اقتصادیات سے ٹوٹ رہی تھی - اگر ایک طرف غلامی کے عہد کے باقیات کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی تو دوسری طرف امپیریلزم کے ستون زمیندارانہ راج 'بے دخلی' بیگار 'نذر نذرانہ' 'تاوان' 'ڈنڈ' اور اس کے بُرے نتائج کے خلاف بغاوت کا شعلہ بھڑک رہا تھا لیکن چونکہ کسانوں کا طبقہ بلا شرکت غیرے اپنی غلامی کے جوئے کو اتار نہیں سکتا ہے تاوقتیکہ اس کی کوئی رہنمائی نہ کرے - اس لئے منشی پریم چند نے اپنے اس زمانے کے غالب رجحان کے تحت دانش ور طبقے ہی کو اس کی رہنمائی کے لئے منتخب کیا جو کہ صرف کسانوں ہی کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جد و جہد نہیں کرتا ہے بلکہ مجموعی اعتبار سے پورے سماج کے لئے اس متوسط طبقے کے روشن خیال افراد کی انقلابیت منشی پریم چند کی نظر میں یہ تھی کہ وہ معاشرتی خرابیوں کی جڑ ہی کاٹ دیں - وہ جڑ منشی پریم چند کی نظر میں زرعی اقتصادیات ہے جو انسانی رشتوں کو سماج سے خارج کر دیتی ہے وہ جڑ پونجی کا اکٹھا ہونا ہے - جس سے سرمایہ داری جنم لیتی ہے - اس چوکھٹے میں ہوری کی پوزیشن کسی لڑاکو اور انقلابی کسان کی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ ایک ایسے فریادی کی ہے جس کے گرد ظلم کے خلاف لڑنے والے سپاہیوں یعنی دانشوروں کی فوج اکٹھا ہوتی ہے - ہوری اس ناول کا ہیرو ایک فریادی کی حیثیت سے ہے نہ کہ بغاوت

کے ایک علمبردار کی حیثیت سے ۔ یہ فریادی ہوری جو رحم کی بھیک مانگتا ہے سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے ہیرو نہیں ہے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے وہ ہیرو اخلاقی قدروں کے بنانے، نباہنے اور برتنے کے نقطۂ نگاہ سے ہے ۔ سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے تو فطری طور پر گوبر ہی ہیرو ہے جو کسانوں کی ایک نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو زمیندارانہ استحصال اور زرعی اقتصادیات سے مجبور ہو کر شہر میں روزی کمانے کے لیے چلا جاتا ہے ۔ نوکری چاکری اور خوانچہ گیری کی منزلوں سے گزر کر مل مزدور بنتا ہے ۔ اپنے حقوق کے لئے لڑتا ہے اور جب دیہات میں لوٹ کر آتا ہے تو مزدوروں کے شعور کو کسانوں میں بھی بانٹتا ہے ۔ ناول میں یہ سارے اشارے موجود ہیں لیکن پریم چند نے شعوری طور سے پیش نہیں کیا ہے کیونکہ وہ اشتراکیت کی سائنس کی طرف ملتفت تھے اور نہ انھیں منظم مزدوروں کی زندگی کے دیکھنے کا اس وقت تک موقع ملا تھا چنانچہ یہی سبب ہے کہ جب شوگر مل میں ہڑتال ہوتی ہے تو وہ مزدوروں کو آپس ہی میں لڑا دیتے ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا ہوتا ہے ۔ لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ نئے مزدور پرولتاری وحدت کے شعور کے تحت مل میں کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مل کی نوکری کے زمانے میں مزدور کی جو زندگی پیش کی یہ مزدوروں کا کوئی ٹیپیکل عمل نہیں ہے وہ صحیح ہوتے ہوئے بھی ٹیپیکل نہیں ہے ۔ زندگی میں مزدوروں کی اخلاقی گراوٹ کا صرف ایک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ان کا اخلاق اور وہ بلند معیار سامنے نہیں آتا ہے جو مزدوروں کے اخلاق کو سرمایہ داروں کے اخلاق پر فضیلت بخشتا ہے لیکن یہاں ہم پریم چند کو معاف کر دیں کیونکہ وہ اصل میں صنعتی تہذیب کی بدکاریوں کو پیش کر رہے تھے نہ کہ گوبر کے اخلاق کو ۔ گوبر مل کی زندگی سے ہٹتے ہی جبکہ وہ مس مالتی کا مالی بن جاتا ہے ۔ وہ بداخلاقی کے اس گڑھے سے بھی باہر نکل آتا ہے ـــ وہ تو سر پر چوٹ کھاتے ہی ٹھیک ہو گیا

(منشی پریم چند اپنے آرٹ میں حقیقت نگار اور معلم اخلاقیات بہ یک وقت دونوں ہی ہیں ۔ وہ حقیقت نگار ہیں ۔ سماجی حقیقت کے تضاد کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور اپنے آرٹ میں نیچرلزم کے برتنے میں ان کا کوئی بھی کردار ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ ان نیچرل ہے لیکن جس حد تک وہ معلم اخلاقیات تھے ۔ یعنی حقیقت کے تضاد کے فطری ارتقا کو دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے اور صرف اخلاقیات کا سہارا لے کر ایک غیر فطری طریقۂ کار سے بدی کو خیر سے مسترد کر دیتے یا بدی کو خیر میں تبدیل کر دیتے ۔ ان کے کرداروں میں غیر حقیقی عناصر کے پیوند بھی لگے ہوئے نظر آتے ہیں)

فنکار کے ایڈیلسٹ ہونے یعنی کسی بلند نصب العین کے رکھنے اور حقیقت نگار ہونے میں تو کوئی تضاد مجھے نظر نہیں آتا ہے لیکن اس کے معلم اخلاقیات ہونے میں اس کا خطرہ پایا جاتا ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے راستے سے ہٹ جائے کیونکہ اس وقت فنکار بہ یک وقت دو چیزوں کی ترویج کرتا ہے ایک تو حقیقت کے ادراک کی اور دوسری اخلاقیات کی۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں جوں جوں اخلاقیات کی تعلیم کے بوجھ کو اپنے آرٹ میں ہلکا کیا ہے ان کی حقیقت نگاری ابھرتی گئی ہے ۔ انسانی رشتوں پر زور دینا بذاتِ خود فن کی اخلاقیات ہے اسی کو انسان دوستی بھی کہتے ہیں ۔ اس سے آگے جب بھی کوئی فنکار قدم اٹھاتا ہے کسی اخلاقی نظام یا آدرش کی ترویج کرنے کا تو اس کا فن آرٹ کے اپنے بلند مرتبے سے گر جاتا ہے ۔ پریم چند کے ساتھ اگر زندگی نے کچھ اور دنوں وفا کی ہوتی تو وہ یقیناً اسی بلند مرتبے کو پہنچتے کیونکہ ان کا آرٹ اس منزل کی طرف گامزن نظر آتا ہے پھر بھی جیسا انھوں نے ہمیں دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کا شمار دنیا کے بڑے فن کاروں ہی میں کیا جائے گا ۔

اب میں چند لفظوں میں کچھ ان کی تکنیک اور کرافٹ کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں ۔ ناول یقیناً اظہارِ خیال ہی کا ایک ذریعہ ہے ۔ لیکن وہ ذریعہ مشتمل ہے کردار نگاری پر ۔ جس طرح شاعری میں تشبیہات اور استعارے رمز اور کنائے خیال کو زندگی اور احساس بخشنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اسی طرح ناول میں کیریکٹر کو استعمال کیا جاتا ہے ۔ کسی بھی ناول میں کیریکٹر اور اس کی زندگی کے واقعات کے خالق ہونے کے علاوہ فن کار کی کوئی دوسری شخصیت واعظ ۔ شارح اور مفسر کی نہیں ہوا کرتی ۔ فلابیر نے اسی خیال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "فنکار کی پوزیشن اس کی اپنی تخلیق میں خدا کی طرح ہوتی ہے ۔ وہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ اور کہیں بھی نہیں"۔ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ چونکہ منشی پریم چند ناول سے بہ یک وقت تعلیمِ اخلاقیات اور ادراکِ حقیقت دونوں ہی کا کام لینا

چاہتے تھے اس لئے وہ بالخصوص اپنے ابتدائی ناولوں میں واعظ ہی رہے ہیں۔ خواہ ان کے وعظ کا لہجہ میٹھا اور آسان ہی کیوں نہ ہو۔ منشی پریم چند کا یہ رجحان "چوگان ہستی" میں کم ہو جاتا ہے وہیں سے صحیح معنوں میں ہمیں جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں خواہ وہ ایڈیلسٹ رجحان کے حامل ہی کیوں نہ ہوں۔ ہوری کچھ کم ایڈیلسٹ ہے لیکن ایسا جیتا جاگتا ٹھوس اور پکا کسان ہے کہ ویسا مجھے ابھی تک اپنے یہاں کسی ناول میں نظر نہیں آیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ مشاہدہ کافی اہم ہے کہ جو زندگی اور جان مجسّم شخصیت منشی پریم چند کے کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے کرداروں میں نظر آتی ہے وہ ان کے اوپر کے درجے کے کرداروں میں نظر نہیں آتی مثلاً "گئودان" میں رائے صاحب اگرپال سنگھ مسٹر مہتا۔ مرزا خورشید۔ مسٹر کھنّا۔ مسز کھنّا۔ مس مالتی لیڈی ڈاکٹر یہ تمام ہی کردار اپنی انفرادی خصوصیات، اپنی اپنی داخلی عصبیتوں میں غیر اطمینان بخش ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف یقیناً ہیں ان کی اپنی اپنی انفرادیت بھی ہے لیکن ان کی انفرادیت کا کوئی ٹھوس مرکز ثقل نظر نہیں آتا ہے لیکن یہ بات پنڈت اونکار ناتھ اور مسٹر شنّا دلال کے کیریکٹر میں نہیں ہے۔ جو کہ نچلے متوسط طبقے کے ہیں۔ بات یہ ہے کہ منشی پریم چند کو پونجی والوں سے اتنی نفرت تھی کہ وہ عام حالات میں ان سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے ان میں یہ کمزوری رہ گئی کہ اوپر کے طبقے کے کردار کو وہ اور زیادہ قریب سے دیکھ نہ سکے۔ منشی پریم چند کے کردار عشق و محبت میں بھی خوب پھنستے ہیں لیکن مشکل ہی سے کبھی وہ جنون کی منزل میں بھی قدم رکھتے ہیں بجز صوفیہ کے جو کہ ہندوستانی نہیں ہے۔ کیا ایک صوفیہ کا دل مس مالتی کے سینے میں نہ تھا اور کیا مسٹر مہتا فلسفی ہونے کی وجہ سے انسان نہیں رہ گئے تھے۔ منشی پریم چند نے جس سختی کے ساتھ ان کے جذبات کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہے اس سے ان کی جذباتی زندگی کا کسی قدر قتل بھی ہوا ہے مجھے یہ قتل ٹالسٹائی کے ناولوں میں نہیں ملتا ہے حالانکہ معلّم اخلاقیات وہ بھی ہے۔ اس کا جواب وہ ہندوستانی سماج دے گا۔ جہاں محبت اور جذبہ عبودیت کے درمیان کوئی خط جاگیردارانہ سماج میں کھینچا نہ جا سکتا تھا۔ اگر ایک طرف یہ چھوٹی موٹی کمزوریاں ان کی کردار نگاری میں ہیں تو دوسری طرف کچھ خامیاں ان کے ناول کی منطق یا پلاٹ میں بھی ہیں۔ کسی بھی ناول میں پلاٹ اجزا کل کی اندرونی تکوین کی ضرورت سے اُبھرتا ہے۔ چنانچہ پلاٹ کی سازش قصّے کے فطری پن کو قتل کر دیا کرتی ہے۔ منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں پلاٹ کی سازش موجود ہے یہ سازش میدان عمل میں بھی ہے۔ جہاں جیل میدان عمل کی ایک منزل نہیں بلکہ روحانی یاترا کا گھاٹ بن جاتا ہے۔ قصّے کا فطری پن تو صرف "گئودان" ہی میں ابھرا ہے۔ اس ناول میں وہ قصے کو کسی بھی یاترا پر ختم نہیں کرتے ہیں بلکہ لا متناہی سلسلۂ عمل کے رشتے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ گاؤں اور شہر کے درمیان اس قربت کو پیش نہیں کرتے ہیں جو کہ ان کے زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع کے بڑھنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ مس مالتی اور مسٹر مہتا دیہات کی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن ہوری کے گاؤں والے گوبر کے شہر کی زندگی میں کوئی دلچسپی لیتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔ حالانکہ جھنگری، بھیشوری اور نوکھے رام ان تینوں ہی کے لڑکے شہر میں انگریزی پڑھتے تھے اور تعطیل میں گھر آتے تھے اس کمزوری کے باوجود جیسی زندہ تصویر انھوں نے ہوری کے گاؤں کی کھینچی ہے اس کی مثال اردو ہندی کے ادب میں نہیں ہے لیکن وہ زندہ تصویر شہر کی زندگی اجاگر کرنے میں نہیں ملتی ہے۔ آخر میں میں ایک بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ منشی پریم چند کے ابتدائی ناولوں کا اسلوب ناہموار ہے لیکن گئودان میں ان کا اسلوب بالکل ہموار اور خالصتاً ان کا اپنا ہے۔ جو فنکارانہ ہونے کے باوجود قابل تقلید ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں کچھ لوگ یہ بات اٹھائیں کہ اسلوب وہی اچھا ہوتا ہے جو نا قابل تقلید ہوتا ہے میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ سچائی اور خلوص کا اسلوب آدمی کے لہجے میں گفتگو کرنے کا اسلوب ہمیشہ ہی قابل تقلید ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبان کی تعریف بہت سے مولویوں اور پنڈتوں نے کی لیکن وہ سچائی تک پہنچ نہ سکے۔ اس سچائی تک منشی پریم چند ہی پہنچے ہیں۔ جو زبان ہوری کے گاؤں میں بولی جاتی ہے وہی اودھ میں ہندوستانی کا دیہاتی فارم ہے۔ اور جو زبان شہر میں پنڈت اونکار ناتھ صحافی اور مزدور بولتے ہیں وہی اس کا اودھ میں شہری فارم ہے۔ میں نے منشی پریم چند کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ پنڈت اونکار ناتھ کا جو مزدوروں کا اخبار "بجلی" نکالتے تھے۔

رحمان راہی

تصویرکِ زٕ رُخ

کشمیری

نیدَس پیٹھ تارہ کوٚکرِہ مالہ محنتس
مہ باسیوٚ زَن زٕ چھکھ نیٖنیٚ امارَن سان ہیٚنہِ دراھرٕ
کوٚہَو پتھٕ ژونہٕ کوٚرٕ ژھل کالہ اَدبرس
مہ دوٚپ ظاہر چھِ چاٚنی ٹاٹھ کانْہہ وٚنِس سون کُن آمٕژ

صُبح پھوٚل بُلبلَو کوٚر بول پوشاہ
مہ باسیوٚ زَن تہ ژٕ ئی چھکھ میٹھِ آلَو دِتھ مہ وُزہ ناوان
ہوا ڈوٚل لنجہِ پھوٚل اکھ داٚن پوشاہ
گماں سپُدم چھِ چاٚنی لولہ مَنقلٕ نار چھکراوان

ڈَلس وُتھِ موج ریٚژ تھنتھراے آبس
خبر چھم آدنک کانْہہ ہاوساہ آسی ژٕ یتہ تنبلیومت
بوٚنٹین پیٹھ لُک چھِ پراراں ناوِ تارس
مہ باساں دورگامن سال کرُنک ژٕ یتہ چھُی پیومت

تصویر کے دو رُخ

ترجمہ

ستارے آسمان پہ موتیوں کے ہار پرو رہے ہیں
اور (انھیں دیکھ کر) مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تو آ میری محبوبہ اپنی آرزوؤں کا جائزہ لینے نکلی ہو
پہاڑوں کے پیچھے سے چاند کالے بادلوں کی گرفت سے نکل آیا
میں سمجھا جیسے تمھاری ہی کوئی پیاری سہیلی کافی دنوں کے بعد ہمارے یہاں آ رہی ہو۔

صبح ہوئی اور بلبلیں چہک اُٹھیں
میں نے یوں محسوس کیا جیسے تم ہی اپنے میٹھے بول بول کر مجھے نیند سے جگا رہی ہو۔
نسیم کا جھونکا آیا اور انار کا سُرخ پھول کھل اُٹھا
مجھے یوں گمان گزرا جیسے تمھاری ہی محبّت کے آتش دان میں انگارے دہک رہے ہیں

جھیل ڈل کی سطحِ آب پر ایک لطیف سا ارتعاش پیدا ہُوا
میں جانتا ہوں تمھارے دل میں جوانی کی کوئی امنگ مچل اُٹھی ہوگی
دریا کے کناروں پر لوگ پار اُترنے کے لئے کشتی کا انتظار کر رہے ہیں
میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے تمھیں دُور، گاؤں کی سیر کا شوق چرایا ہے

کھلن ہیٹھ بیاُل ہے ہے ہاٲل درامٕت
خبر ژے ماہینٛزت کوچھ کوچھ کرٕنِ تس منز لکس لاس
چھ رۄز یانس سمتھ انز ژاٹ آمٕت
خبر ژے ماذوینت گوژھ پوٹھ چھاوُن زاشرٕن ناس

بنجارِیاه لکھ دِواں دراوسا نہ یرتلِ
پزی آسی ژہ یہ اندِ بکھ رِیشمٕچ نخترائے ہش باسان
چھپرٕ گنڈ ہنٛزِ. بوانہ ما یانگرٕ نوٹ رلٕ
خبر چھم ہاوسن منز چھپے ژبہ نژیرٕچ ترائے ہش باسان

حمالس خون گرمیو بور سارال
مہ دوپ ژے شولہ نو وُتھ ژونگ شامن جورٕ ین گنزراں
غریبس ٹکہ نو نیبہ بور راہ ختم ہا راں
مہ باسیوٗ زن ژہ پوئی وانِس نش چھک نیابے کانہہ اُنزراں

چھواں آس مہر نیاه سور مس تہ سازس
مہ دوپ ظاہر یہ چھک ژی یاد ونٛجِ کانہہ شوخ ین بیراں
جواناه اکھ وُچھم دوراں محاذس
مہ باسیوٗ زن ژہ پینہ نس آنگنس چھک پرانِ دٕوس نیراں

چھ کاٚیتاه زندگی ہندِ رنگ شوبان
چھکاٚ ژاه دِل کشی ہیچھمٕژ ہیمو چانیو اشارو واز
زمانٕچ دور ڈیشتھ دِل چھ ٹوبان
سبق دیُت جدّوجہدُک راہیس چانیو امارو واز

کسان اپنے داموں میں نئی فصلوں کے بیج لے کر کھیتوں پر آ رہے ہیں
کیا معلوم تمھیں نے اپنے پنگھوڑے کے لال کو گود میں جھلانا تو شروع نہیں کیا ہے
رفوگری کا کام کرنے والے کم سن شاگرد اپنے اُستاد کے ہاں روزانہ اُجرت لینے آتے ہیں
ممکن ہے تم نے اپنے نوزائیدہ لال کے گریبان پر ریشم سے کشیدہ کاری کی سوچی ہو۔

پھیری والا پارچہ فروش ابھی ابھی ہماری دہلیز سے آوازیں لگاتا گذرا
کوئی تعجب نہیں کہ تمھیں ہر جانب سے ریشم کی سرسراہٹ محسوس ہوئی ہو
ایک بچہ ابھی ابھی لٹو خریدنے کے لئے مچل اُٹھا
میں جانتا ہوں کہ تمھیں اپنی آرزوؤں میں ناچنے اور تھرکنے کے انداز جاگتے ہوئے محسوس ہوئے ہیں

قتال کا لہو بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اُبلنے لگا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمھیں نے شام ہوتے وقت اپنی کاتی ہوئی ریشم کے دھاگے گننے کیلئے دیا روشن کیا ہے
ایک نادار محنت کش نے کسی سرمایہ دار کو سختی سے جھڑک دیا
میں نے یوں محسوس کیا جیسے تمھیں ریشم کے کسی تاجر سے اپنا کوئی قضیہ چکا رہی ہو۔

ایک دُلھن اپنے ہار سنگار پر اترا رہی تھی
میں نے سمجھا جیسے تمھیں اپنی جوانی کا کوئی شوخ تانا بانا بُن رہی ہو
میں نے ایک نوجوان کو مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے محاذ پر دوڑتے دیکھا
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تم اپنے آنگن کی پرانی دیوار کی مرمت کر رہی ہو

زندگی کے یہ رنگ کتنے بھلے لگتے ہیں
تمھاری اداؤں نے کس قدر دل کشی پائی ہے
زمانے کی دوڑ دیکھ کر دل پھولا نہیں سماتا
تمھاری آرزوؤں نے اے میری محبوبہ راہی کو زندگی میں جدوجہد کرنے کا سبق دیا ہے۔

حبیب الرحمٰن غزنوی

گجراتی زبان و ادب

پر

عربی فارسی اور اُردو کے اثرات

(۲)

گجرات میں مسلمانوں کی حکومت

۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی براہ ملتان گجرات پر حملہ آور ہوا۔ گجرات کا سولنکی راجہ بھیم دیو (۱۰۲۲ء-۱۰۷۲ء) انہلواڑ (پٹن) سے فرار ہو کر کچھ جا پہنچا۔ محمود نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ اور سوراشٹر کے آخری سرے پر جا کر سومناتھ۔ پاٹن پر یلغار کی۔ اس مہم میں کامیاب ہو کر وہ کچھ کا ریگستان طے کرتا ہوا براہ ملتان غزنی کو واپس لوٹ گیا۔ محمود غزنوی کے ہم عصر مؤرخ عُتبی اور البیرونی نے سومناتھ کا مندر توڑنے کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ محمود کے درباری شاعر فرخی نے اپنے ایک قصیدے میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ فرّخی اس مہم میں محمود کے ہمرکاب تھا۔

محمود کے بعد ۱۱۷۷ء میں شہاب الدین غوری نے گجرات پر فوج کشی کی، مگر اس مہم میں اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ البتہ گجرات کے دوسرے سولنکی راجہ بھیم دیو (۱۱۷۶ء-۱۲۴۳ء) کے عہد میں شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۴ء میں گجرات پر یلغار کی۔ پٹن کے محاذ پر بھیم دیو کو شکست ہوئی اور قطب الدین ایبک اُس سے تاوانِ جنگ اور خراج وصول کر کے واپس لوٹ گیا۔ اس دوران میں شہاب الدین غوری دہلی میں قطب الدین کو اپنا نائب مقرر کر کے افغانستان چلا گیا تھا۔ قطب الدین نے ۱۱۹۶ء میں گجرات پر دوسرا حملہ کیا اور اس پُورے علاقے کو فتح کر کے یہاں اپنا نائب مقرر کر دیا اور خود واپس دہلی لوٹ گیا۔

۱۲۹۷ء میں علاءالدین خلجی نے اپنے سپہ سالار اُلغ خاں کو ایک عظیم الشان فوج دے کر گجرات کے باگھیلا راجپوت راجہ کرن گھیلا کے مقابلے پر روانہ کیا۔ اُلغ خاں نے کرن گھیلا کو اس جنگ میں شکست دی، اور یہیں سے گجرات پر مسلمانوں کا عملاً تسلط ہو گیا۔ اس کے بعد کسی راجپوت یا گُرجر راجہ کو گجرات پر حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اسی وقت سے گجرات دہلی کی مرکزی حکومت کے زیرنگین ہو گیا تھا، اُلغ خاں کے بعد ۱۲۹۷ء سے ۱۳۲۰ء تک آٹھ نائبین حکومت دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے سرزمین گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔ اسی طرح خاندان تغلق کے عہد میں ۱۳۲۰ء سے ۱۴۰۳ء تک ۱۴ نائبین یکے بعد دیگرے گجرات کا نظم و نسق سنبھالتے رہے۔ غرضیکہ کم و بیش دو صدی تک سلاطینِ دہلی اپنے عمال اور ناظموں کے ذریعے گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔

سلاطینِ گجرات

۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے نے دہلی کی مرکزی حکومت کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اُس وقت گجرات میں ظفر خاں مرکزی حکومت کی جانب سے ناظم الامور تھا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں جس طرح خضر خاں نے ملتان میں، دلاور خاں نے مالوہ میں اور ملک سرور نے جون پور میں اعلان استقلال کر دیا تھا، اسی طرح ظفر خاں نے بھی گجرات میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پٹن اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۴۰۳ء میں ظفر خاں کا بیٹا تاتار خاں سریر آرائے سلطنت ہوا، اور اس نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا، اور اس کے انتقال کے بعد ظفر خاں نے بذاتِ خود مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس طرح گجرات پر سلاطینِ گجرات کی مستقل حکومت قائم ہو گئی اور ۱۴۰۳ء سے ۱۵۷۲ء تک ۱۲ بادشاہوں نے گجرات پر حکومت کی۔

گجرات پر مغلوں کا تسلّط

سلطان مظفر شاہ ثالث (۱۵۶۰ء سے ۱۵۷۲ء) کا عہد حکومت

نہایت متزلزل اور کمزور تھا۔ اسی کے عہد میں اکبر نے گجرات پر فوج کشی کی اور معاً گجرات دوبارہ دہلی کی مغل سلطنت کے اقتدار میں چلا گیا۔ اکبر کے بعد جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب وغیرہ گجرات پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس عرصے میں مرکزی حکومت کی جانب سے گجرات پر ۵۹ صوبیداروں کا یکے بعد دیگرے تقرر ہوتا رہا۔ جن میں مرزا عزیز کوکا۔ عبدالرحیم خان خاناں، شاہجہاں (بہ عہد شہزادگی) اور دارا شکوہ کا زمانہ نہایت پُر امن رہا۔ گجرات میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔

بہر حال گجرات میں مسلمانوں کی حکومت کم و بیش پونے پانچ سو سال رہی۔ اس کا مختصر خاکہ حسبِ ذیل ہے۔

سلاطینِ دہلی کا اقتدار ۱۲۹۷ء سے ۱۴۰۳ء تک۔ سلاطینِ گجرات کا اقتدار ۱۴۰۳ء سے ۱۵۷۳ء تک۔ اور پھر سلاطینِ مغلیہ کا اقتدار ۱۵۷۳ء سے ۱۷۵۷ء تک۔

زبان کی بحث

غلبہ اور استیلا کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفکّر نے لکھا ہے کہ غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی غلبہ، اور دوسرا سیاسی اور مادّی غلبہ۔ کسی قوم کے ذہن و اخلاق کا ماؤف اور مرعوب ہو جانا یا سیاسی اور مادّی اعتبار سے کمزور اور خستہ ہو جانا اس کی ذہنی، اخلاقی، سیاسی اور مادّی موت کے مترادف ہوتا ہے۔ ایک قوم اپنی فکری اور نظری قوتوں میں اس قدر ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار و نظریات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے لگیں، اسی کے خیالات و عقائد کا سکّہ چلنے لگے۔ قلوب و اذہان اُسی کے سانچے میں ڈھل جائیں، اُسی کی تہذیب و معاشرت کو تہذیب و معاشرت سمجھا جائے، اُسی کے علم و فن پر ایمان لایا جائے۔ غرضیکہ اُسی کے تمام رطب و یابس کو صحیح و مستلم جانا جائے تو اِسے ذہنی اور اخلاقی غلبہ قرار دیا جائے گا۔

یا کوئی قوم سیاسی اور مادّی ذرائع و وسائل کے اعتبار سے اتنی طاقتور ہو جائے کہ دوسری قومیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے باعث اس کے مقابلے میں اپنی سیاسی آزادی برقرار نہ رکھ سکیں، اور جذبہ جاں سپاری کے غلط اور خوشامدانہ تصوّر میں مگن رہتے ہوئے اپنے وسائلِ ثروت اُسی کو تفویض کرا دیں تو اسے سیاسی اور مادّی غلبہ سے تعبیر کیا جائے گا۔

آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے گجرات کی بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ گُرجر قوم عرب تاجروں یا حملہ آوروں کی طرح تازہ دم اور تازہ خون نہ تھی۔ بلکہ گرجستان سے چلنے کے بعد اور گجرات میں پہنچنے تک وہ کئی علاقوں کو اپنا وطن بنا چکی تھی۔ مختلف علاقوں میں قیام اور صدیوں تک کی خانہ بدوشی، ایران۔ افغانستان، بلوچستان، پنجاب، راجستھان اور مارواڑ کی اقوام سے میل جول اور باہمی ربط و اختلاط نے گرجروں کی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی حالت پر بڑے دُور رس اثرات مرتب کئے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گجرات میں متوطّن ہونے کے بعد رفتہ رفتہ یہ قوم تدبّر اور تفکّر کے میدان میں ضعیف اور درماندہ ہوتی چلی گئی۔ دوسری اقوام کے تتبّع اور مقامی لوگوں کے رسم و رواج، لباس اور وضع قطع کی پیروی نے اس کے قلوب و اذہان کو تقلید جامد کا شیدائی بنا دیا تھا۔ دراصل جو قوم تقلید کی خوگر ہو جاتی ہے قدرت اُسے اجتہادی غور و فکر کی دولت سے محروم کر دیتی ہے۔

الغرض —— بیرونی تاجروں اور حملہ آوروں کا تسلّط و اقتدار جوں جوں بڑھتا گیا۔ گجراتیوں میں احساس کمتری اور غلط قسم کی خیر سگالی کا جذبہ بھی ترقی کرتا گیا۔ گجراتی زبان پر براہِ راست عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات مرتّب ہونے لگے۔ محکومیت اور مرعوبیت نے فاتح اور طاقتور اقوام کی زبان۔ تہذیب اور معاشرت اختیار کرنے پر اُنھیں اُکسایا۔ روزمرّہ کی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں نے اپنے اثرات دکھائے اور نتیجہ کے طور پر ایسے بیسیوں عربی۔ فارسی الفاظ گجراتی زبان میں داخل ہو گئے جن کا کوئی بدل گجراتی زبان میں نہ تھا۔ چونکہ وضع و اختراع کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ اس لئے عربی، فارسی کے متعدد الفاظ انھیں بجنسہٖ قبول کر لینے پڑے۔

نئے الفاظ

مشہور اسکالر پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے لکھا ہے کہ۔

نئے لوگ اپنے ساتھ تعمیرات کے نئے نام اور نئی وضع قطع بھی لائے تھے۔ انھوں نے یہاں مسجدیں (ع) مینارے (ع) قلعے (ع) بُرج (ع) اور دروازے (ف) تعمیر کئے۔ چونکہ گجراتی میں ان تعمیرات کے لئے مخصوص نام اور الفاظ نہیں تھے، اس لئے یہی الفاظ بجنسہٖ گجراتی میں داخل ہو گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ ایسے الفاظ اس زبان میں اس طرح رس بس گئے کہ آج انھیں جدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔

اسی طرح کئی ایک تجارتی اور روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں بھی اپنے مخصوص

نام ساتھ لائی تھیں جیسے شراب اور قلعی عرب سے آئے۔ سرمہ اور گلاب ایران سے آئے۔ شام سے اطلس آئی، ترکی سے توپ آئی، بندوق اور خنجر خراسان سے آئے۔ پہاڑوں سے برف (ف) منگوا کر پانی ٹھنڈا کرنے کا طریقہ بھی مسلمانوں نے رائج کیا۔ انھوں نے اپنے مکان کے دریچوں پر پردے (ف) لٹکائے۔ وہ لوگ اپنے ساتھ دیگ (ف) رکابی (ف) پیالہ (ف) اور خوانچے (ف) بھی لائے۔ رات کو روشنی کے لئے انھوں نے فانوس (ف) استعمال کئے۔ راستوں پر مشعلیں روشن کیں۔ مقامی لوگ گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر زین (ف) لگام (ف) رکاب (ع) اور مہمیز (ع) کو رواج دیا۔ انھوں نے یہاں حوض (ف) فوارہ (ع) باغ (ف) اور باغیچے (ف) بنوائے۔ کھانوں میں بریانی (ف) حلوہ (ع) جلیبی (ف) برفی (ف) اور کباب (ع) رائج کئے۔ لباس میں پائجامہ (ف) ازار (ع) پیرہن (ف) اور ڈگلا (ف دگلہ) کو رواج دیا۔ بہرحال اسی طرح بے شمار عربی، فارسی اور ترکی الفاظ گجراتی میں آمیز ہوتے چلے گئے۔

گجرات کی ناگر قوم

چونکہ اردو زبان بجائے خود عربی، فارسی، ہندی اور ترکی کا مرکب ہے۔ اس لئے عربی، فارسی کے علاوہ خود اردو زبان نے براہِ راست گجراتی زبان کو کس طریقے پر اور کس دور میں متاثر کیا۔

مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں چونکہ سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی، اس لئے بہ تقاضائے وقت گجراتیوں نے اس زبان کو اپنا لیا، ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ کائستھ، برہم چھتری اور ناگر سب سے پیش پیش تھے۔ اس عہد میں تمام کلیدی عہدوں اور منصبوں پر انھیں کا تصرف ہوگیا تھا۔ ناگر قوم چونکہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی آئی تھی۔ اس لئے سرکاری محکموں میں عمل و دخل اس نے اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ ناگروں کی تاریخ بھی اس امر کی شاہد ہے کہ انھوں نے تاریخ کے پچھلے ادوار میں بھی بڑے بڑے منصب اور سرکاری عہدے حاصل کئے تھے۔ ولبھی میترک راجاؤں ۵۰۰ء لغایت ۸۰۰ء) تک کے جو کتبے ملتے ہیں انہیں بھی وڈنگر (شمالی گجرات) کے ایک برہمن کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد بھی سولنکی اور باگھیلا نسل کے راجاؤں کے عہد میں بھی وزارتوں اور دیگر سرکاری عہدوں پر ناگر ہی قابض تھے۔

ناگروں کا مسلمانوں سے پہلا سابقہ محمود غزنوی کے عہد میں (۱۰۲۴ء) میں پڑا۔ اس کے بعد غوری، آیبک، خلجی کے عہد میں انھوں نے فارسی زبان سیکھنے پر توجہ دی۔ اگرچہ محمود غزنوی کے حملے سے لگا کر اکبر کی یلغار تک تقریباً چھ سو سال کے درمیانی عرصے میں گجرات میں فارسی زیادہ رائج نہیں ہوئی تھی، تاہم اس کی تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور سکندر لودھی (۱۴۸۹ء سے ۱۵۱۷ء) کے عہد میں جا بجا فارسی تعلیم و تدریس کے مدارس چل رہے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی سے پہلے بھی ممکن ہے ناگروں نے فارسی زبان میں ید طولیٰ حاصل کرلیا ہو مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ گجرات ودیا سبھا کی جانب سے پروفیسر چھوٹو بھائی نائک نے ناگروں کی فارسی دانی سے متعلق ایک کتاب گجراتی میں تصنیف کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناگروں نے فارسی زبان میں درجہ کمال حاصل کرلیا تھا۔ نیز اس سلسلہ میں گجرات کے مشہور ماہر لسانیات اور ودیا سبھا کے ریسرچ اسکالر پروفیسر کے۔ کا۔ شاستری اور مشہور گجراتی ادیب و مصنف جینتی دلال سے میں نے بارہا تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ عنقریب ہی میں گجرات کے ناگروں کی فارسی دانی پر ایک سیر حاصل مقالہ آج کل کے ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

عہدِ اکبری میں فارسی کا رواج

اکبر کے وزیر محاصل راجہ ٹوڈرمل نے ۱۵۸۲ء میں جب فارسی کو سرکاری اور دفتری زبان قرار دیا، اُسی زمانے سے ہندوؤں نے عموماً اور گجرات کے ناگروں نے خصوصاً فارسی زبان کی تحصیل کی جانب توجہ کی، تا آنکہ ان لوگوں نے اس زبان میں اس قدر استعداد پیدا کرلی کہ اس عہد کی مسلم حکومتوں میں دیوان (شعبۂ محصولات کا افسر اعلیٰ) وکیل (سرکاری ایجنٹ یا سفیر) بخشی (تنخواہ تقسیم کرنے والا) دفتردار (محاسب یا اکاؤنٹنٹ جنرل) پیشکار (سکریٹری یا پرسنل اسسٹنٹ) وغیرہ کے عہدوں پر عموماً ناگر ہی فائز ہوتے رہے، اور یہ عہدے اُن میں نسل در نسل اس طرح جم گئے تھے کہ جس خاندان کا کوئی بزرگ جس عہدے پر فائز ہوتا اُس کا پورا خاندان اسی عہدے کے نام سے مشہور ہو جاتا۔ گجراتی میں اس لقب کو اٹک کہتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی گجرات کے ہندوؤں میں دیوان، وکیل، بخشی، دفتری وغیرہ اٹکیں رائج ہیں۔ اور بقول پروفیسر نائک۔ جو لوگ کسی مسلمان حاکم یا عہدیدار کے پاس ملازم ہوتے وہ بھی اپنے آقا کے عہدے کو اپنی اٹک بنا لیتے۔ چنانچہ

گجرات کے ہندوؤں میں سیّد، بادشاہ، بخشی، حضرت، معشوق، دلدار، شہنشاہ اور شاہ وغیرہ کی اٹکیں عام ہیں۔ یہ رواج عہدِ اکبری میں کافی عروج پر تھا۔ اور آج بھی یہ اٹکیں باوجود امتدادِ زمانہ کے جوں کی توں قائم ہیں۔

اس سلسلے میں گجرات کی مشہور ادیبہ ونودینی نیل کنٹھ نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں گجراتیوں کی تمام مروجہ اٹکوں پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ عہدِ اکبری اور اس کے بعد بھی ناگروں اور دیگر ہندو جاتیوں میں بچّوں کے فارسی آمیز نام رکھے جانے کا عام رواج تھا۔ مثلاً مجلس رائے، گُلاب چند، ہمّت لعل، صاحب داؤ، خوشحال رائے، دولت رام، نعمت رائے، بلاقی داس، چمن لعل، حکومت رائے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہی وہ زمانہ تھا جس میں گجراتی زبان کافی حد تک فارسی سے متاثر ہوئی۔ بہت سے عربی الفاظ تو براہِ راست گجراتی میں داخل ہوگئے تھے، لیکن عربی الفاظ کا ایک معتد بہ حصّہ فارسی کے ذریعے بھی گجراتی میں شامل ہوگیا تھا۔

گجراتی زبان میں عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا ذخیرہ

گجرات سماچار (احمد آباد) کے سالنامہ میں پنڈت بیچرداس دوشی کا ایک محققانہ مقالہ تین سال قبل شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے گجراتی کے ایک مشہور لُغت "سارتھ جوڈنی کوش" کا اس طرح تجزیہ کیا ہے۔

اس لغت میں کُل ۵۶۸۳۰ الفاظ شامل ہیں۔ جن میں:۔

۲۰۲۶۵۔ سنسکرت

۱۶۵۶۔ فارسی

۸۲۲۔ عربی

۳۶۰۔ انگریزی

۱۸۳۔ ہندی

۴۴۔ مرہٹی

۲۷۔ ترکی، اور

۲۹۔ پرتگیزی زبان کے الفاظ ہیں۔

سنسکرت الفاظ تو چونکہ گجراتی زبان کی بنیاد ہیں، اور وسطی ایشیا سے آئے۔ لہٰذا ان کی کثرت ایک قدرتی بات ہے۔ البتہ گجراتی میں سنسکرت الفاظ کی مندرجہ بالا جو تعداد بیان کی گئی ہے۔ اُن میں سے سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو صرف علمی اور تحقیقاتی مضامین ہی کے لئے گجراتی ساکشر استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ عوامی بول چال کے لئے یہ الفاظ اب متروک اور غیر مانوس بن گئے ہیں۔ صحافتی زبان میں بھی ان کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

گجراتی زبان کا تلفظ

عہدِ حاضر کے مشہور ادیب پروفیسر رمن لال وسنت لال دیسائی' (جن کا انتقال اسی سال ہوا ہے) کا قول ہے کہ۔

"گجراتی زبان تلفّظ کے اعتبار سے کسی حد تک بے جان سی واقع ہوئی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عہدِ متوسط کے گجراتی شعراء اور ادباء نے اس زبان کو زیادہ سے زیادہ نرم و نازک اور فصیح و بلیغ بنانے کی کوششیں ضرور کی ہیں۔ مگر دوسری جانب اسے جوہر مردانگی سے یکسر خالی اور معرّا بنا کر رکھ دیا"۔

(سندیش۔ دیوالی انک)

اور جب ہم سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) کی گجراتی زبان کا گجرات کی گجراتی سے مقابلہ کرتے ہیں تو مندرجہ بالا قول کی صداقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سوراشٹر کی گجراتی دلکش اور شیریں ہونے کے ساتھ ساتھ رزمیہ شاعری کے لئے بھی کافی موزوں ہے۔ جبکہ گجرات کی گجراتی صرف دلکش و شیریں ہی ہے، رزمیہ شاعری کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اب تک کوئی رزمیہ شاہکار گجراتی میں نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ موجودہ دور کے گجراتی غزل گو شعراء نے اب کسی حد تک اس زبان کو چُست اور مردانہ وار بنانے کی کوششیں شروع کی ہیں، اور اُنھیں اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور جگر مرادآبادی کے تتبّع میں گجرات کے غزل گو شعراء نے جو کلام اب تک پیش کیا ہے، نیز پیش کر رہے ہیں وہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ، تراکیب اور اسالیب اور تلفّظ کے اعتبار سے کافی زوردار ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی سے لگا کر بیسویں صدی کے وسطی زمانہ تک ـــــ یعنی کم و بیش ساڑھے سات سو سال تک ـــــ گجراتی زندگی ذہنی اور سیاسی اعتبار سے مجبور و محکوم رہی۔ راجہ کرن گھیلا (۱۲۹۷ء) کے بعد سے اب تک کسی گجراتی راجہ کو اس سرزمین پر آزادانہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ گجرات کے مسلمان سلاطین ـــــ سلطان محمد شاہ اوّل سے سلطان مظفر شاہ ثالث تک ـــــ نے گجرات کی قومی خصوصیات کو عروج پر لانے

کی کوشش کی تھی۔ مگر سولھویں صدی میں اکبر کی یلغار نے ان کوششوں کا بھی خاتمہ کر دیا، اور گجرات کلیتاً ان سلاطین و حکمرانوں کے غلبہ و استیلا کا شکار رہا جنھوں نے اس علاقے کے قومی اوصاف کا عملاً خاتمہ کر دیا۔ ممکن ہے گجرات کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے داخلی طور پر اپنی قومی خصوصیات کو کسی حد تک زندہ و برقرار رکھا ہو! مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طویل و مسلسل عہدِ محکومی میں کوئی ایسی ہمہ گیر تحریک گجرات میں رونما نہیں ہوئی جو گجراتیوں کی قومی خصوصیات اور تاریخی روایات کو زندہ رکھ سکتی جس طرح کہ بنگالیوں، مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے قومی اوصاف اور قومی مزاج کو زندہ و برقرار رکھا ہے۔ اس طویل دور کے لازمی اثرات — جو گجراتی تہذیب اور معاشرت کی اقدار کو پامال کر چکے تھے — گجراتی زبان و ادب میں بھی ظاہر ہو کر رہے۔ برعکس ازیں کاٹھیاواڑ میں اب تک کاٹھی، راجپوت اور مسلمانوں کی ریاستیں قائم تھیں۔ نیز وہاں کے بھاٹ اور چارن کے راجاؤں نوابوں اور کا دو بکرانی یا خورسند جوانی ایسے ڈاکوؤں کے کارنامے نظم کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اس زبان میں زور اور طاقت قائم رہا ہے۔

جغرافیائی اثرات

کسی بھی قوم کی زبان اور ادب کی تعمیر و تشکیل میں جغرافیائی اثرات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ کوہستان یا ساحلی علاقوں میں رہنے والی قومیں عموماً جفاکش اولوالعزم، حوصلہ مند اور دلیر ہوتی ہیں۔ گجرات کی سرزمین پہاڑوں سے یکسر خالی ہے۔ بعض بعض علاقوں میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں واقع ہیں۔ لیکن ۸۰ یا ۹۰ فی صدی علاقہ میدانی اور سپاٹ ہے۔ البتہ سمندر کا بہت بڑا ساحل گجرات کو گھیرے ہوئے ہے۔ تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ سمندری سفر اور امواج بحر کے تیز و تند تھپیڑے ساحلی علاقوں میں بسنے والی قوموں کی زندگی پر بڑے دوررس اثرات مرتب کرتے ہیں، اور خود گجرات کی تاریخ اس امر کا ثبوت پیش کر رہی ہے کہ اس سرزمین پر جس قدر فاتح اقوام آئیں وہ یا تو دشوارگذار پہاڑی علاقوں میں رہنے والی تھیں یا سمندر کی طغیانیوں سے کھیلنے والی تھیں۔

گجرات کو پہاڑی علاقے تو چنداں نصیب نہیں ہوئے، لیکن بمبئی سے لگا کر سورت، کھمبائت، بھروچ، دمن، دھولیرا، گھوگھا، جعفرآباد، دیو، ویراول، مانگرول، سپیل بندر، بھاؤنگر، جام نگر، اوکھا پورٹ اور تولکھی تک سب کا سب ساحلی علاقہ ہے۔ جہاں سمندر کی موجیں دیوانہ وار ساحلِ گجرات سے ٹکراتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ گجراتیوں نے امواجِ بحر کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ ان کی روایاتی زندگی میں سمندر کا سفر گناہ سے تعبیر ہوتا رہا۔ تقریباً سو سال کا عرصہ ہوا کہ انھوں نے سمندری راستے سے تجارتی سفر شروع کئے۔ آج وہ انگلینڈ امریکہ، یورپ اور مشرق بعید کو بھی جاتے ہیں، لیکن وہ سفر انھوں نے قطعی نہیں کئے جو ان میں جفاکشی اور اولوالعزمی پیدا کرتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین نے بہترین سیاست دان، بہترین صنّاع، بہترین ریاضی داں، بہترین شاعر اور ادیب پیدا کئے، لیکن مردِ میدان شاید ہی پیدا کیا ہو!

مروّجہ عربی فارسی الفاظ

ان حالات میں اگر گجراتی زبان زور و طاقت سے محروم رہ گئی ہو تو چنداں تعجب خیز نہیں ہے۔ آج اس زبان میں تھوڑی بہت طاقت اور چستی جو پائی جاتی ہے وہ تقریباً انھیں الفاظ کی رہینِ منت ہے، جو عربی، فارسی یا ترکی سے اس زبان میں منتقل ہو کر بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح جمے ہوئے ہیں۔ اُن میں بیشتر الفاظ تو ایسے ہیں جن کا کوئی نعم البدل گجراتی میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمایئے۔

قلم (ع)، قدر (ع)، قابو (ف)، قلی (ت)، قبضہ (ع)، قاتل (ع)، قاعدہ (ع)، قبول (ع)، قرض (ع)، قدم (ع)، قدردان (ف)، قرمزی (ع)، قضیہ (ع)، قلعی (ع)، قول (ع)، قرار (ع)، قاصد (ع)، قاضی (ع)، قسمت (ع)، قیدی (ع)، قیمت (ع)، قانون (ع)، قتل (ع)، قابل (ع) ——— اور اسی طرح:۔ کُل (ع)، کام (ف)، کارکن (ف)، کاریگر (ف)، کسر (ع)، کسب (ع)، کُشتی (ف)، کلال (ف)، کفش (ف)، کفایت (ف)، کلفت (ع)، کمان (ف)، کمال (ع)، کُنج (ف)، کم نصیب (ف)، کوچ (ف)، کمزور (ف)، کرسی (ع)، کامدار (ف)، کرامت (ع)، کباب (ف)، کیمیا (ع)، کیف (ع۔ف)، کمبخت (ف)، کیسہ (ف۔ گجراتی تلفظ کھیسہ) یہ بچاس الفاظ صرف وہی ہیں جو حرف قاف یا کاف سے شروع ہوتے ہیں۔ ابجد کے حساب سے اسی طرح ہم نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی ایک فہرست تیار کی ہے جس میں ڈھائی ہزار سے زائد الفاظ جمع ہو گئے ہیں۔ اگر مزید غور و فکر سے کام لیا جائے تو اور بھی الفاظ مل سکتے ہیں۔ کیونکہ گجراتی میں رائج ہونے کے بعد تلفظ کے تغیّر نے ان کی اصلی ہیئت بدل دی ہے۔ اس لئے بہت سے الفاظ تو آسانی سے پہچانے بھی نہیں جاتے۔ اوپر جو الفاظ ہم نے درج کئے ہیں یہ تمام کے تمام روزمرّہ کی زبان میں

رائج اور مستعمل ہیں۔ اور پھر ان میں سے تیس یا پینتیس فی صدی الفاظ تو ایسے ہیں جن کا نعم البدل سردست گجراتی زبان میں نہیں ہے۔ مثلاً وکیل، دوکان، کرسی، رُومال، قلم، کمان، قلعی، کفن، کلال وغیرہ وغیرہ۔

گجراتی میں بعض ایسے الفاظ بھی رائج ہیں جو بیک وقت عربی زبان میں بھی ہیں، اور سنسکرت میں بھی! ایسے بعض الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں پروفیسر کے۔ کا۔ شاستری، پروفیسر نایک اور جینتی دلال وغیرہ سے میرا تبادلۂ خیالات جاری ہے۔ ممکن ہے ہم کسی نتیجے پر پہونچ سکیں!

گجراتی پر اُردو زبان کے اثرات

اردو زبان چونکہ مجموعہ ہے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کا ——— لہٰذا اس زبان کے ذریعے جو الفاظ گجراتی میں داخل ہوئے ہوں گے، وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان ہی کے ہوں گے۔ براہِ راست عربی اور فارسی نے جن حالات اور حوادث کے زیرِ اثر گجراتی زبان کو متأثر کیا، اس کا ذکر تو ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو زبان نے براہِ راست گجراتی کو کس حد تک متأثر کیا! تاریخ کے کس دور میں اور کن ذرائع و وسائل کے ماتحت متأثر کیا ——— !

اس سلسلے میں بھی گجراتی کے متعدد ادیبوں، نقادوں نیز ماہرین لسانیات سے میں نے بارہا تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ گجرات کے مشہور غزل گو شعراء ھنیہ پالن پوری، شیخ آدم آبو والا، اشوک ہرش، روی شنکر راول، کے۔ کا۔ شاستری، نرنجن بھگت، جینتی دلال۔ وغیرہ سے مجھے اس سلسلے میں بڑی مدد ملی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض امور میں مجھے ان سے اختلاف ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ گجراتی زبان براہِ راست اُردو سے اسی صدی میں متأثر ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سب سے قبل اس کا سابقہ اردو ڈراموں اور ناٹکوں سے پڑا تھا۔ آغا حشر اور دوسرے ڈراما نویسوں کے اُردو ڈرامے جب پہلی بار گجرات کے اسٹیج پر پیش کیے گئے تو کافی مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں کو گجراتی اسٹیج پر پیش کرنے کا سہرہ پارسیوں کے سر ہے۔ عبدالرحمٰن کابلی اور رتن شاہ سینور ایسے بھاری بھرکم اداکاروں کی دبنگ اور پاٹ دار آوازیں، اُردو کے جاندار مکالمے، دلوں کو متأثر کرنے والا تلفظ گجراتیوں کو متأثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ حتیٰ کہ خود میں نے اپنے بچپن میں بہت سے ہندو حضرات کو نجی گفتگو میں اِن ڈراموں کے پُورے کے پُورے مکالمے بولتے سنا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کے لئے چونکہ گجراتی زبان میں موزوں اور رعب دار الفاظ کا فقدان تھا۔ اس لئے ان مکالموں کے زوردار الفاظ اپنی معنوی خوبیوں اور تلفظ کے تناؤ کے باعث گجراتی زبان میں آمیز ہونے لگے۔ گجراتی کے براہِ راست اردو سے متأثر ہونے کا یہ پہلا زینہ تھا۔

دوسری مرتبہ اردو زبان نے تحریک خلافت کے زمانے میں گجراتی پر اثر ڈالا۔ "بولی اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو" والا زمانہ بڑی سرگرمیوں اور جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ انقلاب۔ آزادی، قربانی، قید، سزا، شہید وغیرہ قسم کے بیسیوں عربی، فارسی الفاظ اس دور میں اُردو کے ذریعے گجراتی زبان میں داخل ہوئے۔ علی برادران، مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر انصاری، مولانا فاخرالہ آبادی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی وغیرہ بزرگوں اور رہنماؤں کے گجرات میں طوفانی دوروں، عظیم الشان جلسے جلوسوں اور ان کی دھواں دھار اُردو تقریروں اور طرزِ خطابت نے بھی گجراتی زبان کو کافی حد تک متأثر کیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی عربی فارسی کے جو الفاظ اُردو کے ذریعے گجراتی زبان میں شامل ہو گئے تھے وہ آج اس زبان کا جزو لاینفک بنے ہوئے ہیں۔

تیسرا اثر اس زبان پر اردو غزل نے ڈالا ہے۔ عہدِ متوسط میں فارسی غزلیات نے بھی گجراتی کو کافی حد تک متأثر کیا تھا، اور ناگروں نے ان غزلوں کا کامیاب تتبع بھی کیا تھا۔ مگر اُردو نے براہِ راست گجراتی زبان پر جو اثر اُردو غزل کے ذریعے ڈالا ہے وہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ گجراتی میں غزل کی ابتدا انیسویں صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی۔ لیکن اُس صدی کے اختتام تک گجراتی میں جو غزلیں کہی گئی ہیں وہ ابتدائی رنگ کی ہیں۔ تغزل اس میں نظر نہیں آتا۔ اور وہ سب فارسی کا چربہ معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ دیارام (متوفی ۱۸۵۲ء) نرمد (۱۸۸۶ء) اور بالاشنکر (۱۸۹۸ء سے ۱۹۲۲ء) وغیرہ نے فارسی غزل گو شعراء ہی کی پیروی کی ہے۔ خصوصاً بالاشنکر نے تو حافظ شیرازی کی کئی ایک فارسی غزلوں کو اُنہی بحور اور ردیف و قوافی کے ساتھ گجراتی میں منتقل کیا ہے۔

مگر بیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے جو غزلیں اُردو کے تتبع میں کہی جانے لگی ہیں، اُن کا سہرہ کلاپی کے سر باندھا جا رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے

کہ خود کلاپی غزل کی تکنیک سے چنداں واقف نہ تھا۔ اس نے عربی، فارسی الفاظ اپنی غزلوں میں کافی استعمال کئے ہیں اور بہت سی تراکیب اور محاوروں کو رائج بھی کیا ہے، لیکن اُردو غزل کے نشیب و فراز سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس کی غزلیں فن کا نمونہ یا شاہکار نہیں بن سکیں۔ البتہ غزل کی مقبولیت اور گجراتی مشاعروں کی ہردلعزیزی اُسی کے دور سے شروع ہوئی ہے۔

گجراتی غزل نے زبان و ادب کی سب سے بڑی خدمت اگر کوئی کی ہے تو یہ ہے کہ اُس نے گجراتی زبان ڈھیلی چولیں کافی حد تک کس دی ہیں۔ آج یہ زبان اس قابل ہوگئی ہے اسے رزمیہ شاعری کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

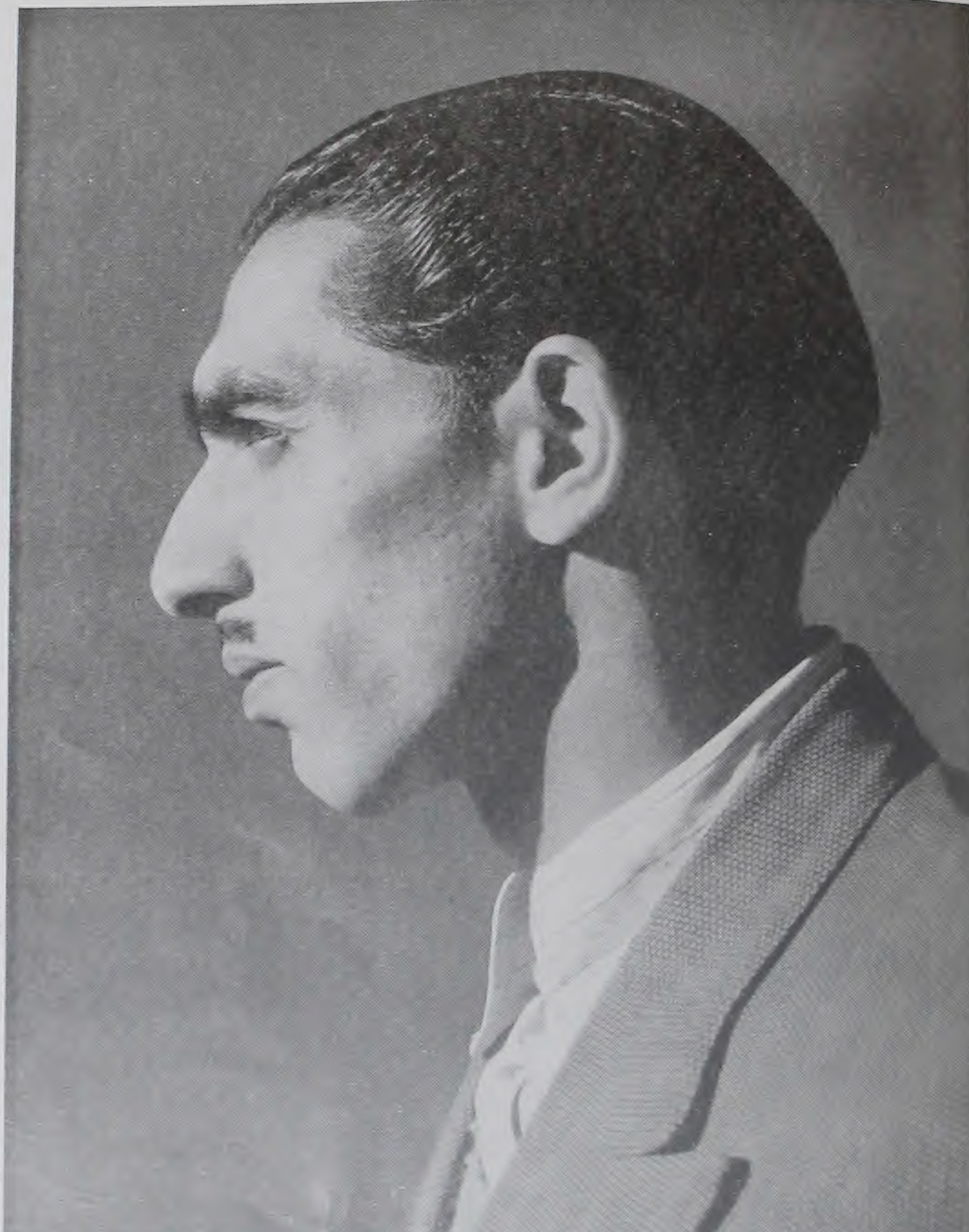
اُردو کے تتبع میں غزلیں کہنے والے گجراتی شعراء میں امرت کیشو نائک۔ کلاپی، منی لال دوی ویدی۔ گوردھن رام، دیرا سری۔ کانت، للت، ادمیشر خبردا، مستان، نارائن وسنت جی ٹھکر، دیوانہ، فانی اور بوٹا وکر وغیرہ نے اردو سے متاثر گجراتی غزلوں کے پہلے دور میں زبان کی کافی خدمت انجام دی ہے۔ اور پھر موجودہ دور میں شیدا۔ صابر، امرت گھائل۔ شنبیہ پالن پوری۔ سیف، شیخ آدم، اوماشنکر جوشی، رنگ اودھت، آثم راندیری۔ بدری کاچ والا، فقیر، بیکار، نثار، محب، انیل، بتیل، نسیم، صغیر، اشوک ہرش۔ ڈایر وغیرہ کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر اُردو غزل کا رنگ کس حد تک چڑھا ہوا ہے۔ شیدا، شنبیہ، شیخ آدم اور امرت گھائل نے اس سلسلے میں اپنی انفرادیت کو کسی حد تک قائم رکھا ہے۔ بیکار اور نثار نے مزاحیہ غزلوں اور طنزیہ رباعیات میں نیا انداز پیدا کیا ہے۔ تاہم ان سب کو غزل کی تکنیک اور غزل کے تقاضوں کے باعث اردو کے غزل گو شعراء کی پیروی کرنی ہی پڑتی ہے۔ گجرات کے غزلگو شعراء عموماً جوش، حفیظ، حسرت، جگر، فانی۔ نوح، اصغر، مجاز اور ساغر سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ کچھ شعراء پر اقبال اور چکبست کا رنگ بھی غالب ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

آج گجراتی مشاعروں اور گجراتی غزلوں نے گجراتی کے تمام اصنافِ سخن کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ گجراتی عوام غزل کے بڑے گرویدہ نظر آتے ہیں، اور غزل ان میں زیادہ سے زیادہ مقبول و ہر دلعزیز بنتی چلی جا رہی ہے۔

گجراتی زبان کو سب سے آخر میں ٹاکیز فلموں نے متاثر کیا ہے۔ "یہودی کی لڑکی" اور نیو تھیئٹرس کی دوسری بیسیوں تصاویر نیز پکار کے مکالمے آج بھی گجراتیوں کی زبان پر رواں دواں ہیں۔ اُردو ڈائلاگ کے بعض مغلق الفاظ نہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ انھیں شوق سے سنتے ہیں۔ چونکہ فلم بینی کا رواج عام ہے۔ اس لئے فلمی مکالموں اور گانوں کے ذریعے بھی گجراتی زبان متاثر ہو رہی ہے۔

گجراتیوں کی وسیع النظری

گجرات کا تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام ——— زبان و ادب کے معاملے میں کافی وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ دوسری زبان کے الفاظ، محاوروں یا ترکیبوں کو انھوں نے کبھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ گجراتی شعراء و ادباء نے اپنی زبان کے دامن کو ہمیشہ گلہائے رنگارنگ سے بھرنے کی سعی کی ہے۔ ایسے الفاظ اور جملے جن کی معنویت یا ظاہری شان و شوکت اُنھیں بھا جاتی ہے، اُنھیں وہ فوراً اپنی زبان میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس صورت خوبصورت، جاندار، معنی خیز اور سلیس الفاظ کا ذخیرہ گجراتی میں آج بھی شامل ہوتا جا رہا ہے۔ بنیادی، عوام، زندگی، مرمت، جمہوریت، عنایت، طوفان، نزاکت ایسے بیسیوں عربی فارسی الفاظ حال ہی میں گجراتی ادب اور صحافت میں داخل ہوئے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے رائج بھی ہوگئے ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آج گجراتی زبان اس قدر صلاحیتیں پیدا کر چکی ہے کہ ہر قسم کے علمی، ادبی، تجارتی، صنعتی، سیاسی، اقتصادی، سائنسی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی اور فلسفیانہ مضامین بحسن و خوبی اس میں لکھے جا سکتے ہیں۔ گجرات کے شعراء، ادباء، سیاس اور مفکر، محقق اور ماہرین اقتصادیات ہر قسم کی تصانیف و تالیفات نیز تلخیص و ترجمے سے گجراتی زبان کے خزانے بھرپور اور معمور کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی چند مشہور و معروف صوبجاتی زبانوں میں آج گجراتی زبان اپنی استعداد اور صلاحیتوں کی بنا پر، نیز اپنے علمی، ادبی اور فنی ذخائر کی بنا پر کافی اہمیت رکھتی ہے، اور ترقی کی رفتار کا یہی عالم رہا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کئی ایک صوبجاتی زبانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی یہ زبان بہت آگے نکل جائے گی۔



رحمان راھي
کشمیری زبان کے ترقی پسند نوجوان شاعر



شہنشاہ ایران اور ملکہ ثریا ۱۶ فروري ۱۹۵۶ء کو
ھندوستان تشریف لاے - ھندوستان میں جہاں بھی
وہ تشریف لے گئے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا

ھز میجسٹی محمد رضا شاہ پہلوي
شہنشاہ ایران



ملکہ ثریا
ھرمیجسٹي ملکہ ایران



میر سید علي تخلص غمگین لقب حضرت جي
مشہوربہ خدانما



۱۵ فروری ۱۹۵۶ کو دھلی میں
مزار غالب پر یوم غالب منایا گیا
تصویر میں پروفیسر محمد اجمل
غالب کے محاسن شعری
پر تقریر فرما رہے ھیں



غالب سوسائٹی کی کوششوں سے غالب کے مزار پر سنگ مرمر کا ایک خوشنما مقبرہ تعمیر ھوا ھے

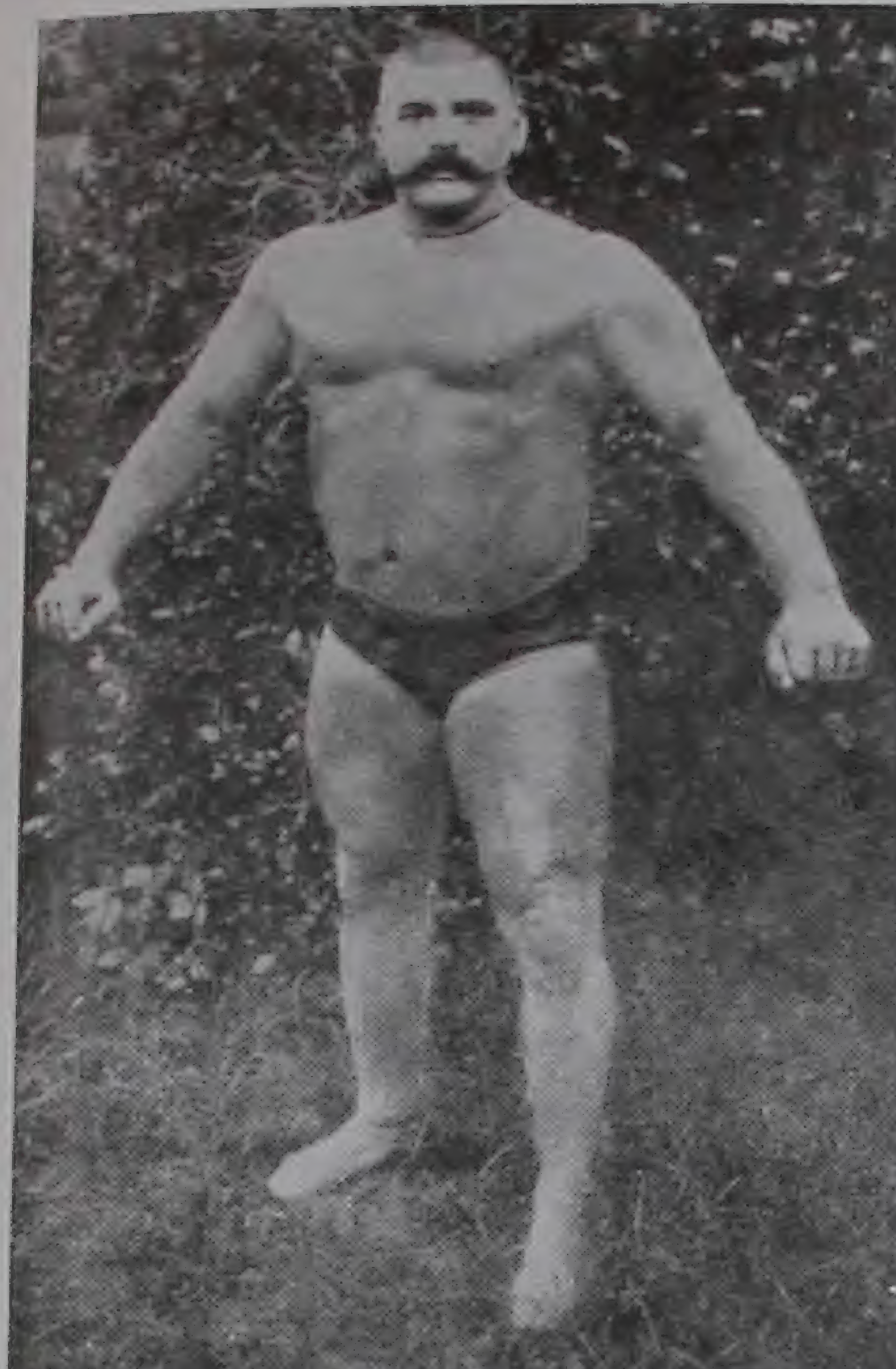
تصویر میں مقبرے کے سامنے دائیں سے بائیں :-
مسٹر شیو راج بہادر رکن غالب سوسائٹی
سید اشفاق حسین سکرٹری غالب سوسائٹی
مسٹر شنکر پرشاد صدر غالب سوسائٹی
مسٹر مالک رام ماھر غالبیات



یوم غالب کی تقریب میں بہت سی
ادب دوست خواتین بھی شامل ھوئیں
سید اشفاق حسین سکرٹری غالب سوسائٹی
تقریر فرما رہے ھیں



زبسکو



رستم زماں گاماں

چند مشہور پہلوان



ہر بنس سنگھ



امام بخش



رحیم ملتانی والا

فضا ابنِ فیضی

اے شاعرِ امروز!

شمعِ رخِ فطرت ہے تو یہ شمع جلا کر
اشعار کو سوزِ نگہِ فکر عطا کر
کب تک تری دنیا میں یہ افسردہ شب و روز
اے شاعرِ امروز!

کر شعر میں پیدا تپش و جذب کی تاثیر
جوہر سے ہے محروم تو ہے کُند وہ شمشیر
انفاس کو دے روشنیٔ جذب و تب و سوز
اے شاعرِ امروز!

بے سوزِ دروں شمعِ نظر جل نہیں سکتی
انفاس میں فطرت کی نوا ڈھل نہیں سکتی
احساس کو کر شعلہ صفت روشن و پُرسوز
اے شاعرِ امروز!

تیری خردِ خام جنوں پیشہ نہیں ہے
امروز ترا صاحبِ اندیشہ نہیں ہے
تو محرمِ فردا ہے نہ آسودۂ دیروز
اے شاعرِ امروز!

سرمایۂ فن فکر کا خمیازہ نہیں ہے
کچھ آج بھی ایمانِ سخن تازہ نہیں ہے
وہ نالۂ دل گیر ہے یا آہِ جگر دوز
اے شاعرِ امروز!

ہر نقش تصوّر کا ہے صورت گرِ الحاد
قلب و نگہ و روح کی یہ دولت برباد
افسردہ ہے کیوں آج ترا سوزِ خود افروز
اے شاعرِ امروز!

یہ رسمِ نظر بازی و آوارہ دلی کیا
الہام ہے جب شعر تو یہ کم نفسی کیا
بے نور و غلط بیں ہے تری چشمِ کم افروز
اے شاعرِ امروز!

سرمایۂ عقل عبارت ہے جنوں سے
زندہ ہے چمن لالۂ خونیں کے فسوں سے
قائم رہے احساس میں جوشِ تپش و سوز
اے شاعرِ امروز!

حاصل نہ ہو صاحب نظری حس سے تو فن کیا
تخئیل میں رفعت جو نہ ہو لطفِ سخن کیا
اے فکرِ رسا جرأتِ پرواز بیاموز
اے شاعرِ امروز!

تقدیرِ سبو تشنہ لبی ہو نہیں سکتی
تدبیرِ سحر تیرہ شبی ہو نہیں سکتی
اے سوزِ نفس شمعِ وفا باز بیفروز
اے شاعرِ امروز!

ویرانۂ افکار کو فردوسِ نظر کر
"فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر"
یہ عالمِ افکار نہ رہ جائے سیہ روز
اے شاعرِ امروز!

محمد یونس خالدی

حضرت غمگینؒ دہلوی اور اُن کا غیر مطبوعہ کلام

آج کی دنیا کا غیر معروف شاعر یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ غیر معروف ہی رہے۔ اور کل کی دنیا اسے نہ جانے یہی حال "حضرت غمگینؒ[1] دہلوی" کا ہے۔ حضرت غمگینؒ کل کی دنیا میں صرف جانے پہچانے شاعر نہیں۔ بلکہ ایک بڑے شاعر کے ادبی مشیر اور[2] اپنے زمانے کے بہترین زبان داں تھے۔ ان کا زمانہ میر تقی 'میر' مرزا محمد رفیع سودا۔ اور خواجہ میر درد کا زمانہ تھا۔ ان کی بارگاہ میں حضرت ذوق کی جبینِ عقیدت تو جھکتی نظر آتی ہے مگر مرزا غالب[3] 'جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہر ایک کو زبانِ طعن کا نشانہ بناتے تھے وہ بھی سجدہ ریز ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

حضرت غمگینؒ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ زبردست مصلح اور اپنے وقت کے کامل شیخ تھے' اور ان کی فیض بخشی کا سلسلہ بھی عام[4] تھا۔ لیکن شعرا کی صف میں جو مقبولیت خواجہ میر درد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ تاریخ ادب اردو کی روشنی میں میر درد ہی پہلے صوفی شاعر ہیں۔ جنھوں نے مجاز کو حقیقت سے آشنا کرایا۔ اور بارگاہِ محبوب میں جبہ سائی کرتے کرتے حقیقی محبوب کے مطلوب بن گئے۔ اس شہرت کا سبب دہلی کی سکونت اور اہل دلی کی قدر دانی اور ان کے جانشینوں کی ہوش مندی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خواجہ میر درد بعض خصوصیات کی بدولت اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ مثلاً

میر کی شاعری ایک صاحب دل اور ادبی بصیرت رکھنے والے انسان کی شاعری ہے۔ اس لئے جہاں ان کے کلام میں رنج اور الم' حسرت اور یاس کا بے پناہ ہجوم ہے۔ وہاں حالات زمانہ کے پیش نظر وہ کرب اور بے چینی بھی نظر آتی ہے جو ایک صاحب بصیرت کا حصہ ہے۔ مگر اس کرب اور بے چینی میں اپنی اور اپنے وطن کی تباہی کا عرفان بھی ہے۔

رہے "مرزا سودا" تو شیخ چاند نے سودا کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ قصائد میں ان کا مقام کچھ بھی ہو لیکن سودا سے درد کی غزل گوئی کہیں بلند ہے۔ درد کی شاعری پاکیزہ اور جاندار ہونے کے علاوہ معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ان کی روح کی پاکیزگی ان کے کلام میں سرایت کر گئی ہے۔ اس لئے ان کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک فانی دنیا ہے۔ اس دنیا کے علاوہ ایک اور بھی دنیا ہے جو اپنی پاکیزگی کی وجہ سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس وصف میں اگر کوئی ان کا شریک ہے اور کسی دوسرے کے کلام میں یہ تمام محاسن نظر آتے ہیں تو وہ صرف حضرت غمگینؒ ہیں۔ اور اگر حضرت غمگینؒ کی شاعری آج سے قبل کاغذی پیکر میں آ چکی ہوتی تو ناقدین کی زبانیں پکار اٹھتیں کہ اس باب میں ادبیت کا شرف اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ حضرت غمگینؒ کو حاصل ہے۔

حضرت غمگینؒ کے کلام کے دو مجموعے ہیں۔ ایک دیوان رباعیات

---

[1] نام میر سید علیؒ تخلص غمگینؒ لقب حضرت جی مشہور بہ خدانما جائے ولادت دہلی ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء جائے وفات خاص گوالیار ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء

[2] حضرت ذوق "ابتدا میں شاہ نصیرؒ مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی خاں غمگینؒ وغیرہ وغیرہ استادوں سے مشورہ ہوتا رہا" (دیوان ذوق صفحہ علمی پرنٹنگ ورکس دہلی)

[3] ملاحظہ فرمائیے کلیات نثر غالب فارسی ص ۱۸۳ تا ۱۸۴ - نول کشور پریس لکھنؤ ۱۲۸۷ھ

[4] اس عام فیض بخشی کی نمایاں نظیر آپ کے سلسلے کی ہر دل عزیزی ہے۔ حضرت بے خود دہلوی کے دادا سید بدرالدین احمدؒ۔ عبداللہ شاہؒ (اناؤ) شیخ الٰہی بخش فاروقیؒ (ناگوری)۔ شہزادہ مرزا فیروز شاہ (اکبر آباد) مولینا حبیب اللہ شاہ (رام پور) شیخ احمد حسینؒ (راتوں کا ببیئی)۔ میاں محمد غنیؒ (کلکتہ) مولوی مفتی بہادر علیؒ (گوالیار) حافظ میاں ہدایت النبیؒ (گوالیار) پیرجی سید دائم علی شاہؒ (گوالیار) حکیم وارث علی خاں بقائیؒ دہلوی ثم گوالیاری وغیرہم جیسے اکابر آپ کے خلفاء میں ہیں۔

"مکاشفات الاسرار" دوسرا دیوان غزلیات "مخزن الاسرار" ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ تو غزل کو میرؔ نے روحِ تغزل عطا فرمایا۔ غالبؔ نے زبان کی معراج بخشی۔ "مومنؔ" نے مجاز کی راہوں سے مشاہدۂ حق کی نشان دہی کرتے ہوئے تجربات انسانی کے لئے بے شمار ذخیرے دنیائے غزل میں داخل کئے۔ تو حضرت غمگینؒ نے دردؔ کی معیت میں تصوف کی پاکیزگی اور حقیقت اور معرفت کی بے پناہ گہرائی اور اسرار الٰہی سے اس کو مالا مال کیا۔ ان کی غزل گوئی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جبکہ دنیائے غزل سنور رہی تھی۔ مگر دہلی کے بُرے دن آنے شروع ہو گئے تھے۔ دہلی انقلاب اور حوادث سے دو چار تھی۔ بھر پُور محفلیں اجڑتی چلی جا رہی تھیں۔ سلطنتِ مغلیہ نابینا ہو چکی تھی۔ اکبری اقبال کا جنازہ اٹھ چکا تھا۔ صاحبانِ ثروت مفلوک الحال ہوتے چلے جا رہے تھے اس وقت شعراء کے لئے لکھنؤ کی سرزمین مبارک سرزمین تھی۔ دہلی میں ہی نہیں بلکہ خانقاہی زندگی پر جمود طاری تھا۔ کلمۂ حق بلند کرنا مشکل تھا۔ مگر ایک ایسے ولی اللہؒ کا خاندان بھی نظر آتا ہے۔ جو مشعلِ حق بلند کئے ہوئے تھا مگر اس کا رُخ مذہب اور سیاست دونوں طرف تھا۔ اس دور میں جو بات کہی جا سکتی تھی اس دور کا سب سے بڑا مجاہد وہ تھا جو نفسِ سرکش سے جنگ کرنا جانتا ہو۔ حضرت غمگینؒ فرماتے ہیں کہ ؎

جنگ اپنے نفس سے مشکل ہے کچھ آساں نہیں   تو ہیں اک نکلے ہے اے دل مرد اس میدان کا

حضرت غمگین اس میدان کے مردِ میدان نظر آتے ہیں۔ دہلی میں تو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چونکہ جب آنکھ کھولی تو حکومت کی باگ ڈور اپنے عمِ محترم[1] اور والد محترم[2] کے ہاتھوں میں دیکھی۔ پھر عم زاد[3] بھائی کے ہاتھوں کو مضبوط پایا۔ فنِ شہسواری اور فنِ سپہ گری میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ ایک بکری کی یخنی صرف ناشتہ کے لئے تھی۔ کھانے کا کیا حال ہو گا۔ لیکن نفس کو شکست دینے کے بعد کل غذا ایک فرنی کا پیالہ دو ٹکیاں روے کی جس کا وزن دو ڈھائی تولے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ عیش و آرام رخصت، دنیا طلبی سے نفور۔ اس کی مثال دہلی چھوڑنے اور گوالیار میں آباد ہونے کے بعد دولت راؤ مہاراجہ سندھیا کی قدر دانی اور اعزاز کی فراوانی اور حضرت غمگین کا استغنا ہے۔ اس طرح بات میں بات نکلتی چلی آئے گی اور مدحت سرائی کا باب طویل ہوتا چلا جائے گا۔ میرا مقصد اس باب کو طول دینا نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ حضرت غمگین نے غزل کو تصوف کی پاکیزگی اور معرفت و حقیقت کی دولت بخشی۔ تو اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود ان کا کلام اس بات کی کھلی شہادت ہے۔ ان کی اہلیت اور جامعیت کے لئے مرزا غالب کی نیاز کیشی کو سامنے لایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ موقع نہیں۔ آپ ان کے کلام سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایئے۔ کسی دوسرے کے سہارے کسی غیر معروف باکمال شخصیت کا تعارف کرانا حقیقت میں اس کے کمالوں پر پردہ ڈالنا ہے۔ حضرت غمگین خود صاحبِ کمال تھے۔ دنیائے تصوف میں حضرت خدا نما کے نام سے مشہور ہیں۔ شعری کمال کے لئے ایک حمد و نعت کو لے لیجئے۔ یہ موضوع بہت اہم موضوع ہے۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ

حمد ہے جس نے جو کلام کیا   میں نے یوں حمد کو تمام کیا
نعت یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے   اس میں اپنا ظہور تام کیا
لا نہایت ہے حمد اے غمگین   پر تری فکر نے بھی کام کیا

دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی۔ کچھ شعر اور سنیئے ؎

ظاہر و باطن ہے حمد و نعت ہر انسان کا   معنی و صورت یہ مطلع ہے مرے دیوان کا
رو برو ہے پر اسے دیکھا نہیں جاتا ہے آہ   کیا کہوں میں حال اپنے حسرت و ارمان کا
بے سر و سامانی اک ساماں ہے اے دل یاد رکھ   کارِ دانِ عشق میں ہر بے سر و ساماں کا
معرفت پر اس کی حق کی معرفت موقوف ہے   مرتبہ ایسا ہے عالی حضرتِ انسان کا
اپنی ہستی کو عدم ہم کو کیا موجود آہ!   نیست ہوں ہم تو بھی بدلہ ہو نہ اس احسان کا

علم سے جبکہ مرا مرتبہ مافوق ہوا   نخوت و اقرب مری گردن میں وہیں طوق ہوا!

---

[1] چچا کا اسم شریف سید شاہ نظام الدینؒ ہے۔ ان کا شمار شاہ عالم کے خاص وزرا میں تھا۔ جب دہلی میں مرہٹہ مہاراج مہادا جی سندھیا کا تسلط ہوا۔ تو سب سے پہلے ان کو ایک صوبہ دار کی فکر ہوئی۔ جو صداقت مآب اور قابلِ اعتماد ہو۔ اس کے لئے سید شاہ نظام الدینؒ کا انتخاب عمل میں آیا اور سندھیا مہاراج نے بہ منظوری شاہ عالم یہ عہدہ جلیلہ آپ کو تفویض کیا۔

[2] والد ماجد کا اسم گرامی حضرت سید شاہ سید احمدؒ تھا۔ آپ کا مزار زیرِ شہر پناہ اجمیری دروازہ دہلی میں ہے۔ آپ اپنے بڑے بھائی کے دستِ راست اور نائب تھے۔

[3] عم زاد بھائی کا نام نواب سید میر خاں تھا۔ آپ اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ اعظم الدولہ معین الملک تہور جنگ آپ کا شاہی خطاب تھا۔

کسی صورت سے ہمیں جب نہ ہوئی ان کی شناخت — ناشناسی میں عجب لطف و عجب شوق ہوا
حالِ غمگین یہ ہوا جب نہ رہا کوئی مقام — جو کہ ماتحت ہے اس کے وہی مافوق ہوا

بُرا نصیب ہو جس کا بھلا نہیں ہوتا — شراب جتنی پئیں ہم نشہ نہیں ہوتا
تری نماز سے بہتر ہے یہ شراب مری — کہ اس میں نام کو زاہد ریا نہیں ہوتا

فدا جو تجھ پہ مثالِ چکور ہیں عشاق — بہ شانِ ماہ ہوا ہے تو شہرۂ آفاق
جمال اپنا دکھائیے اب ان کو اے پیارے — کہ تیرے حسن کے عاشق ازل سے ہیں مشتاق
جہاں میں منعم و شاہ و گدا سے اے غمگین — طمع نہ کیجئے ہر گز کہ ہے خدا رزّاق

"توی یہ حمد اے واعظ سفیدی پر سیاہی ہے — ہمیں ہر نقشے مجسّم صورتِ حمدِ الٰہی ہے
دلیلوں سے کرے ہیں کو دچشم اثبات پھر اس کا — درخشاں حُسن جس کا ماہ سے لے تا بہ ماہی ہے

ان اشعار میں زبان کی لطافت کے ساتھ تخیل کی بلندی بھی نظر آتی ہے اور طرزِ ادا میں جو نُدرت ہے وہ داد اور تعریف سے مستغنی ہے۔ پھر اس کے دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کلام ایک ایسے شاعر کا کلام ہے۔ جو اپنے وقت کا مسلم الثبوت استاد ہے۔ شمس العلما مولٰینا محمد حسین آزاد[1] کی شہادت کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ذوق کا مشورہ کرنا ظاہر ہے۔ لیکن "مرزا غالب" جن کو "ظہوری" اور "نظیری" کا ہم پلّہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور جن کا اردو کلام "سراپا الہام" ہے۔ جو اپنے دَور میں نہیں بلکہ آج تک ایک انفرادی شان کے حامل ہیں وہ حضرت غمگین سے کس قدر متاثر تھے یا ان کے مقابلے میں حضرت غمگین کا کلام کس مقام کو چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم طرح غزلوں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ پورے دیوان پر نظر ڈالنا اس مقالہ میں مشکل ہے۔ دونوں بزرگوں کی ایک ہم طرح غزل کے چند شعر پہلو بہ پہلو حاضر خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :-

حضرت غمگین	مرزا غالب
کون جیتا ہے شب ہجر سحر ہونے تک	آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
عمر اک چاہئے یہ عمر بسر ہوتے تک	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

---

[1] دیوان ذوق صفحہ ۵ علمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء

حضرت غمگین	مرزا غالب
خانہ آباد کہیں دیکھ نہ ہو گھر برباد	دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دل میں اس بُت کی وفا کا ترے گھر ہونے تک	دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک
مثلِ شبنم نہیں کچھ ہستیٔ موہوم اپنی	عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
کہ ترے مہر کی ٹھہرے یہ نظر ہونے تک	دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
آئے بھی اور گئے دل بھی وہ لے کر غمگیں	ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
ہائے کیا کیا نہ ہوا ہم کو خبر ہونے تک	خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
	غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگ علاج
	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جہاں تک حضرت غمگین کے دیوان "مخزن الاسرار" کا تعلق ہے وہ علاوہ مخمس، تاریخی قطعات اور رباعیات کے سات سَو ننانوے ۷۹۹ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس مجموعہ کا ایک ایک شعر اثر میں ڈوبا ہوا اور فطرت کا حسین شاہکار نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے بلند شاہکار دیوان رباعیات "مکاشفات الاسرار" ہے۔ پھر یہ بھی کوئی مختصر دیوان نہیں بلکہ یہ دیوان خود تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں بسم اللہ کی شرح کے علاوہ توحید، وحدت الوجود، حقیقتِ انسانی، بطون، ظہور، حقیقت محمدی، چہل مراتب، ایمان علمی، ایمان غیبی، ایمان خاص و عام، گناہ کبیرہ، اختلاف شرائع، معجزات، کرامات، طبقات صوفیہ، عارف و معرفت، توبہ صاحبِ مجاہدہ، توبہ صاحب مشاہدہ، تسلیم و رضا، وفا، شرم، حیا، اخلاق، مروت، احسان، استقامت، قناعت، حسد، اخلاص، صدق و کذب جیسے سیکڑوں عنوانات کے تحت تقریباً چھ سو ۶۰۰ رباعیاں ہیں، دوسرا حصہ جو ردیف وار رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی اسی قدر رباعیاں آپ کے سامنے آئیں گی۔ متفرقات کے باب میں تین سو سے کم رباعیاں نہ ہوں گی۔ اس طرح یہ دیوان تقریباً پندرہ سو رباعیات کا خزانہ ہے۔ پھر مجھے جو دیوان دستیاب ہوا ہے وہ ناقص ہے، حضرت غمگین نے کتنی رباعیاں کہیں، خود حضرت غمگین فرماتے ہیں کہ :-

"یک دیوان رباعیات قریب یک ہزار و ہشت صد رباعی گفتہ شد"[1]

اور یہ مکمل دیوان آج بھی جانشین حضرت غمگین، امیر المشائخ سید شاہ

---

[1] مراۃ الحقیقت (قلمی) شرح دیوان رباعیات "مکاشفات الاسرار" صفحہ ۳۰۶

غنی محمد حضرت جی کے کتب خانہ فقیر منزل گوالیار میں موجود ہے - پھر یہ سب رباعیاں مرزا غالب کے لئے لکھی گئی تھیں - ان رباعیوں کے لکھنے کا زمانہ ۱۲۵۳ھ ہے - ان رباعیوں نے مرزا غالب کی زندگی پر اور ان کے کلام پر جو اثر ڈالا ہے - اس کا خود مرزا کو اعتراف ہے[1] اور زندگی کے آخری ۳۲ سال اور اس دَور کا کلام شاہد ہے -

رباعیات کے نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے -

تکرار بھلا کب ہے تجلّی میں روا   کس طرح ہر ایک کی نہ صورت ہو جدا
باطن میں دو ہے، ہے ایک ظاہر میں گو   ہر چند جدا، جدا ہے اک، ایک خدا

عارف کوئی پوچھے کس کو کہتے ہیں بنا   تو کہہ کہ جو کچھ نہ جانتا ہو بجز ا!
جو پوچھے کہ معرفت کیا ہے اے غمگین   تو کہہ کہ نہیں شناخت اپنے کے سوا

دل صاف نہیں کسی سے بدظن تیرا   کر مے کشی تا عیب ہو روشن تیرا
غمگین سب دوست ہیں تیرے عالم میں   پر علم خودی ہے ایک دشمن تیرا

وہ آب حیات یہ ہی پانی ہے شراب   دیتی جو عمرِ جاودانی ہے شراب
ہم مست ہیں جس شراب میں اے غمگین   ہے یعنی کہ وہ اپنی زندگانی ہے شراب

ہرگز نہ کسی سے عشق ہے نہ اُلفت   سودا ہے کچھ مجھے نہ غمگین وحشت
ہوتی تھی دیکھنے سے جن کے تفریح   آتی کیوں دیکھ کر ہے ان کو حیرت

ہمدم یہ تری مہربانی ہے عبث   اے دل یہ تری جانفشانی ہے عبث
جیتے ہیں پر مرے سے بدتر غمگین   بن اس کے یہ زندگانی ہے عبث

تشخیص مجھے ہوا نہ کچھ اپنا مزاج   جو درد کا میں اپنے کروں کوئی علاج
ہوجانا فنا مشاہدہ میں اس کے   غمگین انسان کی یہی ہے معراج

گر مے کا نشہ نہ ہو تو مستی ہے ہیچ   اور عشق نہ ہو تو بُت پرستی ہے ہیچ
غمگین یہ بات یاد رکھنا میری   جب تک نہ فنا ہو تو یہ ہستی ہے ہیچ

وہ کہتے ہیں بھید میرے کھولا مت کر   اور جام میں مے کے زہر گھولا مت کر
سو بار کہا ہے تجھے اور کہتے ہیں   غمگین تو نشے میں ہم سے بولا مت کر

جز عشق نہیں ہے کوئی اپنا دمساز   کہنے کا نہیں کسی سے لیکن یہ راز
مت چھوڑ تو عشق کو کبھی اے غمگین   گر ہو نہ حقیقی تو حقیقت ہے مجاز

مت کر تو فقیری میں غیر کی کچھ تحریک   اور اس کو یقین جان لے بے تشکیک
اپنی ہی فنا کی فکر رکھ اے غمگین   تجھ میں نہیں کوئی بھی اللہ کا شریک

ہمدم نہیں کوئی آہ اپنا جز غم   اور غم کو کہیں تو کہہ نہیں سکتے ہیں ہم
غم بھاگے ہے اپنی بے کسی سے غمگین   ہمدم کوئی دم ہے، تو اپنا ہے دم

غمگین یہ شرع، جسم انسانی ہے   ان سے کیا جن کی رُوح حیوانی ہے
اور اس کی بدی میں ہے حقیقت یہ روح   جو سمجھے جُدا، یہ اس کی نادانی ہے

اس سرسری مطالعہ سے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے حضرت غمگین کی زبان میں نکل جاتا ہے کہ :-

غمگین یہ رباعیاں تیری ہیں جو چند   عارف کرے کس طرح نہ ہر یک کو پسند
ذرّہ میں کیا ہے مہر کو پوشیدہ   دریا کو کیا ہے تو نے کوزہ میں بند

مگر یہ رباعیاں ان کے لئے ہیں جو نسبت کی حقیقت سے واقف ہیں اور اس بات پر ایمان بھی رکھتے ہیں کہ

غمگین سُن مجھ سے روح انسانی ہے قلم   اور لوح ہے دل، جس میں سب کچھ ہے رقم
ہے عرش یہ جسم، اور کرسی یہ نفس   بس نسخۂ جامعِ الٰہی ہیں ہم

حضرت غمگین اس راہ کے راہی نہیں بلکہ منزل کا پتا بتانے والے اور منزل تک پہنچانے والے بزرگ تھے - دیوان کا ایک ایک شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے -

[1] دیوان رباعیات سے بے انتہا مسرّت ہوئی - میں نے ان کے مطالب سے بار بار فائدہ اٹھایا - میں اس لائق نہ تھا کہ میرے لئے ایسے موتی پروئے جائیں - ترجمہ تلخیص مکتوب مرزا غالب بنام حضرت غمگین (قلمی)

گوردیال سنگھ والیہ

دُنیا کے مشہور پہلوان

فنِ کشتی میں ہندوستان کا نام دنیا بھر میں ہمیشہ اونچا رہا ہے۔ ہندوستان کے کچھ پہلوان دنیا بھر میں کافی مشہور اور مقبول ہو چکے ہیں اور کچھ تو فاتحِ کُل عالم بھی تھے۔ ہندوستان میں کبھی کشتی کا فن بامِ عروج پر تھا اور نہایت غیر معمولی تعریف کے قابل تھا۔ اسے راجوں مہاراجوں نے خوب ترقی دی۔ کشتی کے شوقین راجہ مہاراجہ پہلوانوں کو اپنی ریاست میں اپنے پاس رکھ کر انھیں خوب کھلاتے پلاتے تھے وہاں اُنھیں معقول خرچ اور انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کشتیاں آج ہوتی ہیں اور دہلی، بمبئی، کلکتہ وغیرہ شہروں میں غیر ملکی اور ملکی پہلوانوں کا دنگل اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے۔ مگر آج کل بیشتر کُشتیاں امریکن طریقہ سے ہو رہی ہیں۔ ہندوستانی طریقہ کی کشتیاں اب اتنی مقبول نہیں رہ گئی ہیں۔ جیسے کہ وہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تھیں، اُس زمانے میں بیشتر لوگوں کو اپنے جسم کو مضبوط اور سڈول رکھنے کا ایک جنون سا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پچیس سال پہلے بھارت کے گاؤں گاؤں میں اکھاڑے پائے جاتے تھے۔

رستمِ ہند غلام احمد بخش

گاما کی مقبولیت سے پہلے غلام بھارت کا بہترین پہلوان مانا جاتا تھا۔ غلام کی وفات سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ لیکن اُس کا نام تب تک زندہ رہے گا جب تک بھارت میں فنِ کشتی زندہ رہے گا۔ غلام کا جسم خوب سڈول اور دلکش تھا۔ کمر پیٹ سے اوپر کا حصہ حقیقتاً قابلِ دید و شنید تھا۔ اس کی چھاتی کا گھیرا ساٹھ انچ کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے دو اچھے توانا جوان کھڑے ہونے پر بالکل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اتنا بھاری جسم ہونے پر بھی اکھاڑے میں اُس کی پھرتی کسی سے کم نہیں تھی۔ "دھوبی پاٹ" اور "ہستہ اکھڑا" اس کے خاص داؤ پیچ تھے۔ اُس کے ان پیچوں سے نکل جانا یا اُنھیں برداشت کرلینا اچھے اچھے پہلوانوں کے لئے مشکل تھا۔ اس کے حملے کی تاب برداشت کرلینے کی ہمت اور طاقت اُن دنوں ہندوستان کے مقبول و محبوب پہلوان کیکر سنگھ اکیلے میں ہی تھی۔

پیرس کی بات ہے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں وہاں فنِ کشتی کی بہت بڑی نمائش کی گئی، اس نمائش میں دنیا کے مشہور پہلوان اور کسرت کرنے والے اکٹھے ہونے والے تھے۔ بھارت سے کشتیاں لڑنے کے لئے غلام کو پنڈت موتی لال اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس نمائش میں غلام کی مڈبھیڑ ترکی کے ایک مشہور پہلوان احمد مادرعلی سے ہوئی۔ ترکی کا چھ ہاتھ لمبا دیو نما انسان اور پھر وہ پہلوان اکھاڑے میں آتے ہی غلام پر بُری طرح ٹوٹ پڑا۔ غلام اتنا زبردست طاقتور ہونے پر بھی مادرعلی کے پیچ میں اس بُری طرح پھنس گیا کہ بڑے زور سے چلّانے لگا "پنڈت جی یہ تو مجھے جان سے مار رہا ہے"۔

پنڈت موتی لال جتنے دلدار، زندہ دل شخص تھے، اُتنے ہی مزاج کے تیز بھی تھے۔ غلام کی وہ گھبراہٹ اُنھیں ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہی غلام کو للکارا "ہندوستان کے نامور پہلوان اپنی طاقت کو مت بھول اور اُٹھ جا" اسے سن کر غلام کے وقار کو ٹھیس لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مادرعلی کے پیچ سے نکل آیا، اور آخر میں کشتی برابر کی رہی۔

غلام، مادرعلی کے ساتھ اگرچہ برابر رہا۔ لیکن اس کے پیچ سے نکل جانا ہی بہت بڑی بات تھی۔ غلام کی اس غیر معمولی طاقت کا تذکرہ یورپ کے تمام اخبارات میں خوب ہوا۔ غلام کی جگہ پر اگر کوئی دوسرا معمولی پہلوان ہوتا تو اُس کے لئے مادرعلی کے پیچ سے نکل جانا ناممکن ہی تھا۔

دوسرے ہفتے دوبارہ غلام اور مادرعلی کا جوڑ پڑا۔ اس بار غلام نے چھیالیس منٹ کے دوران میں مادرعلی کو فرش پر پچھاڑ دیا، اور اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔

رستمِ ہند کیکر سنگھ

کشتی میں غلام سے ٹکر لینے والا اکیلا کیکر سنگھ ہی تھا کیکر سنگھ اور

غلام کی کئی کشتیاں ہوئیں۔ جموں میں پہلی مڈبھیڑ ہوئی تو دو گھنٹے تک سامنا ہوتا رہا۔ دوسری کشتی لاہور میں ہوئی، اور حیرت کی یہ بات ہوئی کہ غلام کا جو خاص داؤ "کسوٹا" تھا اُسی کو کیکر سنگھ نے غلام پر لگایا۔ اس پیچ کی وجہ سے غلام بیہوش ہو کر گر پڑا، اسی طرح ایک بار اندور میں کشتیوں کی نمائش کی گئی۔ یہاں بھی کیکر سنگھ نے غلام کو ایسا ہی پیچ ڈالا تو وہ گھبرا کر زور زور سے چلّانے لگا۔

کیکر سنگھ ایک کسان تھا اور کھیتی باڑی ہی اُس کا ذریعۂ معاش تھا۔ اس لئے اکھاڑے میں بھی اس کا برتاؤ نہایت اُکھڑا اور بے رحمانہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کی ہاتھی جیسی قوّت کے سامنے اچھے اچھے تجربہ کار پہلوان بھی ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے۔ اُس کی قوّت کے بارے میں ایک قصّہ مشہور ہے۔ ایک بار جموں میں کشتیوں کا ایک بڑا دنگل ہونے والا تھا۔ کیکر سنگھ بھی کشمیر دربار کا مہمان بن کر آیا ہوا تھا۔ ان دنوں مہاراجہ نے دباؤ ڈالنے والی بجلی کی ایک مشین یورپ سے منگوائی تھی اُس وقت مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے کسی رشتہ دار کو گٹھیا کی بیماری تھی۔ اس مشین میں دو طرح کی نلکیاں تھیں جن کے ذریعے بجلی کے کرنٹ کو بہا کر دبا دیا جاتا تھا۔ ان نلکیوں کو درد کی جگہ پر گھمانے سے مریض کو آرام ہو جاتا تھا۔ لیکن تندرست آدمی کے لئے اُن کا چھُو جانا بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ اُسے چھوتے ہی جھٹکے کے ساتھ انسان دُور جا گرتا تھا۔ اس موقعے پر مہاراجہ نے آئے ہوئے پہلوانوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کی ترکیب سوچ لی۔ صبح سویرے تمام پہلوانوں کو بُلایا گیا اور ایک ایک کو بجلی کی دو نلکیاں ہاتھ میں پکڑنے کو کہا گیا۔ نلکی ہاتھ میں لینے پر بجلی کا کرنٹ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن اُس کا جھٹکا لگتے ہی ہاتھ کو جھاڑتا ہوا ہر ایک پہلوان دور بھاگ جاتا تھا۔ جب کیکر سنگھ کا نمبر آیا تو تمام کی یہی امید تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح پیچھے ہٹ جائے گا، لیکن کیکر سنگھ نے دونوں نلکیاں اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیں اور برقی قوت کا سامنا کرنے کے لئے وہ چھاتی ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ برقی کرنٹ چلتے ہی اس کے ماتھے پر پسینے کی موٹی موٹی بوندیں اُبھر آئیں۔ آنکھیں لال ہو کر باہر کو نکلنے لگیں۔ لیکن کیکر سنگھ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کی اتنی زبردست قوت دیکھ کر مہاراجہ کو اچنبھا ہوا اور انھوں نے فوراً ایک ہزار روپے انعام کے طور پر دے دیئے۔

کیکر سنگھ ہندوستان کا واحد پہلوان تھا جو کسی بھی کشتی میں گرا نہیں تھا۔

رستمِ زماں گاماں اور رستمِ ہند امام بخش

مرت کمار رستر نام کے ایک رئیس نے ۱۹۱۰ء کی گرمیوں کے موسم میں ہندوستانی پہلوانوں کا ایک دستہ برٹن بھیجا۔ اس میں گاما، امام بخش، احمد بخش جیسے بڑے بڑے اور مشہور پہلوان تھے۔ بھارت سے انگلینڈ جانے والی یہ دوسری پارٹی تھی۔ پہلی پارٹی میں پہلوان بھوتا سنگھ اور گنگا سنگھ تھے، جو وہاں سے آگے اور سارے یورپین ممالک میں کشتیاں لڑتے اور اپنی فتوحات کا پرچم لہراتے واپس ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ ہندوستانی پہلوانوں کی ٹیم کے منیجر بینجمن کو ان ہندوستانی پہلوانوں کے ساتھ کشتیاں جمانے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاما کی کشتی امریکہ کے اُس وقت کے چیمپین "رولر" کے ساتھ ہونی قرار پائی۔ یہ کشتی ہندوستانی فنِ کشتی کے بجائے امریکن فری سٹائل سے ہوئی۔ پانچ منٹ کے اندر ہی رولر کو گاما نے زمین پر لٹا دیا۔ دوبارہ کشتی ہونے پر پھر سے سات منٹ میں اور تیسری بار تو صرف تین منٹ کے اندر رولر کو زمین دیکھنی پڑی۔

ہندوستانی پہلوانوں کے دنگل کو دیکھ کر لندن کے تمام لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور ہر گلی کوچے میں ان کی تعریف کے گیت گائے جانے لگے۔ مگر وہاں کے بہت سے لوگوں میں حسد کا مادہ جاگ اُٹھا اور کسی بھی طرح ہندوستانی پہلوانوں کو نیچا دکھانے کے منصوبے تیار کئے جانے لگے۔ چنانچہ فوراً ہی مقابلے کے لئے یورپ کے رستم جان لوم کو تیار کر کے امام بخش کے خلاف لڑنے کے لئے لایا گیا۔ لیکن امام بخش نے بارہ منٹ کے اندر ہی اُسے دو بار چت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مغربی ممالک کے پہلوان مشرقی ممالک کے پہلوانوں کے مقابلے میں ابھی کافی پیچھے ہیں۔

جان لوم کی شکست کے بعد تو لندن کے عوام بھی جل بھُن گئے۔ کسی بھی قیمت پر ہندوستانی پہلوانوں کو شکست دینے کے لئے انھوں نے انگلینڈ کے تمام پہلوانوں کو پھر مدعو کیا۔ روس کا مشہور پہلوان ہیکن سمد ہندوستانی پہلوانوں کی غیر معمولی قوت دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اسے ہمت ہی نہیں ہو سکی کہ وہ بھی ٹکر لے۔ بڑے بڑے امراء و وزراء بھی اُس کی خوشامد کرنے سے پیچھے نہیں رہے۔ مگر وہ کسی بھی قیمت پر ہندوستانی پہلوانوں سے زور آزمائی پر آمادہ نہیں ہوا۔ آخر میں عوام اور اخباروں کی تنقیدوں اور فقرے بازی

سے بچنے کے لئے وہ سوئیٹزرلینڈ نکل بھاگا۔

ہیکن سمد کے بھاگتے ہی اُس وقت کے تیسرے نمبر کے پہلوان سٹینش لاس زبسکو کو کھڑا کر کے ہندوستانی پہلوانوں کو نیچا دکھانے کی اسکیم تیار کی گئی۔ زبسکو کو خاص طور پر وہاں بلایا گیا تھا۔ اُس کے آتے ہی مشہور سکاٹش پہلوان اپولو کی ہدایات کے بموجب کشتی کی خاص تیاری کرائی گئی۔

زبسکو اور گاما کی یہ مشہور کشتی لندن کے ہال بوزن ایمپائر شفیلڈ میں کرائی گئی۔ اس کشتی کو دیکھنے کے لئے اتنی بڑی بھیڑ اکٹھی ہوئی کہ آس پاس کے تمام راستے بھر گئے تھے۔ کشتی شروع ہوتے ہی گاما نے ایسا حملہ کیا کہ زبسکو لڑکھڑاتا ہوا زمین پر لیٹ گیا اور گاما اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اس کشتی کے بعد زبسکو نے ایک اخباری نمائندے کے سامنے صاف صاف قبول کر لیا کہ "گاما کا سامنا کرنے کی مجھے ہمّت ہی نہیں ہوئی۔ میں اگر کھڑا رہنے کی کوشش بھی کرتا تو گاما مجھے کھلونے کی طرح زمین پر ٹپک دیتا۔" اُس دن لگ بھگ دو گھنٹے تک کشتی ہوتی رہی اور پورے دو گھنٹے تک گاما ہی زبسکو کی پیٹھ پر سوار رہا۔

زبسکو کی ہندوستان میں آمد

مگر اس ہار کے کچھ سال بعد زبسکو کو کیا سُوجھی کہ وہ خود ہندوستان چلا آیا۔ اٹھارہ سال پہلے اپنی شکست کے بدنما داغ کو مٹانے کی غرض سے وہ اتنا لمبا چوڑا سفر طے کر کے آیا تھا۔ گاما کو چاروں شانے چت کرنا ہی اس کا مقصد تھا۔ اٹھارہ سال کے اس لمبے عرصے میں وہ عروج کی ایک ایک سیڑھی چڑھ کر رستم زماں بننے کے قریب آپہونچا تھا۔ اُس نے گاما کو کشتی کے لئے للکارا اور گاما نے اُس کا چیلنج بخوشی منظور کر لیا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں کے لوگ بہت بڑی تعداد میں پٹیالہ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کشتیوں کا مرکز پٹیالہ بنا ہوا تھا۔ ۲۸ جنوری ۱۹۲۸ء کو کشتی کا دن مقرر ہوا۔ دونوں اطراف سے اُردو، ہندی اور انگریزی زبان میں اشتہارات چھاپے گئے کہ جو اس کشتی کو جیتے گا وہی رستم زماں مانا جائے گا۔

ہزاروں شائقینِ تماشا جن میں راجے مہاراجے، بڑے بڑے ملکی اور غیر ملکی افسران اور پہلوان وغیرہ تھے، کے سامنے مقررہ وقت پر کشتی شروع ہوئی۔ دونوں شہ زور پہلوان جب اکھاڑے میں اُترے تو ہزاروں آنکھیں اس بڑی کشتی کو دیکھنے کے لئے ان دونوں پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر کشتی شروع ہوئی اور پورا ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ گاما نے زبسکو کو چاروں شانے چت گرا دیا اور اس طرح گاما ایک بار پھر رستم زماں تسلیم کر لیا گیا۔

زبسکو کی شکست کے بعد کسی بھی غیر ملکی پہلوان نے گاما سے لڑنے کی جرأت نہیں کی۔ امام بخش نے بھی اسی طرح یورپ کے بلند قامت اور شہ زور پہلوانوں کو یکے بعد دیگرے کئی شکستیں دیں اور وہ بھی ایک دن رستم زماں جونیر بن گیا۔ گاما کے بعد رستم زماں کا خطاب امام بخش کو ہی دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسکاٹش مشہور پہلوان "اپولو" بھی ہندوستان آیا۔ یہ وہ انسان تھا جس نے گاما کے خلاف لڑنے کے لئے زبسکو کو تیار کرنے میں حصّہ لیا تھا۔ بھارت کے اپنے اس دورے میں اپولو اپنے جسمانی کرتبوں اور طاقت کی نمائش کرتا رہا۔ اس کا اصلی نام تو ولیم بینکر تھا لیکن جسمانی ساخت اور خوبصورتی میں بہت اچھا ہونے کی وجہ سے اُس کا نام "اپولو" پڑ گیا تھا۔

وہ اپنے ساتھ آٹھ من کی آٹے کی بوری رکھا کرتا تھا۔ اُسے وہ اکیلا اُٹھا لیتا تھا۔ اور اپنی پیٹھ پہ لاد کر سٹیڈیم میں بڑے غرور کے ساتھ چکر کاٹا کرتا تھا۔ اُس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی اس بوری کو میری طرح اُٹھا کر پیٹھ پر رکھے گا اُسے پانچسو روپے انعام دیا جائے گا۔ انگلینڈ میں کوئی بھی یہ کام نہ کر سکا۔ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ بھارت میں بھی یہ کام کوئی نہیں کر سکے گا۔ وہ جب جب بھی بوجھ اُٹھانے کی نمائش کرتا تب تب کئی طاقتور لوگ اُس بوری کو اُٹھانے کی کوشش کرتے لیکن اُس بوری کو اُٹھانا طاقت کے ساتھ ساتھ چالاکی کا بھی کام تھا۔

ایک بار جب الہ آباد میں اُس کی نمائش ہو رہی تھی تو ایک مضبوط فوجی جوان وہاں آنکلا۔ اُس نے آٹے کی اس بوری کو پیٹھ پر اُٹھا لینے کی چالاکی کو تاڑ لیا اور اپولو کے چیلنج کو منظور کر لیا۔ اُس نے وہ بوری زمین پر رکھ دی، اور خود لیٹ کر اس کا ایک کونہ پکڑ لیا۔ پھر دھیرے دھیرے بوری کو اُٹھانے کے ساتھ ساتھ خود بھی کہنی اور گھٹنوں کے سہارے زمین سے اوپر آدھا جُھک گیا اور اُس نے اپولو سے پانچسو روپے جیت لئے۔

سویڈن کا پہلوان پیٹرسن

پیٹرسن نام کا ایک سویڈن پہلوان گاما کو للکار کر ایک بار بھارت آیا تھا۔ پیٹرسن ایک معمولی پہلوان ہوتے ہوئے بھی "فاتحوں کا فاتح" کہلانا مناسب سمجھتا تھا۔ پیٹرسن جیتے یا ہارے اُسے پچیس ہزار روپے دینے کا

اعلان مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی طرف سے کر دیا۔

پٹیالہ میں جب سامنا ہوا اُس وقت پیٹرسن اپنے سارے جسم کو ویسلین سے چکنا کرکے اکھاڑے میں آیا۔ اکھاڑے میں اُترنے کے بعد بھی ایک پوری ویسلین کی شیشی اُس نے اپنے جسم پر اُنڈیل لی۔ اس طرح کی حرکت کشتی کے میدان میں خلاف قاعدہ ہے مگر گاما نے پھر بھی اعتراض نہیں کیا۔ کشتی شروع ہوئی۔ گاما نے سویڈن پہلوان کو کئی بار پیچ میں پھنسانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا جسم ویسلین سے چپ چپا ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی گاما اسے پکڑتا تبھی وہ چکناہٹ کی وجہ سے پھسل جاتا۔ آخرکار تنگ آکر گاما نے ایک ترکیب سوچی۔ اکھاڑے سے ایک مٹھی مٹی اٹھاکر پیٹرسن کے پاؤں پر پھینک دی۔ مٹی اُس کے گھٹنے پر ویسلین کی وجہ سے خوب اچھی طرح جا چپکی، خواہ چاہے انگلی کی جگہ کیوں نہ ہو۔ گاما کے لئے یہی بہت کچھ تھا۔ اُس نے وہیں سے پکڑ کر ایک لمحہ میں اُسے ایسا پٹکا کہ وہ پیٹھ کے بل زور سے زمین پر جا گرا۔ پیٹرسن کے چت ہوتے ہی بڑے زور سے چیختا چلاتا اور بپھرتا ہوا گاما اس کی چھاتی پر اپنے دونوں گھٹنے ٹیک کر جا بیٹھا۔ گاما نے اپنی قوت کا مظاہرہ اس شکل میں پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

پیٹرسن جب اپنے ملک کو روانہ ہوا تو اُس کے پاس کافی دولت تھی۔ وہ دولت مند کیوں نہ ہوتا جبکہ گاما سے مار کھانے پر بھی اُسے پچیس ہزار کی کثیر رقم بطور انعام دی گئی تھی۔

پروفیسر رام مورتی نائیڈو

پروفیسر رام مورتی بھیم سین کے نام سے تمام بھارت میں مشہور تھے۔ ان کے عجیب و غریب جسمانی کرتبوں کو دیکھ کر تمام دنیا سخت حیران تھی۔ آپ صوبہ مدراس کے شہر وجے نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ۱۹۱۲ء میں پورے یوروپ کا دورہ کیا، اور جہاں جہاں گئے وہاں وہاں کی جنتا آپ کے فنِ کشتی اور جسمانی کھیلوں کو دیکھ کر سخت حیرانی میں پڑ گئی۔ دو موٹروں کو ایک ساتھ روکنا، ہاتھی کو چھاتی پر چڑھانا۔ لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں کو توڑنا، پندرہ بیس من کے پتھروں کو سینے پر رکھ کر تڑوانا وغیرہ وغیرہ تمام کام آپ کے لئے معمولی سی بات تھی۔

آپ نے تمام یورپ کے پہلوانوں کو لڑنے کے لئے للکارا لیکن آپ سے بھڑنے کی جرأت کسی میں نہیں ہوئی۔ ہاں سوئٹزرلینڈ کے دو پہلوانوں نے آپ سے لڑنے کی جرأت تو ضرور کی لیکن وہ دونوں ہی آپ کے چیلوں سے شکست کھا گئے۔ خود سینڈو کو بھی آپ نے لڑنے کے لئے للکارا تھا لیکن سینڈو نے آپ کا چیلنج قبول نہیں کیا۔

یورپ کے کچھ علاقوں میں ایک بہت خوفناک اور خونخوار کھیل کھیلا جاتا تھا۔ ایک مہیب سانڈ کو اکھاڑے میں پاگل بنا کر لایا جاتا تھا۔ ایک گھوڑ سوار ننگی تلوار لئے اس پر ٹوٹ پڑتا تھا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ پروفیسر رام مورتی کو یہ کھیل دیکھ کر بہت دلی اور روحانی ٹھیس پہونچی، اور انھوں نے تمام تماشائیوں سے کہا کہ اگر کوئی حقیقتاً بہادر ہے تو سانڈ کو بغیر ہتھیار کے قابو کرکے دکھائے۔ لیکن اتنی جرأت کس میں تھی۔ تب پروفیسر رام مورتی نے کہا کہ اگر آپ لوگ اس کھیل کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کا وعدہ کریں تو میں سانڈ کو دیکھتے دیکھتے قابو میں کر لوں گا۔ لیکن ان کی بات کسی نے بھی نہیں سنی اور وحشیانہ کھیل بدستور جاری رہا۔

پروفیسر رام مورتی کے چیلوں اور شاگردوں نے یورپ میں جہاں جہاں کشتیاں لڑیں اپنے استاد کا نام ہمیشہ ہی اونچا رکھا۔ اور ہندوستان کا شاندار وقار بنائے رکھا۔ پروفیسر رام مورتی حقیقتاً طاقت کا پہاڑ تھے۔

اس کے علاوہ احمد بخش کالی، گوبر پرشاد، حمیدہ پہلوان، رستمِ ہند گونگا پہلوان، بجلی پہلوان۔ رحمان پہلوان۔ محمود پہلوان، دلاور پہلوان، دلبر پہلوان، کریم پہلوان۔ سمپورن سنگھ پہلوان، پاندہ پہلوان، شیخ پہلوان، تارا سنگھ پہلوان۔ تاراچند پہلوان، مان سنگھ پہلوان وغیرہ بھی کچھ ایسے نامور پہلوان تھے جنھوں نے بیرونی ممالک میں جاکر اپنی قوت اور فن کا سکہ جمایا اور اپنے حریفوں کو ہمیشہ نیچا دکھایا۔ احمد بخش کالی کو پنڈت موتی لال نہرو انگلینڈ لے گئے تھے۔ وہاں احمد بخش نے فرانس کے نہایت طاقتور پہلوان ماریس ڈریاچ کو پہلی بار کچھ ہی سیکنڈوں میں، اور دوسری بار ایک ہی منٹ میں چت کر دیا۔ ماریس ڈریاچ اُس زمانہ میں فرانس، انگلینڈ، بلجیم، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ناروے اور ڈنمارک کا چمپین تھا۔ کچھ ہندوستانی پہلوان جن کا چیلنج یورپ میں کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس امید سے امریکہ گئے کہ وہاں دنیا کے بلند قامت اور شہ زور پہلوان فرینک گول سے لڑیں گے، لیکن اتنا مشہور اور لڑاکا چمپین فرینک گول اُن سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکا، کیوں کہ ایک بار مان سنگھ پہلوان نے پیرس میں اُس سے کشتی لڑنے

وقت، اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر اکھاڑے سے باہر ہوا میں دس فٹ اونچا پھینک دیا تھا۔

روس کا پہلوان ہیکن سمد

آج سے ستر سال پہلے پیٹرو گراڈ سے تھوڑی دور معمولی سے ایک گاؤں میں ہیکن سمد کا جنم ہوا تھا۔ اُس کے کئی بہن بھائی تھے۔ بچپن میں اُس کے بارے میں کسی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ آگے چل کر وہ ایک مشہور و معروف پہلوان ہوگا۔ کیونکہ اس کا جنم ایک بہت ہی معمولی کسان کے گھر ہوا تھا، اور روس میں اُن دنوں کسانوں میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ اپنے گھریلو جھنجھٹوں سے گلوخلاصی پانے کے علاوہ وہ بیرونی دنیا اور دیگر اشغالِ زندگی کے بارے میں سوچ سکیں۔ پیٹرو گراڈ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہاں بھیجا گیا۔ وہاں اسکول میں ہی اُس کو پہلوانی کا شوق ہوا۔ اپنی زندگی کے بارے میں ہیکن سمد نے خود ہی بڑے پُرلطف اور دلکش ڈھنگ سے روشنی ڈالی ہے۔

اُس نے لکھا ہے کہ جب میں انیس ۱۹ سال کا تھا تب بھی کافی توانا اور طاقتور تھا۔ ایک بار پیٹرس برگ کے ایک متموّل ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے گھر پر آ کر اپنی طاقت کا امتحان دوں۔ میں وہاں گیا۔ پہلے مجھے کھانے پینے کی چیزیں دی گئیں اور اس کے بعد تھوڑی سی شراب بھی پیش کی گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ اس لئے مجھے فوراً نشہ ہو گیا۔ بعد میں مجھے بوجھ اُٹھانے کو کہا گیا اور میں نے دنیا میں بوجھ اُٹھانے کے تین ریکارڈ یکے بعد دیگرے توڑ دئے۔ پہلے دن میں نے سات سَو اسّی پونڈ وزن اٹھایا تقریباً ساڑھے آٹھ سو پونڈ وزن اُٹھا کر دنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔

کچھ دنوں بعد یورپ کے چیمپین پہلوان "پال پونس" وہاں پہونچے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جو شخص اُنھیں دنگل میں شکست دے گا اُنھیں وہ ایک ہزار فرانک انعام دیں گے۔ میں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا۔ لیکن انھوں نے خود مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ میں پہلوان نہیں ہوں اس لئے مجھے لڑنا نہیں چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں اُن سے لڑوں گا تو میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ ان کی اس دھمکی نے مجھے اندر ہی اندر پاگل بنا دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے صلاح لے کر اُن کو پھر مقابلے پر آنے کا چیلنج دیا۔ لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی۔ پال پونس کو میں نے چھیالیس منٹ کی لڑائی میں نیچے گرا دیا۔ اسی طرح ماسکو، ولین اور ویانا کے دنگلوں میں بھی میں نے اُنھیں پھر شکست دی، اور مجھے رستمِ یورپ کا خطاب دے دیا گیا۔

ہیکن سمد کا وزن دو سو چھیالیس پونڈ تھا۔ وہ پانچ فٹ چھ انچ لمبا تھا۔ اُس کی چھاتی سانس لینے پر چوّن ۵۴ انچ کی ہو جاتی تھی۔ اُس کی گردن کی موٹائی بائیس ۲۲ انچ تھی اور کمر کی موٹائی تینتیس ۳۳ انچ تھی۔ آج سے چالیس سال پہلے وہ دنیا کا سب سے بڑا پہلوان مانا جاتا تھا۔ سانس لے کر وہ اپنی چھاتی بارہ انچ پھیلا لیا کرتا تھا جب کہ عام طور پر بڑے بڑے پہلوان چار یا چھ انچ سے زیادہ چھاتی کا پھیلاؤ نہیں کر سکتے ہیں۔ ترکی کے غیر معمولی پہلوان نور اللہ کو شکست دے کر ہیکن سمد تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔ نور اللہ ہلی الدعلی نام کے ایک ترکی پہلوان کا شاگرد تھا۔ اس لئے نور اللہ کے بعد اس نے ہلی الدعلی سے لڑنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہلی الدعلی کا وزن تین سو پچاس پونڈ تھا، اور وہ چھ فٹ قد کا دیو نما انسان تھا۔ لوگوں نے ہیکن سمد کو ہدایت دی کہ ہلی الدعلی سے لڑنے کا ارادہ چھوڑ دے۔ لیکن ہیکن سمد اپنی ضد پر قائم رہا اور ایک گھنٹے کی لڑائی میں اُس نے ہلی الدعلی کو بھی پچھاڑ دیا۔

ترکی کے سلطان کو جب اس کی خبر ملی تو انھوں نے ہیکن سمد کو احمد علی نام کے ایک درباری پہلوان سے لڑنے کو کہا۔ احمد علی کا وزن ساڑھے چار سو پونڈ تھا۔ لڑائی کے وقت احمد علی نے ہیکن سمد کی ناک میں انگلی گھسیڑ دی جس سے اس کی ناک میں سے خون بہنے لگا۔ غصّے میں آ کر ہیکن سمد نے احمد علی کی کمر پکڑ لی اُسے اوپر اُٹھایا اور گردن کے بل اس طرح زمین پر پٹک دیا کہ فوراً اس کی جان نکل گئی۔

ترکی کے ایک اور مشہور پہلوان "نام جیکیش" کو بھی شکست دے کر اُس سے اُس کا سونے کا گرز ہیکن سمد نے چھین لیا۔

ہیکن سمد کو ہندوستانی پہلوانوں کے ساتھ زور آزمائی کے لئے کئی بار لکھا گیا لیکن وہ یورپ میں کشتیوں کے لڑنے میں اتنا مصروف تھا کہ ہندوستان آنے کا اُسے موقع ہی نہیں ملا۔

مگر ۱۹۱۰ء میں برلن میں جب بین الاقوامی کشتیاں ہو رہی تھیں اور ہندوستان سے رستمِ پنجاب بھوتا سنگھ، شیرِ پنجاب گنگا سنگھ، رستمِ ہند امام بخش اور رستمِ زماں گاما پہونچے، اور وہاں کے تمام غیر ملکی پہلوانوں کو گراتے چلے گئے۔ چیمپین رولر، رستمِ یورپ جان لوم جیسے شہ زور پہلوان لڑھک گئے

تو ہیکن سمد جو اس وقت دوسرے نمبر کا جرمنی پہلوان تھا - اسے امام بخش اور گاما سے لڑنے کو کہا گیا مگر اتنا جرمنی پہلوان ہمت ہار کر انگلینڈ سے سوئیٹزرلینڈ بھاگ گیا تاکہ بدنامی نہ ہو -

دنیا کا ہیبت ناک پہلوان کنگ کانگ

پچھلے سال بمبئی کے ولبھ بھائی پٹیل اسٹیڈیم میں دنیا کے مشہور پہلوانوں کا دنگل بہت بڑی دلچسپی کا باعث بنا رہا - ملک ملک کے پہلوانوں نے اس میں حصہ لیا - چھ فٹ لمبے دیو نما کنگ کانگ کی طرف لوگ حیرت سے دیکھتے تھے - چار من اڑتیس سیر کا یہ دیو نما انسان دیکھنے کے قابل تھا - کنگ کانگ سے اونچے اور بھاری بھرکم کئی پہلوان دنیا میں موجود ہیں - سویڈن کا اینجل پہلوان سوا چھ فٹ اونچا اور چھ من تیس سیر وزنی ہے سنگاپور کا ایک جرمن پہلوان کا جسم تو طاقت کا پہاڑ ہے - وہ سات فٹ اونچا اور نو من بھاری ہے - اس کا نام گار گنٹو آن ہے - لیکن ان دونوں کے مقابلے میں کنگ کانگ کشتی کے فن میں زیادہ تجربہ کار اور ماہر ہے - اور دنیا کا ایک بہت بڑا مشہور پہلوان مانا جاتا ہے -

کنگ کانگ کا اصلی نام ایمل سیا ہے - وہ ہنگری کا رہنے والا بیالیس سال کی عمر کا شخص ہے - ہندوستان کے تواریخی اور مشہور پہلوان بھیم سین کی طرح وہ بھی بڑا پیٹو پہلوان ہے - مہابھارت میں منوں کھانا کھا جانے والے بھیم سین کو اس کی زبردست بھوک کی وجہ سے پیٹو ہی کہا جاتا تھا - کنگ کانگ کی خوراک بھی اس کے جسم کی طرح لمبی چوڑی ہوتی ہے - وہ بڑھیا اور بہت سا کھانا کھانا پسند کرتا ہے - ناشتے میں چھتیس کچے انڈوں کو ایک بڑے مرتبان میں ڈال کر اور نمک مرچ لگا کر وہ غٹا غٹ پی جاتا ہے - دوپہر کے کھانے میں چھ پرندے ایک پاؤ مکھن، آدھا پاؤ کچا پیاز اور ایک پاؤ لال ولائتی مولی، آدھ سیر ٹماٹر، ڈیڑھ درجن کیلے، ایک درجن سنگترے - آدھا سیر اناناس اور آدھ سیر ڈبل روٹیاں یا سینڈوچ وہ کھا جاتا ہے - تیسرے پہر دو سیر تازہ پھلوں کا رس یا دودھ پینا اسے پسند ہے - اور رات کے کھانے میں دو مرغیاں، ساگ سبزیاں اور ایک ٹوکرا پھل اسے دئے جاتے ہیں - دوپہر اور رات کے کھانے کے بیچ میں روزانہ ایک گیلن تازہ دودھ بھی وہ پی جاتا ہے - کچے انڈے، کچی ترکاریاں اور نیم کچے پھل کھانے سے اس کا جسم "اتنا مضبوط ہے" وہ ایسا بڑے غرور سے کہتا ہے - اتنا کھا کر وہ کبھی بیمار نہیں ہوا - وہ کہتا ہے کہ آج تک اُسے زکام تک نہیں ہوا - اس کی وجہ اس کی اچھی خوراک اور ورزش ہے جو مقررہ وقت پر وہ روزانہ کرتا ہے -

اگرچہ وہ بیمار کبھی نہیں ہوا تو بھی اس کی زندگی کے چار قیمتی سال ہسپتال میں گزرے ہیں - کشتی میں لگی ہوئی چوٹوں کی وجہ سے برابر اسے ہسپتال میں پناہ لینا پڑی ہے - اس کی داہنی ٹانگ تین بار ٹوٹ چکی ہے اور بائیں ٹانگ دوبارہ - اس کی ناک، دانت اور پسلیاں بھی ٹوٹ چکی ہیں - جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ بچا ہوگا جو ٹوٹا نہ ہو - کنگ کانگ نے آج تک شادی نہیں کی - کیونکہ وہ شادی شدہ پہلوانوں کی حالت زار دیکھ چکا ہے اور گرہستی کی گاڑی کھینچتے ہوئے وہ پہلوانی نہیں کرنا چاہتا ہے - جوانی کے ایام سے ہی وہ عورتوں کی سوسائٹی سے نفرت یا پرہیز کرتا آرہا ہے اور آج تک کبھی کسی لڑکی کے چنگل میں نہیں پھنسا - وہ کہتا ہے ان ننھی منی لڑکیوں کو جب میں تندرست اور لمبے چوڑے مردوں سے پریم اور مذاق کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد غصہ آتا ہے - حقیقت میں مرد خواہ کتنا ہی مضبوط اور تندرست کیوں نہ ہو اور کیسی بھی شخصیت کا مالک ہو عورت اس کی نکیل اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا پسند کرتی ہے - نہ بابا مجھے نہیں چاہئے ایسی تندرستی اور صنفِ نازک کی دوستی - میں الگ تھلگ ہی بھلا" اسی لئے وہ آج تک اکیلا ہے -

اپنی پہلوانی کی "گولڈن جوبلی" منا کر وہ اکھاڑے سے کنارہ کشی کر لینا چاہتا ہے -

وہ کہتا ہے "جب میں اکھاڑے میں اترتا ہوں تو دو باتوں کا دھیان رکھتا ہوں - ایک تو یہ کہ میں ہر حالت میں جیتوں اور دوسری یہ کہ میری کشتی سے عوام کی زیادہ سے زیادہ تفریح ہو - اور ان کے ٹکٹوں کے پیسے ضائع نہ ہوں - اسی لئے کبھی کبھی تو میں اپنے حریف کو بیس بیس منٹ تک لڑنے دیتا ہوں - اگرچہ میں اسے دو منٹ میں ہی پٹک سکتا ہوں - کنگ کانگ کی یہ خوبی اس کی "نمائشی پہلوانی" کے فن کا نمونہ ہے - بچپن میں وہ بڑا بدتمیز چھوکرا تھا - وہ ایسا تنک مزاج تھا کہ نو دس برس کی عمر میں ذرا ذرا سی بات پر اپنے سے دُگنے لڑکوں سے بھِڑ جاتا تھا - کنگ کانگ کے باپ نے اس کی "لڑاکا ذہنیت" سے چھٹکارا پانے کے لئے اسے ایک ورزش گاہ میں داخل کرا دیا - جس سے وہ کوٹ پیٹ کر وہاں سیدھا ہو جائے - لیکن سیدھا ہونے

کے بجائے وہ ایک بہت بڑا پہلوان بن گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے یورپ کے "مڈل ویٹ چیمپین" کو دو منٹ میں اُٹھا کر پٹک دیا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی نام ایمل سیا سے ہی مشہور تھا اور اسی نام کو لے کر اس نے پورے یورپ کا فاتحانہ دورہ کیا تھا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ مصر کی راجدھانی قاہرہ میں ایک دن شام کے وقت مشہور و مقبول امریکن فلم "کنگ کانگ" دیکھنے گیا۔ افریقہ کے اس بڑے خوفناک بن مانس کو ہوائی جہازوں کو اکھاڑ پچھاڑ کرتے دیکھ کر نوجوان ایمل سیا حیرت زدہ رہ گیا۔ رات بھر سوچتے رہنے کے بعد اس نے اپنا نام کنگ کانگ رکھنا پکا کر لیا۔ کنگ کانگ جیسی بھیانک شکل بنانے کے لیے اس نے داڑھی بھی رکھی۔ چھ مہینے تک داڑھی بڑھانے کے لیے اس نے گوشہ نشینی کی اور کوئی کشتی نہیں لڑی۔ داڑھی بڑھانے بڑھانے اس نے اتنا لمبا کر دیا کہ وہ بزرگ نما معلوم ہونے لگی۔ لیکن کشتی کے وقت حریف پہلوان کے ہاتھ میں آ کر وہ اس کی شکست کا باعث بھی بنی۔ کبھی کبھی جب مخالف پہلوان کا سر اس کے سر سے ٹکرا جاتا تو داڑھی اس کی آنکھیں ڈھانپ لیتی۔ آخر کار اس نے تنگ آ کر داڑھی کٹا کر چھوٹی کر لینے کا پکا ارادہ کر لیا اور شہد کی مکھی کے چھتّے کی طرح اس کی موجودہ فرنچ کٹ خس خسی داڑھی اس پرانی داڑھی کی یاد کا ایک چھوٹا سا لشان یا ثبوت ہے۔ چھوٹی ہونے پر بھی وہ کبھی کبھی اب بھی مخالف پہلوان سے پکڑی جانے پر اس کے غصے کی وجہ بن جاتی ہے۔ کنگ کانگ کے اس دن کے نازیبا سلوک سے عوام بہت مشتعل ہوئے جب اس نے بمبئی میں ریفری رشید کو بھی اکھاڑے کے باہر پھینک دیا تھا۔

کنگ کانگ نے بہت سی کشتیاں جیتی ہیں مگر وہ ہمیشہ حمیدہ پہلوان سے دبتا رہا ہے۔ حمیدہ پہلوان پانچ منٹ کے اندر ہی اسے چت کر دیا کرتا تھا۔ ویسے وہ 'اینجل' دارا سنگھ' 'ٹائیگر جوگندر سنگھ' ہربنس سنگھ' بھولو پہلوان سے بھی شکست کھا چکا ہے۔

دو غزلیں

محمد منشاء الرحمٰن خاں

شکوۂ جورِ یار کون کرے — عشق کو بے وقار کون کرے
اضطراب اصل زندگی ہے تو پھر — دل کو وقفِ قرار کون کرے
جو ہیں خود آپ کی عطائے خاص — اُن غموں کا شمار کون کرے
جب محبّت ہی زندگی ٹھہری — فکرِ انجام کار کون کرے
چاک دامن کو آج ہی کر لوں — انتظارِ بہار کون کرے

دل کو دے کر فریبِ عیش و نشاط
رُوح کو سوگوار کون کرے

چندر پرکاش شاد

دیوانہ فرطِ غم میں یہ کیا سوچتا ہے آج — ہر ذرّہ کائنات کا چونکا ہوا ہے آج
کچھ راہ سُوجھتی نہیں کیا ہو گیا ہے آج — شاید مری نظر سے دُھواں اُٹھ رہا ہے آج
پھر جائزہ لیا ہے کچھ اپنی حیات کا — پھر مجھ کو میرے حال نے تڑپا دیا ہے آج
کچھ آسرا تو دو کہ مرا جی نہ ڈوب جائے — مجھ سے مرا خیال اُلجھنے لگا ہے آج
تو تھا نہ ترا خیال تھا یا تھا مرا وجود! — کیا کیا مری نگاہ کو دھوکا ہوا ہے آج
ہنگامۂ جہاں سے گریزاں تھا دل مگر — تنہائیوں سے اور بھی گھبرا گیا ہے آج
پہلے کبھی کہا نہ گیا تھا زباں سے — جو کچھ مری خموش نظر نے کہا ہے آج

سری کنٹھ کول

راج ترنگنی

ہندوؤں کی سلسلہ وار تاریخ اس وقت دستیاب نہیں ہے جیسے کہ دوسری اقوام کی ہے۔ اس کمی کے بہت سے وجوہ بتلائے جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پراچین ہندو بوجہ نادیہٗ عقبائی دنیاداری کی باتوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے اور اس باب میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ یونانی اور ہندو دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا فانی ہے۔ یونانی اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے ملک کی بہبود کے لئے اس فانی زندگی کو نثار کر دیں۔ لیکن اس کے برعکس ہندو اس دنیا میں بطور ایک اجنبی کے رہ کر عقبےٰ کی فکر میں لگے رہتے اسی وجہ سے فلسفہ، دھرم شاستر وغیرہ مضامین پر تو بے شمار کتابیں ملتی ہیں مگر تاریخ نایاب ہے۔ یہ بات ایک بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن سولہ آنے درست نہیں۔ کیونکہ ہندوؤں نے اپنا ریکارڈ چھوڑا ہے جو سنسکرت کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ ہندو بطور مضمون کے تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ پران، رامائن، مہابھارت اور دیگر ہزاروں سنسکرت کی کتابوں میں زمانہ وسطیٰ کی یادداشت قلمبند کر گئے ہیں۔

ہندوستان کے زمانہ وسطیٰ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کشمیر مدت دراز تک سنسکرت علوم کا ایک مرکز رہا ہے۔ یہاں کے آچاریوں میں تاریخی ادراک پہلے سے تھا۔ آچاریہ ابھنوگپت، کلہن، کھمندر وغیرہ کی تصانیف مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان آچاریوں نے گو اپنے وقت کے واقعات قلمبند نہیں کئے ہیں مگر اپنی زندگی کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تصانیف سے کشمیر کے زمانہ وسطیٰ کی تہذیب و تمدن پر بہت سا مواد ملتا ہے۔ یہاں تک کہ کشمیر میں مناظروں اور مشاعروں پر کس قسم کے مجالس آراستہ کئے جاتے تھے۔ اس مضمون پر منکھ کے شری کنٹھ چرت میں ایک باب ہی الگ ہے جو نہ صرف کشمیریوں کی زندگی کی ایک جھلک دکھاتا ہے بلکہ سنسکرت زبان میں بھی ایک بے نظیر شاہکار ہے۔

راج ترنگنی یا ”بادشاہوں کا دریا“ نظم میں لکھی گئی آٹھ ترنگوں یعنی ابواب پر مشتمل کشمیر کے حکمرانوں کی ایک سرگزشت ہے جسے کلہن نے ۱۱۴۸ء میں لکھنا شروع کیا اور سنہ ۱۱۵۰ء میں دو برس بعد ختم کر لیا۔ کلہن پنڈت کی راج ترنگنی نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں بطور ماخذ تاریخ ہند مشہور ہے۔ سنسکرت کے وسیع لٹریچر میں راج ترنگنی ایک ایسا نسخہ ہے جس کے جوڑ کی دوسری کتاب نہیں ملتی۔

کلہن پہلا مصنف نہیں ہے جس نے کشمیر کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے یوں تو اس سے پہلے کئی عالموں نے کچھ نہ کچھ ریکارڈ چھوڑا تھا مگر وہ اس وقت دستیاب نہیں۔ راج ترنگنی کی تمہید میں کلہن نے خود لکھا ہے کہ تاریخ سے تعلق رکھنے والی گیارہ کتابوں اور نیل مت پران سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی تصنیف سُوورت کی ہے جو کلہن کے مطابق بہت کٹھن ہے اور تاریخی واقعات خوش اسلوبی سے پیش نہیں کرتی۔ دوسری تصنیف کھمندر کی نرپاولی یعنی ”فہرست راجگان“ جو ایک شاعر کی تصنیف ہوتے پر بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔ کیونکہ کھمندر دراصل ہجو لکھنے والا ہے اور ہجو کا تاریخ میں دخل نہیں۔ ایسا ہوتے پر بھی کھمندر کی دیگر تصانیف کشمیر کی سماجی زندگی پہ کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ کشمیر کے حکمرانوں میں سے باون حکمرانوں کا تذکرہ فراموش ہو چکا تھا ان میں سے چند ایک کے کوائف کلہن نے مختلف کتابوں سے لئے ہیں۔ نیل مت پران سے چار راجاؤں کا ذکر لیا ہے۔ ایک اور مصنف پدم مہر نے اپنی کتاب میں اشوک سے پہلے کے آٹھ راجاؤں کی کیفیت اخذ کی تھی۔ راجاؤں کا ذکر کلہن نے پدم مہر سے لیا ہے۔ اشوک اور اس کے بعد کے پانچ بادشاہوں کا ذکر شولاکر کی کتاب سے لیا ہے۔ کلہن کے مطابق ان مصنفوں نے ہم عصر بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے۔

کلہن نے آثار قدیمہ کے تحقیقات کرنے والوں کی طرح مندروں کے کتبے، وقف کے تانبے کے تختے، سکے، بادشاہوں پر لکھے مدح آمیز کلام، قدیم روایات

اور دیگر کتابوں سے سہارا لے کر بھول چوک کا سدھار کیا ہے۔ اور سب سے بڑی صفت جو تاریخ دان کے لئے اشد ضروری ہے وہ ہے مصنف کا بے لوث ہونا۔ کلہن اس بارے میں خود لکھتا ہے کہ اسی تاریخ دان کا بیان قابلِ تعریف ہے جو ایک منصف کی طرح بغیر کسی طرفداری اور تعصب کے واقعات کو بیان کرے۔

راج ترنگنی کے آٹھ ابواب کے مضامین حسب ذیل ہیں :-

نام باب	خاندان
اوّل	۱۔ گونندا اوّل سے ابھمنیو اوّل تک
	۲۔ گونند سوم سے یدھشٹر اوّل تک
دوم	پرتاپ آدتیہ اوّل سے سندھیمت آریہ راج تک
سوم	میگھ واہن سے بال آدتیہ تک
چہارم	کارکوٹ خاندان
	درلبھ وردن سے اُتپلا پیڑ تک
پنجم	اُتپل خاندان
	اونتی ورمن ۸۵۵ء سے سُور ورمن ۹۳۹ء تک
ششم	یشسکر ۹۳۹ء دیدا ۱۰۰۳ء تک
ہفتم	لوہر خاندان
	سنگرام راج ۱۰۰۳ء سے ہرش ۱۰۸۹ء تک
ہشتم	اُچل ۱۱۰۱ء سے جے سنگھ ۱۱۲۸ء تک

راج ترنگنی میں کلہن نے کشمیر کا اتہاس مہابھارت کے بعد سے شروع کر کے اپنے وقت تک قلمبند کیا ہے۔ اوائل کے ابواب کے اندراج افسانہ آمیز ہونے کی وجہ سے تاریخ کے دائرے میں نہیں آسکتے۔ ان میں کتنا حصہ تاریخی ہے اور کتنا افسانہ آمیز۔ یہ ایک مضمون ہے جو تحقیق طلب ہے۔ اس ضمن کو آرکیالوجی اور کسی حد تک قدیم سنسکرت لٹریچر صاف کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ پہلے تین ابواب کی واقعہ نگاری مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کی اصلی تاریخ کہیں بھی درج نہیں۔ چوتھے باب کے شلوک نمبر ۷۰۳ سے تاریخیں ملتی ہیں اور پانچویں باب سے جہاں اُتپل خاندان کے واقعات کا اندراج ہے کلہن نے ہر حکمران کی حکومت کی تاریخ ابتدا اور خاتمہ دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ سال، مہینہ اور دن تک دکھائے ہیں۔ تاریخ بتانے کے لئے سپت رشی سمت جو سن عیسوی سے تین ہزار چھہتر برس پہلے شروع ہوتا ہے، استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سٹین کے قول کے مطابق کلہن کی بتائی ہوئی تاریخیں قابلِ اعتبار ہیں۔

کلہن کی راج ترنگنی یورپ کی سرگزشتوں کے ڈھانچے کی ہے۔ اس میں اکثر راجاؤں کی زندگی کے حالات ملتے ہیں۔ ان کے شادی بیاہ، ارکان دولت کی سازشیں، جنگ و جدل، بادشاہوں کا بے دردی سے قتل، فوجی حالات، جاگیرشاہی، بادشاہوں کی تعمیرات، باہر کے ممالک پر حملے وغیرہ وغیرہ۔

آج کل کی تحقیقات کے مطابق تاریخ کے نام کی حق دار وہی تصنیف ہو سکتی ہے جو عام جنتا کے حالات کا جائزہ لے اور صرف حکمرانوں کے حالات کو بیان ہی نہ کرے۔ راج ترنگنی میں کشمیر کے سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسان کس طرح جاگیرشاہی سے پِسا جاتا ہے۔ راجپوت، برہمن، کالیستھ، عدالتوں کے عملے، فوجی افسر اور دیگر امراء کس طرح سے کسانوں کا خون چوستے ہیں۔ جو بھی شخص حکمرانِ وقت کی ذرا بھی خدمت انجام دیتا اس کو سرکار کی طرف سے جاگیر ملتی۔ مندروں سے وابستہ پروہت پرشید یعنی پروہتوں کی مجلس کو بلا ادائی خراج بڑے بڑے قطعہ زمین ملتے تھے۔ اگر کسی راجے نے برہمنوں کی زمین چھین لی یا بٹائی میں تھوڑی لی تو یہ پروہتوں کی مجلسیں اودھم مچا دیتیں اور ملک میں جتنے بھی حکمرانِ وقت کے حریف ہوتے وہ ان کے ساتھ مل کر امن و امان کو برباد کرتے۔

آج کل کے چند مؤرخوں نے پرانے کشمیریوں اور مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن راج ترنگنی میں بیان کردہ پروہتوں کی بھوک ہڑتال اور مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کا کسی پہلو سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پروہتوں کی بھوک ہڑتال اکثر خودغرضی کی وجہ سے ہوتی تھی اور اس کے برعکس گاندھی جی قومی مفاد یا صداقت کے لئے بھوک ہڑتال کیا کرتے تھے۔ کلہن نے ان پیشہ ور بھوک ہڑتالیوں کی بڑی مذمت کی ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ جب خراسان سے ڈلچ نے کشمیر پر ترکی فوج لے کر دھاوا بول دیا۔ اُس وقت کے راجہ سہہ دیو نے سبھی کشمیریوں پر حملہ آور سے بچنے کے لئے ٹیکس لگا دیا۔ لیکن ایسے آڑے وقت میں بھی برہمنوں نے بوجہ اونچی ذات کے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا اور بھوک ہڑتال پر آمادہ ہو گئے۔ راجا ملک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دشمن ملک میں وارد تھا اور سارے ملک کو تہ و بالا کر کے، انھیں برہمنوں کو غلام بنا کر ایشیا کے دوسرے ملکوں میں گھوڑوں کے

بدلے میں بیچ دیا۔

کلہن کی راج ترنگنی سے ہمیں نہ صرف کشمیریوں کی اقتصادی اور سیاسی واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کی سماجی زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ چھوت چھات کی بیماری زیادہ پائی نہیں جاتی ہے کیونکہ شیومت میں چاروں ورن یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر شامل ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بدھ مت کی وجہ سے ہو لیکن یہ دستور عالمگیر نہیں۔ کشمیر کے ایک منطقی جینت کی ایک بودھ سے مذہبی معاملات پر بحث ہوئی تھی اور بودھ نے بحث کے دوران میں کہا تھا کہ برہمن چھوت چھات کے قائل ہیں۔ اس کا جواب جینت نے اس طرح دیا تھا کہ اگر تم چھوت چھات نہیں مانتے ہو تو پھر شودروں کے ساتھ کھاتے پیتے کیوں نہیں ہو۔ اس سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ کہنا کہ بودھوں میں چھوت چھات نہیں تھی ٹھیک نہیں۔ عقیدے کی بات ایک ہے اور عمل کی دوسری۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذاہب پیدا ہوئے ہیں چھوت چھات کسی نہ کسی طرح سے ان کا ایک بنیادی اصول رہا ہے۔ کلہن نے ذات پات توڑ کر شادی بیاہ اور شودروں کے مندروں میں داخل ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اکثر اچھا سلوک ہوتا تھا۔ امیر لوگ اور راجے مہاراجے ایک سے زیادہ بیاہ کرتے تھے۔ پردے کا رواج نہیں تھا۔ بیوہ عورتوں کا دوسری بار شادی کرنا سوسائٹی میں برا مانا جاتا تھا۔ کھمندر نے اس بارے میں لکھا ہے کہ بیوہ عورتوں کی ٹولیاں ایک تیرتھ سے دوسرے تیرتھ پر اپنے خاوندوں کو پانی دینے کے لئے آوارہ پھرتی ہیں۔ ستی کی رسم زوروں پر تھی۔ راج ترنگنی سے ایسی مثالیں چھانٹی جا سکتی ہیں کہ بیواؤں کے رشتہ دار اُن کی جائیداد ہضم کرنے کے لئے عورتوں کو ستی ہونے پر مجبور کرتے تھے۔ ستی اپنی مرضی سے بھی ہوتی تھی جیسے رانی سوریہ متی راجا اننت کے بعد ستی ہوئی۔ یہ رسم سہہ بھٹ المعروف سیف الدین نے سکندر بت شکن اور علی شاہ کے وقت میں بند کرائی تھی۔ لیکن ہندو اپنی بیوی کو دوسری دنیا میں ساتھ لے جانا چاہتے تھے اس لئے اس رسم کے بند کرنے کو مذہب میں دخل اندازی سمجھنے لگے۔ اسی وجہ سے سلطان زین العابدین اس معاملے میں غیر جانبدار رہے اور ستی کی رسم پھر سے چل پڑی۔

راج ترنگنی میں کشمیریوں کے مذہبی عقیدوں پر بھی جا بجا نوٹ ملتے ہیں۔ ہر سوسائٹی میں مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہوش مندوں کا اور دوسرا بے خبروں کا۔ اس بارے میں البیرونی نے بھی اپنی مشہور کتاب "الہند" میں نوٹ لکھا ہے کہ ہر ہندو بُت پرست نہیں ہے۔ لیکن کلہن کے وقت میں اور اس کے بعد کے زمانے میں کشمیری جنتا کا مذہب شیومت کے اونچے اصولوں سے گر کر روایات پرستی اور جادوگری پر آپہنچا تھا۔ کلہن نے خود لکھا ہے کہ نئی نئی کتابیں تنتر کے نام سے روزانہ مشتہر کی جاتی ہیں۔ شیومت کے ماننے والوں اور تانترکوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ کسی ایک بات پر یہ لوگ متفق نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحدت کے علمبردار آچاریہ ابھینو گپت جیسے عالموں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ غالباً اسی وجہ سے کشمیر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا گیا۔ کلہن نے بطور تاریخ دان کے اہلِ کشمیر کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

اس کے علاوہ کشمیری قوم کی روایات، برہمنوں کا کٹرپن اور تیاگ راجپوتوں کے ڈھنگ، بادشاہوں کی بزدلی اور سنگدلی۔ عورتوں کی بے وفائی نیک و بدرانیاں، ارکان دولت کی سازشیں اور وفاداری، سرکاری اہلکاروں کا جبر و ظلم، خوراک کے مسئلے، خانہ جنگی، شاہی خاندانوں کا گرنا اور بننا، برہمنوں اور راجپوتوں کا باہمی جھگڑا وغیرہ وغیرہ زندگی کے ہر پہلو پر مفصل بیانات اس بیش بہا نسخے میں ملتے ہیں۔ آٹھواں باب تاریخی اہمیت کی وجہ سے خاص درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس باب میں بیان کردہ واقعات کلہن نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ کلہن کی راج ترنگنی کشمیر کے تہذیب و تمدّن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے لئے بھی اس میں سے مواد لیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کے مآخذ میں شمار ہوتی ہے۔

راج ترنگنی نہ صرف بادشاہوں کی ایک سرگزشت ہے بلکہ یہ ایک شاعر کا کلام بھی ہے۔ مصنّف کے شاعرانہ اندازِ بیان کی چھاپ جگہ جگہ ملتی ہے، سنسکرت کے النکار شاستر یعنی علم بلاغت میں ماہر ہونے کی وجہ سے طرزِ تحریر میں آراستگی آئی ہے۔ اس کی زبان نہ را ماین مہابھارت کی طرح سلیس ہے اور نہ بعد کے نیشدھ چرت وغیرہ کی طرح کٹھن۔ استعارہ اور تشبیہ سے جگہ جگہ کلام لبریز ہے جس سے کلہن کے اشلوک مقالوں کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ دُنیا کی ناپائداری اور مقدّر کی ناموافقت پر اشارہ جگہ جگہ ملتے ہیں۔ ساری نظم

ہیں کلہن نے شانت رس ہی کو سمویا ہے۔ اصطلاحی الفاظ کے استعمال ہونے سے کہیں کہیں معنی ٹھیک طور پر سمجھ میں نہیں آتے۔

مسلمانوں کے تسلط کے زمانے میں بھی راج ترنگنی کی اہمیت تسلیم کر لی گئی تھی۔ سب سے پہلے ترجمہ سلطان زین العابدین کے فرمان سے فارسی زبان میں ہوا تھا۔ اکبر اعظم نے بھی عبدالقادر بدایونی کے ذریعے سے کرایا تھا۔ ابوالفضل نے بھی آئینِ اکبری میں راج ترنگنی کے کچھ حصے کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں حیدر ملک نے راج ترنگنی کا خلاصہ نکالا۔ انگریزوں کے زمانے میں سب سے پہلے مسٹر ٹرویر نے فرانسیسی زبان میں اور اس کے بعد جوگیش چندر دت نے انگریزی میں مکمل ترجمہ شائع کیا۔ سٹینس کا انگریزی ترجمہ بوجہ تحقیقاتی نوٹوں کے اعلےٰ پیمانے کا ہے۔ اس کے بعد آر، ایس پنڈت کا انگریزی ترجمہ ہے جس میں تحقیقاتی مسئلوں پر زیادہ زور نہ دے کر مصنف کے کلام کو ہو بہو انگریزی زبان میں لانے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ترجمہ لفظی ہوا ہے۔ بہت دیر ہوئی راج ترنگنی کا اردو ترجمہ ٹھاکر چند نے شائع کیا تھا جو اس وقت بازار میں نایاب ہے۔ کچھ برس پہلے اس کا ترجمہ مراٹھی زبان میں بھی ہوا ہے۔

کلہن کی زندگی کے حالات سے ہم آج کل آگاہ نہیں۔ مگر راج ترنگنی اور اتفاقی شہادت سے اس کی شخصیت کے بارے میں تھوڑا بہت جانا جا سکتا ہے۔ راج ترنگنی کے اندرونی تذکرے سے ہم جانتے ہیں کہ کلہن کے والد کا نام چنپک تھا جو کشمیر کے حکمرانوں کا وزیر اور راجہ ہرش کے وقت میں دوارپتی یعنی دروں کے محافظ کے عہدے پر مامور تھا۔ کلہن للتہ آدتیہ کے بسائے ہوئے نگر پرہاس پور میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ آج کل پرس پور کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ کے کھنڈرات بوسیدہ حالت میں ہونے پر بھی تعمیر کنندہ کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ کلہن ذات سے برہمن اور عقیدے سے شیومت کا پیرو تھا۔ یہ بات راج ترنگنی کے ہر باب کے پہلے اشلوک سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہاں اس نے شو کو اردھ ناریشور کے روپ میں تعظیم ادا کی ہے۔ لیکن کلہن کٹر شیو نہ تھا اس لئے راج ترنگنی میں بدھ مت کو جگہ جگہ ادب سے یاد کیا ہے۔ اس سے مصنف کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ کلہن کی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق گرائمر، انشا پردازی، دھرم شاستر، جوتش، النکار وغیرہ مضامین میں ہوئی ہے۔ کلہن کا مطالعہ بھی وسیع ہے جیسا کہ راج ترنگنی میں رامائن، مہابھارت، پرانوں اور دیگر کتب کے حوالہ جات دئے گئے ہیں۔ کلہن نے سنسکرت کے پرانے شاعروں کی رچنائیں وکرمانکھ دیو چرت، رگھوونش وغیرہ اور بان بھٹ کے ہرش چرت کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے۔ کھمندر کی نرپاولی اور دوسری تاریخی کتابوں سے اس نے کتنا مواد لیا ہے اس باب میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ کتابیں آج کل دستیاب نہیں۔ اتفاقی شہادت میں منکھ کا شری کنٹھ چرت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب میں منکھ نے ایک ایسی مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں کشمیر کے بڑے بڑے عالم اکٹھے ہوئے تھے اور منظم شری کنٹھ چرت پیش کی گئی تھی۔ اس باب میں اس وقت کے کئی شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں ایک شخص کلیان نام سے پکارا گیا ہے اور اس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کہانی لکھنے میں بڑا ماہر ہے۔ علم اللسان کے ذریعے سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کلیان ہی کلہن ہے۔

کلہن کی تصانیف میں سے آج کل صرف راج ترنگنی ملتی ہے مگر رس کنٹھ کے سار سموچے سے پتہ چلتا ہے کہ کلہن نے جے سنگھ ابھیودے نام کی ایک اور کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا ایک شلوک ولبھ دیو کی سبھاشت آولی کے تمہید میں ایڈیٹر نے درج کیا ہے۔

وزیر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے کلہن کی اقتصادی حالت اچھی رہی ہوگی جس کی وجہ سے کلہن سارے کشمیر کی سیاحت کر سکا جیسا کہ راج ترنگنی میں بیان کردہ ندیوں، پہاڑوں اور دیگر مقامات کے ناموں سے کشمیر کی جغرافیائی حالات کی واقفیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

کلہن کے خاندان کا تعلق راجہ ہرش کے ساتھ رہا ہے۔ جس کا قتل اُچل اور سُسل کی بغاوت کی وجہ سے ہوا۔ کلہن کا والد چنپک راجہ ہرش کا ایک وفادار وزیر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے کلہن کسی بڑے سرکاری عہدے پر مامور نہیں ہو سکا۔ کلہن کی اولاد نے سفارتخانوں میں کام کرنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

(مترجم ہیرالال چوپڑہ)

موعظۂ حسنہ

(ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر علی اصغر حکمت سفیر ایران برائے ہند کی وہ تقریر
جو اُنھوں نے جموں کشمیر یونیورسٹی کے چھٹے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر کی

میں جموں کشمیر یونی ورسٹی کا ممنون ہوں کہ مجھے آپ کے سامنے آج تقریر کا موقع ملا۔

کشمیر ہمیشہ علم و حرفت کا ایک اہم مرکز رہا ہے، اور یہ عین واجب ہے کہ یہاں ایسی یونی ورسٹی کا قیام ہو جہاں پُرانے علوم کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے کے فنون کی بھی تعلیم دی جائے۔ یہاں کی یونی ورسٹی ایسی ہو جو مطالعہ اور تحقیق کا مرکز ہو۔

کشمیر کے مشہور اہل علم کے فلسفیانہ اور ادبی شاہکار نیز مستعد فن کاروں کی صنعت کے نمونے ہم کو بطور وراثت عطا کئے گئے ہیں اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن اساتذۂ کرام کا تتبع کریں۔ اُن کی حیات انگریزی شاعر لانگ فیلو کے قول کے مطابق ایسا نشان ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو اعلیٰ و ارفع بنا سکتے ہیں۔

کشمیر نے دنیا کو اخلاق و حکایات کی ایک بلند ترین کتاب "پنچ تنتر" دی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ ایک ایرانی حکیم برزوی اس خوبصورت خطۂ زمین میں ایک ایسی جڑی بوٹی کی تلاش میں محو تھا جس سے انسان کو حیاتِ دوام عطا ہوتی ہے تو اس کے عوض اُسے عقل و ہدایت سے لبریز یہ کتاب مل گئی جو نیم مُردوں کے لئے آبِ حیات تھی۔

اس کتاب کا نام پہلوی زبان میں "ہند نامہ کلیلک و دمنک" ہے اور اسی کا بعد میں عربی زبان میں ترجمہ کرکے اس کا نام "کتاب کلیلہ و دمنہ" رکھا گیا۔ عربی سے یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ کی گئی اور ازاں بعد دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل ہوئی۔ خوش قسمتی سے وہ کتاب اب بھی ہمارے پاس ہے اور دنیا کے ادب میں ایک اہم جگہ رکھتی ہے۔

یہ بھی عین مناسب ہوگا اگر کشمیر یونی ورسٹی اپنی عمارت کے پانچ دروازے رکھے اور یہ دروازے پنچ تنتر کے پانچ ابواب کے نام سے منسوب ہوں یعنی فلسفہ، ادب، قانون، طب اور فنون لطیفہ۔

ہزاروں سال سے ایران اور کشمیر کے خیالات میں ہم آہنگی اور تمدن میں یکسانیت پائی جاتی ہے جو وسطی اور مغربی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے دونوں خوبصورت ملکوں کے باشندے جہاں رفیع و منیع پہاڑوں سے نکلنے والے چشموں سے اپنی تشنگی فرو کرتے ہیں وہاں ادبی اور ثقافتی چشموں کے آبِ حیات سے بھی مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

آج جب کہ ہم مغربی ایشیا میں ایک بہت بڑے ثقافتی انقلاب کے آستانے پر کھڑے ہوئے ہیں تو ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم فکر و تدبر کے روایتی لین دین کو برقرار رکھیں۔ ہم ایک دوسرے کے سماجی اور تاریخی تجربوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ فارسی کے شاعرِ اعظم سعدی نے ہم کو ایک عالمگیر اصول دیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے ؎

نرود مُرغ سوئے دانہ فراز — چوں دگر مرغ بیند اندر بند
پند گیر از مصائبِ دگراں — تا نگیرند دیگراں ز تو پند

(پرندہ دانے کے سامنے نہیں جاتا جب دوسرے پرندے کو وہ قید میں دیکھتا ہے۔ دوسروں کی مصیبت سے نصیحت حاصل کرنا کہ دوسرے تجھ سے نصیحت حاصل نہ کریں)

مغربی ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح ہم بھی ایران میں تمدن کے انقلاب کی نئی روش میں سے گزر رہے ہیں، تاکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ ہم بھی ایسے ہی حالات میں ہیں اور یہ غیر واجب نہ ہوگا اگر ہمارے

کشمیری بھائی ایران کے سماجی انقلاب کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس دل فریب وادی میں چنار کا درخت پہلے پہل ایران سے ہی لایا گیا تھا اور وہ آج اس کی فطری خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہے۔ چنار اپنی نقل مکانی سے ہم کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ اِس دور میں بھی ہم ایک ملک کے سماجی تجربوں کو دوسرے ملک میں آسانی سے رائج کر سکتے ہیں، اور کشمیر اور ایران دونوں میں ایسی بہت سی مشترک مثالیں موجود ہیں، اور آج میں تھوڑی سی مشترک خصوصیتوں پر ہی اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔

آج سے ایک صدی پیشتر مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم صرف مغربی یورپ کے چند ملکوں میں رائج تھی۔ کچھ سال ہوئے ایران نے بھی سات سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دے دی ہے۔ کوئی تیس سال ہوئے ایران کے اکثر شہروں میں لڑکیوں کے بہت کم اسکول تھے، اور ابتدائی درجوں میں مخلوط تعلیم مفقود تھی۔ لیکن ایران میں تعلیم کے میدان میں جو انقلاب رو پذیر ہوا ہے اس کی وجہ سے کئی نئے پرائمری سکول جاری ہو گئے ہیں۔ آج ملک کے دور افتادہ گوشے میں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی اسکول ہے، جہاں لڑکے اور لڑکیاں علیحدہ یا مخلوط تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ پرائمری تک تعلیم مفت ہے، اور دیگر درجوں میں کافی سستی ہے۔

اس لئے یہ دیکھکر مجھے ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ کشمیر میں ابتدائی ثانوی اور یونیورسٹی یعنی ہر سہ درجوں کی تعلیم مفت ہے۔ کشمیر سرکار کا یہ قدم بذاتِ خود اُس کی اشاعتِ تعلیم کی سرگرمی کا بیّن ثبوت ہے۔

جس نکتے کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حرف پر نہیں بلکہ روح پر زور دینا چاہیئے۔ سکولوں کی تعداد پر نہیں بلکہ اُن کی افادیت پر زور دیا جائے۔ نصاب اس ڈھنگ سے مقرر کئے جائیں کہ طلبا اُس سے کردار اور خود اعتمادی کی تشکیل کر سکیں۔ ہمارے اسکول اور یونیورسٹیاں عمل اور ارادے والے ایسے انسان پیدا کریں جو اپنی شخصیت میں راست بازی، خلوص اور پرہیزگاری کو دولت، مرتبہ اور ظاہری نمود و نمائش پر ترجیح دیں۔

کشمیر جیسے ملک میں جہاں قدرت کی نعمتیں فراواں ہیں اور لوگوں میں صنعت و حرفت اور دستکاری کا شوق عام ہے وہاں نصاب بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں، جن سے زراعت، باغبانی اور سلک پروری کو فروغ حاصل ہو اور دوسری طرف دستکاریوں پر زیادہ توجہ مبذول ہو۔ سائنس کی تھیوریوں (نظریوں) کی تعلیم کی بجائے عملی فنون سے بچّوں کو واقف کیا جائے۔ تاکہ وہ مفید شہری بن سکیں۔ عوام کو تعلیم کی نسبت تربیت کی زیادہ ضرورت ہے۔ انسانی ہمدردی رحم اور دیگر نیک خصائل یعنی سچائی، حیا، پاک بازی، سخاوت اور دادودہش کا اُن میں پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہمدردی کے اصول کا ملک کے ہر مرد اور عورت کو جاننا لازمی ہے۔

اکثر مشرقی ممالک کی طرح ایران میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی مدارج میں ان بنیادی اصولوں کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر نوجوان مرد اور عورتیں تعلیمی درسگاہوں سے نکل کر سست اور غبی ہونے کے علاوہ متزلزل مزاج اور بزدل ہوتے ہیں۔ اُن کی تمام بہادری اور شجاعت ملازمتوں کے لئے تگ و دو تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ملازمت کے لئے سرکار کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہی تو آج کل کے سکولوں کے نصاب کی بدترین کمزوری ہے جس کی طرف ماہرین تعلیم نے توجہ دلائی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں تعلیم اس بُرائی سے پاک اور منزّہ رہے گی۔

زبان کا مسئلہ ریاست کے تعلیمی مسائل میں بہت اہم ہے۔ ریاست کا ہر بچّہ چار زبانوں کے سیکھنے پر مجبور ہے۔ مادری زبان، اُردو، ہندی اور انگریزی کا اُس کے لئے جاننا ضروری ہے، تاکہ وہ موجودہ آرٹ اور سائنس کی تعلیم سے مزیّن ہو سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ مادری زبان کے علاوہ دیگر تین زبانوں میں مہارت ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درجوں میں طلبا پر کافی بوجھ ہے۔ اس مسئلہ کو تعلیمی بورڈ اور ماہرین تعلیم کو حل کرنا چاہیئے۔ ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیئے کہ طلبا صرف وہی زبانیں سیکھیں، جیسا کہ ایران، ٹرکی اور دیگر عرب ملکوں میں ہے۔ اس انتظام کے بغیر وہ فالتو زبانوں کے سیکھنے میں قیمتی وقت خواہ مخواہ رائگاں جاتا ہے جس سے موجودہ سائنس اور تمدّن کی تعلیم میں رکاوٹ پڑتی ہے۔

وقت کی اہمیت پر کچھ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس پر میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں، یہاں جہاں قدرت کی نعمتوں کی فراوانی ہے۔ کچھ لوگ ابھی تک وقت کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر لمحہ ایک قیمتی دولت ہے جس سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں ؎

بے فائدہ ہر کہ عمر در باخت   چیزے نہ خرید و زر بینداخت

(جس نے اپنی زندگی کو بے فائدہ گذار دیا اُس نے کوئی چیز خریدے بغیر ہی اپنا زر پھینک دیا)

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ وقت دولت ہے۔ لیکن آپ کی گزیٹڈ اور غیر گزیٹڈ تعطیلات غیر ضروری طور پر بہت زیادہ ہیں۔ اتوار کے علاوہ سال میں آپ کی تعطیلات کی تعداد دچوّن ہے۔ اِن دنوں میں سرکاری دفاتر، مارکیٹ، بنک، سکول اور دیگر ادارے بند رہتے ہیں۔ ہم کو انسانی طاقت کا اِن چھٹیوں کی وجہ سے ضائع ہو جانے پر غور کرنا چاہیئے۔ سماج کی اقتصادی زندگی کو اس تضییع اوقات کی وجہ سے کتنا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ کچھ سال ہوئے ایران میں ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ لیکن تجربے نے سکھایا کہ سال میں صرف چودہ یا پندرہ چھٹیاں عید۔ و محرم کے علاوہ ہونی چاہئیں۔ اس طرح سماجی زندگی میں کافی بچت ہوگئی۔

تعلیم کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اُس انقلاب کا بھی ذکر ضروری ہے جو مغربی ایشیا کے ممالک میں عورت کے مقام کے تعین کے بارے میں ہوا۔ کوئی نصف صدی پیشتر دیگر مُسلم ممالک کی طرح ایران میں بھی عورتیں پردہ کرتی تھیں اور سماج کا یہ نصف عنصر بالکل بیکار تھا۔ جب سے پردہ ختم ہوگیا ہے عورتیں غلامی سے نجات پاکر اپنے ملکوں میں مردوں کے برابر مقام پاسکی ہیں۔ انھوں نے جان لیا ہے کہ خدائے متعال نے حصولِ علم و معاش اور زندگی کے دیگر مسائل میں عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیا ہے پیغمبرِ اسلام نے بھی اس طرح فرمایا ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ (علم کی تلاش ہر مرد اور عورت پر فرض قرار دی گئی ہے) ایران کی عورتوں نے جان لیا ہے کہ پردے سے مراد عورت کی قید یا گوشہ نشینی نہیں ہے۔ نہ ہی اس انسانیت کے نصف جسم کو مُردہ بنانا مقصود ہے۔ پردے کا مقصد صرف عفت عصمت، حیا، اتقا اور دل کی صفائی جیسے اوصافِ حمیدہ کا اختیار کرنا ہے۔ مشرقی ممالک میں اِس احساس نے کئی نسوانی تحریکوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لڑکیاں آج اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں وہ صرف اچھی مائیں ہی ثابت نہ ہوں گی بلکہ اچھی اُستانیاں، کامیاب ڈاکٹر اور ہمدرد نرسیں بنیں گی۔ اور ان میں اکثر ایسی ہوں گی جو ملک کی خدمت میں امتیاز حاصل کریں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ کشمیر کے مسلمان ہمارے اس تجربے سے سبق حاصل کریں گے اور عورتوں کی فلاح کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

دوسرا اہم مسئلہ جو مغربی ایشیا کے تمام ممالک میں اور کشمیر کی سماجی زندگی میں بھی قابلِ غور ہے وہ صفائی اور صحتِ عامّہ کا ہے۔ دین کے آئین و فرائض کبھی صفائی کے بنیادی اصول تھے۔ لیکن آج صفائی طبی اصولوں کے سہارے پر کھڑی ہے۔ اگر زمانۂ قدیم میں وضو اور غسل ضروری فرض قرار دیئے گئے تھے، کیونکہ دین کا حکم تھا اَلنّظافتہ من الایمان (یعنی صفائی ایمان کا جزو ہے) تو آج سائنس ہمیں تلقین کرتی ہے کہ جسم کو صاف اور ضرر رساں کیڑوں سے مبرّا پانی سے دھونا صحت کے لئے بے حد مفید ہے۔ اکثر مغربی ایشیائی ممالک میں خشک لق و دق ریگ زار اور صحرا ہیں اور پانی کی سخت قلّت ہے۔ اور جہاں کے شہروں اور دیہات کے لئے آب رسانی ایک خاص مسئلہ ہے وہاں غسل کے نہ کرنے کا بہانہ چل سکتا ہے۔ لیکن کتنا افسوسناک اور ساتھ ہی حیرتناک بھی ہے کہ کشمیر کا ملاح یا کاشتکار جو دن رات پانی ہی میں رہتا ہے وضو یا غسل کرنے سے قاصر ہے۔ اگر وہ اس فرض سے کوتاہی کرتا ہے تو گویا دین کے ایک حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔

سائنس کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اُس نے ملیریا، اسہال، تپِ محرقہ تپِ دق یا ہیضہ جیسی بیماریوں اور وباؤں کے انسداد کے آسان وسائل مہیا کر دیئے ہیں۔ ہمارے طبیب اُن بیماریوں کے معالجہ سے اچھی طرح واقف ہیں، لیکن صحتِ عامہ کا یہ عالم گیر اصول ہے کہ "پرہیز علاج سے بہتر ہے" ہمیشہ قائم ہے۔ انفرادی اور مجموعی طور پر مرد، عورت، جوان، بوڑھا ہم میں سے ہر ایک کو اُس چیز سے پرہیز اور احتیاط لازم ہے جس سے بیماری کے پیدا ہونے کے امکانات ہوں۔

مغربی ایشیا کے اکثر دیہاتی صفائی کی نعمت سے بے بہرہ ہیں صفائی کے نہ ہونے سے مردم شماری کے اعداد کے مطابق اموات کے متعلق تشویش کُن حالات رونما ہوتے ہیں۔ اب مچھروں کے مارنے اور مکھیوں سے بچاؤ کی تجویزیں گورنمنٹیں عوام کے سامنے رکھتی ہیں جس سے عوام بھی عادی ہوتے جارہے ہیں کہ صاف پانی پئیں اور وہ سادہ اور صحت بخش غذائیں کھائیں جو اچھی سبزیوں سے تیار کی گئی ہوں۔ اس سے امراض اور وباؤں کے پھیلنے کے امکانات بہت کم ہوگئے ہیں۔

جس دَور میں سے ہم جارہے ہیں وہ روشنی اور اخوّت کا دَور ہے۔

بالکل اُسی طرح جس طرح کائنات کے ذرّے اپنی چمک آفتاب سے مستعار لیتے ہیں، علم کی روشنی سے بھی ہر ایک انسان کو منوّر ہونا چاہیئے۔ تمام بنی نوع انسان بلا امتیاز رنگ، نسب، نسل اور جنس خدا کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والے ہیں۔ اگر اُن کو کوئی چیز ممیز کرنے والی ہے تو وہ اُن کی خوبی اور خوش اخلاقی ہے۔ کیونکہ خداوند کریم کی نگاہوں میں وہی سب سے زیادہ معزز ہے جو پاکباز ہے۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُم)

تعصب اور تفرقہ زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اِس لئے ہم کو اُن سے باز رہنا چاہیئے۔ ہم کو واجب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے میل جول سے رہیں جیسے باغ میں ایک ہی مالی کے لگائے ہوئے مختلف پیڑ رہتے ہیں۔

صلح پسند مشترکہ زندگی کے پانچ سُنہری اصول (پنچ شیل) جو ہندوستان کے مایۂ ناز وزیر اعظم نے وضع کئے ہیں صرف سماجی گروہوں، قوموں اور ملکوں کی ہی بہبود کا موجب نہ ہوں گے بلکہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ نجی زندگی میں بھی مسرّت اور اطمینان کا باعث ہو سکتے ہیں کشمیر کی وادی ایک ایسے گھر کی طرح ہے جس کے گرد پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔ یہاں کی زمین اس کی ماں ہے جو اپنے سپوتوں کو محبت اور شفقت سے پالتی ہے۔

وقت آ گیا ہے جب اِس خاندان کے سب افراد بہنوں اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اور نسلی اور مذہبی امتیازات کو بھلا کر اُن کو صلح اور خوش حالی میں رہنا چاہیئے اور یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سنواریں گے تو خدا بھی اُن کو کامیابی عطا کرے گا۔

پیشتر اِس سے کہ میں اِس مقدّس مجلس سے رخصت ہوں، چاہتا ہوں کہ قرآن کی ایک فاضلانہ نصیحت پر ختم کروں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

دو تہذیبوں کا میل

بھارت اور ایران

زندگی اور ثقافت

بھارت کی زندگی اور ثقافت پر اثر انداز ہونے والے بہت سے لوگوں اور قوموں میں سب سے زیادہ قدیم اور مسلسل تعلقات ایرانیوں کے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات انڈو آرین تہذیب کے آغاز سے بھی قبل کے ہیں۔ نسلی رشتے کے علاوہ اُن کے قدیم مذاہب اور زبانوں کا پس منظر بھی مشترکہ ہے۔ ویدک دھرم اور پارسی مذہب میں بہت حد تک اشتراک موجود تھا۔ ویدوں کی سنسکرت اور قدیم پہلوی بولی یعنی "اوستا" کی زبان ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ کلاسیکی سنسکرت اور فارسی نے الگ الگ نشو و نما پائی ہے لیکن ان کے بہت سے مصادر ایک ہی ہیں، جیسے دیگر تمام آرین زبانوں کے کئی مصدر مشترکہ ہیں۔ دونوں زبانیں اور ان سے بڑھ کر دونوں ملکوں کے فنون اور ثقافت اپنے اپنے ماحول سے اثر پذیر ہوئے۔

ہندوستان کی مانند ایران کی ثقافتی بنیادیں بہت مضبوط اور مستحکم تھیں اور وہ حملہ آوروں کو بھی متأثر کرتے اور ان کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عربوں نے ساتویں صدی عیسوی میں ایران کو فتح کر لیا تھا، لیکن وہ بہت جلد ہی ایران کا اثر قبول کر گئے، اور انھوں نے اپنے سادہ صحرائی طریق و اطوار کو چھوڑ کر ایران کی پُرتکلف ثقافت اختیار کر لی۔ یورپ میں فرانسیسی زبان کی طرح فارسی بھی بہت جلد ایشیا کے وسیع خطوں میں مہذب لوگوں کی زبان بن گئی تھی۔ ایرانی فنون اور ثقافت پچھم میں قسطنطنیہ سے لے کر صحرائے گوبی کے کنارے تک پھیل گئی تھی۔

بھارت پر ایرانی اثرات مسلسل جاری رہے بلکہ افغان اور مغلوں کے عہدِ حکومت میں فارسی اس ملک کی درباری زبان تھی، اور انگریزی دورِ حکومت کے آغاز تک فارسی ہی سرکاری اور عدالتی زبان رہی۔ ہندوستان کی تمام جدید زبانیں فارسی کے الفاظ سے بھری پڑی ہیں۔

کابل قندھار اور سیستان کے سرحدی علاقے جو اکثر مرتبہ سیاسی طور پر ہندوستان کا حصہ رہے ہیں، ہندوستانیوں اور ایرانیوں کے ملاپ کا مقام تھے۔ پارتھین عہد کے ان علاقوں کو سفید ہندوستان کہا گیا۔ ان علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی علامہ جیمز ڈارمیسٹار لکھتا ہے: ان علاقوں میں ہندو تہذیب پھیلی ہوئی تھی حقیقت میں دوسری صدی قبل از مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک ان علاقوں کو سفید ہندوستان کہا جاتا تھا اور مسلمانوں کی فتوحات تک یہ علاقے ایران کے مقابلے میں زیادہ تر ہندوستان میں ہی شامل تھے۔

ہندوستان میں ایک نئے فنِ تعمیر نے جنم لیا جو ہندوستانی آدرشوں اور ایرانی تخیل کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ دہلی اور آگرہ میں بہت سی نہایت نفیس اور حسین عمارتیں جا بجا نظر آنے لگیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور تاج محل ہے۔ مشہور فرانسیسی سیاح اور مؤرخ ایم گروسٹ تاج محل کے بارے میں لکھتا ہے: "ایران کی رُوح نے ہندوستان کے قالب میں ظہور پایا ہے"۔

بدقسمتی سے ہمارے اس طویل، گہرے اور باوفا تعلق کی آخری یاد آج سے دو سو برس قبل نادر شاہ کا حملہ ہے۔ جو مختصر ہونے کے ساتھ ہی نہایت خوف ناک بھی تھا۔

اس کے بعد انگریز آئے۔ انھوں نے تمام دروازے بند کر دیے، اور وہ تمام راستے مسدود کر دیے جو ہمیں اپنے ایشیائی ہمسایہ ممالک سے ملاتے تھے۔ باقی ایشیا سے اچانک اس طرح الگ تھلگ اور منقطع ہو جانا

ہندوستان میں انگریزی راج کا سب سے زیادہ نمایاں اور قیمت اثر تھا۔

تیرہ سو برس گزرے جب ایران میں اسلام پھیلا تو زرتشت مذہب کے چند ہزار پرستار ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور وہ مغربی ساحل پر آباد ہوگئے۔ وہ بنا کسی خلل اندازی کے اپنے عقیدہ اور رسم ورواج پر کاربند رہے۔ انھوں نے دوسروں کے کسی ایسے کام میں کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ آج بھی ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ انھوں نے کاروبار میں خوب ترقی حاصل کی، اور ان میں سے بہت سے بھارت کی صنعتوں کے رہنما ہیں۔ عملی طور پر ان کا ایران کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ مکمل طور پر ہندوستانی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی قدیم روایات پر قائم ہیں۔ اور اپنے قدیم وطن کی یاد بنائے رکھتے ہیں۔

حال ہی میں ایران میں ایک زبردست رجحان پایا گیا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل کے زمانہ کی قدیم تہذیب پر پھر سے توجہ دی جائے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جذبہ ثقافتی اور قوم پرستانہ ہے جس کا مدّعا ایران کی طویل اور مسلسل ثقافتی روایات کی کھوج لگانا اور ان پر فخر کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

دنیا کے حالات کی رفتار اور مشترکہ مقاصد ایشیائی ملکوں کو پھر سے ایک دوسرے سے تعلق بڑھانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یورپی قوموں کے غلبے اور حکومت کا زمانہ ایک بُرے خواب کی طرح گزر چکا ہے۔ اب ماضی قدیم کی یادیں ان کو پھر سے قدیم دوستی اور مشترکہ جدوجہد پر مائل کر رہی ہیں۔ بلا شبہ بھارت مستقبل قریب میں ایران کے اسی طرح زیادہ قریب ہو جائے گا جس طرح کہ چین کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ (جواہر لال نہرو)

اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران

اعلیٰ حضرت شاہِ ایران پہلوی خاندان کے بانی جناب رضا شاہ پہلوی کے فرزند ہیں۔ ان کا جنم ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ہوا، اور ۱۹۴۱ء میں آپ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ شاہِ ایران اپنے ملک کے لوگوں کی حالت بہتر بنانے کی بڑی تمنا رکھتے ہیں، اور انھوں نے اس مقصد کے لئے اپنی مساعی مسلسل جاری رکھی ہیں۔

۱۹۲۵ء میں جب ان کی عمر صرف چھ برس کی تھی ملٹری ایلیمنٹری اسکول تہران میں ان کی تربیت کا آغاز ہوا۔ بعد میں انھوں نے سوئیٹزرلینڈ میں اس تربیت کو جاری رکھا، اور آخر کار ایران ملٹری اکاڈیمی سے ۱۹۳۸ء میں گریجویٹ بن کر نکلے، اور ان کو فوج میں لیفٹننٹ کا عہدہ دیا گیا۔ اعلیٰ حضرت شاہ کو فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ انھیں نیچرل سائنس۔ لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر سے بہت انس ہے۔ ان کی عظیم الشان ذاتی لائبریری میں ایران کے بلند پایہ شاعروں اور مفکّروں کی تصانیف شامل ہیں۔ شاہِ ایران کھیلوں اور جسمانی تعلیم میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ خود برف پر دوڑنے کے کھیل کے ماہر اور اعلیٰ درجے کے ہوا باز ہیں۔ انھیں ایران کے برف پوش پہاڑوں کی ڈھلانوں سے نیچے پھسلنے یا خود اپنے ہوائی جہاز میں ان پہاڑوں کے اوپر پرواز کرنے سے زیادہ کوئی دوسرا شغل مرغوب نہیں ہے۔ کھیلوں میں شاہ کی ذاتی دلچسپی کی بدولت ہی لندن اور ہیلسنکی میں اولمپک کھیلوں کے گذشتہ دونوں مقابلوں میں ایران کے کھلاڑیوں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مرتبہ کے ساتھ ذمہ داریاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ہمیشہ ہی شاہی خاندان کے افراد پر زور دیتے رہتے ہیں کہ وہ ایران کی سماجی انجمنوں میں سرگرم حصّہ لیں۔ مثال کے طور پر خود ملکہ ثریّا (شاہ کی بیوی) زچّہ بچّہ کی بہبود کے ادارے کی رکن اعلیٰ ہیں۔ شاہ کی دونوں بہنیں شہزادی اشرف اور شہزادی شمس سماجی خدمات کے شاہی اداروں سرخ شیر ببر۔ آفتاب سوسائٹی کی لیڈر ہیں۔ یہ دونوں انجمنیں ایران میں ریڈ کراس سوسائٹی کی مدّمقابل ہیں۔

شاہ نے خود بھی اپنی شاہی جاگیر کو کسانوں میں بانٹ کر ایک ترقی پسندانہ اقدام کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت شاہ نے ۱۹۵۰ء میں ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے ذریعے پچاس ہزار ایکڑ سے زائد زیر کاشت آراضی اور باغات ایران کے کسانوں کو تقسیم کردیے گئے۔ اس فرمان کے تحت کُل آراضیات جو کسانوں میں تقسیم کی جائیں گی وہ اس رقبہ سے پچاس گُنا زائد ہوں گی اور ان کی قیمت سات کروڑ ڈالر سے زائد ہوگی۔

شاہ نے اپنے ذاتی سرمایہ اور جائداد کو کس طرح اپنے ملک کے لوگوں کی بہتری کے لئے صرف کیا ہے۔ شاہی آراضیات کی تقسیم تو اس کا صرف ایک نمونہ ہے۔ گذشتہ برسوں میں شاہ نے ساڑھے تین لاکھ ریال یعنی تقریباً چالیس لاکھ ڈالر صحت وصفائی، تعلیم اور خیراتی کاموں کے پروگراموں

کے لئے چندہ دیا ہے۔ ایران کی زراعت و صنعت کی ترقی کا ایک طویل المیعاد پروگرام وضع کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شاہ نے سات سالہ منصوبہ تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ادارے نے ایران کی صنعت و زراعت کو نمایاں طور پر بلند کرنے میں مدد دی ہے۔

۱۹۲۶ء میں شاہ نے ایران کی تاریخ میں پہلی بار سینٹ کے انتخابات کا حکم جاری کیا تھا۔ ایران کے آئین میں اس قانون ساز جماعت کے قیام کی دفعہ تو موجود تھی لیکن اعلیٰحضرت شاہ کے مذکورہ فرمان سے قبل کبھی اس پر عمل نہیں ہوا تھا۔

باہمی تعلقات

اُردو زبان کی نشو و نما ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھارت اور ایران کی زبانوں کے اختلاط کی یاد دلاتی رہے گی۔ یہ دونوں ملکوں کے لوگوں کے خیالات اور اصولوں کے باہمی تبادلہ اور مفاہمت اور اشتراک کی وسعت اور صلاحیت کی بیّن دلیل ہے جنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ گفت و شنید اور نامہ و پیام کے لئے اُردو کو ایک نہایت عمدہ وسیلہ اور ذریعہ پایا۔ بھارتی مورّخین فارسی کے نامور علامہ ابوریحان البیرونی کے بعید ممنون ہیں جنھوں نے اپنی مشہور تصانیف قدیم قوموں کے تاریخ وار حالات اور انڈیکا میں ہندوستانی، ایرانی اور یونانی علوم اور معاشروں کے تقابلی مطالعہ کے لئے یادگاری وقائع اور تحریریں پیش کی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ البیرونی نے کابل، ملتان، پشاور، بنارس اور کشمیر کی سیاحت کی، اور ہندوستانی عالموں کے ساتھ براہِ راست تعلق کے کافی مواقع حاصل کئے۔ اس نے ہندوستان کے مشہور ودوانوں کی مدد سے سنسکرت کے بہت سے گرنتھوں کا مطالعہ کیا۔ اسے علم نجوم اور جیوتش میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ سلطان محمود کے درباری جیوتشی کی حیثیت میں وہ "برہم صدھانت" اور اسی قسم کے دیگر جیوتش شاستروں سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

جب ایران کے علماء ہندوستان کے عظیم علوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے اس وقت اکبر نے ایرانیوں کو ہندوستان کے مشہور علوم و فنون کی بہت سی خوبیوں سے روشناس کرنے کے لئے سرگرم مساعی کی تھیں۔ اس شہنشاہِ اعظم نے مہابھارت رامائن، ہری ونش اور کلہن کی تاریخ کشمیر جیسی عظیم تصانیف نیز بھاسکر آچاریہ اور لیلاوتی کے علم حساب پر مشہور رسالوں کے فارسی میں ترجمے کرائے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں "شک سپتتی" (طوطے کی ستر کہانیاں) کے فارسی ترجمہ "طوطی نامہ" کے ذریعے اور اسی کی مانند "کتھا سرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) جیسی بھارتی تصانیف سے دنیا بھر کو روشناس کردیا گیا تھا۔

(ہز ایکسیلنسی علی اصغر حکمت)

مشترکہ وراثت

قدرت نے ایران اور ہندوستان کی دونوں قوموں کے درمیان محبت، قرابت اور اخوت کے رشتوں کی بنیاد اس وقت ڈالی جب کہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے آباء و اجداد سطح مرتفع پامیر کے شمالی اور مغربی علاقوں میں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ زمانۂ تاریخ اور زمانۂ قبل از تاریخ کے ایک ہزار سال کے دوران میں فاصلے کی دوری، بڑھتے ہوئے اختلافات اور تغیرات کے باوجود ایکے اور اتحاد کا یہ جذبہ، قربت کا احساس اور پُر مسرت باہمی مفاہمت جوں کی توں چلی آتی ہے۔

صدیوں کے سماجی و تجارتی تعلقات اور باہمی تبادلۂ خیالات نے دونوں قوموں کے طور طریقوں، رسم و رواج اور اعتقادات کو ایک ہی جیسی شکل و صورت اور یکساں ترتیب عطا کی ہے جس طرح لسانیات میں 'اوستا' کی زبان میں ہمیں سنسکرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح زرتشتی نے بھی بہت سی چیزیں ہندوازم کے اصولوں سے لی ہیں نسل و تہذیب کے اس بنیادی ایکے اور اتحاد کی قدیم مثالوں اور حوالوں سے ان لوگوں کے تعجب کو دور کرنے میں مدد ملے گی جو ایران اور ہندوستان کی ادبی اور فنّی یادگاروں کو بہ نظر استعجاب دیکھنے کے عادی ہیں۔

ہندوستان کے لوگوں نے سنسکرت میں اپنے آباء و اجداد سے ایک عظیم اور شاندار وراثت پائی ہے اور گذشتہ چھ صدیوں میں انھوں نے اپنی اس وراثت میں فارسی کے نظم و نثر کے مختلف شاہکاروں کے ذریعے کافی اضافہ کیا ہے۔

اگر آج کوئی ماہرِ اعداد و شمار اس زندہ جاوید ترکہ کا شمار کرنے بیٹھے تو معلوم ہو گا کہ ہندوستانی علماء نے فارسی میں جو تصانیف چھوڑی ہیں، ان کی تعداد کسی صورت میں ان کتابوں کی تعداد سے کم نہیں ہے جو

ایران میں لکھی گئیں۔ گیارھویں صدی میں ایران اور ہندوستان میں ایک ہی قسم کے ادبی و فنّی شاہکاروں کی تصنیف و تخلیق میں رشک و مقابلہ کا ایک بڑا جذبہ پایا جاتا تھا۔ یہ ایک لازمی سی بات نظر آتی ہے کہ اصفہان میں جو بھی گیت لکھا گیا ہوگا) اس کا مماثل آگرہ اور دہلی میں ضرور موجود ہوگا اسی طرح ایران میں عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں کی نقّاشی نے ہی یہاں کے فن کاروں کو متأثر کر کے فتح پور سیکری آگرہ اور دہلی میں ویسی ہی نقّاشی کرنے کی ترغیب دی ہوگی۔

اس مقابلہ و رفاقت کے نتیجے کے طور پر ایک قلیل مدّت میں ایسے بے شمار شاہکار وجود میں آئے جنھیں ہندوستان اور ایران آج اپنا مشترک قیمتی سرمایہ یا مشترکہ وراثت خیال کر سکتے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں جب کہ ہندوستان کے عوام ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی تلے دبے ہوئے تھے اور حالات اس مشترکہ سرمایہ کے تحفّظ کے لئے موافق نہیں تھے تو بھی انھوں نے ان یادگاروں کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے اس عالمی وراثت کے لئے اپنی محبّت اور دلچسپی کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ ہر غیر ملکی حکومت اس بارے میں ایک نرم رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی سینکڑوں خوبصورت اور پُرکشش عمارتیں اور شاندار ادبی تصانیف اپنی پرانی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہیں، اور موجودہ نسل کو ایک یادگار صورت میں حاصل ہوئی ہیں۔ (انڈو ایرانیکا)

ہندوستانی آرٹ پر ایران کا اثر

گذشتہ کئی صدیوں میں ایرانی آرٹ اور ثقافت ہندوستانی آرٹ پر اثر انداز ہوئے ہیں، اور مغلیہ حکومت کے ابتدائی دور میں فنِ کتاب سازی نے جو شائد آرٹ کا سب سے دل کش شعبہ ہے اور جس میں خوش خطی اور مصوّری بھی شامل ہیں لوگوں کی بہت زیادہ توجّہ کھینچی۔ چنانچہ متمدّن اشخاص، عالموں اور مصوّروں کی ایک بڑی تعداد میں اس فن کے لئے بے مثال دلچسپی اور جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ بنگال میں گذشتہ صدی کے وسط تک ایسے بنگالی موجود تھے جو ایرانی ثقافت کے مدّاح تھے، اور جنھیں فارسی شاعری اور فلسفے پر عبور حاصل تھا۔

ایشیائے کوچک، عراق۔ شام اور فلسطین۔ کاکیشس اور ترکستان، مصر۔ افغانستان اور شمالی ہندوستان (دریائے سندھ تک) سب کے سب کسی وقت ایرانی اقتدار کو تسلیم کرتے تھے اور ایرانی آرٹ، ادب اور ثقافت نے ان کی تہذیبوں، لباس، رسم و رواج اور رہن سہن پر گہرا اثر ڈالا ہے، حتّٰی کہ قدیم یونان کو بھی ایران کی طاقت کا احساس تھا۔

ایرانی فنِ تعمیر کی خصوصیات میں گنبد کی خوبصورتی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ہم تاج کے گنبد میں جو بلا کی نفاست اور خوبصورتی دیکھتے ہیں، اس کا محرّک کسی اور مُسلم ملک کی بہ نسبت ایران کا آرٹ زیادہ تھا۔ ایک نقّاد کے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں یہ ایک عجیب سی بات نظر آتی ہے کہ ایک ایسے مذہب نے جس کا شروع میں آرٹ سے اتنا کم تعلق تھا ان تمام مقامات پر جہاں کہ اس کی اشاعت ہوئی آرٹ کے ڈیزائن میں اتنی زیادہ یکسانیت پیدا کی؛ چنانچہ سپین سے لے کر ہندوستان تک مُسلم عمارتیں اور بُت تراشی کے نمونے محض تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ ایک ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایرانی آرٹ کے سبھی ادوار میں ہمیں آرائش کا ایک بے پناہ جذبہ ماہرانہ صنّاعی اور اختراعی قابلیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ خوبیاں اور رنگوں کا دل کش امتزاج مصوّری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غالیچوں اور مٹّی کے برتنوں میں بھی یہ خوبیاں کچھ کم اجاگر نہیں ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ہندوستان پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہندوستانی ڈیزائن کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایرانی طرزِ تزئین نے ہندوستان کے آرائشی آرٹ کو غایت درجہ تک متأثر کیا ہے۔

کثیر تعداد میں چمکدار ٹائلوں کا استعمال جس کے سبب ابتدائی مغل دور کی عمارات کی خوبصورتی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ایرانی آرٹ نے ہندوستانی فنِ تعمیر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ فنِ خوش نویسی کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور مشہور خوش نویسوں کو قرآن کے بیش قیمتی نسخے لکھنے کے لئے ملازم رکھا جاتا تھا۔ ان خوش نویسوں نے بھی عظیم ترین آرٹسٹوں سے کوئی کم شہرت حاصل نہیں کی۔ اکثر اوقات خوش نویس اور آرٹسٹ ایک ہی شخص ہوتا تھا۔



بچوں کا آج کل



علم

انور برہانپوری

کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو — بنو پڑھ کے فاضل تم اے پیارے بچو
جہالت مٹا دو زمانے سے بڑھ کر — کرو عزمِ کامل تم اے پیارے بچو
کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

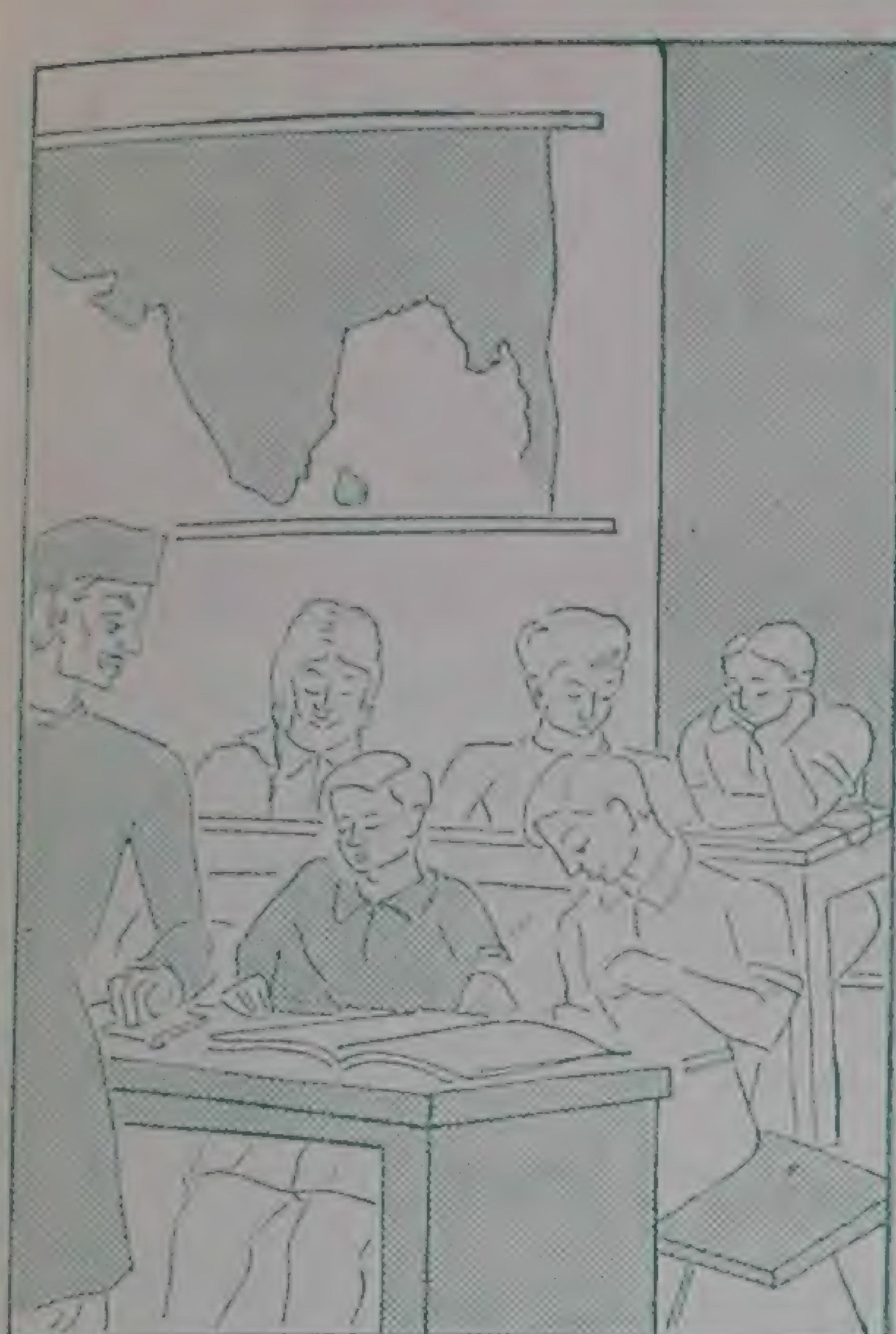
یہ علم و عمل کے کرشمے تو دیکھو — یہ موٹر یہ گاڑی یہ تانگے تو دیکھو
یہ ایجادیں ہیں علم ہی کی بدولت — تم اوراقِ تاریخ اُلٹ کے تو دیکھو
کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

جہالت کی دُنیا کو اب خاک کر دو — جو پردے جہالت کے ہیں چاک کر دو
مٹاؤ بُرائی ، بڑھاؤ بھلائی — یہ چرچا زمیں سے با فلاک کر دو
کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

یہ سکوں کی دولت نہ کام آ سکے گی — بھروسے کے قابل نہیں دولت ایسی
عجب دولتِ علم دی ہے خدا نے — کرو خرچ جتنا یہ ہے بڑھنے والی
کرو علم حاصل تم اے پیارے بچو

مختار بارہ بنکوی

گڑیوں کا اسکول





بہت معقول ہے گڑیوں کا اسکول
بہت موزوں ہے اس کا عرض اور طول

ہیں سب کمرے نہایت ہی ہوادار
ہے سب کا فرش چکنا اور ہموار

کشادہ اس کی ساری کھڑکیاں ہیں
سبھی کمروں کے آگے سائباں ہیں

ہراک کمرے میں فرنیچر ہے کافی
کتابوں کی ہیں صندوقیں بھی وافی

قرینے سے لگی الماریاں ہیں
حسیں ہر ایک پر گُل کاریاں ہیں

ہے اُستانی کی بالکل وسط میں میز
ہے جس کی وارنش بے حد دلآویز

بیک انداز ڈیسکیں بھی رکھی ہیں
سبھی کے کرسیاں پیچھے لگی ہیں

بجا اسکول کا گھنٹہ ٹنا ٹن
لگی آنے سبھی گڑیاں دنا دن

برابر آتی تھی اسکول کی بس
چلی جاتی تھی خالی ہو کے واپس

کچھا کھچ بھر گیا اسکول کا ہال
تھی اُستانی کی سب پر دیکھ اور بھال

سوا اُن کے کئی اُستانیاں تھیں
ہراک کے کام کی نگرانیاں تھیں

سوا دس کی جونہیں گھنٹی بجائی
لگی ہونے وہیں فوراً پڑھائی

لیا اک دم نہ استانی نے آرام
اُسے دیکھا جو گھر پر تھا دیا کام

کسی گڑیا کی کاپی لے کے دیکھی
غلط جو بات تھی اُس کو بتائی

کسی گڑیا کو مارا زن سے چانٹا
کسی کے کان اُکھیڑے اور ڈانٹا

کسی گڑیا کو تو مُرغا بنایا
کسی کے بید ہاتھوں پر لگایا

طمانچوں سے کسی کے سُرخ تھے گال
کسی کے ہاتھ کی تھی اُڑ گئی کھال

کوئی بے چاری سِسکی بھر رہی تھی
کوئی اپنی جگہ پر ڈر رہی تھی

پھر اس کے بعد میں املا لکھایا
برابر ہال میں سب کو بٹھایا

تھا اُستانی کا ایسا رعب غالب
کوئی تھا نقل کرنے کا نہ طالب



تھے املا میں کئی الفاظ مشکل   حباب و قلزم و گرداب و ساحل
لکھے سب بورڈ کے اوپر برابر   کہ لکھیں بچیاں اس کو سمجھ کر
لکھائے ارتھمیٹک کے سوالات   بتا کر حل نکلوائے جوابات

کرائی حل زبانی ارتھمیٹک   پڑی دس بیس کے ہاتھوں پہ اسٹک
خوش الحانی سے پھر پڑھوائے اشعار   کہ جس سے ان کے ہوں جذبات بیدار
رہی تا دیر یوں ہی نغمہ خوانی   زبانوں میں ہراک کے آئی روانی
کرے کے نقشے میں بتلا کے حالات   دکھائے سب کو جغرافی مقامات
ضروری نوٹ کاپی پہ لکھائے   ہراک کے نقشے نظروں میں جمائے
جو تھیں تاریخ کی ایک اوستانی   بڑی تھیں قابل اور بے حد سیانی
وہ کرنے لگتی تھیں جس وقت تقریر   تو سننے والے بن جاتے تھے تصویر
تھی ان کی قابلیت کی بڑی دھوم   زمانے بھر کی تھی تاریخ معلوم



بھرے درجے میں استانی جو آتی   معین اپنا مضموں وہ پڑھاتی
ڈرل کی اوستانی تھیں تنومند   کسا تھا جسم کا ان کے ہراک بند
اچھل اور کود میں بے حد تھیں بے باک   بڑی ہنس مکھ نہایت چست چالاک
ڈرل کے واسطے جس دم وہ آتیں   بہت ہنس ہنس کے وہ سب کو ہنساتیں

یوں ہی پڑھتے پڑھاتے بج گئے چار   بجا چھٹی کا گھنٹہ آخر کار
بہت تھا وقت چھٹی کا سہانا   سبھی گڑیاں ہوئیں گھر کو روانہ
کوئی موٹر سے اپنے جا رہی تھی   کسی کے واسطے بس آ رہی تھی
گیا مغرب کو سورج ہو گئی شام   کریں گی بچیاں اب گھر میں آرام
کوئی تو جا کے دیکھے گی سینما   وہاں سے لوٹ کر کھائے گی کھانا
یوں ہی تھیں ہر روز صبح و شام ہوں گے   یوں ہی تھیں اسکول کے سب کام ہوں گے

لکھا مختار نے یہ نظم الاوقات
یہ سب گڑیوں کے ہیں زندہ کمالات

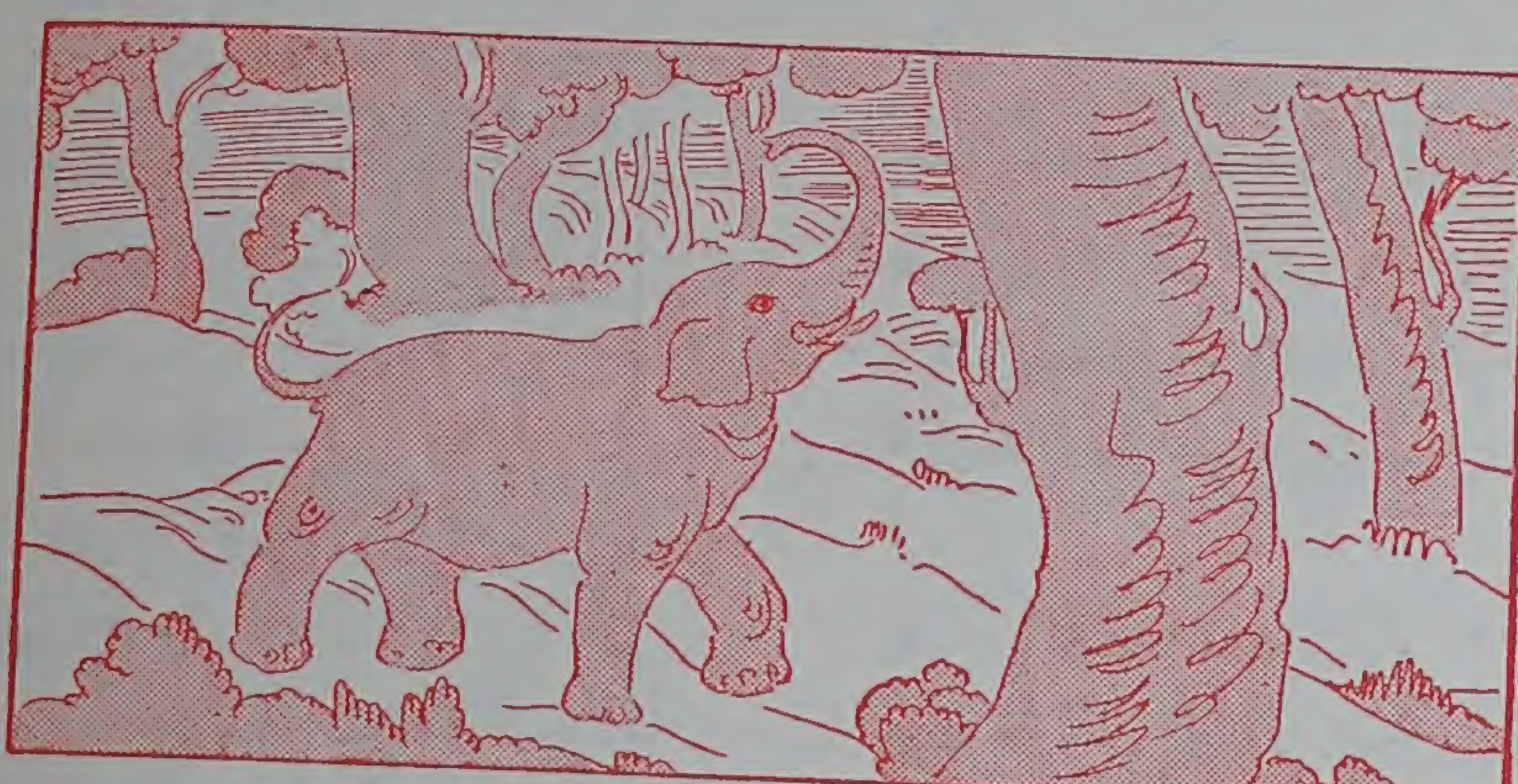
رتن سنگھ شاہی

ہاتھی

پیارے بچو! تم سب نے کئی بار ہاتھی دیکھا ہوگا۔ آؤ آج تمھیں ہاتھی کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ ہاتھی ایک بڑا بھاری جانور ہوتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً سیاہی مائل خاکی ہوتا ہے اور جسم موٹا ہوتا ہے۔ اس کا سر بڑا اور گول ہوتا ہے آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بھدی سی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اس کی سونڈ بہت لمبی ہوتی ہے جس کی لمبائی تقریباً پانچ یا چھ فٹ ہوتی ہے۔ اس کے کان بھی بہت چوڑے چکلے پنکھے کے مانند ہوتے ہیں۔ نر ہاتھی کے منہ کے دونوں طرف دو لمبے لمبے دانت ہوتے ہیں۔ ہاتھی خشکی کے جانوروں میں سب سے بڑا جانور ہے۔ اس کی اونچائی آٹھ سے دس فٹ تک ہوتی ہے۔

ہاتھی ہندوستان، افریقہ اور برما کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ جنگلوں میں چھوٹی بڑی ٹولیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک سردار ہوتا ہے اور وہ سب اس کے زیرِ حکم رہتے ہیں۔ جنگلوں میں یہ عموماً وحشی حالت میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں ہاتھی کا شکار بڑی مشکلوں اور جان جوکھوں سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہوتا۔

شکاری جنگلی ہاتھیوں کو گڑھوں یا جالوں کے ذریعے سے پکڑتے ہیں۔ مگر اکثر اوقات ہاتھی شکارگاہوں میں بند کی ہوئی ہتھنیوں کے ذریعے سے پکڑے جاتے ہیں جو اسی غرض کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ پالتو ہاتھی بہت ہی فرماں بردار ہوتے ہیں



اور ہر بات میں اپنے مہاوت کا حکم مانتے ہیں۔ کیونکہ وہی انھیں سدھاتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ مہاوت اس کے سر کے قریب بیٹھا ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور نوکیلا

اوزار ہوتا ہے جسے یہ ہاتھی کے سر میں چبھو کر جس طرف کو اشارہ کرتا ہے وہ اسی طرف کو چلتا ہے۔ اسی طرح ان کے اُٹھنے اور بیٹھنے کے لئے بھی خاص اشارے مقرر ہیں۔ شکار میں پکڑے ہوئے ہاتھی کئی کئی روز بھوکے رکھے جاتے ہیں اور جب یہ بھوک سے تنگ آکر ایک لمبی چیخ مارتے ہیں تو اس وقت انھیں کھانے کو دیا جاتا ہے۔

ہاتھی پانی میں نہانے کا بہت شائق ہے۔ وہ اپنی سونڈ میں پانی بھر لیتا ہے اور پھر اس کا کچھ حصّہ وہ اپنے بدن پر چھڑک لیتا ہے اور کچھ حصّہ اپنی سونڈ کی نوک سے اپنے حلق میں ڈال لیتا ہے۔ خطرے کے موقع پر ہاتھی کے دانت اس کے لئے بہت ہی کار آمد ہوتے ہیں۔ ہاتھی راگ کا بہت ہی دلدادہ ہے۔ یہ بہت عقل مند جانور ہے اور اپنے مہاوت کے ادنےٰ سے ادنےٰ اشارے کو فوراً ہی سمجھ جاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں ہاتھی لڑائیوں میں بہت استعمال ہوتے تھے۔ ان سے راجوں، مہاراجوں اور رئیسوں کی سواری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ آج کل ہاتھی اکثر لکڑی کے لٹھے لے جانے کے لئے برما اور ہندوستان کے لکڑی کے کارخانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کھیل تماشوں، جلوسوں اور شکار میں بھی کام آتے ہیں۔ ہاتھی کے دانت بہت قیمتی ہوتے ہیں کیونکہ ان سے بہت سی کار آمد اشیا بنائی جاتی ہیں۔ بچّوں کے اکثر کھلونے اور بہت سی خوبصورت چیزیں ہاتھی دانت سے ہی بنائی جاتی ہیں؛

جاوید (فخر سے) امی جان۔ میں اپنی کلاس میں تیسرے نمبر پر پاس ہوا۔
ماں (خوش ہو کر) جیتے رہو یہ تو بتاؤ کل کتنے لڑکے پاس ہوئے؟
جاوید... تین!

(انور)

سیّد منظر امام

تعویذ

کہتے ہیں کسی شہر میں ایک حکیم رہتا تھا جو تعویذ بیچا کرتا تھا اس تعویذ کے متعلق مشہور تھا کہ جو کوئی بھی اسے باندھ لیتا وہ زندگی کے تمام خطروں سے آزاد ہو جاتا تھا، اس کے تمام گناہ دُھل جاتے تھے اور موت کا خدشہ اس کے دل سے ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتا تھا۔

شہر کے تقریباً سبھی لوگ حکیم کو مانتے تھے اور اس تعویذ پر یقین رکھتے تھے اور انھوں نے تعویذ باندھ رکھے تھے۔

ایک نوجوان جو اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اُس نے جب تعویذ کے متعلق سنا تو وہ حکیم کے پاس آیا اور اُس سے کہا "مجھے بھی ایک تعویذ دیجئے۔"

حکیم نے اُسے تعویذ دیتے ہوئے بتایا کہ اب وہ زندگی کے تمام خطروں سے محفوظ ہو چکا ہے۔ نوجوان یہ سُن کر بے حد خوش ہُوا اور تعویذ لے کر چلا گیا۔

×

دو ماہ بعد وہی نوجوان ایک اسٹریچر پر حکیم کے پاس لے جایا گیا۔ حکیم اسے دیکھ کر بوکھلا سا گیا اور بولا۔ "کیسے آئے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میں تو زندگی کے تمام خطروں سے آزاد ہو گیا تھا لیکن آج ایک پانی چھڑکنے والی گاڑی سے ٹکرا گیا ہوں اور میری داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔"

حکیم بولا۔ "میرے دوست! یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ لیکن میں تمہیں اپنے تعویذ کے فائدے سمجھا دوں۔ ٹانگ کا ٹوٹ جانا بڑے خطروں کے مقابلے میں ایک معمولی سا سانحہ ہے اور اس کا تعلق اس بڑے کے حادثے سے ہے جس جگہ میرا تعویذ کارگر نہیں ہوتا۔ گناہ، میرے دوست، گناہ ہی وہ سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے ایک عقل مند کو بچنا چاہیئے۔ میں نے تمہیں گناہ سے محفوظ کر دیا ہے اور جب تم گناہ پر آؤ گے اس وقت تمہیں میرے تعویذ کی اہمیت کا پتہ چلے گا۔"

"خیر! جو کچھ بھی ہُوا ہے میری بہتری ہی کے لئے ہُوا ہے۔" نوجوان نے ٹھنڈی آہ بھری اور مایوس ہو کر بولا۔ "اب میں تمہارا شکر گزار ہوں گا اگر تم میری ٹانگ درست کر دو گے۔"

"یہ میرا نہیں ڈاکٹر کا کام ہے۔" حکیم نے جواب دیا۔

نوجوان چلا گیا۔

قریب تین سال بعد پھر وہی نوجوان حکیم کے پاس انتہائی پریشانی کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا اور بولا:

"میں تو گناہ کے بندھن سے آزاد ہو گیا تھا لیکن ابھی ابھی میں نے ایک شخص کو قتل کر کے گناہِ عظیم کیا ہے۔ پھر اس تعویذ کا کیا فائدہ ہے؟"

"کیوں؟" حکیم نے کہا۔ پھر رُک کر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں مجھے تم کو اس تعویذ کی تاثیر بتلانی ہی پڑے گی۔ اچھا تو سنو۔ یہ گناہ کو مکمل طور پر روکتا نہیں ہے بلکہ بُرے نتائج کو روکتا ہے۔ یہ اس دنیا کے لئے اتنا مفید نہیں ہے جتنا دوسری دنیا کے لئے۔ مختصر یہ کہ زندگی کے لئے نہیں بلکہ موت کے لئے ہے جس کے لئے میں نے تمہیں ابھی سے تیار کر رکھا ہے اور جب تم مرنے کے قریب آؤ گے اس وقت تم میرے تعویذ کی اہمیت جان سکو گے۔"

"اُف!" نوجوان بے چین ہو کر بولا۔ "اب مجھے مایوسی ہو رہی



ہے، لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سب کچھ میری بہتری کے لئے ہُوا ہے۔ میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا اگر آپ میرے گناہ دور کرا دیں گے۔"

"یہ میرا کام نہیں ہے۔" حکیم نے جواب دیا۔ "ہاں اگر تم پولیس کے دفتر جاؤ تو مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں سکون نصیب ہوگا۔"

یہ کچھ دنوں بعد حکیم کو شہر کے قید خانے میں بلایا گیا۔ نوجوان اسے دیکھتے ہی چلّایا۔ "آخر اس کا کیا مطلب ہے، میں نے اب تک تمہارا تعویذ باندھ رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی ٹانگ توڑ لی ہے۔ مجھ سے ہر قسم کے گناہ سرزد ہو چکے ہیں اور کل مجھے پھانسی ہونے والی ہے اور میں اس قدر خوف محسوس کر رہا ہوں جس کی تصویر لفظوں میں نہیں کھینچ سکتا۔"

"میرے عزیز!" حکیم مسکرایا۔ "سچ سچ یہ بڑے تعجب کی بات ہے، لیکن اگر تم اس تعویذ کو نہیں باندھتے تو تم اس سے بھی زیادہ خوف محسوس کرتے جتنا تم اس وقت محسوس کر رہے ہو۔"

نوجوان سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور حکیم مسکراتا ہوا واپس چلا آیا۔

(آر، ایل اسٹیونسن کی انگریزی کہانی سے)

شاہد علی خاں

کرنی کا پھل



ایک تھی بڑھیا، کمر اُس کی کمان کی طرح ٹیڑھی، بال سفید سن جیسے، نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، سارے بدن میں رعشہ، ہر وقت جیسے لرزا چڑھتا رہتا، پر کھانے کی بے حد شوقین، ہر وقت مُنہ چلتا ہی رہتا۔

ایک دن اُسے سیم کھانے کا شوق چرّایا۔ لکڑی ٹیکتی باغ میں پہنچی۔ ڈھیر سے سیم توڑے، پھونس اکٹھا کیا اور گھر واپس آگئی۔ کانپتے ہاتھوں سے پتیلی میں سیم ڈالے ہی تھے کہ ایک سیم اُچھل کر دُور جا گرا۔ بڑھیا دیکھ بھی نہ پائی اور اس نے پتیلی کو انگیٹھی پر چڑھا دیا۔ انگیٹھی میں کوئلے پہلے ہی سے بھرے تھے۔ اب اس نے پھونس کو مٹھی میں دبا کر انگیٹھی میں بھرنا شروع کیا تو ایک پھونس اُنگلیوں کے بیچ سے نکل کر ہوا کا سہارا لے، سیم کے قریب جا پہنچا۔ بڑھیا نے انگیٹھی میں ماچس دکھائی اور پھونس سر سے جل اُٹھے۔ تم جانو کوئلہ جیسا صاف دل اور صحبت کا اثر ماننے والا کون ہوگا۔ آگ لگے تو آگ اور پانی پڑے تو پانی ہو جاتا ہے۔ کوئلوں نے آگ پکڑ لی۔ ان کوئلوں میں ایک کوئلہ بڑا تیز طرّار تھا۔ کونے میں پڑا بڑھیا کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ آن کی آن میں غصّہ کے مارے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا اور وہ جھٹ سے ایک چھلانگ لگا سیم اور پھونس کے قریب پہنچ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلے کو دیکھ کر پھونس میاں کی ہوا سرکی اور گھبرا کر بولے۔ ”بھائی او بھائی۔ ہم سے ذرا دُور ہی رہنا۔ یہ لال لال آنکھیں ہمیں کیوں دکھاتے ہو۔ واہ بھئی واہ۔ کرے کوئی بھگتے کوئی۔ میاں جب تمھارا غصّہ ٹھنڈا ہو جائے تب ہمارے قریب آنا۔“ کوئلہ ٹھیرا سمجھدار، اس نے سوچا۔ یہ تو سب بڑھیا کا کیا دھرا ہے ہمیں جلانے میں ان بچاروں کا کیا قصور“ اور اس کا غصّہ کافور ہو گیا۔ اب تینوں گلے ملے اور بولے۔ ’جان بچی لاکھوں پائے‘ ایک طرف ہو لئے۔

چلتے چلتے راہ میں انھیں ایک ندی ملی۔ اب اسے پار کریں تو کیسے۔۔۔ تینوں سر جوڑ کر سوچنے لگے۔ اتنے میں پھونس بولا۔ ”دیکھو تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ میں تمھیں پار اُتار دوں گا۔“ سیم تھا بڑا چالاک، بڑا ہوشیار۔ فوراً بولا۔ ”دونوں کا ایک ساتھ جانا خطرے سے

خالی نہیں۔ تم پہلے کوئلے کو پار چھوڑ آؤ پھر مجھے لے جانا۔" یہ بات سب کو پسند آئی۔ پھونس جھٹ سے پانی میں کود پڑا۔ کوئلہ چھلانگ لگا کر پھونس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور دونوں لگے پانی میں تیرنے۔ اچانک کوئلے کو اپنے ساتھیوں کی یاد آئی۔ اس کے سارے جسم میں گرمی دوڑ گئی۔ اتنے میں پانی کا ایک چھینٹا اس پر پڑا اور وہ بیچ میں سے کھسک گیا۔ پھونس تھا بڑا دوست نواز، فوراً کوئلے کو بچانے کے لئے لپکا۔ لیکن فوراً ہی ایک خوفناک لہر آئی اور کوئلہ اور پھونس دونوں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ سیم کنارے پر کھڑا ان دونوں کو ڈوبتا دیکھ کر ہنسنے لگا۔ تم جانو اللہ میاں دوسروں پر ہنسنے والے سے کتنے ناراض ہوتے ہیں۔ سیم ہنسا اور اتنا ہنسا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ وہیں چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا۔ اس نے جب سیم کو اس حالت میں دیکھا تو اسے بڑا ترس آیا۔ اس نے جھٹ جیب سے سوئی اور دھاگا نکالا اور اس کا پیٹ سی دیا۔ چونکہ کسان کے پاس اس وقت کالا دھاگا تھا۔ سیم میں جان تو پڑ گئی لیکن اس کا پیٹ آج تک اسی کالے دھاگے سے سِیا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہمیشہ دکھائی دیتا رہے گا۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھگتے گا۔ دوسروں پر ہنسنے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

جان پہچان۔ مُلا نصر الدین جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ کچھ آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ملا بھی اُن کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی نے پوچھا "آپ کی ہم میں کس کے ساتھ جان پہچان ہے؟" ملا نے کھانے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس سے میری جان پہچان اور دوستی ہے۔"

محمد اسماعیل حسن خاں

پہیلیاں

۱۔ لعنتا ہے، لعنت کی بھری ہے
اس کو بھی لوگ کہتے ہیں پوشیدہ کلی ہے

۲۔ چنبلی مرغی دم دراز — انڈا دیوے بے شمار
انڈا گرا طشت پر — بیوی پکڑ دی گئیں گشت پر

۳۔ قفل، کنجی۔ تالا — ماں گوری بٹیا کالا

۴۔ شیر پنجہ، فیل گردن — چشم آہو، بانگ خر

۵۔ ذرا سا لڑکا احمد نام — سارے نرکش چھینے نام

۶۔ ایک کھیت میں ایک ہی ڈھیلا

۷۔ راہ راہ دو جوگی جائیں — چمپا پھول بکھیرتے جائیں

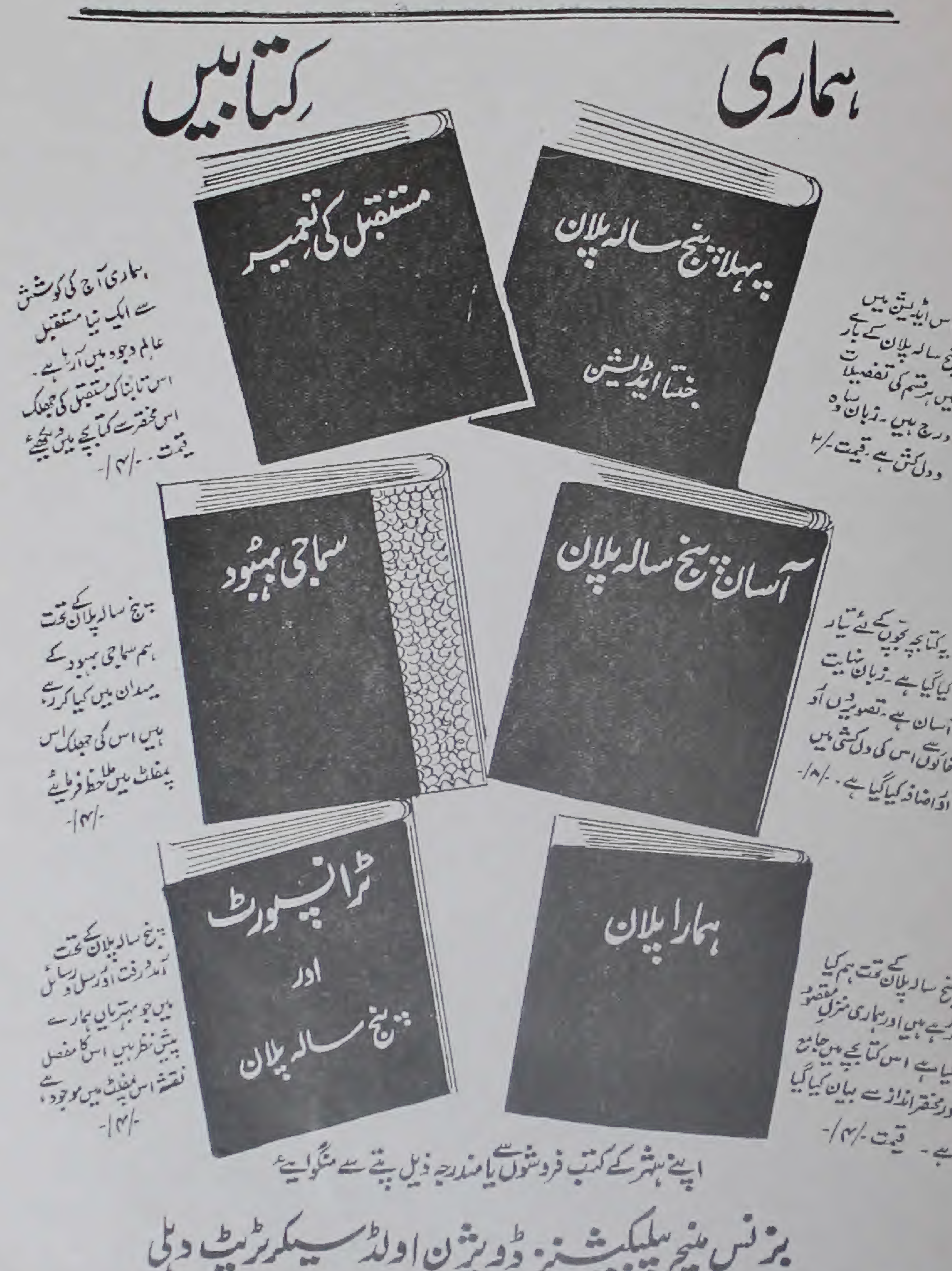
۸۔ ہری تھی من بھری تھی لالہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی

۱۰۔ ایک بوٹا اس میں پانچ شاخیں۔ دو دھوپ میں تین سایے میں

۱۱۔ لکڑی کا گھوڑا کپڑے کی زین۔ آئے دو سوئے تین۔

۱۲۔ ذرا سا بھُدکو بھدکتا جائے — نو سو انڈے دیتا جائے

جوابات:- ۱۔ چھپ کلی ۲۔ مچھلی ۳۔ شریفہ ۴۔ مینڈک ۵۔ بچھو ۶۔ چاند ۷۔ گتا ۸۔ جوار ۱۰۔ نماز ۱۱۔ ڈولی ۱۲۔ سوئی ڈورا



ہماری کتابیں
پہلا پنج سالہ پلان
مختصر ایڈیشن
اس ایڈیشن میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ہر قسم کی تفصیلات درج ہیں۔ زبان سادہ و دلکش ہے۔ قیمت -/۲
مستقبل کی تعمیر
ہماری آج کی کوشش سے ایک نیا مستقبل عالم وجود میں آرہا ہے۔ اس تابناک مستقبل کی جھلک اس مختصر سے کتابچے میں دیکھیے قیمت ۔ -/۴/-
آسان پنج سالہ پلان
یہ کتابچہ بچوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ تصویروں اور خاکوں سے اس کی دلکشی میں اور اضافہ کیا گیا ہے۔ -/۸/-
سماجی بہبود
پنج سالہ پلان کے تحت ہم سماجی بہبود کے میدان میں کیا کر رہے ہیں اس کی جھلک اس پمفلٹ میں ملاحظ فرمائیے
-/۴/-
ہمارا پلان
پنج سالہ پلان کے تحت ہم کیا کر رہے ہیں اور ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اس کتابچے میں جامع اور مختصر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت -/۴/-
ٹرانسپورٹ اور پنج سالہ پلان
پنج سالہ پلان کے تحت آمدورفت اور رسل و رسائل میں جو بہتریاں ہمارے پیشِ نظر ہیں اس کا مفصل نقشہ اس پمفلٹ میں موجود ہے
-/۴/-
اپنے شہر کے کتب فروشوں سے یا مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509



آج کل

مئی ۱۹۵۶ء

آٹھ آنے

ترتیب

بچّوں کا آج کل

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

بال مکند عرش ملسیانی

جلد ۱۴ نمبر ۱۰

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- آٹھ آنے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

مئی سنہ ۱۹۵۶ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

سکندر علی وجد

اجنتا

(بعدِ ترمیم و اضافہ)

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں　　بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں　　بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

تجلّی زارِ عرفاں شاہکارِ ابنِ آدم ہے　　سرِ فطرت عمل کی بارگاہِ حُسن میں خم ہے
تمدّن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے　　جمالِ زندگی رہنِ جلالِ عزمِ گوتم ہے
اُمیدِ جانِ تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی تھی
تلاشِ امن میں تہذیب اس منزل میں آئی تھی

حریم کعبۂ فن، معبدِ نازک خیالاں ہے　　جہانِ نُور و نکہت مسکنِ آشفتہ حالاں ہے
جنوں افشاں فضا میں مستیٔ چشمِ غزالاں ہے　　لبِ جوئے کہستاں جلوہ گاہ خوش جمالاں ہے
ملا ہے زندگی کو بانکپن ان کج کلاہوں سے
نظر والوں پہ شمشیریں برستی ہیں نگاہوں سے

بہانہ مل گیا اہلِ جنوں کو حُسن کاری کا　　اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا　　سکھایا گُر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا
دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے　　ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے　　کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

حریفِ نغمۂ جاں بخش یہ خاموشیٔ گویائی　　کمالِ فکر و فن اِحسنِ تناسب شانِ زیبائی
حقیقت بن گئی جذبات کی صد رنگ رعنائی　　لبوں پر ضو فگن ہے نورِ اعجازِ مسیحائی

نگاہوں میں عجب انداز ہے خارا گدازی کا
دلوں پر نقش رہ جاتا ہے جن کی بے نیازی کا

کہیں پیدا ہے ساری کیفیت صحنِ گلستاں کی　　کہیں رونق نظر آتی ہے بازار و شبستاں کی
کہیں حیرت زبانِ حال ہے حالِ پریشاں کی　　لکیریں ہیں کہ شریانیں دلِ انسان و حیواں کی

کہیں ظلمت کے پیچھے روشنی محسوس ہوتی ہے
کہیں تو موت میں بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی　　تصدّق جن کے ہر خط پر نگارستانِ مانی
مشکّل ہے شباب و حُسن میں تخئیلِ انسانی　　تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عُریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

کرشمہ ہے یہ اربابِ ہمم کی سعیٔ پیہم کا　　جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالَم کا　　قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حُسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقیّد بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاہ و داں پیغام کی خاطر　　خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاکِ دربدر کی کسی انعام کی خاطر　　جئیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش اِن کے نام مِٹ جائیں گے شاہوں کے

مہاتما بدھ کا پیغام

طبیب کے دواخانے میں سبھی قسم کی دوائیں رہتی ہیں۔ طبیب کو یہ سب دوائیں ہمیشہ یاد نہیں ہوتیں۔ جب جس دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ قابل طبیب کا ہاتھ اسی وقت اس دوا پر جاتا ہے۔ یہ انسانی عادت ہے۔ کہنے کو انسان کتنا ہی اصول پرست ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی خاص وقت اس بات کو اپنا اصول مان لیتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو۔ سچائی اور اہنسا کی تعریف بھارت میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ بھارت کی تو تمام مذہبی کتابیں ان دو نیکیوں سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سچائی اور اہنسا کی جیسی قدر گزشتہ تیس برسوں میں ہوئی ہے۔ ویسی صدیوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مہاتما گاندھی سے پہلے دنیا کے لوگ سچائی اور اہنسا کو اونچے درجے کا دھرم یوگ کا ذریعہ اور نِش کام کرم (بے غرض عمل) کا حصہ مان کر غور و خوض اور ریاضت کا موضوع سمجھا کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے انھیں موجودہ بھارت کے سب سے بڑے روگ یعنی بدیشی راج کو ختم کرنے کا ذریعہ بنا کر کار آمد ثابت کر دیا۔ یہ دیکھ کر بھارت کے لوگوں کو خوشی ہوئی کہ سچائی اور اہنسا جیسے قدیم مذہبی اصول آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اب تو "ستیہ میو جیتے" اور "اہنسا پرمو دھرمہ" جیسے اقوال جو انگریزی کتابوں کے ڈھیر میں دبے پڑے تھے۔ نکال کر دیواروں پر چسپاں کئے جانے لگے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اصول پرستی کا ڈھول بجاتے ہوئے بھی اندرونی طور پر مقصد پرست ہے

جس زمانے میں مہاتما بدھ نے بھارت میں جنم لیا۔ اس وقت دیش بہت سے مذہبی اور سماجی امراض میں بری طرح مبتلا تھا۔ مذہب صرف روایات میں زندہ تھا۔ تپسوی (ریاضت کار) اور برہمن وہ لوگ کہلاتے تھے جو جٹائیں بڑھا کر اور جسم جلا کر بے عمل زندگی گزارنے لگتے تھے۔ جاڑوں میں ٹھنڈے پانی میں کھڑا ہونا یا گرمیوں میں جلتی آگ تاپنا ریاضت کہلاتا تھا۔ یگیوں میں جانوروں کی بھینٹ چڑھانا مذہب کا اہم حصہ مانا جاتا تھا۔ بھارتی سماج ایسی مذہبی بدحالی میں مبتلا تھا۔ جب مہاتما بدھ نے کپل دستو میں جنم لیا۔ وہ جب سب کچھ دیکھنے اور غور کرنے کے قابل ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ جسے لوگ دھرم مان رہے ہیں۔ وہ دھرم کا صرف ظاہری روپ ہے۔ اور وہ بھی بہت بگڑا ہوا روپ۔ ان کے دل میں سچا دھرم جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جو شاہی محلوں سے نکال کر راجکمار سدھارتھ کو جنگلوں میں لے گئی۔ کچھ عرصے تک سدھارتھ نے اس زمانے کی مروجہ ریاضتوں اور مذہبی طریقوں کا مطالعہ کیا۔ جب دیکھا کہ باہر کی بھاگ دوڑ سے نہ تو سچا گیان (عرفان) حاصل ہوا اور نہ دل کو سکون ملا تو انھوں نے اپنے اندر ہی سچائی کی تلاش شروع کی۔ جو چیز چند برسوں کی بھاگ دوڑ سے نہ ملی وہ دل کی آنکھیں کھول کر تلاش کرنے سے چند دنوں میں مل گئی۔ وہ سخت جسمانی ریاضتوں اور روائتی طریقوں سے مایوس ہو کر نرنجنا ندی کے کنارے ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے دھیان لگا کر بیٹھ گئے اور سچے راستے کی جستجو کرنے لگے۔ صبح ہوتے ہوتے انھیں اندر سے وہ روشنی مل گئی۔ جس کی تلاش میں وہ گھر سے نکلے تھے۔ انھوں نے جان لیا اصلی دھرم سچی اور اچھی زندگی گزارنے میں ہے۔ جسم کو تپانے اور یگیوں میں جانوروں کو بھینٹ کرنے میں نہیں۔ اس وقت راجکمار سدھارتھ "بدھ" یعنی "عارف" کے درجے کو پہنچ گئے۔

گوتم بدھ نے جس روپ میں دھرم کو سمجھا وہ "دھم پد" کے ان اشلوکوں سے ظاہر ہوتا ہے:-

"بہت بولنے سے دھرم کا پالن نہیں ہوتا۔ جو تھوڑا سُن کر اپنے جسم سے دھرم کا پالن کرتا ہے اور جو دھرم میں مشکلات پیدا نہیں کرتا۔ وہی دھرم کو ماننے والا ہے" (ترجمہ)

"جس میں سچائی 'دھرم' اہنسا اور ضبط ہے۔ وہی پاک' صابر اور مستقل مزاج کہا جاتا ہے"۔

"صرف سر منڈانے سے کوئی شرمن (بودھ سادھو) نہیں ہو سکتا۔ جو جھوٹ بولتا ہے اور دنیاوی فائدہ کی خواہش رکھتا ہے وہ 'شرمن' کیسے کہلا سکتا ہے"۔

'شرمن' کون ہے؟ اس سوال کا جواب مہاتما بدھ نے ان الفاظ میں دیا ہے: "جو یہاں عذاب و ثواب کو چھوڑ کر برہمچاری بنا اور 'گیان' کے ساتھ دنیا میں مصروفِ عمل ہوا وہ بھکشو کہا جاتا ہے"۔

اس وقت دھرم اپنی اصلی شکل کو چھوڑ کر روایات کا شکار ہو گیا تھا۔ لالچی بھکشوؤں اور ناسمجھ برہمنوں کی رہبری کی وجہ سے عوام الٹے راستے پر چل کر دکھ اٹھا رہے تھے، مہاتما بدھ کی تعلیم نے انھیں بہت سکون پہنچایا۔ گویا روحانی پیاس سے ستائے ہوئے لوگوں کو امرت مل گیا۔

اس زمانے میں ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ راجہ لوگ خاص کر دو ہی کام جانتے تھے۔ یا تو راج کی دولت لٹاتے تھے یا اپنے راج کی حدیں وسیع کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے۔ لڑائیوں کی وجہ سے راجاؤں اور ان کے خاندانوں میں دشمنی پیدا ہو جاتی تھی اور ہمیشہ کے لئے پڑوسیوں کو دشمن بنا دیتی تھی۔ راجاؤں کی ان لڑائیوں میں رعایا برباد ہوتی تھی۔ اس طرح راج کاج رعایا کے لئے مصیبت کا باعث بنا ہوا تھا۔ مہاتما بدھ نے اس مصیبت کو دور کرنے کا یہ طریقہ بتایا۔

"یہاں دشمنی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے امن و سکون نہیں۔ دوستی سے ہی امن و سکون پیدا ہوتا ہے۔ یہی سچا دھرم ہے"۔

"مجھے گالی دی' مجھے مارا' مجھے ہرا دیا' مجھے لوٹ لیا۔ اس طرح من میں جو گانٹھیں باندھتے ہیں۔ ان کی دشمنی کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔"

یگیوں میں جانوروں کی بھینٹ دھرم کا کام سمجھا جاتا تھا۔ راجہ لوگ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی سیکڑوں گؤوں کو مار ڈالتے تھے۔ مہاتما بدھ نے انھیں بتایا۔

"جیسا میں ہوں، ویسے ہی وہ ہیں۔ اور جیسے وہ ہیں ویسا ہی میں ہوں اس لئے اپنی طرح سب کو سمجھ کر نہ کسی کو مارے اور نہ مارنے کا خیال دل میں لائے"۔

"پہلے تین ہی روگ تھے، خواہش، بھوک اور بڑھاپا۔ جانوروں کی بھینٹ شروع ہو جانے پر وہ ۹۸ ہو گئے۔ یہ پاجی، یہ پروہت معصوم جانوروں کو مروا ڈالتے ہیں۔ دھرم کو برباد کرتے ہیں۔ یگیہ کے نام پر جانوروں کی بھینٹ یقیناً قابلِ ملامت اور نیچ کرم ہے"۔

اسی طرح کے مختلف اپدیشوں کے ذریعے مہاتما بدھ نے لوگوں کو اہنسا کی تعلیم دی۔ یگیوں میں جانوروں کی بھینٹ کی خاص طور پر برائی کی جس دھرم کو بھکشو اور برہمن بہت پردوں میں چھپا کر عوام کے سامنے رکھتے تھے، اُسے مہاتما بدھ نے بہت آسان الفاظ یعنی "آریہ ستیہ چتشٹیہ" کی صورت میں پیش کیا۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

۱۔ پہلا آریہ ستیہ، دنیا میں دکھ ہے۔ جنم میں بڑھاپے میں، موت میں، دشمن کے ملنے میں اور دوست کی جدائی میں دکھ ہی دکھ ہے۔

۲۔ دوسرا آریہ ستیہ۔ دکھ کی اصل وجہ تشنگی ہے۔ رات دن بڑھتی ہوئی خواہش ہی دکھوں کو پیدا کرتی ہے۔

۳۔ تیسرا آریہ ستیہ —— انسان دکھ سے چھٹکارا چاہتا ہے۔

۴۔ چوتھا آریہ ستیہ —— دکھ سے چھٹکارا پانے کے آٹھ راستے ہیں —— وہ یہ ہیں:۔

سچی نگاہ۔ سچا ارادہ۔ سچ بولنا۔ نیک کام۔ سچی روزی۔ سچی کوشش۔ سچی یاد۔ سچا تجربہ۔ سچائی پر جمے رہنا۔

یہ تھا عملی اور آسان دھرم، جو مہاتما بدھ نے جھوٹی تعلیم اور تشدد آمیز عمل کے ستائے ہوئے انسانوں کو بتایا۔ انسان دھرم کے نام پر روایات کو مانتے اور ان پر چلتے ہوئے بھی اپنے دلوں میں بے چینی محسوس کرتے تھے، انھیں اپنی روح کی گہرائیوں میں دھرم کی جگہ خالی محسوس ہوتی تھی۔ جب مہاتما بدھ نے انھیں دھرم کا آسان اور سیدھا راستہ بتایا تب اُسے اپنانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ راجہ اور پرجا اس کی طرف کھنچنے لگے، اور تھوڑے ہی عرصے میں بدھ کا پیغام سارے دیش میں پھیل گیا۔

مہاتما بدھ کی تعلیم کے لگ بھگ سو سال بعد ان کا پیغام ایشیا کے بڑے حصّے میں پہونچ چکا تھا۔ مہاراجہ اشوک کی کوششوں سے بھکشوؤں اور مبلّغوں کی جماعتوں نے جنوبی اور پوربی دیشوں میں جگہ جگہ عملی دھرم

کا پرچار کر دیا۔ اس پرچار کو جیسی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انسانی سماج صرف ریت رواج میں گھرے ہوئے مذہبی ٹھیکیداروں سے تنگ آ چکا تھا۔ انھیں ایسی تعلیم کی ضرورت تھی، جو اُن کی روح کو سکون دے سکے۔ مہاتما بدھ کی تعلیم انسان کو روایات کی دلدل سے نکال کر عملی دھرم کا راستہ دکھانے والی تھی۔ لوگ لڑائی جھگڑے، جھوٹ فریب سے پریشان تھے۔ بدھ نے انھیں امن کا راستہ دکھایا، گویا بھوکے کو کھانا مل گیا۔ عالم انسانیت کے ایک بڑے حصے نے بودھ دھرم کو اپنا لیا۔

آج پھر انسانی دنیا مہاتما بدھ کو یاد کر رہی ہے۔ انسان مریض ہو کر ہی طبیب کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت دنیا کے مہذب کہلانے والے دیشوں کی جو حالت ہے، اُس کو اگر سرسام کے مرض سے تشبیہہ دی جائے تو مناسب ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ترقی کا زمانہ ہے۔ ترقی کا یہ ثبوت دیا جاتا ہے کہ انسان نے سائنس کی مدد سے بہت بڑی تعداد میں سُکھ کے ذرائع پیدا کر لئے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سائنس نے انسانی ذرائع کو بہت بڑھایا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ ان ذرائع سے انسانوں کے سُکھ چین میں کوئی ترقی ہوئی۔ اگر غور سے مہذب کہلانے والی قوموں کی ذہنی حالت کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کہ دراصل جوں جوں سائنس کی مدد سے انسان کے مادی ذرائع بڑھتے گئے ہیں — انسان اور سماج کی روحانی بے چینی بھی بڑھی ہے۔

آج کل کے مفکّر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نیا زمانہ علّت پرستی کا زمانہ ہے —— وہ روایات کا دشمن ہے۔ موجودہ زمانے کے مفکّروں کا یہ دعویٰ خود ایک بھدّی روایت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔ روایات کا روپ بدل گیا ہے۔ لیکن مغرب کے دماغ پر آج بھی نئی روایات کی ویسی ہی حکومت ہے جیسی آج سے ۵۰۰ سال پہلے یورپ میں بسنے والوں کے دماغ پر تھی۔ عیسائیت ہو یا کمیونزم وہ خود انھیں بیماریوں کے شکار ہیں، جن سے انسانوں کو نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سائنس اور مشین کی ساری طاقت لگا کر امریکہ اور یورپ کے دیش ان کی قیادت میں بہت سے دوسرے دیش بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جنگ کا خطرناک سامان تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ ۲۵۰۰ سال پہلے وہ لوگ اَن دیکھے دیوتاؤں کی پیاس بجھانے کے لئے جانوروں کی بھینٹ کیا کرتے تھے۔ آج کی ترقی کے دعوے دار یہ لوگ اپنی بڑی بڑی خواہشات کے لئے انسانوں کی بھینٹ چڑھانے میں دن رات کوشاں ہیں۔

کچھ عرصے سے انسان پھر سے مہاتما بدھ کو یاد کرنے لگا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب مرض ویسا ہی ہے تو علاج بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور معالج بھی وہی چاہیئے جو مرض کا علاج کر سکے۔ آج پھر انسانیت کو مہاتما بدھ کے اس سچے پیغام کو دل میں بٹھانے کی ضرورت ہے جو انھوں نے اپنے پیروؤں کو دیا تھا۔

گناہوں کا نہ کرنا، کُشل دھرمو، یعنی ثواب کا پھیلاؤ۔ اور اپنا من صاف رکھنا۔ یہی بدھ کی تعلیم ہے۔

بدھ کی تعلیم ہے:۔

۱۔ برائی نہ کرنا۔
۲۔ تشدّد نہ کرنا۔
۳۔ اصول کے ساتھ ضبط قائم رکھنا۔
۴۔ ہلکی غذا کھانا۔
۵۔ تنہائی میں رہنا۔
۶۔ من کو یوگ میں لگانا۔

مہاتما بدھ نے یہ تعلیم پنڈتوں کی زبان سنسکرت کو چھوڑ کر عوام کی زبان میں دی، اسی وجہ سے ان کی تعلیم عوام میں تیزی کے ساتھ پھیلتی گئی۔ جیسے آج سے پچیس صدی پہلے مہاتما بدھ کی اس تعلیم نے عوام کو سُکھ کا راستہ دکھایا۔ ویسے ہی آج بھی دنیا امن اور سکون پا سکتی ہے۔

باقر مہدی

یگانہ آرٹ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
یاسؔ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا یہ شعر ہمیں ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے کیونکہ یہی ان کا مطمح نظر تھا۔ یگانہ کے بارے میں نقادوں اور شاعروں کا رویہ زیادہ تر یک طرفہ تھا۔ مجھے اردو غزل کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب میں حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ مگر یگانہ کے بارے میں ایک جملہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ انھوں نے اتنا احسان ضرور کیا ہے کہ یگانہ کی چند غزلوں کو انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح ترقی پسند نقادوں نے (سوائے مجنوں گورکھپوری کے) بھی ان کو نظر انداز کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس رویے کے بنانے میں خود یگانہ کا بھی حصہ ہے انھوں نے تعلی کو خود پرستی کے فلسفے کا رنگ دیا اور اتنے زور شور کے ساتھ پیش کیا کہ معتدل مزاج ادیبوں کو بھی ان سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ "غالب شکن" لکھ کر انھوں نے اپنے خلاف خاصہ مواد "دشمنوں" کو دے دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یگانہ کے آرٹ میں آب و تاب بھی ان کے انتہا پسند نظریے سے آئی ہے وہ اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ لکھنوی شاعری فرسودہ روایات کی ردا میں لپٹی ہوئی تھی اور شعراء اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لیے دوسرے بڑے شاعروں کے رنگ میں غزلیں کہنا فخر سمجھتے تھے۔ عزیز لکھنوی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کے اس دور کے شاعروں نے آتش سے اپنے رشتے توڑ لیے تھے اور میر و غالب کے رنگ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے یہ شاعر خود اپنے شہر کی قدیم روایات کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ ان سے فیض حاصل کیا جا سکے۔ ایسے دور میں اگر کوئی شاعر کسی دور دیس سے آ کر لکھنؤ کی بود و باش اختیار کر کے وہاں اپنی انفرادیت کا علم اٹھانا چاہے تو اسے باغی سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہاں کی اکثریت کا اس کو اپنے خلاف ایک محاذ سمجھنا بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یگانہ کو لکھنؤ والوں سے جو بے شمار شکایتیں تھیں ان میں تھوڑی بہت صداقت ضرور تھی۔ یہاں اس "خطرناک" مسئلے کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے بلکہ اشارتاً یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ یگانہ کی شخصیت میں جو چڑچڑا پن پیدا ہوا وہ فطری تھا اور ان کے انتہا پسند رویے کی ابتدا بھی ایک ردِّ عمل کی صورت میں ہوئی تھی وہ شروع میں کھری کھری سنانا ہی ایک بڑا کام سمجھتے تھے اور اس حق گوئی نے آگے چل کر ان کے کلام پر وہ جلا کی ہے کہ قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ ان کو جن معرکوں کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ انشاءؔ اور مصحفیؔ کے دور کی یاد دلاتے ہیں ان کی زندگی ان مظالم کے خلاف جد و جہد کرتے گزری تھی اور ان کے آرٹ میں جو زندگی کا ولولہ اور جوش ہے وہ بھی ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "میر اور ہم" میں ایک اہم بات لکھی ہے ان کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"ہر دور میں بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے زمانے کی کشاکشوں کا خودداری اور وقار کے ساتھ رہتے ہوئے اشاروں میں اظہار کر لیتا ہے لیکن شعر کو پروپیگنڈہ نہ ہونے دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاعر کی عظمت کی ایک اور پہچان یہ ہے کہ وہ آیندہ نسلوں کے اندر بغیر واعظانہ یا مبلغانہ دھن اختیار کیے ہوئے یہ احساس پیدا کر سکے کہ ان کو بھی اپنے زمانے کی نئی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا خود اعتمادی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے" (فنکار نمبر ۴۴ سنہ ۱۹ء)

اس بات کو پوری طرح سے سمجھ لینا چاہیے جبھی ہم یگانہ کی شخصیت میں

شدید قسم کی کجروی کو سمجھ سکتے ہیں ان کی خودداری نے انھیں انتہا پسندی کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا تھا مگر اس سے ان کے آرٹ کو نقصان نہیں پہنچا شاید کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یگانہ کے کلام میں جو تلوار کی کاٹ، دھار کی تیزی اور زندگی کی لگن ہے وہ اسی کی ودیعت کی ہوئی تھی۔ وہ بظاہر غالب کے شدید مخالف تھے مگر وہ ان کے معترف بھی تھے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ آیات وجدانی پڑھتے ہوئے کم از کم مجھے بار بار اس کا احساس ہوا تھا کہ وہ غالب کی عظمت کے قائل ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کی پیروی کرنا "کسرِ شان" سمجھتے ہیں اور یہ منطقی طور سے غلط بھی نہیں ہے۔

یگانہ آرٹ کو سمجھنے میں "آیات وجدانی" کا مطالعہ بڑی مدد کرتا ہے یہ اپنی قسم کا واحد مجموعہ ہے جس میں اشعار کی شرح بھی شامل ہے یہ کتاب سنہ ۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ دور اردو ادب میں ایک ہنگامے کا دور تھا۔ اقبالؔ کی شاعری عروج پر تھی۔ جوشؔ نے اپنا ایک حلقہ بنانا شروع کر دیا تھا اور لکھنؤ اسکول کے شعراء ابھی تک بڑے شاعروں کی پیروی میں کھوئے تھے۔ حسرت موہانی نے غزل کا احیاء کیا تھا لیکن اس کو وہ معیار نہیں دے سکے تھے جو ان سے پہلے کلاسیکی شاعروں نے قائم کیا تھا۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ حسرت نے غزل کو دوبارہ مقبول بناتے ہوئے بڑا اہم رول ادا کیا ہے لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ غزل کو پُر وقار اور بہت بلند مقام پر لے گئے تھے۔ ان کا شعری لب و لہجہ دل نشین ہونے کے باوجود بڑی شاعری کا لب و لہجہ نہیں ہے اور کم و بیش یہی حالی اس دور کے دوسرے غزل گو شعراء کا تھا۔ اس مضمون میں تمام شعراء کے تقابلی مطالعے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب اردو غزل دوبارہ ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لئے قدم بڑھا رہی تھی اس وقت جو لوگ اس کے ساتھ ساتھ تھے ان میں یگانہ بھی پیش پیش تھے۔ اس بات کا اعتراف نہ تو ڈاکٹر یوسف حسین نے "اردو غزل" میں کیا ہے اور نہ ہی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مقالے "جدید غزل" میں۔ یگانہ کو شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں سے نظر انداز کرنے کی مہم بڑی حد تک کامیاب رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے پڑھے لکھے متوازن مزاج لوگ بھی ان کے کلام سے زیادہ واقف نہیں ہیں اس زیادتی کے خلاف کسی نہ کسی نقاد کو ایک دن قلم اٹھانا ہی پڑے گا۔

مرزا یاس کا اصلی نام مرزا واجد حسین اور تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ تھا۔ ان کا پہلا تخلص یاس تھا لیکن لکھنؤ آکر انھوں نے یگانہ بھی رکھ لیا تھا۔ وہ سنہ ۱۳۰۱ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے تھے ان کی ابتدائی تعلیم مولانا بیتاب اور مولانا شاد کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ وہ سنہ ۱۹۱۴ء سے لکھنوی ہو گئے تھے اور خود کو لکھنؤ کے فدائیوں میں سمجھتے تھے۔ یہاں ایک اور ناانصافی کا ذکر کر دوں۔ ڈاکٹر ابواللیث نے اپنی کتاب "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں معمولی معمولی شاعروں کا ذکر کیا ہے مگر یگانہ کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں ملتا۔ یہ یقیناً زبردست زیادتی تھی مگر یگانہ ان "مظالم" کے عادی ہو چکے تھے جبھی تو یہ کہا کرتے تھے کہ؎

دل طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفاں ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

اس شعر کو یگانہ کی زندگی کے پس منظر میں دیکھئے تو اس میں ایک لمبی داستان پوشیدہ معلوم ہوگی اور اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ یہ ایک بڑے جری شخص کے کارناموں کا خوبصورت شاعرانہ انداز میں اعتراف ہے ان کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے وہ ان غزل گو شعراء میں نہیں تھے جن کے چند مصرعے یا دو ایک شعر ہی تاریخ ادب میں رہ جاتے ہیں۔ عزیز اور صفی اسی قبیل کے شاعر تھے مگر اپنے دور میں ان کو یگانہ سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی اسی لئے کہا گیا ہے کہ مقبول عام کو شاعرانہ عظمت کے لئے سند بنا کر نہ پیش کرنا چاہئے۔ ورنہ وقت کا ایسا بڑا نقاد مشاعروں کے ہنگاموں محفلوں کی شمعوں اور پروپیگنڈے کو حرف غلط کی طرح مٹا کر صرف کلام کو پرکھتا ہے اور یگانہ اس معاملے میں یقیناً خوش نصیب ہیں کہ آنے والا زمانہ انھیں زیادہ عزت دے گا۔

یگانہ کا فلسفۂ حیات ایک جامع صورت میں نہیں ملتا کیونکہ ایک غزل گو شاعر سے اس کی توقع کرنا ہی بے سود ہے۔ پھر بھی زندگی کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کا ایک انداز ضرور ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک روشن فکر کے مالک تھے اور ان کا ذہن رسا دور دراز فکری مضامین کی خبر بھی رکھتا تھا ان کے یہاں تصوف ایک عقیدے کی صورت میں نہیں ملتا جیسے کہ اکبر کی شاعری میں ہے بلکہ کلاسیکی شعراء کا یہ دستور تھا کہ ایک غزل میں مختلف موضوعات کو زیر بحث لاتے تھے اور خیال آرائی کے پیش نظر تصوّف کے مضامین بھی نظم کرتے تھے اس کے علاوہ اپنے انفرادی رنگ کو ابھارنے کے لئے دوسرے شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہتے تھے۔

اس طرح ایک ہی بحر میں دو تین شاعروں کی غزلیں دیکھئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کس شاعر کا کلام ہے۔ مصرع طرح پر کہنے کا رواج عام تھا اور یگانہ کے یہاں بھی بہت سی غزلیں ایسی ملیں گی جو مشاعرے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ مگر وہ "روش عام" سے ہمیشہ ہٹ کر ملتے تھے اور اپنی انفرادیت کا ہر لمحہ خیال رکھتے تھے وہ بھی مقبول عام رنگ میں غزلیں کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ مگر اس میں ان کی شخصیت کے مجروح ہونے کا امکان تھا۔ یگانہ کا فلسفۂ حیات اردو کے کلاسیکی شعرا سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہ بھی جبر و قدر، وحدت الوجود، دنیا کے فانی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی جد و جہد پر ایمان، خود شناسی، زندگی کی لگن اور کچھ کر گزرنے کی تمنّا بھی ملتی ہے۔ انھوں نے آتش کی آبائی شاعری کو دوبارہ زندہ کیا تھا۔ وہ کلاسیکی شعراء سے ایک معنی میں مختلف بھی تھے ان کے یہاں جو سوز و گداز ہے وہ عشق کی دین نہیں ہے بلکہ زندگی کے "تلخ تر تجربات" کا نتیجہ ہے جس سے انھیں سابقہ پڑا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں عشقیہ اشعار نہیں ہیں لیکن ان کے کلام میں نمایاں حیثیت ان شعروں کی ہے جس میں زندگی کے کسی نہ کسی تجربے کو فکری انداز میں پیش کیا گیا ہے میرا تو خیال ہے کہ اگر ان کی شخصیت کی کج روی انھیں اپنے میں محدود کرنے کے بجائے کسی ادبی تحریک سے وابستہ کر دیتی تو وہ بہت ہی بڑے شاعر مان لئے جاتے۔ یوں بھی وہ بیسویں صدی کے غزل گو شاعروں میں سب سے زیادہ اہمیت کے مستحق ہیں اس سے انکار کرنا زیادتی ہو گی۔ آیات وجدانی میں پہلی اردو غزل میں یہ اشعار ملتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزہ نہ ملا — کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا
امید وار رہائی قفس بدوش چلے — جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

اور آیات وجدانی کی پہلی غزل جو فارسی میں ہے۔ اس کے بھی یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

منکہ برنمے تابم درد زیستن تنہا — صبحدم چساں بینم شمع انجمن تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پرشکستہ دل تنگ — داورا نمی زیبد بال و پر بمن تنہا

ان اشعار کو پڑھنے کے فوراً بعد جو ردّ عمل ہوتا ہے وہ لطیف شاعرانہ کیفیت کے علاوہ قوتِ عمل کے جذبے کو جگاتا ہے اور ذہن کو بیدار کرتا ہے ان اشعار کا لب و لہجہ بھی دوسرے اس دور کے شاعروں سے بہت مختلف ہے ان میں بقول مجنوں گورکھپوری ایک مردانہ پن پایا جاتا ہے۔

یگانہ کا آرٹ مینا کاری کا آرٹ نہیں ہے ان کے یہاں نازک جذبات بھی زور بیان کے تیکھے پن کے ساتھ آتے ہیں اور ان کا یہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے آتش و غالب کی زمین میں بلند پایہ غزلیں کہی ہیں جو نہ تو ان شعراء کی آواز باز گشت ہیں اور نہ صدا بہ صحرا بلکہ ان میں آواز کی تیزی اور سوز و گداز کی آنچ کے ساتھ زندگی کا ولولہ بھی پایا جاتا ہے جسے ہم یگانہ آرٹ کہہ سکتے ہیں ؎

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کہ دل تو کس سے کروں درد نارسا کا گلہ — کہ مجھ کو لے کے دل دوست میں بھی سما نہ گیا

ان کے مجموعۂ کلام "گنجینہ" کی پہلی غزل کے یہ دو شعر ہی میرے خیال کی پوری تائید کرتے ہیں ان میں درد کی عظمت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اس خوبصورتی کے ساتھ نظم ہوا ہے کہ ہم بڑی آسانی کے ساتھ پوری کیفیت سے نہ صرف آگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ روح کی بالیدگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یگانہ کی یہ بھی ایک خوبی تھی کہ رائج الوقت خیالات کے شدید مخالف ہوتے ہوئے بھی ان انسانی تجربات اور محسوسات کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں جن سے ہم سب دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

ان کی زندگی ایک شدید تنہائی اور اذیت کے ساتھ گزری تھی لیکن ہمیں کہیں بھی وہ قنوطیت نہیں ملتی جو فانی کا جزو ایمان تھی اور وہ فراریت نہیں ملتی جو انسان کو آسمانوں میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اصغر کی شاعری کی بنیاد اسی پر تھی یگانہ کے یہاں ایک ایسا بانکپن ہے جو نامرادی اور غم کو بھی آسان بنا دیتا ہے انھوں نے اس بات کو یوں کہا ہے ؎

مزے کے ساتھ ہوں اندوہ غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

اور یقیناً یگانہ اس امتحان میں کامیاب رہے ہیں ان کے طنز میں نشتریت ضرور ہے لیکن وہ زہر میں بجھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی خلش آدمی کو بے چین رکھ سکتی ہے مار نہیں ڈالتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا — مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

کدھر چلا ہے ادھر ایک رات بستا جا　　گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا
صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے　　اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر
خداؤں کی خدائی ہو چکی بس　　خدا یا بس دہائی ہو چکی بس
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا　　کنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں
جو غم بھی کھائیں تو پہلے کھلائیں دشمن کو　　اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

چپکے چپکے ریشہ دوانی یہ بھی کوئی جیتی ہے
للکار نہیں تو کچھ بھی نہیں، جھنکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل سے خدا کا نام لئے جا، کام کئے جا دنیا کا
کافر ہو دیندار ہو، دنیا دار نہیں تو کچھ بھی نہیں

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضل الٰہی ناگہاں کیوں ہو

حُسن یہ فرعون کی پھبتی کہی　　ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی
طاعت ہو یا گناہ، پس پردہ خوب ہیں　　دونوں کا جب مزہ ہے کہ تنہا کرے کوئی
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے　　دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے
آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے　　خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلمان ہو جائے
جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے　　کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

ان اشعار میں ظرافت کی چاشنی ہے ہلکی ہلکی سی گدگدی ہے طنز کی نشتریت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ہنسی ہنسی میں بہت سی کام کی باتیں کہی گئی ہیں جو زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہم ان اشعار کو پڑھ کر ذہنی لطف حاصل کرتے ہیں اور طنز کی تلخی کا بھی احساس رہتا ہے اس کے معنی ہیں کہ شاعر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ یگانہ کے یہاں مزاح کہیں کہیں پھکڑ پن کی صورت اختیار کر لیتا ہے خاص کر ان کی وہ رباعیات جو غالب کے بارے میں ہیں مگر عموماً ان کے مزاح میں صرف الفاظ کی الٹ پھیر نہیں رہتی بلکہ ایک مقصد اور خیال کے تحت وہ تبسم ہونٹوں پر آجاتا ہے جو زندگی کی صحت پر دلالت کرتا ہے مندرجہ بالا اشعار میں ایک اور بات صاف نمایاں ہے وہ ہے خلوص نیت۔ وہ اپنے طنز کی دھار کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں استعمال کرتے اور نہ کسی کی پگڑی اچھالنے کا کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا ہو گئی ہے جو مزاح کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یگانہ کے کلام میں خاصہ تنوع ہے اس کے باوجود روایتی انداز کے اشعار بھی ملتے ہیں پھر بھی ہر جگہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر الگ اپنی راہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یگانہ اپنے دور میں مقبول نہ ہو سکے وہ بازار کا بھاؤ دیکھ کر شعر نہیں کہتے تھے بلکہ جو ان پر گزرتی تھی اس کو آتش سیال بنا کر پیش کرتے تھے۔ ان کے یہاں فکری عناصر کے ساتھ جذبات کی گہرائی بھی ملتی ہے وہ عقل و دل کی کشمکش ہو یا حسن و عشق کی کشش دونوں قسم کے موضوعات کو اپنے اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہیں ان سے یہ شکایت تو کسی کو نہیں ہو سکتی کہ وہ ادائے خیال میں الجھتے ہیں یا محاورات کے استعمال میں کمزور ہیں۔ البتہ کچھ لوگ اتنی تیزی و طرآری پسند نہیں کرتے۔ ان کی شاعری شیشہ گری نہیں کرتی وہ شکست و ریخت میں یقین رکھتے ہوئے بھی جہد و عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ اصل میں ان کے کلام میں خودپرستی نے ایک نئے قسم کا تیقن پیدا کر دیا ہے جو ترقی پسند اور دوسرے قسم کے غزل گو شعراء کے یہاں نہیں ہے، ان کی بڑھی ہوئی انفرادیت نے اپنے لئے وہ سنگلاخ زمین چنی تھی جس کو میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ ایسے شاعر پہلے ہی ہموار کر کے شاداب کر چکے تھے اور ان پامال موضوعات کو دل کی جلن کے طفیل نئے انداز میں پیش کرنے کا کام بھی یگانہ نے انجام دیا وہ لکھنؤ کے شعراء سے لڑائی کر کے ادبی دنیا میں وقتی طور سے کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے اپنے کلام میں مردانگی، بانکپن، نشاط، مزاح اور فکری عناصر کے امتزاج سے وہ جوہر ضرور پیدا کر دیا جو ان کو فاتح بنا کر رہا۔ ان کے یہاں الفاظ کی بندش، محاورات کی سادگی، تراکیب کی خوب صورتی تشبیہات کی قدرت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور کوئی بھی انصاف پسند نقاد ان کی شاعرانہ اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ہے ان کا شعری لب و لہجہ نہ صرف اس دور کے اردو غزل گو شعراء سے الگ اور بہتر ہے۔ بلکہ اردو کے کلاسیکی شعراء کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اسی میں یگانہ آرٹ کی عظمت مضمر ہے۔ وہ اپنے مرتبے سے واقف تھے یا نہ تھے لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ایک فنکار کے لئے خود اعتمادی ضروری ہے اور انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں پر اسی سے صیقل کی ہے جبھی وہ دھار میں تیزی آسکی ہے جو ایک ہی وار میں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھئے اور پھر تیور کا اندازہ لگائیے ؎

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
مرا پا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا
عجب کیا وعدۂ فردا یونہی فردا پہ ٹل جائے
اُف رے تکلفات عشق آگ لگے دھواں نہ ہو
یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
دل نے بزورِ عشق لگایا ہے راہ پر
زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
شمع کیا، شمع کا اُجالا کیا
دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
تمھارے دم سے سلامت ہیں ٹوٹے دل کے
نگاہِ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں

اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائیگا
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
دلیلِ راہ محبت ہے فیصلہ دل کا
مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا
کوئی شام اور آ جائے نہ شام بے سحر ہو کر
ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذتِ سوز و ساز میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں
گم گشتگانِ غمکدۂ روزگار کو
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکرِ آسماں کیوں ہو
دن چڑھے سامنا کرے کوئی
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے
انساں کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
سزا کے بعد مظاہر اُبھارنے والے
ستم رسیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے
مرے حال پہ دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

میں نے اتنے زیادہ اشعار کو اس لئے پیش کیا ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ ان کے کلام کی خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کے اشعار کا تجزیہ اور تنقید کرنا مشکل ہے پھر بھی مندرجہ بالا اشعار کے بارے میں چند باتیں کہہ دینا ضروری ہے ان میں موضوع کے تنوع کے ساتھ لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ بھی موجود ہے فکر کے پہلو بھی عیاں ہیں۔ خیال کی لطافت بھی ظاہر ہے۔ عشق کا والہانہ پن بھی ملتا ہے اور سوز و گداز بھی ہے جو ناکامیوں کو قوتِ عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ تیقن بھی ہے جو زمانے کی راہ سے الگ اپنی راہ بنانے میں مدد دیتا ہے اور یہی صاحب نظری کی دلیل بھی ہے۔ چند شعر تو ایسے ہیں کہ اردو غزل کے سخت سے سخت انتخاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں اور کئی شعر ضرب المثل بن چکے ہیں۔ لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ شعر یگانہ کی دین ہیں۔ غالب کی زمین میں دو تین شعر بھی اتنے اچھے کہنا محال تھا اور یگانہ کے شعر (کیوں ہو) کسی لحاظ سے بھی غالب کے اشعار سے کم نہیں ہیں ان میں جذبات کی نہیں نہ سہی فکر کی بلندی اور لب و لہجہ کا وقار ضرور ہے جس کی اتنی اچھی تصویر بھی ہے۔ "چتونوں سے باطن کا سراغ" لگانا اردو شاعروں کے لئے نیا خیال نہ سہی پھر بھی اپنی قسم کا واحد شعر ضرور ہے! ور دنیا میں آدمی ماضی کی باتیں کتنی جلدی بھول جاتا ہے۔ اس کو اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ جوش ایسے بڑے شاعر نے بھی یہ مصرع استعمال کیا ہے یہاں تمام اشعار کی تفسیر و تنقید کی گنجائش نہیں ہے اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں۔

یگانہ آرٹ کے سلسلے میں رباعیات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے یہ آبگینہ کا فن ہے اور اس میں مہارت چند ہی شاعروں کو حاصل ہے ان میں بیسویں صدی کے شاعروں ہی میں نہیں بلکہ انیس کے بعد یگانہ ہی کا نام آتا ہے۔ پھر جوش اور فراق کا ـــ اس فن میں یگانہ کا آرٹ اپنے عروج پر ہے اور اس بات کے تو وہ لوگ بھی قائل ہیں جو یگانہ کو بڑا غزل گو شاعر نہیں مانتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اچھے شاعر کے کمال کے جوہر اس میں کھلتے ہیں۔ چار مصرعوں میں ادائے خیال کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ اور سب سے بڑھ کر تیسرے اور چوتھے مصرع کی کاریگری ہی حسن رباعی کو دوبالا کرتی ہے یہ ایک خطرناک صنف بھی ہے کیونکہ اوسط درجے کے غزل گو کا سارا بھرم کھل جاتا ہے دوسرے صرف تشبیہہ و استعارہ سے کام نہیں چلتا ہے۔ خیال کی ندرت تراکیب اور الفاظ کی بندش کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ صنف نظم اور غزل کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یگانہ نے اس کو اپنے انتہا پسندانہ نظریے کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ ترانہ کے نام سے منتخب رباعیات کا مجموعہ بھی ۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اب ان کو "گنجینہ" میں شامل کر لیا گیا ہے پہلی رباعی ہے۔

ساجن کو سکھی منا لو پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا

سونا سنسار، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سُنا تو پھر سو بیٹا

اس رباعی میں کوئی بڑا خیال نہیں ہے لیکن حسن ادا اور سادگی نے اس کو دل نشین بنا دیا ہے "سننے والا بیدار" استعمال کر کے سکھی کے دکھ درد کی پوری کہانی کو چھیڑ دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانے کتنی افسردہ دلی سے سوئی ہوگی شاید انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہو۔

اسی طرح ایک اور رباعی ملاحظہ ہو جو فلسفہ حیات کے بارے میں ہے۔

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا　　سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے　　جھونکا کھاتے سنبھلتے رہنے کے سوا

شاعر نے "سنبھلتے رہنے" کہہ کر زندگی کی جد وجہد کی طرف اشارہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ رباعی انیس کے اس خوبصورت شعر سے زیادہ اچھی ہے ؎

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

یگانہ نے عزم سے زندہ دلی کا کام لیا تھا اور طوفان سے ٹکرا کر آگے بڑھتے رہتے تھے۔ امید کن دشوار گزار منزلوں سے گزرتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اپنے پر پورا اعتماد رکھتا ہو اور امید پر نہ جیتا ہو۔ یگانہ نے اپنی رباعیات میں کہیں تو جذبات کے نازک نازک پہلوؤں کو پیش کیا ہے کہیں مردانہ وار حالات سے جنگ مول لی ہے کہیں زندگی کے تسلسل کو بیان کیا ہے اور کہیں موت کی آرزو کی ہے۔ کہیں غور و فکر کے لئے وہ نظر پیدا کی ہے جو اوجھل راہوں کا پتہ لگاتی ہے اور پتھر کا جگر چاک کر ڈالتی ہے۔ مندرجہ ذیل رباعیات ملاحظہ ہوں۔

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے　　طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے　　کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

امکان طلب سے کوئی آگاہ تو ہو
منزل کا نہ دل سے ہوا خواہ تو ہو
چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی راہ راست گمراہ تو ہو

ہر رنگ کو کہتا ہے فریب نظری　　ہر بو کو ہوائے منزل بے خبری
ہر حسن کو فلسفی کی آنکھوں سے نہ دیکھ　　دشمن کو مبارک ہو یہ بالغ نظری

ہاں فکر رسا دیکھ بڑا بول نہ بول　　گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت اتنی قیمت　　ہیرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک　　مشکل ہے کچھ آسان نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حسین بنتا ہے تجھے　　اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

دنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو　　یا جیتے ہی جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار　　بڑھنا ہے بڑھو، نہیں تو رستہ چھوڑو

وہ حسن ہی کیا ہے جو گلے کٹوائے　　فتنے برپا کرے قیامت ڈھائے
دیکھا ہوگا مگر نہ دیکھا ہوگا　　وہ حسن جسے دیکھ کے چپ لگ جائے

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں　　یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا　　ایک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

یگانہ کی ان رباعیات میں تمام فنی خوبیاں ملتی ہیں ان میں جامعیت بھی ہے اور خیال کی پوری ادائگی بھی۔ زبان و بیان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی اس کا اظہار بھی ملتا ہے۔ آخری زمانے میں انھوں نے زیادہ تر رباعیات ہی لکھی تھیں۔

یگانہ کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کی کمی ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا آرٹ قابل وقعت ہونے کے باوجود بہت بڑا نہ بن سکا اس میں وہ آفاقیت نہ آسکی جو اقبال، جوش، فراق اور مجاز کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے اپنے تصور حیات میں دنیا کے غم کو محسوس تو کیا مگر اس کو ایک نظریے کی صورت میں نہ دیکھ سکے ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کو ایک بڑے پس منظر کی تلاش نہ تھی اور جد وجہد کا پیغام بھی دیتے تھے لیکن زندگی کے فانی اور آدمی کے مجبور ہونے کے قائل تھے۔ ان میں ایک بہت بڑے شاعر بننے کے پورے امکانات تھے مگر انھوں نے اپنی کج روی کے پیش نظر زندگی دشواریوں میں گذار

دی لیکن اُف تک نہ کی۔ کاش وہ بھی تھوڑی بہت مصلحتِ وقت سمجھتے اس طرح ان کے آرٹ میں روح عصر کے عناصر زیادہ آجاتے تو ان کا ذہنی اُفق زیادہ وسیع ہو جاتا۔ اس کے باوجود وہ اردو کے ان غزل گو شعراء کی صف میں یقیناً شامل ہیں جن کے نام سے غزل کی شمع آج تک روشن ہے اور ان کے اس مرتبے کو ادب کے طالب علم کو پہچاننا چاہیئے اُنھوں نے لکھنؤ کے آخری دور کی شاعرانہ روایات سے بغاوت کر کے کوئی اسکول تو نہیں قائم کیا مگر فراق ایسے بڑے غزل گو کو متاثر ضرور کیا اور جو رچاؤ اور وقار ان کے کلام میں ملتا ہے وہ اصغر اور جگر کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ یگانہ کے خلاف جتنے ہنگامے اٹھائے گئے تھے اس کا کسی موجودہ شاعر کو سامنا نہ کرنا پڑا۔ اور ان صبر شکن حالات میں بھی وہ پوری خودداری کے ساتھ اپنے آرٹ کی پرورش کرتے رہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کو زمانے کی ناقدری کا نشانہ بننا پڑا وہ آزاد فکر اور روشن طبع شاعر تھے۔ ان پر جہالت اور تعصب نے ہر طرح کے وار کئے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اُن کے سینے میں زخم ناسور بن چکے تھے مگر جب بھی یہ درد شعر میں ڈھل کر آیا ہے تو وہ مردانہ وار حالات سے مقابلہ کرنے والا جنون بن کے آیا ہے کتنے ایسی بلند شخصیت کے لوگ ہوں گے جو اپنے خیالات اور نظریات کے لئے سخت سے سخت سزائیں برداشت کر لیتے ہیں اور پوری زندگی غم و اندوہ میں گزارنے کے باوجود اپنے کلام میں مزاح کی چاشنی، طنز کی نشتریت، لب لہجہ کا وقار، مضامین کی بلندی اور زبان و بیان کی قدرت کا اظہار کرتے ہیں۔

یگانہ کا آرٹ وہ آئینہ ہے جس میں ایک بلند شخصیت کے شاعر کی تنہا جد و جہد کی پوری داستان چھپی ہے اور آج بھی وہ حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ ابھی تک لوگوں نے ان کو نظر انداز کیا ہے یہ سلسلہ کب تک رہے گا کوئی کیا جانے۔ مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ قدر شناس نظروں نے ان کے کلام کو پہچان لیا ہے اور بہت جلد اردو ادب کا نیا مؤرخ بھی ان کو وہ بلند مقام عطا کرے گا جس کے وہ مستحق تھے۔

حبیب تنویر

غزل

بتلائیں راز برہمیٔ زلفِ یار کیا
سمجھائیں لذتِ سببِ انتشار کیا

سہنا پڑے گا عشق کے غم کا بھی بار کیا
کم تھا مرے لئے یہ غمِ روزگار کیا

ہونٹوں تک آکے خوفِ ہزیمت سے رُک گیا
اے دل یہی تھا نالۂ بے اختیار کیا

رکھا نہ اُن کے لطف و کرم کا بھی کچھ حساب
اب قطرہ ہائے خونِ جگر کا شمار کیا

ہاں رفتہ رفتہ باعثِ تسکینِ دل تو ہیں
وجہ نشاط ہوں گے مگر غم گسار کیا

دل چاہتا ہے مل کے کسی دن یہ پوچھ لوں
ہوتے ہو تم بھی درد سے یوں بے قرار کیا

تنویر اب کی ہم نے ہی انکار کر دیا
تجدیدِ عشق خوب ہے پر[1] بار بار کیا

[1] پر بمعنی مگر متروک ہے۔

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

مہاتما بدھ کی یاد میں

مژدۂ عیش ملا قیدیٔ زنداں کے لئے ہوئی اُمید رفو چاک گریباں کے لئے خواب مایا[3] نے جو دیکھا تھا وہ سچا نکلا دردمندوں کی دعاؤں کا نتیجہ نکلا

آ گیا تحفۂ معراج دل و جاں کے لئے پھر وہ پیدا ہُوا ہمدردِ انساں کے لئے آدمیت کے فلک پر وہ ستارا نکلا سامنے جس کے رُخِ مہر بھی پھیکا نکلا

ہو چکا ہے جو نمودار جہاں میں پہلے دیوتا جس کی سلامی کے لئے رکتے ہیں

آ چکا ہے جو کئی بار جہاں میں پہلے جس کے سجدے کو فرشتوں کے بھی سر جھکتے ہیں

درِ لاہوت عجب شان سے وا ہوتا ہے وعدۂ عالمِ اسرار وفا ہوتا ہے روشنی دانش و ادراک کے ایواں میں ہے تازگی مہر و محبّت کے گلستاں میں ہے

پردۂ غیب سے اعجاز نما ہوتا ہے ازلی عقدہ کشا عقدہ کشا ہوتا ہے چاشنی ایک نئی علم میں عرفاں میں ہے زندگی ایک نئی گردشِ دوراں میں ہے

پاٹلی پتر[1] کے گلشن میں بہار آتی ہے صدق و اخلاص کے کانٹوں میں وفا تُلتی ہے

کوہِ ممتانہ[2] کے دامن میں بہار آتی ہے ترک و ایثار کی اک راہ نئی کھلتی ہے

بُرج مایا[3] کے حمل کا جو چمک اُٹھا ہے دل مہاراجہ سدھودھن[4] کا پھڑک اُٹھا ہے دل تڑپتا ہُوا سینے میں صدا دیتا ہے دردمندوں کو محبّت کی دوا دیتا ہے

جلوۂ فطرتِ بیدار جھلک اُٹھا ہے گلشنِ عالمِ اسباب مہک اُٹھا ہے اپنے اعجاز سے مُردوں کو جلا دیتا ہے غمِ دُنیا کے مریضوں کو شفا دیتا ہے

زندگی ایک نئی بینشِ منظر ملتی ہے بے سکت جو ہیں انھیں تاب و تواں ملتی ہے

بدھ اوتار[5] کی دنیا کو خبر ملتی ہے بے نیاہوں کو رہِ امن و اماں ملتی ہے

---

۱ شہر پٹنے کا قدیم نام   ۲ کوہِ ممتانہ سے مراد ہے ہمالہ پربت   ۳ مایا مگدھ دیش (موجودہ بہار) کے مہاراجہ سدھودھن کی مہارانی کا نام جن کے بطنِ مقدس سے مہاتما گوتم بدھ کا ظہور ہُوا۔   ۴ مہاراجہ سدھودھن۔ مہاتما گوتم بدھ کے پدرِ بزرگوار کا نام۔
۵ اوتار یعنی نزول۔

صیدِ زخمی کو جو سینے سے لگا کر رو دیا مرغِ بسمل کو زمیں سے جو اُٹھا کر رو دیا
چوٹ سی چوٹ کلیجے پہ جو کھا کر رو دیا پاس اک بیکس و بیمار کے جا کر رو دیا
جس نے بربادِ جوانی سے لڑکپن دیکھا
جس نے مخلوق کو مخلوق کا دشمن دیکھا

رنگ رلیوں کی فضائیں جسے اُلجھن تھیں بہت عیش و عشرت کی ہوائیں جسے اُلجھن تھیں بہت
حلقۂ زلفِ دوتا میں جسے اُلجھن تھی بہت پنجۂ ناز و ادا میں جسے اُلجھن تھی بہت
حُسن کی تہ میں فنا جس کو نظر آتی تھی
عاشقی ایک بلا جس کو نظر آتی تھی

راج کے ٹھاٹھ کو جو ایک مصیبت سمجھا تاج کے تخت کے اعزاز کو لعنت سمجھا
ظلم کو جور کو جو وجہِ اذیت سمجھا جس نے سمجھا تو بس اک رازِ محبت سمجھا
سلطنت سے تھا نہ کچھ کام حکومت سے تھا
مطمئن دل تھا تو اک درد کی دولت سے تھا

منہ زر و مال کے انبار سے موڑا جس نے دوستداروں کو عزیزوں کو بھی چھوڑا جس نے
زن و فرزند کے رشتے کو بھی توڑا جس نے سلسلہ زیست کا نروان سے جوڑا جس نے
چوٹ کھا کھا کے نئی طرحِ عمل ڈالی ہے
جس نے انسان کی فطرت ہی بدل ڈالی ہے

جس کو دم بھر نہ رہا شوکتِ زر سے مطلب جس کو دم بھر نہ رہا لعل و گہر سے مطلب
جس کو دم بھر نہ رہا تیغ و تبر سے مطلب جس کو دم بھر نہ رہا شور و شر سے مطلب
کج کلاہی کی طرف جس کی نظر ہی نہ اُٹھی
تاجِ شاہی کی طرف جس کی نظر ہی نہ اُٹھی

جس نے بچپن کی ادائے گزراں کو دیکھا جس نے ڈھلتے ہوئے افرادِ جواں کو دیکھا
جس نے ملتے ہوئے پیری کے نشاں کو دیکھا جس نے ہر کیفیتِ عمرِ رواں کو دیکھا
درس دیتا ہی رہا ہر غمِ تازہ جس کو
سبق آموز تھا مُردے کا جنازہ جس کو

خود کو اپنا ہی بنایا ہے نشانہ جس نے زینتِ جسم کیا ترک کا بانا جس نے
مہر و اُلفت کا لُٹایا ہے خزانہ جس نے شخصیت اپنی بنائی ہے یگانہ جس نے
جس کو تعلیمِ بنارس سے بھی تسکیں نہ ہوئی
علم حاصل تو کیا قلب کی تزئیں نہ ہوئی

روشنی بودھ گیا سے ہوئی حاصل جس کو مل گئی منزلتِ رہبرِ کامل جس کو
اپنے حلقے میں کیا عقل نے داخل جس کو کر دیا ہوش نے نروان کے قابل جس کو
پا لیا اپنا پتہ ہو گیا جب ذات میں گُم
آشکارا جو ہوا، ہو کے مساوات میں گُم

جس کی عظمت کا ہے صدیوں سے زمانہ قائل جس کی جانب ہوا پھر آج زمانہ مائل
جس کے رستے میں نہیں اب بھی فتنہ حائل جس کے آگے ہے دراز آج بھی دستِ سائل
پیروی جس کی محبت کا سبق دیتی ہے
نوعِ انساں کو اخوت کا سبق دیتی ہے

جس کی تعلیم سے وابستہ ہے قوموں کی نجات جس کی تعلیم کا اعجاز ہے تہذیبِ حیات
جس کی تعلیم سے شیطان نے بھی کھائی ہے مات جس کی تعلیم سے ہے امن و عالم کو ثبات
جس کی تعلیم کا پھر دورِ نیا آیا ہے
جس کی تعلیم کو نہرو نے بھی اپنایا ہے

سید لطیف حسین ادیب

مثنوی پیامِ ساوتری

حضرت شام موہن لال جگر بریلوی ایک اونچے غزل گو کی حیثیت سے آجکل (اکتوبر ۱۹۵۲ء میں) متعارف کرائے جا چکے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا یہ ایک ناتمام سا پہلو تھا۔ تمامی کیفیت مثنوی "پیام ساوتری" میں ملتی ہے۔ جہاں ایک مقصد ہے آدرش ہے اور اس کو منوانے کے لئے بے پناہ جذبہ۔ انھوں نے "پتیلی" ہی نہیں پکائی "دیگ" پکانے کی بھی جرأت کی۔ "پتیلی" اور "دیگ" کی نسبت ڈھکی چھپی ہوئی نہیں تھی، لیکن وہ عہدہ برآ ہوئے۔ نہ نمک پھیکا رہا نہ آنچ کی کسر رہی۔ ان کی غزل میں ہم نے دیکھا کہ تحرک ایک ازلی پرتو ہے، وہ کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ روح میں بالیدگی و انبساط کے طوفان اُمنڈ آتے ہیں۔ پڑھنے والا کچھ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے ہی دل کی بات کہہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ غزل کی بات تھی۔ مثنوی میں زیادہ مربوط، زیادہ واضح طور پر خیالات کو نظم کرنا پڑتا ہے۔ "پتیلی" اور "دیگ" والا معاملہ ہے۔ ایک آنچ کی کسر والے امکانات ہر ہر منزل پر پیدا ہوتے ہیں۔ جگر صاحب ان منزلوں سے بھی گذر گئے۔ انھوں نے سب کچھ کہا اور خوب کہا۔ سوچی سمجھی باتیں سامنے رکھیں۔ بڑی حد تک اپنے "فلسفۂ غم" سے گریز کیا، اور زندگی کرنے کے لئے عمل کو ضروری قرار دیا۔

جس سے کھل جائے فریبِ حسنِ تدبیر و عمل
ایسی بھی اک کوششِ ناکام ہونا چاہئے

یہ بلند آہنگی اور اس کے جلو میں نسوانی سیرت کا افسانوی پس منظر، اُردو مثنوی کا نیا موضوع ہیں۔

جیسا نام سے ظاہر ہے مثنوی قدیم ہندو دیومالا پر مبنی ہے ساوتری ستیہ وان کا قصہ پرانوں میں ملتا ہے، اور چونکہ ستی دھرم کا مثالی نمونہ ہے۔ اس لئے آج بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جگر صاحب نے خود کہا ہے "ساوتری ستیہ وان" کا قصہ ہر سال ہرا ماوس کے دن پوجا کے سلسلے میں میرے خاندان میں بڑی بوڑھی عورتیں دہرایا کرتی ہیں۔ اس قصے کا پلاٹ سیدھا سادھا اور گنجلک سے پاک ہے۔ ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ درمیانی کڑیاں مربوط، مضبوط اور واضح ہیں ---- "ست جگ کے زمانے میں ایک راجا تھا جس کا نام اشوپت تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہندوؤں میں خیال کیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جس کے کوئی پانی دینے والا نہ ہو اس کی نجات نہیں ہوتی۔ کچھ اس خیال سے، کچھ تاج و تخت کے وارث نہ ہونے کے خیال سے، پیری میں راجا بہت غمگین رہنے لگا۔ اُس نے اپنے پنڈتوں اور منجموں سے مشورہ کیا، آیا اولاد پیدا ہونے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی قسمت میں اولاد نہیں ہے۔ ہاں اگر تاج و تخت چھوڑ کر جنگل میں عبادت کریں تو قدرتِ خدا سے کچھ بعید نہیں۔ راجا نے جنگل میں جا کر اٹھارہ سال تپ کیا۔ اس تپ کا یہ اثر ہوا کہ ساری کائنات گھبرا اٹھی اور سُرلوک میں دیوتاؤں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اشوپت کی ریاضت و عبادت اس لئے تو نہیں کہ ہمارے حقوق و اختیارات حاصل کرے۔ یہ سب برہما (خالق عالم) کے پاس گئے کہ ان سے اپنے اندیشے بیان کریں اور ہدایت چاہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ راجا کسی کے اختیارات چھیننا نہیں چاہتا۔ اندر کا سا اس کا اقبال ہے۔ کبیر کی سی دولت ہے۔ اس کے سامنے جمراج کا بھی اقتدار ہیچ ہے۔ یہ بات جمراج کو ناگوار ہوئی۔ انھوں نے ردو قدح کیا۔ برہما نے تقدیر و عمل پہ درس دے کر ان کی تشفی کی اور آخر میں فرمایا کہ راجا کا تپ اولاد کے لئے ہے۔ اب برہما نے ساوتری دیوی کو بلایا اور ان سے کہا کہ راجا اشوپت اٹھارہ برس سے جنگل میں تپ کر رہا ہے، تم اسے جا کے درشن دو اور کہو کہ تیری ریاضت قبول ہوگئی۔ راجا جنگل سے گھر پلٹ آیا اور ایامِ مقررہ کے بعد اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ چونکہ اس کا مژدہ ساوتری دیوی نے دیا تھا اس لئے لڑکی کا

نام ساوتری رکھا گیا۔ جب ساوتری سولہ سال کی ہوئی تو راجہ کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ لیکن لڑکی میں کچھ ایسا غیر معمولی حسن تھا کہ کوئی تاب نہ لاسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر بجائے اس کے کہ شادی کا خیال پیدا ہو ترکِ دنیا و تجرد کی آرزو دلوں میں پیدا ہوتی تھی۔ جب عام طریق پر ساوتری کا مسئلہ حل نہ ہوا تو راجا نے مجبور ہو کر بیٹی سے کہا کہ اب تم خود ہی اپنے لئے بر تلاش کرلو، تیرتھ ستھانوں میں جاؤ۔ ممکن ہے وہاں کوئی لائق بر مل جائے۔ ساوتری نے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے سفر کیا اور ایک مقام پر ستیہ وان کو دیکھا۔ وہ ایک ایسا جوان تھا جو اس کے حسن و جمال سے مرعوب و منفعل نہ ہو سکا۔ ساوتری سفر سے پلٹ آئی۔ راجا سے کہا کہ ستیہ وان کو میں نے بنظر شوہر دیکھا ہے۔ راجا اور سب اہلِ دربار خوش ہو گئے۔ مگر نارد منی نے برہمی ظاہر کی اور کہا کہ ستیہ وان ایک سال بعد مر جائے گا، اس لئے شادی بے کار ہے۔ راجا نے ساوتری کو مخاطب کر کے کہا کہ بیٹی کیا کیا جائے کچھ اور سفر و سیاحت کر ڈالو۔ ساوتری نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ اس کے بعد راجا اشوپت جنگل میں گئے، جہاں ستیہ وان کے ماں باپ عبادت کرتے تھے اور ساوتری کا بیاہ ستیہ وان سے کر دیا۔ ساوتری کا بیاہ ہو گیا اور اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ شوہر کی موت کو کس طرح ٹالنا چاہئے۔ اس نے بالکل ایک سادھو کی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ قوتِ ارادی کو ترقی دینا شروع کیا اور عبادت و ریاضت سے یقین کو مضبوط کیا کہ شوہر کی موت ہو نہیں سکتی اور ہو گی تو میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ آخر ستیہ وان کی موت کا دن آیا۔ یہ دن اور اس کے پہلے دو دن ساوتری نے اپواس میں گزارے تھے۔ اپواس وہ برت ہے جس میں کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ اس دن شام کو ستیہ وان کے ساتھ خود بھی بن میں گئی کہ اسے اکیلے چھوڑ نہیں سکتی۔ وہاں ستیہ وان ایک پیڑ پر لکڑی کاٹتے کاٹتے دردِ سر سے بیتاب ہوا۔ نیچے اترتے اترتے بے ہوش ہو گیا۔ ساوتری اس کے پاس بن میں بیٹھ گئی۔ پہلے جم کے دوت یعنی قاصد ستیہ وان کی روح قبض کرنے آئے۔ مگر ساوتری کی پُرجلال صورت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کے پاس آئیں۔ اب جمراج خود آئے اور ستیہ وان کی روح قبض کر کے عالمِ علوی کی سمت روانہ ہوئے۔ ساوتری نے ان کا پیچھا کیا اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد ستیہ وان کی روح بخشوالی اور دنیا کو دکھا دیا کہ ستی دھرم کیا چیز ہے اور کس طرح یقین

عمل کی قوت سے مردے زندہ ہو سکتے ہیں۔"

(بحوالہ مکتوب جگر صاحب۔ ۳۔ اپریل ۱۹۵۳ء)

اس مثنوی میں کل چودہ سو اشعار ہیں۔ بحر وہی ہے جو نسیم نے اختیار کی ہے۔ مثنوی کی تقسیم اسی ڈھنگ پر ہے جس طرح متقدمین کرتے آئے ہیں۔ مختلف عنوانات ہیں اور ہر عنوان ان اشعار کا اختصار ہے جو اس کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں۔ مثنوی مختلف اوقات میں کہی گئی۔ غالباً دسمبر ۱۹۲۵ء یا جنوری ۱۹۲۶ء میں اس کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۲۹ء میں تکمیل کو پہنچی۔ پھر نظرِ ثانی کی جس کا سلسلہ اب تک جاری رہا۔" (دیباچہ مصنف) مثنوی ایک فاضل دوست کو بھیجی، اور ان کی رائے بھی مانگی۔ انھوں نے لکھا "ایک اعلیٰ درجے کی مثنوی میں جو آپ کے قلم سے نکلے جس قدر روانی اور زورِ بیان ہونا چاہئے وہ اس میں پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ زورِ بیان سے یہ نظم بالکل معرّا ہے۔ ہرگز نہیں بعض موقعوں پر آپ نے روانی اور زورِ بیان کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ باید و شاید مثلاً کرم کے متعلق ساوتری کی تقریر ہر دو محاسن مذکورہ کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔ مگر کل نظم اس اعتبار سے جیسی ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہے۔ بقول حضرتِ مصنف "یہ نہایت مختصر و جامع تبصرہ تھا۔" چنانچہ"۔۔۔۔ ترمیم لازمی ٹھہری اور شروع کر دی گئی۔ اب کے قطع و برید کا سلسلہ جو شروع ہوا تو آج تک برابر جاری رہا۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہر نسخہ کچھ نہ کچھ بدلتا چلا گیا۔۔۔۔" (دیباچہ مصنف)

واقعات کی تمام ترتیب ہندی ناول "ساوتری ستیہ وان" سے اخذ کی گئی ہے۔ کہیں کہیں تاریخی واقعات سے بچ کر شاعرانہ تصرف سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ساوتری جب دمت سین کی کٹی پر پہنچتی ہے تو ہندی ناول میں ستیہ وان بچھڑے سے کھیلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ مثنوی میں اس موقع پر ستیہ وان کو پھلواری میں کھڑے ہوئے دکھایا ہے۔

مثنوی کی ابتدا حمد اور مناجات سے ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اردو مثنوی کی یہ ایک روایت ہے۔ "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" کی ابتدا بھی حمد اور مناجات سے ہوتی ہے۔ بعض نے اجتناب بھی کیا، لیکن "عشق کی تعریف" اور "شکایتِ فلک" سے آگے نہ بڑھ سکے۔

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال (میر)

اور

پہنچی ہے کارد استخواں تک — بے مہر ہے آسماں کہاں تک (راسخ)

میر حسن نے کافی طویل حمد لکھی ہے، انداز فلسفیانہ اور مقابلتاً مشکل ہے، گویا آورد ہے۔ آمد اور روانی نہیں۔ نسیم کے یہاں کمال کا اختصار ہے۔ یقیناً قابل تقلید اختصار، اس سے ان کی فنّی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری　　ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسیر　　حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے　　یعنی کہ مطیعِ پنج تن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی　　کرتا ہے زباں کی پیش دستی

جگر صاحب نے بائیس اشعار حمد پر اور تیس اشعار مناجات پر نظم کئے ہیں۔ بظاہر یہ طوالت عیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ اُن کا طرزِ بیان نہ صوفیانہ، نہ فلسفیانہ، بلکہ نفسیاتی ہے۔

تخیل کی مدد سے نئے مضمون کی تلاش اور "لے دل تبو خرسندم تو بوئے کسے داری" والی باتیں نہیں ہیں۔ انھوں نے پہلے بشر کی ذہنی کیفیات سمجھنے کی کوشش کی ہے یعنی پہلا انسان کیا تھا، ماحول کیفیت کیا تھی۔ اس ماحول میں اس نے خود کو کس طرح کھپایا، کس طرح اس کے شعور نے رہنمائی کی اور بالآخر وہ ایک "مدارِ قوّت" اور "جوہرِ کائنات" کا قائل ہو گیا۔ یہ خدا کی توصیف نہیں ہے۔ "پہلے بشر" کی حیرانگی اور اس کی ذہنی ترقی کا ذکر ہے۔ بغیر استدلال اور فلسفیانہ غور و فکر کے وہ خدا کی برتری کا قائل ہو جاتا ہے۔ حمد کا مطلب خدا کی تعریف اور اس کی عظمت کا اظہار ہے۔ لیکن عظیم تر بات یہ ہے کہ انسانی امکانات کو سامنے رکھ کر اس کی قدرت تسلیم کی جائے۔

تخلیق ہوئی جب بشر کی!　　حیران تھا جس طرف نظر کی
جو دفترِ کائنات دیکھا　　نیرنگِ عجائبات دیکھا
جب عقل و خرد نے پر نکالے　　دفتر دنیا کے دیکھ ڈالے
مجبور رہا جو ہو کے ششدر　　سر عجز سے رکھ دیا زمیں پر
کہنے لگا اے مدارِ قوّت　　اے جوہرِ کائنات و فطرت
آتا نہیں تو سمجھ میں کیا ہے　　لیکن یہ یقین ہے بڑا ہے
قدرت نہیں کوئی تیری محدود　　کیوں کر نہ بنائیں تجھ کو معبود
سر عجز سے خم ہے تیرے آگے　　خاموش قلم ہے تیرے آگے

یہ مناجات کا انتخاب ہے ؎

جب سے مجھ کو شعور آیا　　جب سے آنکھوں میں نور آیا
بازارِ جہاں کو خوب دیکھا　　ارزاں کو، گراں کو خوب دیکھا
دولت ہے تو ہے سخن کی دولت　　عزّت ہے تو ہے سخن کی عزّت
اربابِ سخن ہیں مرد آزاد　　ہر حال میں ہر خیال میں شاد
رہتے ہیں یہ بے پیئے ہوئے مست　　خم خانہ بدوش و جام در دست
اے خالقِ جوہرِ معانی　　سرچشمۂ فیض خوش بیانی
رحمت سے مجھے نہال کر دے　　دامانِ سخن گہر سے بھر دے

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے عموماً مثنویوں میں آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے ؎

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب　　کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
مئے ارغوانی پلا ساقیا　　کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا
پلا ساقیا مجھ کو اک جامِ مُل　　جوانی میں آیا ہے ایامِ گُل
پلا آتشیں آب پیرِ مغاں　　کہ بھولے مجھے گرم و سردِ جہاں
شتابی مجھے ساقیا دے شراب　　کہ یہ حال سن کر ہوا دل کباب

نسیم اپنے قلم کا ذکر کرتے ہیں ؎

کرتا ہے جو ختمے سوادِ نامہ　　یوں حرف ہیں نقشِ پائے خامہ
گُل کا جو الم چمن چمن ہے　　یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
پھرنا جو وطن کو مدّعا ہے　　اب صفحہ پہ یوں قلم پھرا ہے
ہے بس کہ یہ چرخ جور پیشہ　　یوں خارِ رہِ قلم ہے ریشہ
گُل چیں کا جواب پتا ملا ہے　　یوں شاخِ قلم سے گُل کھلا ہے

لیکن اس طرح آغاز ہو تو بھی حرج نہیں ہے محض مروّجہ طرز کی پابندی ہے۔ جگر صاحب کے یہاں عرضِ مدّعا کے لئے کسی تمہید یا کسی گریز کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

ست جگ کا زباں پہ ہے فسانہ　　کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ
طفلی کا تھا کائنات کا دَور　　جو طور تھا سادگی کا تھا طَور
بھولے تھے لوگ جیسے بچّے　　سیدھے سادے زباں کے سچّے
آپس میں بشر تھے بھائی بھائی　　یکساں تھی نگاہ میں خدائی

(ست جگ کا حال)

تاروں کی ہے چھاؤں کچھ اندھیرا　　ہوتا چلا آتا ہے سویرا
تاریکی میں نور کے ہیں آثار　　پردے میں جھلک رہے ہیں انوار

سناٹا فضا میں چھا رہا ہے — فطرت کو کچھ انتظار سا ہے
مُنہ دیکھتا ہے اثر دعا کا — ہے وقت قبول التجا کا
ساوتری اب کٹی سے نکلی — پُوجا کرنے خوشی سے نکلی

(ساوتری کا اپواس)

مثنوی آغاز سے انجام تک بالکل سیدھے سادے طریقے پر پہنچتی ہے۔ پہلی کڑی دوسری کڑی کا پتہ دیتی ہے۔ داستان کی گنجلک اور مختصر قصوں کا اُلجھاؤ نہیں ہے، اور نہ ہی جدید افسانے کی ٹیکنیک برتی گئی ہے، کوئی اُلٹ پھیر، کوئی اُلجھاؤ نہیں ہے۔ پلاٹ کا سارا حُسن اس کے قصّے پن میں ہے۔ حمد اور مناجات کے علاوہ اُنیس ٹکڑے یا باب مثنوی کے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضبوطی سے ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے، اور نہ ہی دوسرا بیان پہلے کی تکذیب کرتا ہے۔ نظم اس سادگی کی متحمل ہے۔

قصّے کا موضوع "ہندوانہ" ہے، اور غالباً اردو مثنوی میں اپنی قسم کی سب سے پہلی کوشش ہے۔ ہندو کرداروں پر مبنی مثنویاں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ نصرتی کی "منوہر و مدمالتی" یا ہنر کی "نیہ درپن" اور "اوتار درپن" کافی مشہور ہیں۔ لیکن ہندی جام میں پارسی شراب بھری گئی ہے۔ چند ہندی الفاظ کا استعمال، کرداروں کا منوہر و مدمالتی نام اس فضا، اس رس، اور اس تھرتھراہٹ کی ضمانت نہیں کرتے جو ہندی سے متھ کر امرت کی شکل میں نکالا جائے۔ چنانچہ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ منوہر و مدمالتی کو اس صدی میں بھی "دائرۂ شریعت" میں داخل کیا گیا تھا۔ عاقل خاں رازی نے اس کا نام مہر و ماہ رکھا اور فارسی میں ترجمہ کر ڈالا ؎

حدیثِ روشن و دل خواہ گویم — سخن از عشقِ مہر و ماہ گویم
کنم عشقِ منوہر را کتابے — دہم از نام مہر آں را خطابے
نوائے عشقِ مدمالت سرایم — ولے از پردۂ ماہش نمایم

گویا فارسی تہذیب ہندی نام کی متحمل نہیں تھی۔ ترجمے کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ ناموں میں تبدیلی کر دی جائے۔ بالکل آج کی اُردو کی طرح جو آغوش میں ہندی و سنسکرت کے موزوں اور سرل اور رچے ہوئے الفاظ کو جگہ نہ دے سکی جس نے اُردو کو بجائے کلچرل روایات کے حامل بنانے کے اس حد تک بے گانہ کر دیا کہ وہ ایک عام ہندو کے احساسات و جذبات کا مخرج و منبع نہ بن سکی۔ اس کی نظر جب بھی ادب پر پڑی تو وہ اُردو نظم کی شعریت کی تو تعریف کر سکا لیکن جس رس کا وہ جویا تھا یا وہ کیف جو روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کرتا ہے اُس کو کبیر۔ میرا بائی۔ تلسی داس، رس کھان۔ سور داس۔ دیو، متی رام اور بہاری لال وغیرہ ہی میں مل سکا۔ یہ اُردو کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ جگر صاحب نے سفالِ ہند میں خالص ہندی ٹھرا بھرا ہے۔ فارسی دخترِ رز کا خون رگ جاں نہیں۔ ان کی شراب میں وہ مستی ہے جو تیر بہدف ہے۔ اس میں ہمارے کلچر، ہمارے احساسات کی نمائندگی ہے۔ یہاں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ جگر صاحب خود فارسی کے اسکالر ہیں۔ فارسی کا رس اُن کو ورثے میں ملا ہے۔

انگریزی ادب نے یونانی اور لاطینی سے کیا کچھ نہیں حاصل کیا۔ ہر اچھا انگریزی داں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ خود بیسویں صدی میں بلکہ انیسویں صدی کے آخری نصف دَور سے اُردو ادب نے انگریزی سے کتنا استفادہ کیا۔ ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، لیکن کیا یہ غضب نہیں ہے کہ ہم نے سنسکرت کو فراموش کیا۔ قدیم ہندو دیومالا سے پرہیز کیا اور اُردو کو جس کی ابتدائی جڑیں اس زبان سے ملتی ہیں علیحدہ کر کے ایک حد قایم کر دی، وسعت سے محروم کر دیا۔ انگریزی اور اُردو اپنی اپنی جگہ ہیں۔ پردیسی ادب نے (یونانی، لاطینی، انگریزی) ان کو نئے الفاظ دیئے، اور فکر کے نئے طریقے بخشے، محکوم نہیں بنایا۔ سنسکرت الفاظ اور خیال کا اضافہ کر سکتی ہے، ایسے تصوّرات دے سکتی ہے جو ہماری قومی زندگی کے لئے امرت ہیں۔ "پیام ساوتری" میں سنسکرتی ہے۔ بھارتیتا ہے، ستی دھرم کا آدرش ہے۔ ہر مشرقی عورت کے لئے وہ قوتِ حیات ہے جو موت پر بھی فتح پا سکتی ہے۔

اُردو مثنوی کی تمام کائنات عشق ہے۔ چند صوفیائے کرام مثنوی نگاروں کو چھوڑ کر ہر مثنوی میں روایتی۔ پامال اور تصوّراتی عشق ملے گا۔ زندگی تمام تر عشق نہیں ہے، نہ تھی اور نہ ہوگی۔ زندگی کی کچھ اور بھی لذتیں ہیں جو جنس سے ماورا ہیں۔ مثنوی "پیام ساوتری" ایک ایسی بالغ کوشش ہے جس میں زن و شوہر کی محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ محبت مثالی ہے، اور دوسروں کے لئے نمونہ۔ اس میں رچاؤ ہے مٹھاس ہے جنسیات کہ عرفِ عام میں ہم جس کو شہوانیت کہتے ہیں وہ اُردو مثنویوں میں ملتی ہے۔

جنسی لذت کا چٹخارا عام ہے۔ ایک پر سرام، ایک بے نظیر، ایک بکاؤلی، ہر مثنوی میں جاری وساری ہے۔ تاہم جنسی ہیجان آنکھوں پر تاریکی کے پردے نہ ڈالے تو شاعر بس اتنا ہی کہہ کر گزر جاتا ہے ؎

چھایا تھا فضا میں رنگ دلجو   مہکی ہوئی تھی شباب کی بُو
ذرّہ ذرّہ نشاط آگیں!   کیفیت و انبساط آگیں
رشتہ جب ان کا ہو گیا پاک   پردے نا محرمی کے تھے چاک
دلدادہ و دلستاں تھے دونوں   دو قالب اور ایک جاں تھے دونوں
دیدار کی کھُل گئیں جو راہیں   ملنے لگیں شوق کی نگاہیں

(ساوتری کا بیاہ)

یہاں شاعر کی نظر "اونچی کیرتی" کے اتار چڑھاؤ میں اٹک کر نہیں رہ جاتی۔ اس کا مشاہدہ زیادہ عمیق اور اس کا بیان بہت پُر اثر ہے۔

جیسا میں نے کہا روایتی عشق و محبت نے اردو شاعروں کو مشاہدۂ فطرت سے باز رکھا، اور مثنویوں میں جستہ جستہ منظر کشی ملتی ہے لیکن رسم اور تکلف کے ساتھ۔ کلیم الدین احمد کے الفاظ جو انھوں نے میر حسن کے لیے استعمال کئے تھے: "بیان مرصّع ہے۔ شاعر نے پھولوں کا معطّر گلدستہ مرتب کیا ہے جس سے دل و دماغ مسرور ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ پھول مصنوعی ہیں۔ جو خوبصورتی کسی دیہاتی پھول کی سادگی میں ہوتی ہے وہ سارے باغ کو میسّر نہیں۔" قریب قریب ہر اردو مثنوی پر لاگو ہو سکتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ ہمارے مثنوی نگاروں کا قلم وہیں تیز چلتا ہے جہاں اختلاط، غمِ فراق اور وصل کی باتیں ہوتی ہیں۔

اس کے خلاف مثنوی "پیام ساوتری" میں ایک صبح کا منظر ان الفاظ میں ملتا ہے ؎

تاروں کی ہے چھاؤں کچھ اندھیرا   ہوتا چلا آتا ہے سویرا!
تارے ابھی جھلملا رہے ہیں   چھپنے کو ہیں ٹمٹما رہے ہیں!
تاریکی میں نور کے ہیں آثار   پردے میں جھلک رہے ہیں انوار
سنّاٹا فضا میں چھا رہا ہے   فطرت کو کچھ انتظار سا ہے
کیا نور و سُرور کا سماں ہے   رحمت کے ظہور کا سماں ہے
مُنہ دیکھتا ہے اثر دعا کا   ہے وقت قبول التجا کا

اس کے بعد تڑکا ہو جاتا ہے ؎

تڑکے کا سماں وہ عالم نور!   بکھرا ہوا دور تک وہ کافور
وہ نور میں جھلکیاں شفق کی   نارنجی کہیں، کہیں سنہری!
میدان میں سبزۂ دوب کا فرش   شبنم کے وہ قطرے انجم فرش
موتی بکھرے ہوئے پڑے ہیں   ہیرے ابھرے ہوئے جڑے ہیں
اشجار میں کونپلیں نئی ہیں   دھانی، عنابی، کتھئی ہیں
نکھرے ہوئے ہیں ہرے ہرے برگ   چکنے چکنے نئے نئے برگ
ننھی کلیاں غضب سجیلی   طوسی، نارنجی، نیلی، پیلی
چھو جائے ہوا تو گل کھلائیں   چٹکیں کھلیں نکہتیں اڑائیں
جھاڑی ہے کریل کی طرحدار   چُنری اوڑھے ہے یا کوئی نار
بھینی بھینی گلوں کی خوشبو   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے دلجو

اور یہ ہے ایک شام کا منظر ؎

دن ڈھل گیا شب کا دَور آیا   آخر ہوئی شام اندھیرا چھایا
گُنجان گھنا گھنا وہ جنگل!   سنسان ڈراونا وہ جنگل
ہیبت سی جہاں پہ چھانے والی   پھیلی ہوئی رات کالی کالی
آسیب و بلا نے بن کو گھیرا!   ظلمت کا ہجوم گھُپ اندھیرا
ظلمت وہ کہ جس سے بھوت بھاگے   آنکھوں سے نظر بڑھے نہ آگے
آغوشِ عدم تھی رات کیا تھی   میّت تھی کائنات کیا تھی
اشجار کا سائیں سائیں کرنا   خونخوار درندوں کا گزرنا
ہیبت سے ہوا کا بند تھا دم   پُر ہول سکوت ہُو کا عالم
سنکے جو ہوا تو جی نکل جائے   پتّہ کھڑکے تو دل دہل جائے
ایسے میں اگر کہیں بشر آئے   اپنے ہی سے ہول کھا کے مر جائے

اور یہ ہے ایک حسین عورت کی عبادت کا منظر ؎

ساوتری اب کُٹی سے نکلی   پُوجا کرنے خوشی سے نکلی
ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے   چوٹی سلجھا کے مانگ بھر کے
وسواس سے دل کو پاک کر کے   باطن میں یقیں کا رنگ بھر کے
بیٹھی ہے بچھائے کُشا کا آسن   ہے گھی کا چراغ آگے روشن
چاول، کافور، دھوپ اور گھی   لونگیں، روئی، سپاریاں بھی
کچھ پھُول، بتاشے اور اک پان   پُوجا کا سبھی ہے جمع سامان
پھیلی ہوئی ہے جو بُو ہَوَن کی   مہکی ہوئی ہیں ہوائیں بن کی

دل دھیان میں ہاتھ میں ہے سُمرن   پُوجا میں لگا ہوا ہے تن من

چھایا ہے سکون تن بدن پر   ہے سانس نسیم سے سبک تر

مورت ہے وہ دھیان کی سراپا   ترشا ہوا بُت ہو جیسے رکھا

ان اشعار کو دھیان میں لا کر ایک مصوّر بڑی آسانی سے نظر فریب تصویریں کھینچ سکتا ہے۔

یہ تینوں اقتباس اپنی اپنی جگہ مکمل ہلکی پھلکی نظمیں ہیں۔ ان میں بلا کی شعریت اور اثر انگیزی ہے۔

بیانیہ شاعری میں دوسروں کی تصویر کھینچنا، دوسروں کے جذبات کو صحیح صحیح پیش کرنا فن کار کے لئے مشکل کام ہے۔ تخیل کی معمولی بے راہ روی تصویر غلط بنا سکتی ہے، اس کے فن اور اثر میں کمی کر سکتی ہے۔ شاعر عموماً ایسے موقع پر صنائع بدائع سے کام لیتے ہیں۔ لیکن دیکھا کچھ ایسا گیا ہے کہ مبالغہ اور صنائع لفظی اور معنوی ظاہری حسن تو بڑھا دیتی ہیں لیکن اثر گھٹا دیتی اور محاکاتی پہلو تاریک کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی تصویر اسی وقت ممکن ہے جب کہ شاعر خارجی واقعات کو اس حد تک اپنا کر لے کہ وہ اس کے اپنے ہی بن جائیں یعنی تصویر کا موضوع یا واقعہ کا ہیرو وہ خود ہو جائے ؎

محویت شہ کی ہے یہ صورت   پتھّر کی دھری ہو جیسے مورت

چیتل، پاڑھے، پلنگ، لنگور   کیفیت بندگی سے مخمور

راجا کے ہیں ارد گرد بیٹھے   چیلے ہوں کسی رشی کے جیسے

ہے جسم میں کچھ تو استخواں ہیں   یا کھال ہی اور جھریاں ہیں

لب بند ہیں، بند دیدہ و گوش   ہیں یادِ خدا میں خود فراموش

چھٹکی ہے بھبھوت تن بدن میں   ویراگ برس رہا ہو بن میں

چہرے سے جلال ہے نمودار   جنگل میں جھلک رہے ہیں انوار

تصویر سکوں کی ہیں سراسر   دم بھی کہیں رک رہا ہے چل کر

آئینۂ طاعت و صفا ہیں   تصویر تصوّرِ خدا ہیں

(راجا اشوپت کا تپ)

اتنے ہی میں چند بھوت آئے   بھیجے ہوئے جم کے دوت آئے

سوکھی ہوئی ہڈیوں کے پنجر   مکروہ، مہیب، فتنہ در سر

دیدے کوئی لال لال پھاڑے   ہونٹوں میں سفید دانت گاڑے

چہروں پہ شکن غضب کی ڈالے   شعلے کی طرح زباں نکالے

دائیں بائیں گزر رہے ہیں   آپس میں اشارے کر رہے ہیں

(ساوتری کی فتح)

مثنوی مختلف واقعات و حالات سے گزرتی ہے۔ کردار بھی کئی ہیں۔ ایسی صورت میں مختلف موقعوں پر مختلف اور پر تنوّع جذبات کا پیش کرنا ضروری تھا۔ ایسے مقام مثنوی میں بہت سے ہیں جہاں متضاد نفسی کیفیات کرداروں پر طاری ہوتی ہیں۔ اور جہاں شاعر اگر صحیح اور سالم نکل جائے تو اس کے فن کی معراج ہے۔ جذبات نگاری کے معاملے میں میر اور اثر کے یہاں اثر انگیزی ہے، وہ کچھ اس وجہ سے کہ دونوں درد اور تکلیف کی عکّاسی کے وقت اپنی شخصیت کا گہرا رنگ بھر دیتے ہیں۔ میر حسن کے یہاں پختگی اور تنوّع ہے۔ نسیم شروع سے آخر تک پر تکلف اور پر تصنّع ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ جگر صاحب میر حسن کی طرح سادہ ہیں لیکن نفسی کیفیت اور خصوصیت سے نسوانی جذبات کے تجزیئے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

ساوتری سفر سے واپس آنے کے بعد ستیہ وان کے لئے اپنی پسند کا اظہار کرتی ہے۔ نارد منی جو اُس وقت کے دربار میں موجود تھے غیظ و غضب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایک سال بعد ستیہ وان مر جائے گا۔ راجہ اشوپت کی محبّت موجزن ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساوتری کوئی دوسرا بر تلاش کرے۔ کچھ ایسی صورت آ پڑی ہے ؎

یہ سنتے ہی مضطرب ہوئی وہ   مشکل میں تھی کشمکش میں تھی وہ

بحث آ پڑی غیرت و وفا میں   اور باپ کے حکم ناروا میں

ایک طرف ستیہ وان کی محبّت اور دوسری طرف باپ کا حکم ہے۔ شاعر نے اس کش مکش سے فائدہ اُٹھا کر ساوتری کے دھرم کی پختگی اور بیخوفی کا نمونہ بھی پیش کیا ہے ؎

گویا ہوئی یوں وہ ہو کے مجبور   ارشاد یہ راستی سے ہے دُور

مذہب سے، رواج و رسم سے دُور   زنہار نہیں یہ مجھ کو منظور

وہ زر ہو کہ قول ہو کہ دختر!   واپس لیتا ہے کوئی دے کر

دیکھا جب انھیں سمجھ کے شوہر   رشتہ میرا ہو چکا مقرّر

ممکن نہیں اب یہ عہد ٹوٹے   ممکن نہیں اُن سے رشتہ چھوٹے

بیاہوں گا کسی کو تو انھیں کو عمر اُن کی زیادہ ہو کہ کم ہو

اسی طرح سفر سے واپسی پر راجا نے جب ساوتری سے پوچھا ؎

رودادِ سفر سناؤ بیٹی کیا کیا دیکھا بتاؤ بیٹی
تو وہ ؎ غیرت کا مقام تھا لجائی نیچا کیا سر نظر جھکائی
اور بولی کہ بہت دیار دیکھے جنگل اور کوہسار دیکھے
گزرے کبھی ایک جا نہ ایام ہوتی کہیں صبح اور کہیں شام
جنگل میں کبھی قیام ہوتا بستی میں کبھی مقام ہوتا
یوں ہی اک دن سفر سے تھک کر پہونچے سر شام اک کٹی پر
رہتے ہیں وہاں رشی دُمت سین خالق کی کبھی تھی ان پہ بھی دین
اک وقت تھا تاجدار تھے وہ قسمت سے فقیر ہوگئے وہ
دل بند ہیں ستیہ وان اُن کے اٹھارہ برس کے کوئی ہوں گے
اُٹھنا تھا ادھر میری نظر کا مقصود سمجھ گئی سفر کا
صحرا میں ہوئی جو ختم منزل بے چین ہوا پلٹنے کو دل

عشق کی سب سے اہم منزل محض ایک لمحے میں گزر جاتی ہے، اور جو بات دفتر کے دفتر چاہتی ہے پلکوں کی دو جنبشوں اور پتلی کی ایک گردش میں طے ہو جاتی ہے ؎

حیرت سے نظر ادھر اُٹھائی وہ شمعِ جمال کچھ لجائی
دو چار ہوئیں نگاہیں اُن کی نہریں ملیں شہد و شیر کی سی
بچھڑی ہوئی روحیں تھیں مقابل ملتے ہی نگاہیں مل گئے دل
عقدے ہوئے حل بس اک نظر میں منزل پوری ہوئی سفر میں

ہمارے متقدمین نے بجائے چار اشعار پر اکتفا کرنے کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں۔

مثنوی کا مرکزی کردار ساوتری ہے۔ شاعر نے اس کردار کے نشو و نما میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ پوری مثنوی میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور توجہ کے قابل ہے تو یہ نسوانی سیرت ہے، صاحبِ مثنوی نے دیباچے میں کہا ہے "اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کی صحیح تصویر نظر نہیں آتی جو محبوب شاعروں کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ اگر اس سے قیاس کیا جائے تو ہندوستانی عورت کا تخیلِ جسمانی ہر پہلو سے مضحک نظر آتا ہے اور اخلاقی معیار سے اس قدر پست کہ بیان کرتے شرم آتی ہے اور تصور سے نفرت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے ایسی نظم کہنے کی فکر ہوئی جس میں عورت کے قلب کے خاص خاص پہلو اصلیت کے ساتھ نمایاں ہو جائیں اور یہ نقش ایک حد تک معیاری اور مکمل نقش ہو۔۔۔۔!" اردو مثنوی میں خصوصیت سے جن کرداروں کا تذکرہ آیا ہے وہ ہماری دُنیا کے انسان نہیں ہیں۔ ان کی صورت درحقیقت مضحک ہے۔ وہ دنیا کی تمام صفات کا مرکز ہیں۔ عالم ہیں۔ شجاع ہیں، وسیع سلطنتوں کے مالک ہیں، عشق کے میدان میں پرچم بردار ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ہیرو کی تعریف، اس کے حسن کا تذکرہ کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ اس میں نسوانیت، شانِ محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہیروئن کی تعریف پر قلم توڑ دیئے گئے ہیں۔ ہر ہر عضو کی علیحدہ علیحدہ تعریف کی گئی ہے، راسخ اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ انھوں نے ترتیب وار جبیں سے لے کر "پائے نگاریں" تک کا تذکرہ کیا ہے۔ اثر دو قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ اپنے تخیل کو کسی مستور شے کے تصور سے بھڑکانا چاہا ہے ؎[1]

کچھ نہ کہہ زیرِ ناف کیسا ہے رفتہ و شستہ صاف کیسا ہے

ساوتری کے حسن کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن رہتی وہ انسان ہی ہے، اور نہ ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاہدِ بازاری ہے۔

وہ حسن کہ دل کو پاک کر دے دامانِ نظر میں نور بھر دے
وہ جلوہ کہ چاندنی بھی شرمائے جس سمت نظر ہو دھوپ کھل جائے
وہ شانِ جمال و رعبِ عصمت کیا تابِ نظر جو دیکھے صورت
دیکھا نہ لباس نے بھی عریاں پتلی میں نظر ہو جیسے پنہاں
رفتار نسیم کو بھی شرمائے اک موجِ شراب اُٹھ کے رہ جائے
صورت کو شباب نے نکھارا سیرت کو شعور نے سنوارا

کیسا پاکیزہ اور شعریت سے لبریز بیان ہے۔ بایں ہمہ اس کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشرقی آداب کی جان ہیں۔ شادی سے پہلے ؎

ماں کی جو مثال سامنے تھی آئینہ ہوئے رسوم ہستی
سیکھی کیا گھر ہے کیا گرہستی کیا دھرم ہے کیا وفا پرستی
حاصل کیا علم بھی ہنر بھی دامن میں تھے پھول بھی گہر بھی

---

[1] فردوسی کے اس شعر سے بھی یہ شعر آگے نکل گیا ؎

نشیرہ تنم دخت افراسیاب برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب (ع-م)

شادی کے بعد ؎

ساوتری جب عروس بن کر — آئی جنگل میں ساس کے گھر
سوچا کہ یہاں تو سب ہیں سادھو — ظاہر نہ ہو خسروانہ خُو بُو
زیبا نہیں زرق برق پوشاک — سج دھج کے خیال سے ہوں پاک
زیور کہ تھا جی دُکھانے والا — چھلّا چھلّا اُتار ڈالا
پوشاک شہانہ بھی اُتاری — پہنی سادہ سپید ساری

شوہر پرستی کا یہ حال ہے کہ ایک مثالی کردار بن گئی ہے۔ موت پر فتح پاتی ہے —— اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بناتی ہے۔

صاحبِ مثنوی نے اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے معمولات، رہن سہن، سوچ اور فکر کے طریقے، عبادت و ریاضت، نیک باتیں، غرض کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا ہے جو اس کی سیرت کو تشنہ چھوڑ دے۔ اس کی سیرت میں غضب کی جاذبیت ہے، اور ان تمام باتوں کے باوجود وہ ہم آپ میں سے ہی ایک ہے۔ ایک نیک عصمت مآب، شوہر پرست عورت مد حالی کے یہاں جو بات اشارہ تھی، جگر صاحب کے یہاں وہ زندہ اور بھرپور تصوّر بن گئی ہے۔

اردو مثنویوں کو پڑھنے کے بعد قاری پر کیا جذبات طاری ہوتے ہیں، اس کی چشمِ تصوّر میں کس قسم کی تصویریں گھومتی ہیں، ایک دلچسپ بات ہے۔ یہ سب کچھ قاری کی ذہنی صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ اُس وقت جب علم وسیع نہیں تھا۔ ہر حقیقت پر انسان کا تخیل افسانہ بن کر چھایا ہوا تھا، ان مثنویوں میں زبردست کشش تھی۔ اس کی چشمِ تصوّر میں ایک "بکاؤلی" ایک "پر اسرار" گھومتے ہوں گے طلسم حقیقت ہوگا۔ ایک لاشعوری آرزو ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوگی کہ وہ بھی طلسم سیکھے، ایک "بکاؤلی" پر حکومت حاصل کرے۔ لیکن اس عہد میں، قطعِ نظر خالص ادبی نقطۂ نظر کے، ان مثنویوں کی حیثیت کسی کتب خانے کی زینت سے زیادہ نہیں، اور کیونکہ اس زمانے کے معاشرے سے ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے ان میں تمدنی آثار اور بڑی حد تک غیر شعوری عہدی رجحانات کا ردِّ عمل ہے۔ اس طرح یہ اس زمانے کے عمرانی اقدار کی بھی امین ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک چیز ایسی ہے جو آج بھی تیر کی طرح چبھتی ہے، خصوصیت سے پرولتاری دماغوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہے، اور وہ ہے جنسی طغیان جو ان مثنویوں پر فضا بن کر چھایا ہوا ہے۔ صورت کچھ ایسی ہے ؎

جذبِ لطیف رنگ و بُو چھوٹے نہ چھوٹا ہے کبھی
ربطِ حبیب و آرزو ٹوٹے نہ ٹوٹا ہے کبھی
جتنا بُھلاؤ گے مجھے اتنا ہی یاد آؤں گا میں

ہر چند یہ طغیان صحت مند اور سائنٹیفک طرزِ فکر رکھنے والے دماغوں کے لیے اتنا ہی بے معنی ہے جتنا بھوتوں اور دیوؤں کا وجود۔ لیکن "جذبِ لطیف رنگ و بُو" اور "ربطِ حبیب و آرزو" کو کیا کیا جائے۔ آج بھی ایک لمبی چوڑی تعداد شوق، آثر اور نسیم کی جنسی روایات کو دہراتی نظر آتی ہے۔ متقدّمین نے انجان بن کر کہا اور یہ جان بوجھ کر کہتے ہیں۔ فرق بس یہی ہے، وہ ڈھیٹ نہیں تھے یہ ڈھیٹ ہیں، ضدّی ہیں۔ ورنہ جنسیات اور نفسیات کے لفظوں سے وہ بھی ناآشنا تھے اور یہ بھی ہیں۔ جنسِ ادب کا ایک اہم اور معاشرتی ترقی کے لئے بے حد ضروری موضوع ہے۔ لیکن قلم اُٹھانے سے پہلے زبردست رچاؤ، مقصد میں خلوص، کاوش، جنسیات پر کامل حاصل قدرت، معاشرتی مشاہدے اور پھر ان سب کی مصوّری کی پیغمبرانہ صلاحیت کی ضرورت ہے۔

مثنوی "پیامِ ساوتری" میں ایک روحانی سکون اور ٹھیراؤ ہے۔ سنسکرت ادب کی بڑی خصوصیت وہ روحانی فضا ہے جو اس پر جاری و ساری رہتی ہے۔ مثنوی کا تعلق کیونکہ پُرانوں کے عہد سے ہے۔ اس لئے پُوری احتیاط کے ساتھ دست، سکون اور فطرت نگاری سے اس کو سجایا ہے، جگمگایا ہے۔ قاری پر ایک ہی اثر مرتسم ہوتا ہے اور وہ ہے تپ دھرم جس کو ست جگ کی فضا، بنوں کے ماحول اور ویدک روایات نے اچھی طرح اُجاگر کر دیا ہے۔ مثنوی میں کوئی دوسرا طغیان نہیں۔ اس میں ایک ایسا تکلّم ہے جو جنگلوں کی تنہائی میں سنا جاتا ہے، اور ایسی نغمگی ہے جو تقدّس کی طرف مائل کرتی ہے۔

طلسمِ تقدیر پرستی، اور تقدیر پرستی طلسم پیدا کرتے ہیں۔ مثنوی "پیامِ ساوتری" کا موضوع انسانی عظمت سے عبارت ہے۔ اس میں موت پر فتح حاصل کی گئی ہے، انسان کے تپ اور عمل کو کامیاب بنایا گیا ہے۔ اس لئے فوقِ فطرت اور فوقِ انسان، باتوں کا ادّعا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک مرد اور ایک عورت کا قصّہ ہے جو ہم اور آپ میں سے ہی تھے۔

ان کی داستان ہماری آپ کی داستان ہے۔

مثنوی میں نادر تشبیہات ہیں، پُر اثر اور خوبصورت۔ ان میں بیساختگی ہے۔ شعریت ہے، تصنع اور خشکی نہیں۔ ساوتری جوانی میں قدم رکھتی ہے ؎

دن رات بڑھی برنگِ امید   یا صبح کو جیسے نورِ خورشید

یا

طفلی تھی شباب کے اثر میں   ملتی تھی چاندنی سحر میں

نسوانی خصوصیات کا اظہار ؎

تھا جان و فا حیا کا انداز   تھا جسم لطیف صورتِ راز

دکھلاتی تھی جسم میں جوانی   مینا میں شراب ارغوانی

رفتار نسیم کو بھی شرمائے   اک موجِ شراب اُٹھ کے رہ جائے

تتلیوں کو انسانی آرزو سے تشبیہہ دی ہے ؎

یہ تتلیاں ہیں کہ آرزوئیں   متوالی ہیں شوقِ رنگ و بو میں

ایک برگد کے پیڑ کا پُر معنی نقشہ ملاحظہ ہو ؎

نیچے برگد کے تھا وہ مسکن   سینے میں جیسے قلب روشن

برگد تھا کہ ایک راہب پیر   با عظمت زندگی کی تصویر

ستیہ وان کے حُسن پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

چھوٹی چھوٹی جٹائیں سر کی   کرنیں چھٹکی ہوئیں قمر کی!

پیکر میں شباب بس رہا تھا   غنچہ کھل کھل کے ہنس رہا تھا

دامانِ شباب میں تھا پیکر   یا دھوپ کھلی تھی گلستاں پر

اور جب غم کی طرف دماغ راغب ہوتا ہے ؎

اس غم میں لبوں پہ جو ہنسی تھی — شمشان میں چاندنی بسی تھی

جھاڑی جھاڑی بلا بنی تھی — گویا پرچھائیں موت کی تھی

مثنوی کے آخری اوراق خصوصیت سے بہت خوب ہیں۔ ان سے شاعر کی بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جمراج جب ستیہ وان کی روح لے کر جاتے ہیں تو ساوتری ان کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ یہ منظر ایک سو تینتالیس (۱۴۳) اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔ جمراج ستیہ وان کی روح واپس دینے پر آمادہ نہیں ہیں قطع نظر دوسری باتوں کے انھیں ایک احساس یہ بھی ہے کہ کہیں ایک عورت اُن پر فتح نہ پالے، ساوتری پیچھا نہیں چھوڑتی، کافی بحث و تمحیص کے بعد شوہر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

اشعار میں مثنوی کے فلسفے کا نچوڑ ہے جو ستی دھرم کی روح ہے، اور شاعر کی فنی کامیابی کا آدرش ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں بھاگ دوڑ کا منظر ہے۔ الفاظ کا وزن اور تشبیہات کی موزونیت سے مختلف مراحل کتنی عمدگی سے طے کئے گئے ہیں ؎

پیچھے پیچھے لپک چلی وہ — سائے کی طرح سرک چلی وہ

پیچھے نہ مگر ذرا رہی وہ — ہمزاد کی طرح ساتھ تھی وہ

ساوتری پھر بھی ہم عناں تھی — آندھی کی طرح رواں دواں تھی

اک آہ ہوئے بادپا ہوئی وہ — صرصر یہ ہوئے، ہوا ہوئی وہ

یہ کہہ کے اڑے وہ صورتِ تیر — بجلی سی لپک چلی وہ دلگیر

مثنوی کا تعلق کیوں کہ قدیم ہندو دیو مالا سے ہے، اس لئے یہ ضروری تھا کہ لب و لہجہ خالص ہندی یا ہندوی ہو۔ چنانچہ ہندی الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ شاعر نے بڑی خوبی سے ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اور وہ فضا اور لہجہ قائم کر دیا ہے جس کو مثنوی کی شدید ضرورت تھی۔ ہندی الفاظ بحر کی قید میں پھنسنے کے بعد ترش گئے ہیں، اُن میں چمک بڑھ گئی ہے ؎

جنگل میں اشوپت جب آئے   کچھ بھیل کھرا اور کانس لائے

راجا کے لئے کٹی بنائی   پھلواری ہری ہری لگائی

سائے میں بچھا کے مرگ چھالا   کفنی پہن اور لے کے مالا

راجا دھونی رما کے بیٹھے   خالق سے لگن لگا کے بیٹھے

وہ خالقِ دہر و عالم آرا   وہ جوہر کائنات برہما

با شان و شکوہ سطوت افزا   تھا برہم پوری میں جلوہ فرما

تھا وقت عجب، عجب سماں تھا   سامان سرور قلب و جاں تھا

گز گندھرو، اپسرائیں   گاتے تھے وید کی رچائیں

سارنگی، ستار اور مردنگ   بینا، طنبورہ، بانسری، چنگ

سب ساز ملے ہوئے تھے باہم   توحید کی بج رہی تھی سرگم

جگر صاحب حضرت عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح ان کا دبستانِ لکھنؤ سے معنوی تعلق ہے۔ علامہ عزیز کے یہاں نکھار ہے، طہارت ہے، محبوب گردی نہیں ہے۔ یہی حال جگر صاحب کا ہے۔ وہ بہت ڈوب کر کہتے ہیں۔ پاکیزگی کو مقدم سمجھتے ہیں — اپنے موضوع، مقصد اور پھر اس کے اظہار کے لحاظ سے مثنوی "پیام ساوتری" اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہے۔



نظیر اکبر آبادی

لیلیٰ ہی اس کے ہوش سے واقف تھی ورنہ یاں اکثر یہ جانتے ہیں کہ مجنوں دِوانہ تھا



بُدھ کی کانسی کی مُورتی (...عیسوی)

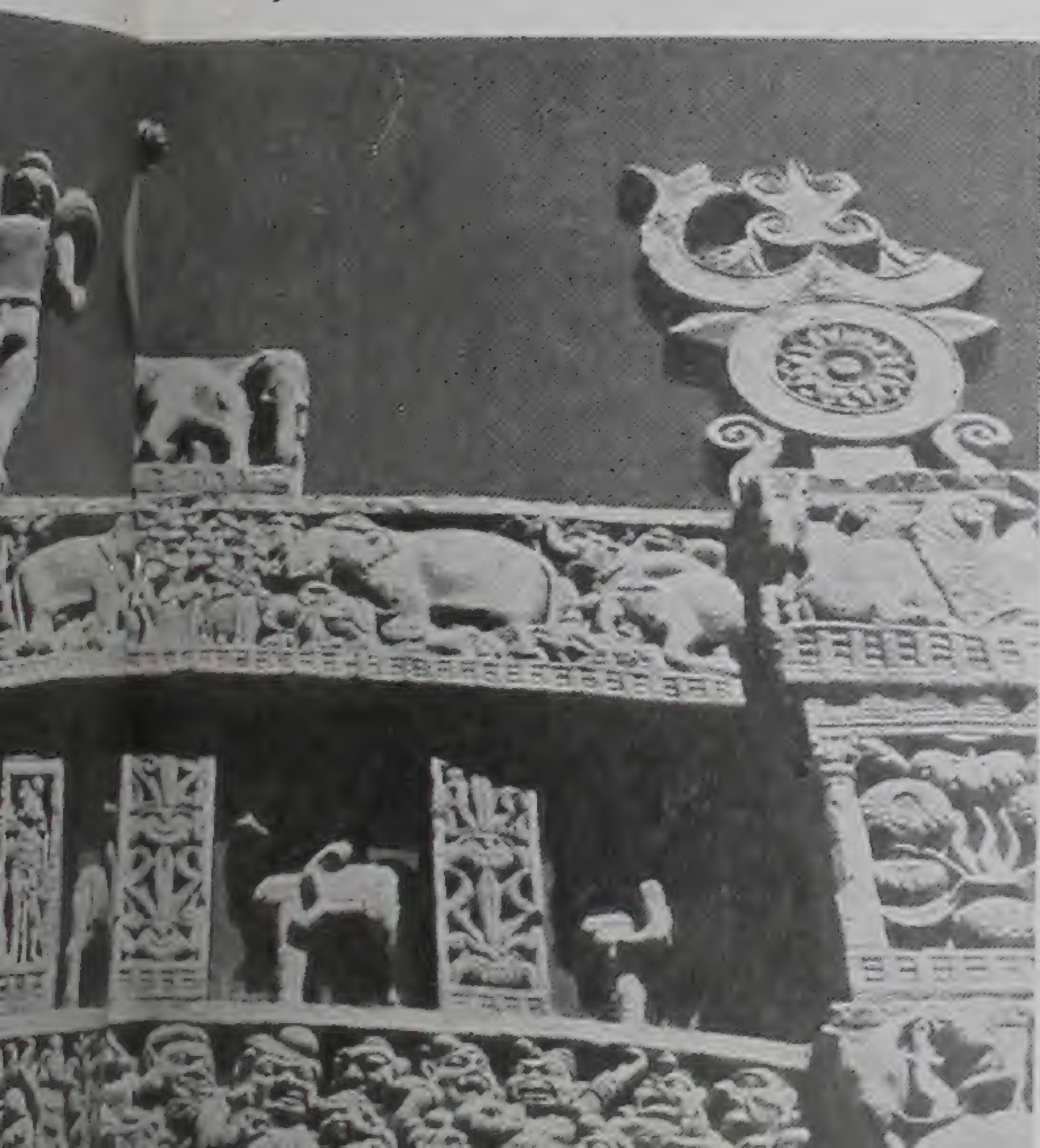


بُدھ ۔ سمادھی میں



بُدھ کی مُورتی ۔ پانچویں صدی عیسوی

سانچی کے دروازہ...



بُدھ کا انتقال ۔ دسویں صدی عیسوی کی سنگ تراشی





بُدھ ستوّا ۔ دسویں صدی عیسوی



مہاتما بُدھ ۔ کُشان یگ

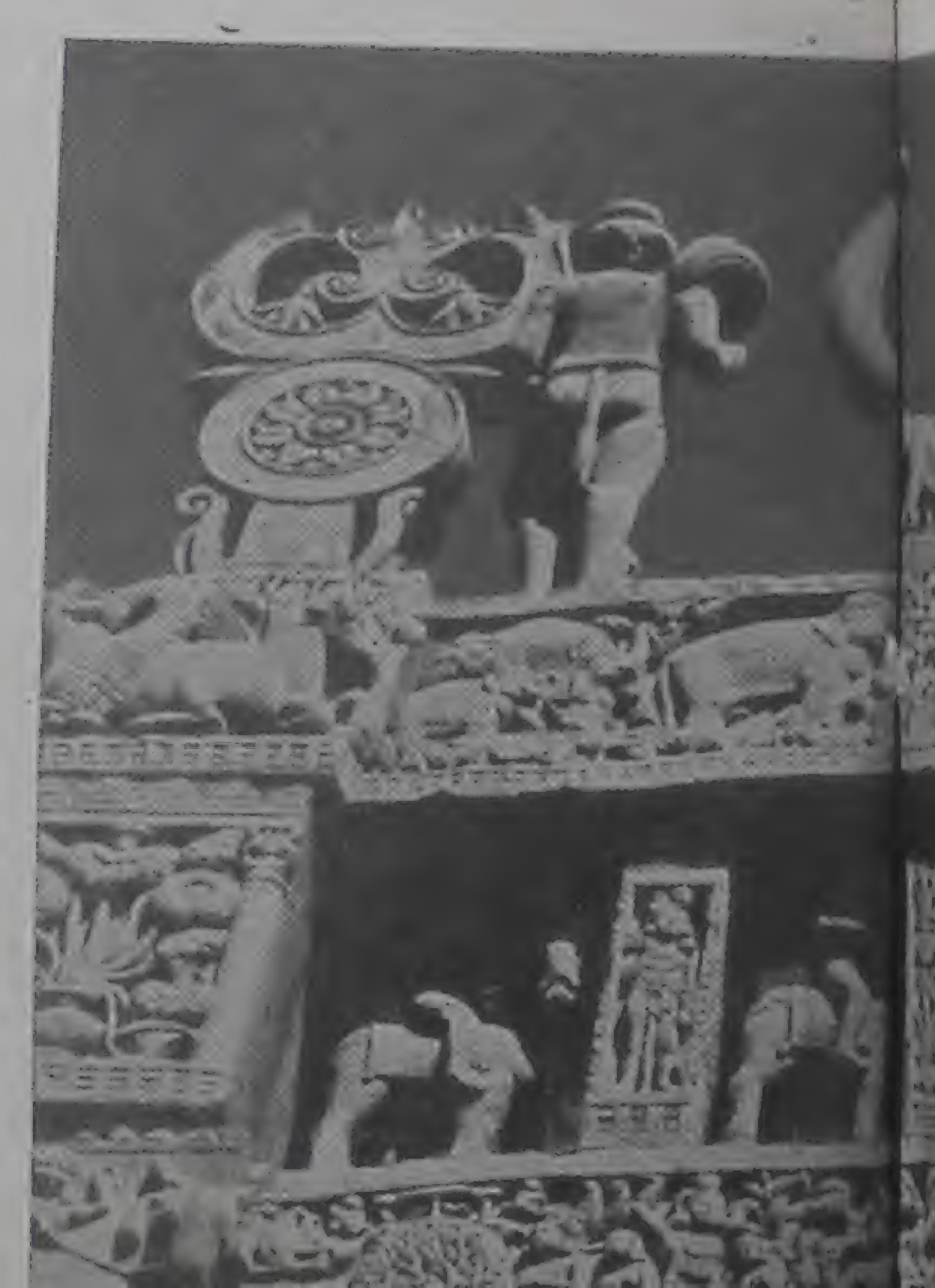


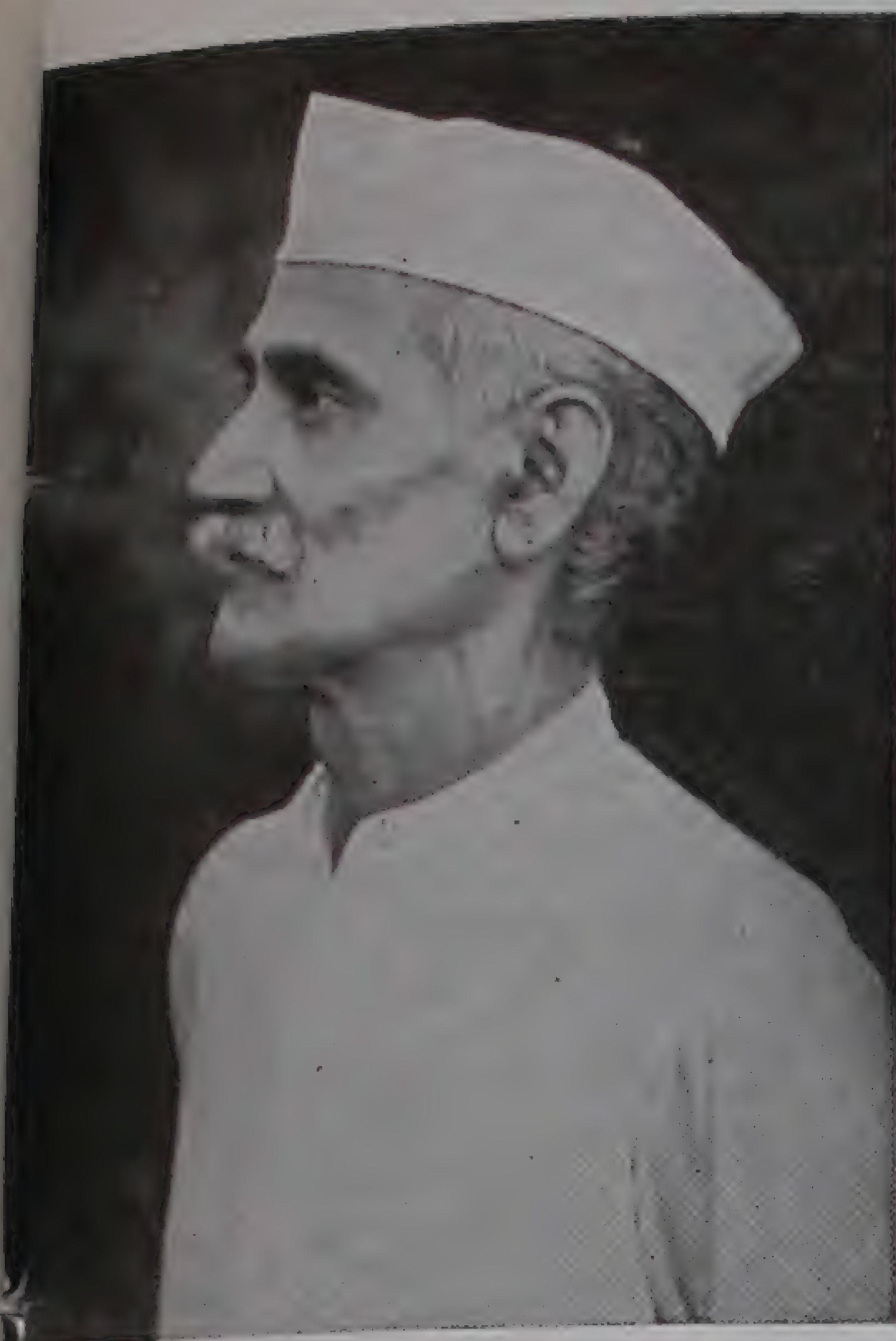
صدی عیسوی)

مہاتما بُدھ ۔ اُپدیش دیتے ہُوئے

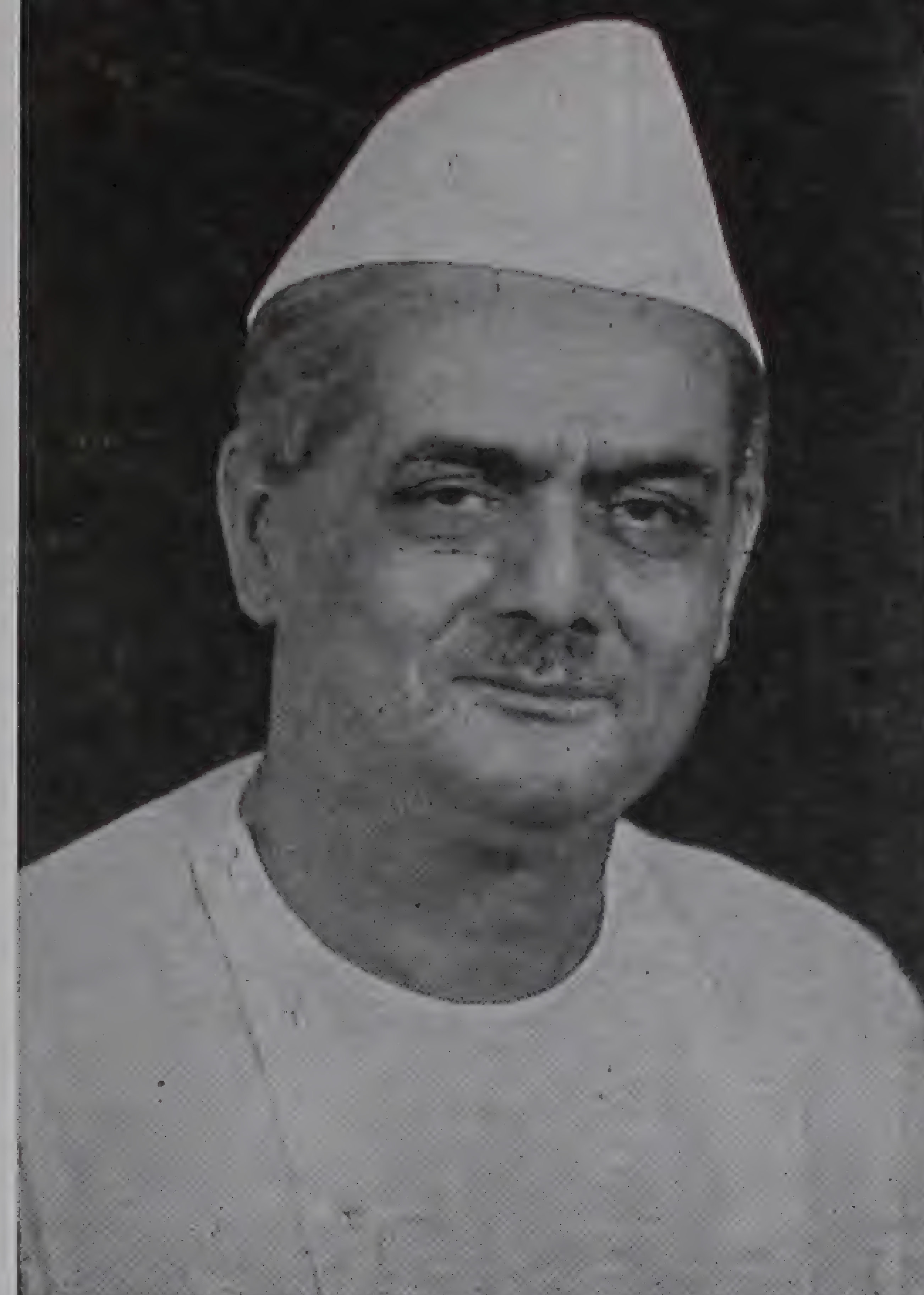


ئی حصّہ





آچاریہ نرندر دیو



شری جی' وی ماولنکر



ڈاکٹر میگھ ناد ساہا

پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے   وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے
(میر)



شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی
ہم نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

مخمور دہلوی



یگانہ چنگیزی

خیر مقدم

بہ تقریبِ وُرودِ مسعودِ اعلیحضرت شہنشاہِ ایران در کشورِ ہندوستان

سیّد محی الدّین قادری زور

ستمِ دوست بجا ہست امروز ۔۔۔ شاید از ما کہ خطا ہست امروز

تو چہ دانی کہ چہ باشد فردا ۔۔۔ آنچہ نقشِ کفِ پا ہست امروز

ایں مپندار کہ خالی ز خطر ۔۔۔ راہِ اربابِ وفا ہست امروز

حافظ و سعدی ہمی یاد آیند ۔۔۔ شاہِ ایراں کہ بہ ما ہست امروز

ساقیا بزمِ رباب و چنگ است ۔۔۔ مے و پیمانہ کجا ہست امروز

بادۂ عہدِ جہانگیر بیار ۔۔۔ محفلِ شاہِ رضا ہست امروز

شجرِ رشتۂ دیرینہ را ۔۔۔ موسمِ نشو و نما ہست امروز

بہرِ خوش وقتیِ ہند و ایراں ۔۔۔ ہر کجا دستِ دعا ہست امروز

فیضِ مہمانِ عزیز است اے زور ۔۔۔ فکرِ شاعر کہ رسا ہست امروز

تلوک چند محروم

شاہِ ایراں جانبِ ہندوستاں آید ہمی ۔۔۔ میہماں عزّت فزائے میزباں آید ہمی

گل فشاں صبحِ بہاراں است ایں دورِ سنت ۔۔۔ واندریں، دیگر بہارِ گل فشاں آید ہمی

مژدہ اے دہلی، کہ با امواجِ نکہت صف بہ صف ۔۔۔ در چمن ہا بینِ نسیمِ اصفہاں آید ہمی

کامراں باشد وزیرِ اعظمِ ہندوستاں ۔۔۔ فالِ نیک است اینکہ شاہِ کامراں آید ہمی

ہند و ایراں امن جو یانند بہرِ عالمی ۔۔۔ گفتگوئے امنِ عالم درمیاں آید ہمی

آنکہ می نازد بہ علم و ادب عزم و عمل ۔۔۔ آنکہ باشد صاحبِ بختِ جواں آید ہمی

تا فرازِ آسماں بختِ بلندِ ما رسید ۔۔۔ بر زمینِ ما ثُریّا شادماں آید ہمی

در زبانِ رُودکی بر مقدمِ مسعودِ شاہ ۔۔۔ ہر زماں ایں شعر ما را بر زباں آید ہمی

شاہ ماہِ جلوہ ساماں است و ہند است آسماں ۔۔۔ جلوہ ریزاں ماہ سوئے آسماں آید ہمی !

ہنس راج رہبر

رُوح کا رِشتہ

کردار

سریندر موہن ۔	ایک ادیب ۔ عمر تیس کے لگ بھگ
پران ناتھ ۔	سریندر موہن کا دوست عمر پچیس کے قریب
ریکھا ۔	ایک پڑھی لکھی لڑکی، عمر اکیس بائیس قد ٹھگنا
سروج ۔	ایک اور پڑھی لکھی لڑکی ۔ عمر بائیس تیئیس ۔ قد لمبا

پہلا منظر

زمانہ ۱۹۵۶ء　　　　وقت بعد دوپہر

(سریندر کا گھر ۔ ایک عام کمرہ ۔ نہ بہت بڑا اور نہ چھوٹا ۔ دائیں بائیں دو دروازے ۔ معمولی مختصر سامان ۔ دو کرسیاں، ایک مونڈھا، ایک تپائی اور ایک میز ۔ میز پر کچھ کتابیں اور ایک دو رسالے پڑے ہیں ۔ سامنے کی دیوار پر دائیں طرف ایک الماری ہے اور اس کے قریب ہی دیوار پر تاریخیں بدلنے والا کیلنڈر ہے ۔ بائیں طرف کانس ہے جس پر کنگھا، شیشہ اور ٹائم پیس وغیرہ کے علاوہ دو فریم شدہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک ٹیگور کا اور دوسرا سریندر کا ہے ۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو سریندر موہن بلند آواز سے خط پڑھ رہا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے)

سریندر موہن (خود پڑھتا ہے) تمھارا خط پڑھ کر دل خوشی سے بھر گیا ۔ اس میں جانے ایسا کون سا جادو تھا کہ ہر لفظ آپ ہی آپ دل پر نقش ہو گیا ۔
(بولتا ہے) واہ پیاری واہ! خوش کر دیا ۔ خوب کہی ۔ ہر لفظ دل پہ نقش ہو جاتا ہے ۔ ہا ہا ہا! اچھا آگے کیا لکھا ہے ؟
(پڑھتا ہے) مجھے اب اس بات کا وشواس ہو گیا ہے ۔ وہ جادو اصل میں تمھاری شخصیت کا جادو ہے جو تمھاری تحریر کو اتنا سندر بنا دیتا ہے ......

(بولتا ہے) شخصیت کا جادو (ہنستا ہے) شخصیت کا جادو تحریر کو سندر بنا دیتا ہے ۔ عورت جب مرد کو سمجھنا چاہتی ہے تو سچ مچ کمال کر دیتی ہے (ذرا توقف سے) لیکن پیاری ایک بات اور بھی ہے جس نے سونے پر سہاگہ کر دیا ہے ۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ جب سے تم نے مجھے عشق اور محبت کی دولت سے مالا مال کیا ہے ۔ میری شخصیت اور میری تحریر اور بھی نکھر آئی ہے ۔ عشق کا جادو سب جادوؤں کو مات کر دیتا ہے ۔ پیاری میں سچ کہتا ہوں کہ تمھاری یاد آتے ہی میرے تصوّر میں ہزاروں جنتیں جگمگا اُٹھتی ہیں اور ہر گھڑی یوں محسوس کرتا ہوں ؎

تم میرے پاس ہوتی ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بس یوں سمجھ لو کہ اب تمھارے ہی نام سے زندہ ہوں

(پران ناتھ داخل ہوتا ہے سریندر اسے نہیں دیکھتا)

پران ناتھ ۔ کیوں جناب، یہ آپ ہی آپ کیا بڑبڑا رہے ہو ؟

سریندر ۔ آیئے شریمان پران ناتھ جی تشریف رکھیئے ۔ (کرسی اس کی طرف سرکاتا ہے) سنایئے کیا حال ہے ؟

پران ناتھ ۔ میرا حال تو ٹھیک ہے اس کی فکر نہ کرو ۔ تم سناؤ تمھارا اپنا کیا حال ہے

سریندر ۔ ہمارا حال بھی ٹھیک ہے، سولہ آنے ٹھیک ۔

پران ناتھ ۔ پھر تم یہ آپ ہی آپ کیا بڑبڑا رہے تھے ؟ کس کے نام سے زندہ ہو رہے تھے

سریندر ۔ (مسکراتے ہوئے) پران ناتھ جی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سننے اور سنانے کے بجائے دیکھنے اور دکھانے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

پران ناتھ ۔ تو گویا یہ کسی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی

سریندر ۔ بہت ہی خوبصورت، دلچسپ اور دلکش ڈرامے کی ۔

پران ۔ جو ہمیں بہت جلد دیکھنا نصیب ہوگا!

سرینیدر۔ صرف ڈرامہ ہی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا ساتھ ہی مٹھائی بھی کھانے کو ملے گی۔

پران۔ آج تو خوب چہک رہے ہو اور نشے میں معلوم ہوتے ہو

سرینیدر نشہ! (ہنستا ہے) میرے دوست تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ یہ عشق بھی تو ایک نشہ ہے، ایک ایسا نشہ جو بہت دیرپا اور مسرور کن ہوتا ہے۔

پران۔ گویا تم جو ڈرامہ ہمیں دکھانے جا رہے ہو وہ عشق و محبت کا ڈرامہ ہے؟

سرینیدر۔ اس میں کیا شک ہے (ذرا توقف سے) اور تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تمھارا دوست شریمان سرینیدر موہن حسن و عشق کے اس ڈرامے کا ہیرو ہوگا۔

پران۔ اور ہیروئن؟

سرینیدر۔ وہی جس کے نام سے ہم زندہ ہیں۔

(پران کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستا ہے)

پران۔ وہ نام جس سے تم زندہ ہو اگر ہمیں بھی معلوم ہو جائے تو کوئی حرج ہے؟

سرینیدر۔ حرج (ہنستا ہے) حرج بالکل نہیں۔

پران۔ پھر بتاؤ۔

سرینیدر۔ مگر تم اتنی جلدی کیوں کرتے ہو۔ کیا تم اس وقت کا انتظار نہیں کر سکتے جب تمھارا دوست سرینیدر موہن سہرا باندھ کر دولھا بنے گا۔ تم مبارک باد دینے آؤ گے۔ برات میں ساتھ چلو گے۔ پھر تم وہ نام بھی جان جاؤ گے اور نام والے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو گے۔

پران۔ یہ شیخ چلی کی باتیں چھوڑو۔ تم نے کئی بار سہرے باندھے۔ ہم نے کئی بار مبارک باد بھی اور برات چڑھی۔ اب تو یہ عالم ہے کہ تمھیں دیکھ کر پنجابی کی ایک کہاوت یاد آتی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ دن کبھی نہیں آئے گا جب کبڑے کو گھوڑی چڑھنا نصیب ہوگا۔

سرینیدر۔ لیکن اب دنیا کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ تمھارا دوست سرینیدر موہن کبڑا نہیں ہے۔ وہ ایک بلند شخصیت کا مالک ہے۔ ملک کا مشہور اور نامور ادیب ہے

پران۔ اور ایک شاندار ایکٹر بھی ہے جو جلد ہی حسن اور عشق کے ڈرامے کا ہیرو بنے گا

سرینیدر۔ ہیرو بن چکا ہے۔ ڈرامہ بہت دنوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ بس آخری سین اور ہوگا جس میں تمھارا دوست سرینیدر موہن گھوڑی چڑھے گا اور تم حیران ہو کر دیکھو گے۔

پران۔ تو یہ ریہرسل آخری سین کا ہو رہا تھا۔

سرینیدر۔ ہاں بالکل آخری۔

پران۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں پورا ڈرامہ نہیں اس کا صرف آخری سین دکھاؤ گے

سرینیدر۔ میں نے اس بار باقی سین دوستوں سے پوشیدہ رکھے ہیں اور اس طرح پوشیدہ رکھے ہیں کہ انھیں صرف آخری سین میں پورے ڈرامے کا لطف آ جائے۔

پران۔ لیکن کل آنند سے ملاقات ہوئی تھی . . .

سرینیدر۔ آنند تمھیں کہاں ملا؟ وہ تو ترن تارن گیا ہوا ہے۔

پران۔ میں بھی تو ایک ہفتے سے ترن تارن گیا ہوا تھا۔ رات ہی کو لوٹا ہوں۔

سرینیدر۔ تو وہاں تمھاری آنند سے ملاقات ہوئی؟

پران۔ ہاں یونھیں، اتفاق سے بازار میں مل گیا اور اس نے کہا . . .

سرینیدر۔ کیا کہا؟ تم نے کچھ میرا ذکر چھیڑا ہوگا

پران۔ نہیں۔ میں نے تو کوئی ذکر نہیں چھیڑا وہ خود ہی کہنے لگا کہ سرینیدر سے ملاقات ہو تو اسے مبارک باد دینا۔ اب اس کی شادی جلد ہونے والی ہے۔

سرینیدر۔ (جھنجھلا کر) وہ بھی عجیب آدمی ہے۔ ہزار بار سمجھایا کہ ابھی کسی سے مت کہنا۔

پران۔ اور آج امرت سے ملاقات ہوئی تو اس نے سب سے پہلے یہی خوش خبری سنائی۔

سرینیدر۔ خیر امرت کی تو اور بات ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس سے تو کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ شادی کا انتظام وہی کرے گا۔

پران۔ اور مہندر سے؟

سرینیدر۔ کیا مہندر ملا تھا؟

پران۔ نہیں۔

سرینیدر۔ پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ اسے بھی شادی کی بات معلوم ہے؟

پران۔ (ہنستا ہے) میرے پیارے دوست شریمان سرینیدر موہن! بس تمھیں جو جانتا ہوں اس لئے اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میری امرت سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔

سرینیدر۔ ملاقات نہیں ہوئی؟

پران۔ نہیں (ذرا توقف سے) اور میرا آنند سے بھی تمھارا اور تمھاری شادی
کا کوئی ذکر نہیں آیا۔

سریندر۔ سچ ؟

پران۔ بالکل سچ۔ جھوٹ تو ہم نے کبھی بولا ہی نہیں

سریندر۔ اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے مفت میں بنا رہے تھے۔

پران۔ واہ، یہ بنانے کی بھی خوب رہی۔ میرے پیارے دوست شریمان سریندر جی کسی کو بنانے کی کیا ضرورت ہے، جب تم خود بن رہے ہو (ہنستا ہے) میرا مطلب ہے کہ تم دولھا بن رہے ہو۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ایک لڑکی۔ (باہر سے) کیا میں اندر آسکتی ہوں ؟

سریندر۔ بڑے شوق سے (جلدی جلدی اُٹھتا ہے اور کرسی ایک طرف لڑھک جاتی ہے)

لڑکی۔ نمستے

پران۔ نمستے۔

سریندر۔ (کرسی ٹھیک کرتے ہوئے) آپ ہیں میرے دوست شریمان پران ناتھ ایک مشہور اور نامور آرٹسٹ

پران۔ اور آپ ؟

سریندر۔ آپ ہیں کماری ریکھا اور۔۔۔۔

پران۔ اچھا سمجھ گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔ میری مبارکباد قبول کیجئے۔

(پران ناتھ جاتا ہے)

سریندر۔ بیٹھئے۔

لڑکی۔ آپ بھی بیٹھئے۔ کیا آپ۔ ہاں ہاں تم نے اپنے دوستوں سے شادی کا چرچا شروع کر دیا ہے

سریندر۔ نہیں تو

لڑکی۔ پھر یہ مبارکباد کس بات کی دے رہے تھے۔

سریندر۔ اوہ، یہ بات ہے۔ (ذرا توقف سے) انھوں نے میری وہ نئی کہانی پڑھی ہے جو منزل میں شائع ہوئی ہے۔ کہانی انھیں پسند ہے۔ کہہ رہے تھے کہ بالکل نیا تکنیک ہے آرٹ کے اعتبار سے بھی بے جوڑ ہے۔ اور (قدرے شرما کر اور مسکرا کر) کہہ رہے تھے کہ اس پر میری شخصیت کی چھاپ ہے۔

ریکھا۔ کہانی واقعی اچھی ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ میں نے اسے چار پانچ بار پڑھا۔ جب اکیلی ہوتی ہوں تبھی پڑھنے لگتی ہوں۔ جب پڑھتی ہوں تمھاری شخصیت آنکھوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔ اور۔۔۔۔

سریندر۔ اور وہ تصویر میری اس ظاہری تصویر سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے

(دونوں ہنستے ہیں)

کیوں ٹھیک ہے ریکھا؟ تم یہی کہنا چاہتی تھیں نا ؟ دیکھا کیسی رہی۔ تمھارے منہ کی بات چھین لی۔

ریکھا۔ آپ کہانی کار جو ٹھہرے۔ دوسروں کے دل کی بات سمجھنے والے۔

(پھر دونوں ہنستے ہیں)

سریندر۔ دراصل کہانی یا نظم پڑھتے وقت ادیب اور شاعر کی جو تصویر ذہن میں بنتی ہے وہ اس کی روح کی اور شخصیت کی تصویر ہوتی ہے جو اس کی ظاہری اور مادی تصویر سے۔۔۔۔

ریکھا۔ کہیں زیادہ خوبصورت ہوتی ہے، دل کو لبھاتی ہے

(دونوں ہنستے ہیں)

ریکھا۔ دیکھا، میں نے تمھارے من کی بات بوجھ لی۔

سریندر۔ اور پیاری اس بات کی داد دو کہ میں نے بھی اس لڑکی کو منتخب کیا ہے جو میرے من کی بات بوجھ سکتی ہے، جو میری شریکِ حیات بن سکتی ہے۔ پیاری سچ کہتا ہوں کہ جب میں نے تمھیں پہلی بار دیکھا اس وقت سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی۔

ریکھا۔ اور مجھے بھی ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو اونچی شخصیت کا مالک ہو جس نے سماج کے پرانے بندھنوں کو توڑ دیا ہو۔ جو عورت کے من کو سمجھتا ہو اور اپنی ہونے والی بیوی کو داسی نہیں زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہو۔

سریندر۔ نئے ہندوستان میں اب ایک نئے سماج کی تعمیر ہوگی۔ اس میں مرد اور عورت کے رشتے بھی نئے ہوں گے۔ پرانے اور دقیانوسی طریقے ترک کر دئے جائیں گے۔ نئے ہندوستان اور نئے سماج کی تعمیر کے لئے بلند خیال اور بلند شخصیت کے مرد اور عورتوں کی ضرورت ہے۔

ریکھا۔ مجھے جب تمھارا پہلا خط ملا تو میں سمجھی کہ یہ بلند خیال اور بلند شخصیت

سب عورت کو پھسلانے اور بہلانے کی باتیں ہیں - مرد اپنے مطلب کے لئے ایسی باتیں کیا ہی کرتے ہیں -

سریندر - تو گویا تمھیں میرے پہلے خط کا یقین نہیں آتا اور اسی لئے تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا (ہنستا ہے) اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے -

ریکھا - پھر تمہارا دوسرا خط اور پھر تیسرا خط ملا - تب میں سمجھی کہ یہ باتیں صرف لکھنے کے لئے نہیں لکھی گئیں سچے دل سے نکلی ہیں اور میں نے اسی وقت آپ سے .... نہیں نہیں تم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا -

سریندر - بیاہ سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا آپس میں ملنا بہت ضروری ہے - ظاہری شکل صورت اور رنگ روپ معمولی باتیں ہیں - اصل بات شخصیت ہے - اور شخصیت کا اندازہ آپس کے میل جول ہی سے ہو سکتا ہے - اب ہم نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ لیا ہے - ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دونوں کی آیندہ زندگی نہایت خوش گوار ہوگی اور ہمارا بیاہ نئے سماج کے لئے ایک مثال قائم کرے گا -

ریکھا - میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو خوب سمجھ لیا ہے اور ہمارا بیاہ اب جلد ہو جانا چاہیئے -

سریندر - (جوشِ مسرت سے) نیکی اور پوچھ پوچھ - میں تو ایک مدت سے تمھارے منہ سے یہ بات سننے کے لئے بے قرار ہوں - بتاؤ تو وہ مبارک دن کب آئے گا - آج اور اسی وقت طے کر لو (ذرا توقف سے) پیاری چپ کیوں ہو گئیں ؟ کیا تمھیں کسی سے مشورہ لینا ہے ، کسی سے کچھ پوچھنا ہے ؟

ریکھا - نہیں مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا - میں اپنی مرضی کی آپ مالک ہوں -

سریندر - میں جانتا ہوں کہ جو لڑکی سخت محنت کرتی ہے اور اپنی روزی آپ کماتی ہے وہ کسی کے مشورے کی محتاج نہیں - وہ اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آزاد اور خود مختار ہے -

ریکھا - میں نے تمھیں اپنی مرضی سے پسند کیا ہے میں تمھارے خیالات کی قدر کرتی ہوں اور تمھاری شخصیت کی پجارن ہوں - میں خود چاہتی ہوں کہ بیاہ جلد ہو جائے -

سریندر - پھر پیاری آؤ ، ہم تاریخ کا فیصلہ کر لیں - آخر جھجک کس بات کی ہے ؟

ریکھا - کوئی جھجک نہیں - میں چپ اس لئے تھی کہ دل ہی دل میں تمھاری خوشی کا اندازہ لگا رہی تھی -

(سریندر ہنستا ہے - ریکھا بھی ہنستی ہے)

ریکھا - تمھیں یہ جان کر اور بھی خوشی ہوگی کہ میں نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لے لی ہے - کل گاؤں چلی جاؤں گی اور ایک مہینہ بے فکر ہو کر رہوں گی دفتر کے جھنجھٹوں اور جھمیلوں سے دور رہ کر اپنے آپ کو نئے جیون کے لئے تیار کروں گی -

سریندر - واہ کیا اچھوتا خیال ہے - گاؤں کی کھلی فضا میں تمھارا یہ حسن اور بھی نکھر آئے گا - یہ حسین کلی جو اب بند بند سی رہتی ہے ایک دم کھل جائے گی

ریکھا - گاؤں سے نئے ارمان اور نئے ولولے لے کر لوٹوں گی اور لوٹتے ہی پہلا کام .....

سریندر - ہم دونوں کا بیاہ ہوگا - (دونوں ہنستے ہیں) بیاہ کتنا خوش گوار لفظ ہے - اور پھر ہم دونوں کا بیاہ دو آزاد روحوں کا ، دو دھڑکتے دلوں کا ملاپ ہوگا - یہ ملاپ ایک مہینہ بعد ہوگا - ایک مہینہ !

ریکھا - جب دلوں میں پریم ہو تو ایک مہینہ آنکھ جھپکنے میں گزر جاتا ہے -

سریندر - پیاری - ایک مہینہ کیا میں برسوں اور صدیوں تمھارا انتظار کر سکتا ہوں

ریکھا - یہ کیوں نہیں کہتے کہ پہلے بھی تو اتنی مدت سے انتظار کر رہے تھے -

سریندر - یہ تم نے ٹھیک کہا - تلاش کرنا بھی تو انتظار کرنا ہی ہوتا ہے -

(دونوں ہنستے ہیں)

سریندر - اچھا تو اب تم جا رہی ہو - اس دوران میں خط تو برابر لکھو گی ؟

ریکھا - وعدہ نہیں کرتی - کوشش کروں گی - کیونکہ گاؤں میں ....

(دروازے کی طرف آگے بڑھ جاتی ہے)

سریندر - ہاں ہاں میں سمجھ گیا - اچھا بائی بائی

(دوسرا منظر)

(وہی سریندر کا کمرہ - میز اور کرسیاں پہلے دائیں کونے میں لگی ہوئی تھیں اب بائیں کونے میں لگی ہوئی ہیں - کلینڈر میں تاریخ دس پندرہ دن آگے بڑھ گئی ہے - جب پردہ اٹھتا ہے تو سریندر اور سروج آپس میں باتیں کر رہے ہیں)

سریندر - مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے -

سروج - ضرور دیکھا ہوگا -

سریندر۔ ممکن ہے نہ دیکھا ہو۔ ویسے بھی خیال آتا ہے۔ کیونکہ جو آدمی ہمیں اچھا لگے۔ میرا مطلب ہے کہ بہت اچھا لگے اس کے متعلق خواہ مخواہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہم نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے جیسے وہ ہمیشہ ہی سے ہماری زندگی کا حصّہ رہا ہو۔

سرُوج۔ یہ تو آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

سریندر۔ نہیں سروج، میں سچ کہتا ہوں۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو، بہت اچھیّ — اتنی اچھیّ کہ تمھارے بنا میری زندگی ادھوری تھی۔ میں اپنی شخصیت میں کمی سی محسوس کرتا تھا۔ تم نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ ہمیں ایک دُوسرے سے ملانے والے پروفیسر دیوراج کو میرا بال بال دعائیں دیتا ہے۔

سرُوج۔ پروفیسر دیوراج بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں۔

سریندر۔ سروج، مجھے آپ نہیں تم کہو۔ میں تمھارے مُنہ سے "تم" سننا چاہتا ہوں۔

سرُوج۔ لیکن آپ اتنے بڑے لیکھک ہیں۔ دیس بھر میں مشہور ہیں۔ ہر کوئی آپ کا نام لیتا ہے ہر جگہ آپ کا چرچا ہے۔ میں آپ کو . . . .

سریندر۔ یہ سچ ہے کہ سریندر موہن دنیا کی نظر میں ایک مشہور اور نامور ادیب ہے۔ مگر اس نے تمھیں اپنے دل کی رانی بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تم بھی اسے اپنے دل کا راجا بناؤ۔ یہ آپ سے نہیں تم ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہو پیاری جیسے میں تم کہتا ہوں۔ تم بھی مجھے "تم" کہو۔

سرُوج۔ لیکن آپ کی بلند شخصیت . . . . .

سریندر۔ یقین جانو کہ "تم" کہنے سے بلند شخصیت اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بار ہا مل چکے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ آپ میں جو ایک طرح کا بیگانہ پن ہے ایک دُوری کا احساس ہے وہ اب مٹ جانا چاہیئے۔

سرُوج۔ تم اگر سچ مچ ایسا سمجھتے ہو تو پھر "تم" ہی سہی

سریندر۔ واہ، تم! تم!! تم!!! خوش کر دیا (ہنستا ہے)

سرُوج۔ آپ . . . . . نہیں نہیں تم اسی اداسے ہنستے ہو کہ مجھے تم سے ملتے ہوئے شروع میں جو ایک طرح کا ڈر، ایک جھجک محسوس ہوئی وہ اب بالکل دُور ہو گئی۔

سریندر۔ دو دھڑکتے ہوئے دل جب آپس میں مل جاتے ہیں تو ڈر اور جھجک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

سرُوج۔ اب تو بلکہ (قدرے توقّف سے) جب میں تم سے دُور ہوتی ہوں تو مجھے اپنا گھر سُونا اور ویران دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف سائیں سائیں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں اور دیواریں بھائیں بھائیں کرتی ہیں۔

سریندر۔ یہ بھی تو کمال ہے کہ تم اتنے بڑے شہر میں اکیلی، ایک دم اکیلی رہتی ہو۔ مرد تو اکیلے رہ لیتے ہیں مگر عورتیں بھی اکیلی رہ سکتی ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین نہ تھا۔ ہمارا یہ سماج بہت پچھڑا ہُوا ہے۔ عورت کی آزادی اور خود مختاری پر ہر طرف سے حملے ہوتے ہیں۔ آوازے کسے جاتے ہیں۔

سرُوج۔ پہلے جب آپ سے . . . نہیں نہیں تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ تنہائی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب تو گھر کاٹنے کو آتا ہے

سریندر۔ سرُوج۔ سچّی محبّت کی یہی پہچان ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ تنہائی اب مجھے بھی کھٹکنے لگی ہے۔

سرُوج۔ لوگوں کو کہتے سنا تھا اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ تنہائی بھی ایک روگ ہے

سریندر۔ کچھ روگ جسم کے ہوتے ہیں اور کچھ روح کے ہوتے ہیں۔ جسم کا روگ کیسا بھی بھیانک ہو، برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن روح کا روگ ایک دم ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ تنہائی بھی روح کا روگ ہے۔

سرُوج۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں اس روگ کا علاج سوچیں۔

سریندر۔ علاج بہت آسان ہے (ہنستا ہے) اور میرا خیال ہے کہ تم نے بات کہنے سے پہلے ہی علاج سوچ لیا ہے، لیکن جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں۔ ہم ابھی کچھ دن ایک دوسرے سے ملیں جلیں، ایک دوسرے کے اور قریب آئیں اور ایک دوسرے کے خیالات اور شخصیت کو سمجھیں۔

سرُوج۔ لیکن تھوڑی دیر پہلے تمھیں نے کہا تھا کہ ہمیں آپس میں ملتے ہوئے اب کافی دن ہو گئے ہم اب ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں، ایک دوسرے کو کافی سمجھ لیا ہے اور ہم میں دُوری کا جو احساس ہے وہ اب مٹ جانا چاہیئے۔

سریندر۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن پیاری بیاہ کے معاملے میں میں جلد بازی کا قائل نہیں ہوں۔ کیونکہ بیاہ دو جسموں کا نہیں دو روحوں کا ملاپ ہے۔

ہر ایک بیاہ سے پہلے لڑکے لڑکی کو آپس میں ملنے کا ایک دوسرے کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیا جائے۔ تبھی بیاہ بیاہ ہوں گے اور زندگی خوش گوار رہے گی۔

سروج۔ یہی بلند خیالی تمہاری بلند شخصیت کا ثبوت ہے۔ اسی لئے پروفیسر دیوراج آپ کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ یہی خیال تمہاری کہانیوں میں موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ آپ کی —— نہیں نہیں تمہاری کہانیاں پڑھ کر مجھے نشہ سا ہونے لگتا ہے۔

سریندر۔ میری کہانیوں سے نشہ سا ہونے لگتا ہے۔ میں بڑا خوش ہوں اور تمہارا بے حد ممنون ہوں۔ میں کہانی ہمیشہ محنت سے لکھتا ہوں اور اس میں اپنی روح کو منتقل کر دیتا ہوں۔

سروج۔ میں نے ان ملاقاتوں سے کہیں زیادہ تمہاری کہانیوں سے تمہیں سمجھا ہے جب بھی میں تمہاری کوئی کہانی پڑھتی تھی تم سے ملنے کا ارادہ کرتی تھی۔ پھر جب پروفیسر دیوراج نے تمہاری تعریف کی اور تمہارا پتہ بتایا تو میں ملنے کے لئے بے چین ہو اٹھی اور سچ کہتی ہوں کہ میں نے اپنے من میں تمہارا جو روپ سوچا تھا تمہیں ٹھیک اس کے مطابق پایا۔

سریندر۔ کہانی کا روپ ہی لیکھک کا سچا روپ ہوتا ہے۔

سروج۔ میں نے تو تمہیں خوب سمجھ لیا ہے۔ ملنے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا (مایوس لہجے میں) تم نے مجھے ابھی نہ سمجھا ہو یا پسند نہ کیا ہو تو دوسری بات ہے۔

سریندر۔ نہیں نہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے سروج۔ سچ مچ جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ جس لڑکی کی مجھے مدت سے تلاش تھی وہ اب اچانک مل گئی ہے۔

سروج۔ پھر یہ ملنے ملانے اور سمجھنے سمجھانے کی باتیں کیوں کہتے ہو۔ میں جس طرح صاف کہتی ہوں کہ مجھ سے اب یہ تنہائی کا روگ سہا نہیں جاتا۔ اس طرح ......

سریندر۔ اچھا اچھا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری خوشی میری خوشی اور میری خوشی تمہاری خوشی ہے۔

سروج۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے بھی مجھے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

سریندر۔ ہاں پیاری سمجھ لیا ہے اور خوب سمجھ لیا ہے۔

سروج۔ اگر یہ سچ ہے تو میں چاہتی ہوں کہ ہم اگلے مہینے کی دس تاریخ سے ایک شریر اور ایک پران ہو کر ایک ہی گھر میں رہنا شروع کر دیں۔

سریندر۔ (جوش کو دباتے ہوئے) اگلے مہینے!

سروج۔ اگلے مہینے اور دس تاریخ کو

سریندر۔ تو گویا تم جیوتشی سے تاریخ پوچھ آئی تھیں (ہنستا ہے)

سروج۔ پریم خود ہی سب سے بڑا جیوتشی ہے۔ بات پکی رہی نا؟

سریندر۔ جیسی سرکار کی مرضی

سروج۔ تو پھر آپ —— نہیں نہیں۔ میں بھی کیا بھول کر جاتی ہوں۔ میں پرسوں پانچ بجے پھر آؤں گی اور ہم دس تاریخ کا پروگرام بنائیں گے۔

سریندر۔ کیا کچھ لمبی چوڑی تیاری کا ارادہ ہے؟

سروج۔ بس یہی کہ دعوت کیسی ہو، کون کون سا سامان خریدا جائے اور تمہارے اور میرے دوستوں میں سے کس کس کو بلایا جائے۔

سریندر۔ بہت خوب، ہم تم بیاہ کا پروگرام بنائیں گے اور ہمارا بیاہ تو ایک آدرش بیاہ ہوگا۔

سروج۔ تو پرسوں پانچ بجے تم میرا انتظار کرو گے؟

سریندر۔ ضرور۔

سروج۔ اچھا نمستے

سریندر۔ نمستے۔

(سروج چلی جاتی ہے اور پران داخل ہوتا ہے)

پران۔ یہ شریمتی کون تھیں

سریندر۔ تم خود ہی بتاؤ۔

پران۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔ صاف صاف بات کرو۔

سریندر۔ تو پھر شریمان پران ناتھ جی صاف صاف سنیئے۔ یہ شریمتی جی جنہیں آپ نے ابھی جاتے ہوئے دیکھا ہے آپ کے دوست شریمان سریندر موہن کی ہونے والی دھرم پتنی ہے۔

پران دھرم پتنی!

سریندر ہاں ہاں دھرم پتنی۔ اس میں چونکنے کی کوئی بات ہے۔ ہماری دھرم پتنی اور تمہاری بھابی۔

پران۔ اور دیکھا؟

سریندر۔ دیکھا دیکھی کی باتیں چھوڑو۔ وہ اس قابل کہاں کہ ہندوستان کے

بلند پایہ ادیب سریندر موہن کی۔ ۔ ۔ ۔

پیران۔ یعنی اس وقت تو بڑے ڈھول پیٹتے رہے تھے کہ وہ جلد بہت جلد ہماری بھابی اور تمہاری دھرم پتنی بننے والی ہے۔

سریندر۔ لیکن تمہارے دوست سریندر موہن کو اپنی صحیح عظمت کا احساس اب ہوا ہے۔ اب اس نے اپنی قابلیت، ذہانت اور شخصیت کا لوہا لوگوں سے منوا لیا ہے۔ اب ایک سے ایک بہتر لڑکی اس پر فدا ہو رہی ہے۔ بیاہ کرنے کو اس کے پیچھے دوڑتی ہے۔

پیران۔ اس لئے تم ۔ ۔ ۔ ۔

سریندر۔ اس لئے ہم انتخاب کریں گے (ذرا توقف سے) اور تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لڑکی ریکھا سے کہیں بہتر ہے۔ صحت اچھی ہے۔ خدوخال تیکھے ہیں۔ پھر ریکھا محض کلرک تھی۔ یہ ایک سکول میں ٹیچر ہے۔ ریکھا سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ ہمارے ادب اور ہماری شخصیت کو اس سے کہیں بہتر سمجھتی ہے اور خود بھی ایک بلند پایہ شخصیت کی مالک ہے۔ ٹیچر ہونے کے علاوہ سماجی اصلاح اور ترقی کے کاموں میں حصّہ لیتی ہے۔ عورتوں کی انجمن کی سرگرم کارکن ہے۔ خوب کام کرتی ہے۔ ہم دونوں مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو جائیں گے۔

(ہنستا ہے)

پیران۔ یار۔ بڑے خوش قسمت ہو۔

سریندر۔ خوش قسمت ہی نہیں سمجھدار بھی ہیں۔ ہم نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ ریکھا کو چند روز ٹالا تو اس سے کہیں بہتر لڑکی مل گئی۔

پیران۔ اگر اسے بھی چند روز ٹالو تو ممکن ہے کہ اس سے بھی بہتر لڑکی مل جائے۔

(ہنستا ہے)

سریندر۔ اب وہ دن دور نہیں جب تم ہماری خوش قسمتی پر رشک کرو گے۔

پیران۔ ہم تمہاری خوش قسمتی پر اس سے بھی زیادہ رشک کرنا چاہتے ہیں۔

سریندر۔ واقعی؟

پیران۔ ہاں، میری بات مانو اور چند روز اسے بھی ٹالو۔ اب تو تم ایک اور ایک گیارہ بنتے ہو لیکن تیسری یا پھر چوتھی لڑکی تمہیں ملے گی وہ ایسی ہو گی کہ تم دو اور ایک ایکیس بن جاؤ گے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

سریندر۔ خیر دوست، اب مذاق چھوڑو اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ہمارا بیاہ ہو رہا ہے۔

پیران۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو!

سریندر۔ ہاں دس تاریخ سوموار کے روز ہمارا بیاہ ہو رہا ہے اور یہ تاریخ میں نے نہیں تمہاری ہونے والی بھابی نے خود تجویز کی ہے۔

پیران۔ بہت خوب!

سریندر۔ اس سلسلے میں تمہارے ذمّے ایک کام تو یہ ہے کہ کم سے کم دو سو روپے کا انتظام تمہیں کرنا ہو گا۔

پیران۔ اور دوسرے برات میں چلنے کو تیار رہنا ہو گا۔

سریندر۔ وہ تو خیر تم بنا کہے بھی چلو گے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

پردہ گرتا ہے

تیسرا منظر

(وہی سریندر کا کمرہ۔ میز اور کرسیاں اسی طرح پڑی ہوئی ہیں صرف ٹائم پیس اب کانس کی بجائے میز پر پڑا ہے اور سریندر اس کی طرف بار بار دیکھتا ہے)

سریندر۔ پانچ بجنے میں دس منٹ۔ صرف دس منٹ باقی رہ گئے۔ وہ اب آتی ہی ہو گی (اٹھ کر کانس کے قریب جاتا ہے۔ آئینہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور آپ ہی آپ مسکراتا ہے۔ چونک کر) ہاں یہ اس کی چاپ ہے اسی کی۔ ان نازک قدموں کی چاپ کو اب میں خوب پہچانتا ہوں۔

(آئینہ رکھ کر مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور سامنے ریکھا کو کھڑے دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے)

ریکھا۔ نمستے۔

سریندر (بے دلی سے) نمستے۔

ریکھا۔ مجھے دیکھ کر تم گھبرا کیوں گئے۔

سریندر۔ نہیں تو۔ گھبرانے کی اس میں کیا بات ہے؟

ریکھا۔ تو پھر بیٹھئے نا (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سریندر۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ہاں ہاں، آپ بھی۔ میرا مطلب ہے کہ

تم بھی بیٹھو۔

ریکھا۔ آج ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ تم واقعی بہت پریشان ہو۔ شاید میرا آنا ہی اس پریشانی کا باعث ہے۔

سریندر۔ دراصل۔ . . . دراصل . . . .

ریکھا۔ ہاں، ہاں۔ کہتے کیوں نہیں، دراصل آنا کسی اڈکو تھا اور میں یوں آن ٹپکی (کرسی سے اُٹھ کر) لو۔ میں چلی جاتی ہوں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو۔

سریندر۔ نہیں ریکھا۔ ایسی بات نہیں۔ بیٹھو بیٹھو۔ دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہاری چھٹی تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تمہیں تو ابھی کچھ دن اور گاؤں میں رہنا تھا۔

ریکھا۔ (بیٹھ جاتی ہے) چھٹی کے ابھی دس دن باقی ہیں۔ لیکن گاؤں میں میرا دل ہی نہیں لگا۔ بار بار تمہاری یاد . . . . .

سریندر۔ (خوش ہوکر) واقعی ؟

ریکھا۔ ہاں سچ کہتی ہوں بار بار تمہاری یاد آتی تھی۔ اس لئے سوچا کہ جب یہاں من نہیں لگتا تو چلو شہر ہی میں چلوں۔

سریندر۔ اس لئے تم چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چلی آئیں۔

ریکھا۔ ہاں، میں پہلے ہی چلی آئی۔ لیکن تم خوش کیوں نہیں ہو؟

سریندر۔ (مسکرا کر) میں تو خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔

ریکھا۔ پھر مجھ سے کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے ؟

سریندر۔ اب تو تم یہیں ہو۔ باتیں ہم خوب کریں گے اور ہر روز کریں گے۔ لیکن اس وقت معذرت چاہتا ہوں۔ کیونکہ آج مجھے فرصت نہیں ہے۔

ریکھا۔ کیا مطلب؟ آج تمھیں فرصت نہیں ہے ؟

سریندر۔ (ملائمت سے) ہاں ریکھا، دو منٹ بعد مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

ریکھا۔ اور مجھے بھی تو تم سے ضروری — بہت ضروری کام ہے اور اس سلسلے میں بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

سریندر۔ وہ باتیں کل بھی تو ہو سکتی ہیں۔

ریکھا۔ (مچل کر) آج اور ابھی ہوں گی۔

سریندر۔ ریکھا۔ اتنی جلد بازی کیوں ؟ سوچو کہ اگر آج تم گاؤں سے نہ آتیں اور اگر اس وقت میں تمھیں گھر پر نہ ملتا ؟

ریکھا۔ لیکن آج میں آ گئی ہوں اور تم مجھے گھر پر بھی مل گئے ہو اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ہمیں جو فیصلہ کرنا ہے وہ ابھی کر لیں۔

سریندر۔ فیصلہ ؟

ریکھا۔ ہاں، جب ہم ایک ساتھ رہنا طے کر چکے ہیں تو اب الگ الگ نہیں رہا جاتا اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج ہم بیاہ کی تاریخ کا فیصلہ کر لیں۔

سریندر۔ ریکھا۔ کیسی بھولی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی تم اتنے دن بعد آئی ہو۔ کچھ اپنی کہو۔ کچھ میری سنو۔ بیاہ کوئی بچوں کا کھیل ہے جو . . . .

ریکھا۔ ہاں ہاں میں جانتی ہوں کہ بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ روح کا رشتہ ہے اور میں نے تم سے دور رہ کر دیکھ لیا کہ یہ روح کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ اب ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا مشکل ہے بلکہ ممکن ہی نہیں ہے،

سریندر۔ (ذرا طنز سے) بہت خوب! اب ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ریکھا۔ نہیں ہے، نہیں ہے، بالکل نہیں ہے۔

سریندر۔ (ہنس کر) اچھا تو ہم قریب رہیں گے۔ اب تم کبھی گاؤں مت جانا۔

ریکھا۔ (حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

سریندر۔ یوں کیا دیکھ رہی ہو؟

ریکھا۔ میں دیکھ رہی ہو کہ تم وہی سریندر موہن ہو جو پہلے تھے۔

سریندر۔ ہاں میں وہی سریندر موہن ہوں جو کہانی کار ہے جو ملک کا مشہور ادیب ہے جو . . . . .

ریکھا۔ مگر آج تمہارا لہجہ کچھ کچھ بدلا ہوا ہے۔

سریندر۔ میرا لہجہ (طنزاً ہنس کر) میرا لہجہ بالکل نہیں بدلا۔ دراصل شہر سے دور گاؤں میں رہ کر تم خود بدل گئی ہو . . . .

(سروج یکایک داخل ہوتی ہے۔ اس نے چمپئی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ بالوں میں پھول ٹنکے ہوئے ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ دل کش دکھائی دے رہی ہے)

ریکھا۔ (کھڑی ہوکر) بہن نمستے۔

سروج۔ نمستے (ایک نظر سریندر کو دیکھ کر اور پھر ریکھا کی طرف پلٹ کر) تم یہاں کیسے ؟

ریکھا۔ یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں کہ تم یہاں کیسے ؟

سروج۔ بہن میرے ہونے والے دولہا بھی تو ہیں اور میں ان سے . . .
ریکھا۔ کیا کہا ؟ شری یان سریندر موہن تمھارے ہونے والے دولہا ہیں ؟
سروج۔ ہاں ہاں۔ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ؟
ریکھا۔ لیکن بہن میرے ہونے والے دولہا بھی یہی ہیں اور میں ان سے . . .
سروج۔ بیاہ کی تاریخ طے کرنے آئی ہو ؟
ریکھا۔ ہاں بہن۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہو کر رہیں گے۔
سروج۔ لیکن ان سے میرے بیاہ کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔
ریکھا۔ تاریخ طے ہو چکی ہے ؟
سروج۔ ہاں بہن۔ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ہمارا بیاہ ہے اور اب میں اسی کا پروگرام بنانے یہاں آئی ہوں۔
ریکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے میرا دولہا مجھ سے چھین لیا۔
سریندر۔ (چڑھ کر) ریکھا، بات مت بناؤ۔ میں نے تم سے بیاہ کا وعدہ کبھی نہیں کیا۔
ریکھا۔ بیاہ کا وعدہ کبھی نہیں کیا ؟
سریندر۔ نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست تھے اور دوست رہیں گے۔
ریکھا۔ اور یہ لمبے لمبے خط صرف دوست بنے اور دوست رہنے کے لئے لکھے تھے۔

(بٹوا کھولتی ہے اور خط نکال کر سامنے پھینک دیتی ہے)

سریندر۔ (گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)
ریکھا۔ اس وقت تو بڑے طمطراق سے کہتے تھے۔ تمھیں وہ لڑکی ہو جس کا مجھے مدت سے انتظار تھا۔
سروج۔ اور بیاہ جسم کا نہیں روح کا رشتہ ہے۔
ریکھا۔ بالکل، بالکل! اور بہن یہ بھی کہا تھا کہ اصل بات شخصیت ہوتی ہے۔ ہم نے چونکہ ایک دوسرے کی شخصیت کو سمجھ لیا ہے۔ اس لئے ہمارا بیاہ ایک آدرش بیاہ ہوگا۔
سروج۔ اور نئے سماج کے لئے نمونہ بنے گا۔
ریکھا۔ (دانتوں میں انگلی دے کر) ہاں بہن! کیا یہ ساری باتیں انھوں نے تم سے بھی کہیں ؟
سروج۔ اور میں نے سوچا کہ جس کے خیالات اتنے اچھے ہیں اور جس کی شخصیت اتنی بلند ہے اسے پا جانا خوش قسمتی ہے . . . .
ریکھا۔ (اٹھ کر) تو بہن تمھاری یہ بلند شخصیت تمھیں مبارک۔ میں چلتی ہوں۔

(دروازے کی طرف تیزی سے بڑھتی ہے)

سروج۔ ریکھا، ریکھا! (وہ ٹھہر جاتی ہے) ذرا ادھر آؤ۔ بات سنو۔ تم میری پیاری سکھی ہو، منہ بولی بہن ہو۔ میں تمھارا ہونے والا دولہا تمھیں لوٹاتی ہوں اور تم دونوں کو سچے دل سے بدھائی دیتی ہوں۔
ریکھا۔ نہیں نہیں، تمھارا دولہا تمھیں مبارک (پھر چلنے لگتی ہے)
سروج۔ بہن ٹھہرو۔ تمھیں میرے سر کی قسم۔ ذرا میری بات سنو۔
ریکھا۔ (ٹھیر کر) ہاں کہو
سروج۔ پہلے ادھر آؤ
ریکھا۔ (لوٹ کر) لو میں آ گئی۔ لیکن تم مجھے جانے کیوں نہیں دیتیں۔ تمھیں تو اپنے دولہا سے باتیں کرنا ہوں گی۔
سروج۔ دیکھو بہن۔ تم پہلے ان کی زندگی میں آئی ہو۔ اس لئے یہ تمھارے دولہا ہیں۔ میں ہرگز ان سے شادی نہیں کروں گی۔
ریکھا۔ اور میں بھی نہیں کروں گی۔
سروج۔ تم کرو۔ میں نہیں کروں گی۔
ریکھا۔ کہہ دیا کہ میں نہیں کروں گی۔
سروج۔ تو میں بھی نہیں کروں گی۔
سریندر۔ کیا مطلب ؟
سروج۔ شری یان سریندر موہن جی۔ دیس کے مشہور لیکھک۔ کیا آپ اتنی سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔

(ریکھا اور سروج دونوں کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ سریندر حیران و پریشان اُن کا مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ڈراپ سین)

موج علیگ

تخلیق

وہ دوستوں کی ہزار راتیں
تبسّموں قہقہوں کے فتنے
حسین چہرے
محبتوں کے
جوانیوں کے
بہت زمانہ ہُوا کہ اے دل
خلائے ماضی میں کھو گئے ہیں
مرے مقدّر سے چھن گئے ہیں
مگر نگاہیں نہیں بجھی ہیں
کہ نصف شب تک
اسی شبستاں میں بن سنور کر
شراب کی تلخیاں نگل کر
اکیلا بیٹھا ——
خود اپنے سائے کو دیکھتا ہوں
دراز سایہ!
بلند سایہ!!

من موہن تلخ

موت کی آواز

آج پھر موت کے جذبے میں بڑی شدّت ہے
آج وہ بات نہیں ہے کہ طبیعت شل ہو
اس خنک رات میں موجود ہے ہر وہ عنصر
جس سے تکمیلِ تمنّا بڑی آساں ہو گی
کچھ نہیں سوجھ رہا ہوش کا عالم یہ ہے
سیٹیاں بجتی ہیں کانوں میں، عجب گونجیں ہیں
یوں دھمک نبض کی آتی ہے کہ دم رُکتا ہے
یوں ٹھٹھکتے ہیں قدم جیسے کہ اندھا ہوں میں
دل پہ جیسے ہو منوں بوجھ، کہ ہر دھڑکن سے
ذہن میں ٹیسیں اُبھرتی ہیں رگیں تنتی ہیں
مُٹھیاں آپ ہی بھنچ جاتی ہیں، کھُل جاتی ہیں
کوئی احساس کا لاوا ہے کہ تھمتا ہی نہیں
ماورائے سخن و فہم ہے آوازِ ضمیر
زندگی گھوم گئی ہے مری نظروں میں کہ یوں
جی میں آتا ہے کہ میں چہرہ جھُلس لوں اپنا
اتنا ویراں مرا ماضی ہے کہ ممکن ہی نہیں
میں کسی یادِ گزشتہ کا سہارا لے لوں
رکھ دیا مجھ کو دھنک کر مرے احساس نے آج
سرد ماتھے پہ پسینے کی ہیں بوندیں ایسے
سنگِ مرمر کی کسی قبر پہ جیسے دمِ صبح
اوس کے قطروں کی جھالر سی پڑی ہوتی ہے
حاصلِ عمر ہے یہ پل کہ مری ہستی میں
زندگی بھر نہ ہوئی تھی کبھی ایسی ہلچل
میں ہوں مرنا بقدم مرکزِ محسوسات اب
غالباً موت دبے پاؤں چلی آتی ہے

ل۔ احمد اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی

(صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے)

یہ تقریر ۹۔ دسمبر ۱۹۵۵ء کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی لیکن ریڈیو تقریر میں بحث کے بعض پہلو چھوڑ دیے گئے تھے، اب توضیحی اضافوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ ل۔ احمد

آزاد نے نظیر کے بعض شعروں کو میر کے اشعار سے پہلو مارتے کہا ہے۔ اس کو اگر تعریفاً سمجھ بھی لیا جائے تو ایسی تعریف کسی معمولی درجے کے شاعر کے لئے وجہ تفاخر ہو سکتی ہے۔ نظیر تو اپنی جگہ صرف صاحبِ طرز ہی نہیں، ایک اسکول ہیں۔

طرزِ نظیر کی خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ ان کا شعر اگر ان کے کسی ہم عصر کے کلام میں ملا دیا جائے تب بھی شناخت ہو جائے گا۔ نظیر کے ہر شعر پر ان کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ و محاورات کا کثیر استعمال کر کے نظیر نے بہت سے حسین پیرایۂ بیان محفوظ کر دیے ہیں۔ "ہر آن چیڑ کو ان جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا" اس مصرعے میں چھڑ کو (ٹاپ) کا لفظ جس خوبی کے ساتھ آیا ہے، یہ طریق استعمال اب کسی کو یاد بھی نہیں رہا ہے۔ اس گفتگو میں نظیر کے جو شعر نقل کئے جائیں گے وہ طرزِ نظیر کی خصوصیت کا اندازہ کرا دینے کو کافی ہوں گے۔

نظیر کی شاعری کا رتبہ قرار دینے میں ادبی نقّاد فی الجملہ مشکل میں ہے، ایک طرف ان کا حقیقت زندگی سے معمور کلام، اور عوام النّاس کے جذبات و محسوسات کی نقّاشی ہے تو دوسری طرف پوچ و پست بلکہ کچھ غیر ثقہ اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں۔ شیفتہ کی تنقید اور فرحت اللہ بیگ کے تبصرے کے مابین کئی مستقل تبصرے اور متعدد مضامین لکھے گئے، مگر کلام نظیر کے اس تضاد و تباین پر بحث یا توجیہہ نہیں کی گئی یا پھر وہ میرے علم میں نہیں آئی۔ اسی دقت نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو غیر جانب دار بن جانے پر مجبور کیا، اور وہ مختلف نقّادوں کی رائیں نقل کر کے سبکدوش ہوئے۔

میاں نظیر کے متعلق یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ تاج گنج سے مائی تھان، اور وہاں سے تاج گنج جاتے ہوئے لوگ میاں نظیر کے یابو کو روک لیتے اور حسبِ حال شعروں کی فرمائش کرتے تھے، اور چوں کہ میاں نظیر کے مسلک میں دل شکنی نا روا تھی، اور مزاج میں قلندریت کا عنصر بھی تھا، کھڑے کھڑے تک بندی کر کے یاروں کو ہنسا دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس تک بندی کا مقصود اہلِ بازار کو ہنسانا ہو اس کی شاعرانہ نوعیت کیا ہوگی سمجھیے۔ وہ شاعری تو ہونے سے رہی۔ اس بنا پر میرا پختہ خیال ہے کہ نظیر کے مجموعے میں ایسی تک بندیاں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ اور اس کے علاوہ ان کے دیوان میں الحاقی غزلیں ہونا بھی بعید از قیاس نہیں جو شاید ان کے لڑکے آسیر کی ہوں۔

الحاصل، ایسے کلام کو نظیر کے مجموعے میں شامل کر دینا ایک اہم ادبی غلطی تھی، اور اس کلام کو بنائے تنقید بنانا میرے خیال کے مطابق دوسری اہم غلطی ہے۔

اس کو ایک طرفہ اتفاق ہی کہا جائے گا کہ اردو زبان کے شعراء کی طویل فہرست میں غالب و نظیر دو ہی شاعر ایسے گزرے ہیں جو اپنے جیتے جی تو ناموری حاصل نہ کر سکے، بلکہ مردود ٹھہرے، لیکن بعد کے زمانے میں اُن کی مقبولیت نے اردو شاعری کے دھارے ہی کو موڑ دیا۔

غالب ونظیر کی اس بے مثال مقبولیت نے ہمارے ادب نوازوں کو ان دونوں کے غیر شائع شدہ کلام کی تلاش وجستجو میں لگا دیا، اور ان "دریافتوں" کے نتیجے میں غالب کا وہ کلام بھی شائع ہوگیا جسے خود انھوں نے مسترد کر دیا تھا، اور نظیر کا سارا رطب و یابس بھی چھاپ دیا گیا جس کا بڑا حصہ میں سمجھتا ہوں کہ دیوان میں شامل کرنے کی غرض سے نہیں کہا گیا تھا۔

بلاشبہ اس طرح ان "دریافت" کر لینے والوں کو تفاخر کا موقعہ مل گیا، لیکن اس وجہ سے تنقیدی اُلجھنیں بھی پیدا ہوگئیں، اور غالبؔ نظیر کے ادبی رتبے میں بالیقین کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آج غالب جس بنا پر زندہ ہیں وہ ان کی سہل ممتنع غزلیں ہیں۔ اور نظیر کو جس چیز نے پھر سے زندہ کیا وہ ان کی نظمیں ہیں۔ میری رائے میں غالب کے نسخۂ حمیدیہ اور نظیر کے دیوانوں کے مسودوں کا کتب خانے میں محفوظ ہو جانا کافی تھا۔ ہمارے کتب خانوں میں بہت سے مسودے محفوظ ہیں جو شائع نہیں کئے گئے مگر ریسرچ کے کام آتے رہتے ہیں۔

حالات زمانہ کے انقلاب نے زندگی کی قدروں کو بدل دیا ہے اور اس انقلاب سے کلام نظیر کی مقبولیت عام ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اگر انجمن ترقی اردو (ہند) اس طرف توجہ کرے اور بعد تحقیق و تدقیق کلام نظیر کا ایک منتخب اور ایک فرہنگ نظیر مدوّن کرا کے شائع کر سکے تو زبان و ادب کی یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی، اور وقت کی بڑی ضرورت پوری کرے گی۔

الغرض، جاگیرداری دور کی اشرافی سماج نے شیفتہ کی زبان سے کلامِ نظیر اور خود نظیر پر "بازاری" ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ اس لئے کہ نظیر نے سماجی قید و بند سے بغاوت کر کے زندگی کی حقیقتوں کو موضوعِ شعر بنایا تھا، اور زندگی بھی طبقہ "اجلاف" اور "حشرات الارض" کی، اور ستم بالائے ستم یہ کیا کہ خود کو عوام الناس کے ساتھ شناخت کرا کے اپنے شعر میں عوامی لب و لہجہ۔ عوامی الفاظ و زبان، عوامی روزمرّہ و محاورات استعمال کئے (جہاں تک آج کل کے بادعائے خود "عوامی شاعر" نہیں پہنچ سکے ہیں، اور وہ نظیر سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں) اور انسانوں کے اس جمِ غفیر کے احساس و خیال کو اپنے شعر کا پیکر بخشا۔

چنانچہ شیفتہ کی تنقید کی غایت و نوعیت تو بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن عہدِ حاضر کے نقّاد کا جب کہ فن و صناعت کے نظریات اور زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں، کلام نظیر کے تضاد و تبائن پر امتیازی نظر نہ ڈالنا حیرت انگیز ہے، نظیر کے ثقہ و پست اشعار پر نظر پڑتے ہی خیال کا اس طرف جانا ناگزیر ہے کہ یہ اگر ایک ہی شخص کا کلام ہے تو پست و فحش اشعار یقیناً اشاعت پانے کے لئے نہیں کہے گئے تھے۔ اسی قسم کی شاعری اکثر شعراء نے کی ہے جو کھُلا بھی دی گئی۔ لیکن بعض اساتذہ کا غیر ثقہ کلام شائع بھی ہوا۔ مگر اس بنا پر ان کا رتبۂ شاعری مجروح نہیں ہوا۔ شیخ سعدی اپنے غیر ثقہ کلام کے سبب رسوا نہیں ہوئے۔ اور امیر خسرو زفاف کی تفصیلات بیان کر کے مردود نہیں ٹھہرے۔

ہر چند نظیر غزل گو شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کے بعض غزلیہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر خیال کی ندرت و بلندی، مفہوم کی پاکیزگی اور گہرائی۔ بیان کی سادگی و صفائی اور لب و لہجہ کی ثقاہت و سنجیدگی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ٹھہرنا عشق کے آفاق کے میداں میں نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

دیا دل تو پھر عہد و پیمان کیا
لیا جس نے اُس کا ہے احسان کیا

نظیر اس سے ہم نے چھپایا جو دل کو
تو ہنس کر کہا "ہیں یہ انسان کیا؟"

لیلےٰ ہی اُس کے ہوش سے واقف تھی ورنہ یاں
اکثر یہ جانتے ہیں کہ مجنوں دِوانہ تھا

تیشے کی کیا مجال تھی یہ کہ تراشے بیستوں
تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طورکے شعلے
کہ مثلِ آتشِ افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا کملا

تھے ابھی ہم جواں اور نظیر اب
رنگ موسم تاب سا دیکھا

شام کی صبح ہوگئی دم میں
یہ تو کچھ ہم نے خواب سا دیکھا

یہ جو ہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا، اہلِ معنی کا سراب

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کا
اے ساقیانِ بزم بیار یدہر چہ ہست

میں تو بے غیرت نہیں کیا جاؤں اُس بدخو کے پاس
کون سا کم بخت لے جاتا ہے تجھ کو گھیر کر

قرب سمجھا تھا جسے تو وہ ہی دُوری اے شیخ
اسی نزدیکی نے پھینکا تجھے دور آخر کار

بندے کے قلم ہات میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہم نشیں
دورِ فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے وہ فنا ہے

جو شکل دُور باش تھی روزِ نخست کی   اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی
جب اُس مہ جبیں پاس ہم شب کو پہنچے   فروغِ مسرّت کے منصب کو پہنچے

ان مختلف اشعار پر کسی اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں، اور ان بانظر سے ان کے محاسن شعری نظر انداز ہو بھی نہیں سکتے، مگر مختلف اشعار پیش کرنے کے ساتھ ایک پوری غزل نقل کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کی غزل گوئی کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب   یوں ہے جیسے بر روئے آب حباب
گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں؟   پر کاہ ہے میانہ گرداب
بادۂ ناب کیا ہے؟ خونِ جگر!   زردیِ رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں   وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے؟   مثلِ تحریرِ موج، نقش بر آب
حسن اور عشق جس کو کہتے ہیں   خطفۂ برق و قطرۂ سیماب
فرصتِ عمر؟ قطرۂ شبنم!   وصلِ محبوب؟ گوہرِ نایاب

سب کتابوں کے کھُل گئے معنے
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

ان شعروں کا لب و لہجہ، معانی و مفہوم اور سنجیدگی و ثقاہت پر نظر رکھتے ہوئے یہ شعر بھی سنئے۔

نازکا اس کے جو تھپیڑا ہے   طبع مشتاق کو وہ پیڑا ہے
کہا جو ایک لے بوسہ، ہیں ٹولگا لینے   تو ہنس کے کہنے لگی چل ہے اب ایک دو

وقس علیٰ ہذا۔

کون صاحبِ ذوق باور کرے گا کہ ایسے شعر میاں نظیر کے سرورِ غلبی کی تحریک کا نتیجہ ہیں؟ اور کون ذی فہم قیاس نہ کر سکے گا کہ یہی وہ شعر ہیں جو اہلِ بازار کی فرمائش پر ان کو ہنسا دینے کے لئے کہے گئے تھے؟

اوپر کی سطروں میں کہا جا چکا ہے کہ نظیر جس بنا پر نظیر مانے گئے ہیں وہ ان کا غزلیہ کلام نہیں، بلکہ ان کی نظمیں ہیں، جن کے موضوعات کا تنوع زندگی کی گوناگوں کیفیات، متنوع انسانی جذبات و محسوسات کے اظہار کے ساتھ ہر نظم کی تہ میں ایک وجہ مشترک بھی ہے اور وہ ہے نظیر کی انسان دوستی؛ نظیر جو کچھ بھی تھے، وہ سب سے پہلے ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، اور اسی لئے عامۃ الناس کے رنج و مسرّت سے شدید اثر لیتے تھے۔ ان کی نظر میں آدمی، آدمی پہلے تھا اور باقی سب کچھ بعد میں، اور وہ باقی سب کچھ نظیر کی نظر میں بے حقیقت تھا۔ دردمندی انسانیت کا وصفِ اوّل ہے۔ نظیر کا یہ قطعہ پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا۔

کہا یہ دل نے مجھے ایک دن کہ باغ کو دیکھ   ذرا تو چل کے گلستاں کے شب چراغ کو دیکھ
جو نہی گیا میں چمن میں تو دل ہوا خرّم   گلوں کے حسن کو اور نازاور دماغ کو دیکھ
کہ اس میں آیا نظر مجھ کو ایک گُل لالہ   میں شاد اس سے ہوا عیش با فراغ کو دیکھ
یکایک اُس نے کہا تو نگہ نہ کر مجھ پر   نہ میرے بادۂ شبنم سے پُر ایاغ کو دیکھ
نہ میری دیکھ تو سبزی نہ رنگِ سرخ نظیر!   ہے دردمند اگر تو تو میرے داغ کو دیکھ

آدمی نامہ، نظیر کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں نظیر کی انسان دوستی پوری طرح جھلکتی ہے۔ جب وہ اعلیٰ و ادنیٰ، اچھے اور بُرے ہر قسم کے آدمی کو جیسا کا تیسا پیش کر کے کہتے ہیں کہ "ہے وہ بھی آدمی"۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار   اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقّہ، صراحی، جوتیاں دوڑے بغل میں مار   کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اس طویل نظم میں نظیر خود کوئی رائے نہیں دیتے کسی قسم کا خیال ظاہر نہیں کرتے۔ نہ اچھے سے اُلفت بیان کرتے ہیں، نہ بُرے سے نفرت۔ محض حقیقت الامر کی طرح اشارے کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والا یہ اثر لینے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ نابرابری کیوں ہے؟ یہ ایک پالکی سوار کے لئے اتنے کہار، کفش بردار، پیادے سوار اور نقیب بنا کر آخر انسانیت کو ذلیل کیوں کیا جا رہا ہے۔

نظیر نے جو زمانہ پایا اُس زمانے میں "عالم ہیچ است" کا فلسفہ مذہبی عقیدہ بن کر خاص و عام کی زندگی کا جزو بن گیا تھا، اور نظیر اس سے بدرجۂ اتم متأثر ہوئے۔ اس لئے قناعت مزاج بن گئی۔ ایسا اگر نہ ہوتا تو ریاست بھرت پور اور دربار لکھنؤ کے بلاوے مسترد نہ ہو جاتے۔ کیونکہ میاں نظیر کی بسر اوقات کا ذریعہ معلّمی کا پیشہ تھا، اور اس پیشے میں جو یافت ہو سکتی وہ معلوم عام ہے۔ میاں نظیر نے ایک نظم میں اپنا حلیہ بیان کیا ہے، اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ان کی جوانی اور پیری دونوں دورِ عالم افسردگی تھے۔

لیکن اس کے باوجود کلام نظیر اگر ان کی طبع و مزاج کی شہادت بن سکتا ہے تو مجھے ان کے کلام میں "بیزاری" منسلک ہونے کی شہادت نہیں ملی بلکہ اس کے برخلاف اس کا ثبوت کثرت سے ملا کہ وہ زندگی کے زبردست شیدائی تھے اور اس کے ہر ہر لمحے کو جی لینا چاہتے تھے۔ عیش میسر کو ہات سے کھوتے نہیں اور غیر حاصل مسرت کے سخت آرزومند رہتے ہیں! کہتے ہیں۔

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

ایک مختصر سے قطعے میں نظیر خوب محبوب سے شادکام ہوتے اور اس کی ایک ایک ادا اور سجاوٹ سے جداگانہ لطف اندوزی کو اس طرح بیان کرکے زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہوئے خوش ہم ایک نگار سے، ہوئے شاد اس کی بہار سے
کبھی شان سے کبھی آن سے، کبھی ناز سے کبھی پیار سے
ہوئی پیرہن سے بھی خوش دلی کلی دل کی اور بہت کھلی
کبھی طرّے سے کبھی گجرے سے، کبھی بدھی سے کبھی ہار سے
وہ کناری اس میں جو تھی گندھی، اُسے دیکھ کر بھی ہوئی خوشی
کبھی نور سے کبھی مہر سے، کبھی برگ سے، کبھی بار سے
وہ نظیر سے تو ملا کیا، مگر اپنی وضع میں اس طرح
کبھی جلد سے کبھی دیر سے، کبھی لطف سے کبھی عار سے

نظیر کا سارا کلام اسی رنگ و آہنگ کا ہے، اور وہ آس پاس کی زندگی سے جی کھول کر بہرہ اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعے میں ایسے شعر بکثرت ملیں گے جن کے اندر نظیر کے خنداں و رقصاں زندگی کے مرقع نظر آئیں گے۔ اور جہاں یہ نہ ہوگا وہاں عشرت نارسا پر حسرت کا اظہار ملے گا۔ اس غزل کو پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ کوئی افسردہ دل انسان ایسی غزل کہہ سکتا ہے۔

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا
جوں رنگ بہاروں میں ہووے جوں حال چمن و گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں
ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں
وہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے
وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا
ہے روپ عبیروں کا پھوش اور رنگ گلالوں کا گلگوں
ہیں پھرتے جس میں رنگ، بنا ہے رنگ عجب اس برتن کا
اس گل رُو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی اور مدہوشی ہے
نا خیال ہمیں کچھ چولی کا نا دھیان ہمیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اس گل رُو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم
کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہے مست مہینا پھاگن کا

یہ اور ایسی اکثر نظمیں جیسے "آیا رچل کے دیکھیں برسات کا تماشا" یا "پھر دیکھ بہاریں جاڑے کی" یا "جکھ ڈال مال دھن کو" ایک ہی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اتنا سارا اور اس رنگ کا کلام سامنے ہو تو باور نہیں ہوتا کہ یہ ایک مُرتاض انسان کا کلام ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا کو ہیچ سمجھ لینے کے بعد زندگی کی اُمنگوں کے لئے میدان باقی نہیں رہتا ہے، اور جب اس کے باوجود نظیر زندگی کی مسرتوں میں حریص بن کر حصہ لیتے نظر آتے ہیں تو ان کی عالی ظرفی کے سامنے سر جھکا دینا پڑتا ہے کہ مستقل افسردگی کے باوجود وہ شگفتہ رہتے اور دوسروں کو شگفتہ دل بناتے تھے۔ اس اعتبار سے نظیر کا کردار بہت بلند نظر آتا ہے۔ اور اُن کے کردار کا یہ پہلو گوگول کا قول یاد دلاتا ہے کہ:۔

"ایک فن کار کا کمال اس میں ہے کہ وہ زندگی پر دونوں حالتوں میں نظر ڈالے۔ قہقہہ مارتے ہوئے بھی جسے دنیا دیکھ سکتی ہے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی جسے کوئی نہیں دیکھتا"

حضرت مانی جائسی یہ شعر کہہ کر گوگول کے خیال کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں۔

دل میں کہرام ہے میں پھر بھی ہنسوں گا اے دوست
اگر اس طرح کے ہنسنے میں خوشی تیری ہے

ڈال ڈال کے پات

گیت ——— شاد امرتسری

تیرے نام کی مالا جپتے جپتے جیون انت ہوا
شانت بھئی اب آشا اور نراشا کارن انت ہوا

اس کی چھب نیاری البیلی جیسے مدھر سُریلی تان
من بالک رس راگ کا رسیا اس کے کارن انت ہوا

گورے مکھڑے نین رسیلے راس نہ آئے جیون بھر
ان کے دھیان میں گھُلتے گھُلتے اپنا جوبن انت ہوا

روگ لگا تو جوگ کمایا اس پر بھی پل چین نہیں
پل پل نیر بہائے نہ مل آنسوں کا دھن انت ہوا

نگری نگری چلتے پھرتے پاؤں تھک کر چور ہوئے
سُندرتا کی کھوج لگاتے من موہن تن انت ہوا

سُکھ کے اُجلے نگر پہ چھائیں دُکھ چنتا کی پرچھائیں
اب اندھیارا دوار دوار اُجیالا درشن انت ہوا

شاد بڑا ہی مورکھ ہے جو موہ کی بانی بولے ہے
جگ بیتے اس لوبھی جگ میں موہ کا بندھن انت ہوا

"لالہ زار" لائلپور۔ جنوری ۱۹۵۶ء

قلم نہیں ہے ——— عبدالحمید عدم

بڑے سلیقے سے حلقۂ ارباب ذوق کا بزم آفریں ہے
اور اپنی ہنگامہ خیزیوں کے لحاظ سے رزم آفریں ہے
خیال ہے کرسیٔ صدارت پہ نصب اب کچھ کیا ہی جائے
گزر گئی ساعتِ معین تو کسب اب کچھ کیا ہی جائے
تضیعِ اوقات ہو رہی ہے عجیب سی بات ہو رہی ہے
یہ کیسی لغزش سی پیہم سے خلافِ عادات ہو رہی ہے
مقالہ ہائے لطیف و نازک مزاج ناراض ہو رہے ہیں
غزل پریشان ہو رہی ہے، غزال شبہات سے بھرے ہیں
مگر سلیقہ شعار ارباب ذوق نعرے لگا رہے ہیں
قلم کے ملنے کی دیر ہے ہم بساط محفل سجا رہے ہیں
بڑے بڑے باوقار افراد زینت افروز انجمن ہیں
علوم عرفان ابتلا ہیں، خیال "الہام" پیرہن ہیں
مگر مصیبت یہ ہے بھری انجمن میں کوئی قلم نہیں ہے
کھُلے مطالب کی زلف جس سے وہ شانۂ نیز رم نہیں ہے
قلم ملے نام درج ہوں صدر منتخب ہو تو رنگ چھائیں
جوان غزلیں رباب چھیڑیں حسین مضامین سبُو اٹھائیں
ابھی ذرا دیر اور ٹھہرو، وہ ایک خوش پوش آ رہا ہے
جو اپنی رفتار گرم سے "پارکر" کا جلوہ دکھا رہا ہے
مجھے یہ شک تھا کہ صرف مجھ کو ہی راس کوئی قلم نہیں ہے
یہاں تو ساقی تمام حلقے کے پاس کوئی قلم نہیں ہے

"اقدام" ۔ ۵ فروری ۱۹۵۶ء

گفتنی و ناگفتنی

شورش کاشمیری

دار و رسن کی گود میں پالے ہوئے ہیں ہم | سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم
وہ دولتِ جنوں کہ زمانے سے اٹھ گئی | اس دولتِ جنوں کو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

ہو تو گردشِ لیل و نہار رک جائے | وہ راز جن سے بہت غم اٹھائے ہیں ہم نے
ہزار بار زمانے کے سرد طاقوں پر | چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں ہم نے

اُفق کی سُرخ قبا سے سراغ ملتا ہے
ہمارا خون ستاروں میں جگمگائے گا
ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے
کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

اُلجھیں تو کائنات کے سینے میں ہو شگاف
یلغار ہو تو لشکرِ میداں شکار ہیں
اُٹھیں تو مہر و ماہ کے جلو میں ہوں ہم رکاب
پھیلیں تو ہر روش پہ گلوں کا نکھار ہیں
ہم ہیں حرم فروش فقیہوں کے نکتہ چیں
ہم ہیں فقیرِ راہ مگر شہسوار ہیں

حفظِ خودی پہ نظمِ جہاں کا مدار ہے
یہ رازِ آشکار اگر کر سکے تو کر
بیدار کر ضمیر کو، بے باک کر عمل
یہ عہدِ اُستوار اگر کر سکے تو کر

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
مرے وطن! تری عظمت کے گیت گاؤں گا
بچھاؤں گا ترے ذرّوں پہ فرشِ لالہ و گل
ترے افق کے ستاروں میں مسکراؤں گا
تری طلب پہ مرے لختِ دل بھی حاضر ہیں
انھیں سے میں ترے دیوار و در سجاؤں گا

وہ لوگ جنھوں نے اپنی بیویوں کی ہجو کی

خالد الحذاء کہتا ہے کہ میں نے قبیلہ اسد کی ایک عورت کو شادی کا پیام دیا۔ اس نے مجھے دیکھنے کے لئے طلب کیا۔ میرے اس کے درمیان باریک پردہ پڑا تھا۔ اس نے مجھے پردے کے باہر بیٹھنے کو کہا اور کنیز کو اپنے لئے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ کنیز ایک بہت بڑی قاب لائی، جو چاول اور گوشت سے پُر تھی۔ خاتون کھا گئی پھر ایک بہت بڑا پیالہ دودھ کا پی گئی۔ اس کے بعد پردہ اُٹھا دیا گیا۔ واقعی وہ جوان اور خوبصورت تھی اور شیر کی کھال پر بیٹھی ہوئی تھی مجھ سے کہنے لگی۔ "عبداللہ! میں شیرنی ہوں اور شیر کی کھال پر بیٹھا کرتی ہوں۔ میرا ناشتہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو، آج کل بھوک ہی نہیں لگتی۔ بتاؤ اب کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "کل آ کر کہوں گا"۔ مگر پھر کبھی اس کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔

اصمعی کی روایت ہے کہ میں ایک بدوی شاعر کے پاس مشکل الفاظ کے معنی پوچھنے جایا کرتا تھا۔ جب دروازے پر آواز دیتا تو وہ کہتا "امامہ دروازے پر جو ہے اُسے بلا لے۔" امامہ اس کی بیوی تھی۔ ایک دن جب میں گیا تو امامہ سے اس نے یہ بات نہیں کی۔ مجھے تعجب ہوا اور سبب پوچھا اس نے غصّہ کے ساتھ چند شعر پڑھے جن کا ترجمہ ذیل میں دیکھئے۔

"امامہ طلاق لے کر چلی گئی اور مجھے بیڑیوں سے نجات مل گئی!"
"وہ چلی گئی تو نہ میرے دل کو رنج ہوا نہ آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔"
"اگر میں اُسے طلاق نہ دیتا تو خود اپنی زندگی کو طلاق دینا پڑتی۔"

(سوغات دہلی)

اگر متعرضِ گل چیں رہا بہاروں پر
تو پھر میں ان کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا
خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے
عوام سوئے ہوئے ہیں انھیں جگاؤں گا
تری نگاہ نے جس کو ہلال سمجھا ہے
کہیں یہ نوحۂ قدرت کا کوئی بند نہ ہو
سوادِ ارض کے انساں کی بربریت پر
مری ندیم! فرشتوں کا زہر خندہ نہ ہو
(چٹان لاہور)

سر عبدالقادر — (ایک طویل مضمون کے اقتباسات) — عاشق حسین بٹالوی

مخزن جاری ہوتے ہی ایک ادبی انقلاب رُونما ہوا۔ ہندوستان کا انگریزی خواں طبقہ جو قدیم خیال کے بزرگوں کے نزدیک گویا ذوقِ ادب سے یکسر محروم تھا یکایک جاگ اُٹھا۔ اس طبقے میں علی گڑھ۔ لاہور۔ دہلی حیدر آباد اور پٹنہ کے وہ نوجوان شامل تھے۔ جنھوں نے ایک طرف جدید تعلیم سے اپنے دماغ کو روشن کیا تھا اور دوسری طرف قدیم روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ ان لوگوں میں اقبال۔ سجاد حیدر یلدرم۔ ظفر علی خاں۔ محمد علی۔ مرزا محمد سعید۔ غلام بھیک نیرنگ۔ اعجاز حسین۔ شاہ دین ہمایوں۔ خوشی محمد ناظر۔ حسرت موہانی۔ تلوک چند محروم۔ شو نرائن شمیم وغیرہ شامل تھے۔ ان نوجوانوں کے ساتھ ساتھ جلال۔ تسلیم۔ رسا۔ سائل۔ مہدی مجروح۔ محمد حسین آزاد۔ شبلی اور حالی بھی مخزن کی آراستہ کی ہوئی بزمِ سخن میں موجود تھے۔ قدیم رنگ تغزل سے پہلو بہ پہلو جدید رنگ کی نظمیں چھپتی تھیں۔ اور پرانی نثر کے ساتھ ساتھ مغربی طرز کے افسانے بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ اقبال کی شاعری کو پہلی مرتبہ مخزن ہی نے عوام سے روشناس کرایا۔ ابو الکلام آزاد۔ سجاد حیدر یلدرم۔ سلیمان ندوی اور حسن نظامی کے مضامین پہلی بار مخزن ہی میں شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی کہتے تھے کہ ندوہ کی طالب علمی کے زمانے کے چھپنے سے جتنی خوشی مجھے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں صفحے سیاہ کئے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ دنیا نے توقع سے بڑھ کر داد بھی دی۔ لیکن جو مخزن میں اپنا پہلا مضمون چھپنے کے بعد ہوئی تھی وہ دوبارہ حاصل نہ ہوئی"۔

مخزن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قوم کے نونہالوں کو احساسِ کمتری سے نجات دلا کر انھیں ذہنی غلامی سے آزاد کیا۔ ان میں خود اعتمادی کی رُوح پیدا کی اور اُن کو اپنے ادبی سرمایے کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے خدمت گزاروں کی فہرست میں ایسے ایسے نام شامل ہونے لگے جن کے متعلق آج گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ بھی ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں گے مخزن کے اولین دور کے مضمون نگاروں میں سر فضل حسین۔ سر علی امام سر منوہر لال۔ سر عبداللہ المامون سہروردی۔ سر تیج بہادر سپرو اور سر جوگندر سنگھ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں نوجوان تھے۔ اور زبان و ادب کی خدمت کے ولولے نے انھیں بھی سرشار کر رکھا تھا۔

جب بادشاہ جارج پنجم ولی عہدِ سلطنت کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ہز ہائی نس آغا خاں کی سعی و کوشش سے وہ چند گھنٹوں کے لئے علی گڑھ بھی تشریف لائے تھے۔ علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد آغا خاں کی اس کرم فرمائی کے بے حد ممنون تھے۔ چنانچہ اسی شب آغا خاں کے اعزاز میں دعوت منعقد ہوئی جس میں نواب محسن الملک نے بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی اور آغا خاں کی اُن مساعی کا ذکر کرتے ہوئے جو وہ ایم اے او کالج کی بہتری کے لئے مسلسل کرتے رہے تھے کہنے لگے۔

می گویم من اے ساقی گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

دوسرا مصرع پڑھتے وقت محسن الملک بار بار اپنی انگلی سے آغا خاں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اور آخر میں زور سے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر مار کر کہنے لگے۔ یار از من۔ اس پر جس زور سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے وہ فلک شگاف تھے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آ گیا ہے۔ جس زمانے میں شیخ صاحب وزیر ہند کی کونسل کے رُکن تھے۔ اور انگلستان میں مقیم تھے تو انھوں نے ایک دفعہ مسجد ووکنگ میں عید الفطر کی نماز کی امامت بھی کی تھی۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو ڈاکٹر اقبال نے ایک بے تکلف صحبت میں کہا کہ "لو بھئی۔ ایک امامت عبدالقادر کے دستِ ستم سے بچی ہوئی تھی۔ ظالم نے اس پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہے"۔

اتفاق سے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب اپنے صاحب زادے احسان قادر کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر لاہور تشریف لائے تو ایک روز باتوں باتوں میں مَیں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ کی امامت کی خبر سُن کر ڈاکٹر صاحب نے یہ فقرہ چُست کیا تھا۔ شیخ صاحب بے اختیار ہنسے۔ اور دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ اگر تم ڈاکٹر صاحب سے ملو تو ان سے عرض کرنا کہ عبدالقادر نے آپ کے فقرے کے جواب میں آپ ہی کا یہ شعر سُنایا تھا ؎

جو لے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال ۔۔۔ بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

ایڈیٹر ادبی دنیا کے صاحب زادے وجیہہ الدین کی شادی تھی۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کے احترام اور اپنی خاندانی روایت کے مطابق یہ تقریب سعید اپنے جدی مکان میں منائی۔ جو شاہ عالمی دروازے کے اندر گمٹی بازار کے قریب ایک چھوٹی سی گلی کوچہ ہنوماں میں واقع تھا۔ چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی اور بیچ میں صرف یہی ایک مکان مسلمانوں کا تھا۔ صحن میں کرسیوں پر مہمان بیٹھے تھے۔ اور میں شیخ صاحب کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگے۔ یہ مکان بڑی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا سے کہو کہ وہ اسے اچھی طرح محفوظ کر لیں۔

میں نے عرض کیا "وہ کیا تاریخی حیثیت ہے۔ ذرا ہمیں بھی بتا دیجئے"۔

کہنے لگے "میر غلام بھیک نیرنگ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی (مولوی ضیا الدین احمد مرحوم) کے بہت دوست تھے۔ اور جب وہ یہاں گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو اسی مکان میں رہتے تھے۔ اقبال اور میں اُن سے ملنے اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کونے میں ایک اکھاڑہ تھا۔ جہاں نیرنگ اور اقبال کشتی لڑا کرتے تھے"۔ (ادبی دنیا)

ہجر کی رات ڈھل گئی ——— فیض احمد فیض

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے، بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہمسفر، فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

(چٹان)

(ادارہ)

ملاحظات

ماہ مئی ۱۹۵۶ء میں بدھ کی ۲۵۰۰ ویں جینتی منائی جارہی ہے۔ اس شمارے میں بھی بنی نوع انسان کے اس مصلح اعظم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ بھارت کو اس بات پر فخر ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی تعلیمات سے متاثر کرنے والے اس مہاپرش کا جنم اس دیس میں ہوا۔ اور پھر اسی دیس میں گیا کے تاریخی پیپل کے درخت کے نیچے اسے عرفان حاصل ہوا۔ بدھ کی تعلیمات ظلم، تعدّی اور بربریت کے خلاف ہیں اس لیے اس دور میں جسے انسانیت کش اسلحہ سازی کا دور کہنا چاہیے۔ بدھ کی جینتی مناکر اس کی تعلیمات کو تازہ کرنا انسان دوستی کی روایات کو تازہ کرنے کے برابر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ جینتی دنیا میں بقائے امن کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوگی۔

اس سال سیاست، صحافت اور ادب کے میدان کو کتنے ہی شہ سواروں نے خالی کردیا۔ ہماری پارلیمنٹ کے اسپیکر شری ماؤلنکر کا سانحۂ ارتحال ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے پارلیمانی حلقوں کا نقصان ہے۔ موصوف آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے پہلے اسپیکر تھے انھوں نے دستوری روایات کو قائم رکھنے کے لیے جو مساعی کیے وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

آچاریہ نریندر دیو یوں تو پرجا سوشلسٹ پارٹی کے صدر تھے لیکن علم و فضیلت اور شرافت نفس کی بناء پر ہندوستان کے ہر سیاسی، مجلسی اور ادبی حلقے میں مقبول تھے۔ اُن کا اُٹھ جانا ایک بہت بڑی شخصیت کا ہم سے الگ ہو جانا ہے۔ اتنا متین، گمبھیر اور مرنجاں مرنج انسان ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ ڈاکٹر میگھ ناتھ ساہا نے سائنسی تحقیق میں جو کارہائے نمایاں کیے تھے وہ ہماری ملکی ترقی کے آئینہ دار تھے۔ افسوس ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

ادب کی صف تو صفِ ماتم بن گئی۔ یگانہ، قاضی عبدالغفار، بدر جلالی، عباس بیگ محشر، پیارے لال شاکر میرٹھی، حکیم آشفتہ لکھنوی، مخمور دہلوی اور مراٹھی کے ممتاز شاعر شری مردھیکر اپنے چاہنے والوں کو مصروف ماتم چھوڑ کر چلے گئے۔ یگانہ بقول خود "خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا"۔ زبردست خود پرستی اور انا کے مالک بلکہ مریض تھے۔ ایسے تیکھے مزاج کے شاعر اردو میں کم پیدا ہوئے ہیں۔ قاضی عبدالغفار صحافی بھی تھے، ادیب بھی۔ سیاست دان بھی اور مجلس و قوم کے خادم بھی متین بھی اور ہنسوڑ بھی۔ ایسی طرزِ نگارش اب کہاں دیکھیں گے۔ جناب بدر جلالی بہت پرانے صحافی اور نیشلسٹ تھے۔ عباس بیگ محشر کی نظموں میں ورڈزورتھ کی شان تھی۔ پیارے لال شاکر کہنہ مشق شاعر اور ادیب تھے۔ ادیب اور مختلف رسالوں کے ایڈیٹر رہے۔ آشفتہ لکھنؤ کی پرانی وضعداری کا نمونہ تھے۔ حیدرآباد کو وطن بنا لیا تھا وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ غزل سرایانِ دہلی کی یادگار حضرت مخمور دہلوی کے مرنے کے دن نہ تھے۔ ابھی ان کی غزلیں ہندوستان اور پاکستان میں گونج رہی تھیں۔ لیکن یہ خوش رنگ پھول بھی دستِ قضا نے توڑ لیا۔ شری مردھیکر آل انڈیا ریڈیو میں ایک ممتاز عہدے پر تھے۔ مراٹھی کے مقبول شاعر بھی تھے۔ ابھی پچاس کے بھی نہ ہو پائے تھے ؎

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی　　مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

مسٹر عطاء اللہ خاں درانی (رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ارکانس امریکہ) نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر (تقریباً ساڑھے سات لاکھ روپیہ) کا گراں قدر عطیہ مسلم یونیورسٹی کو مرحمت فرمایا ہے جس سے سید حسن اردو ریسرچ چیئر کا قیام مقصود ہے۔ درانی صاحب اردو شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غالب کے فکر و فن کی عظمت و اہمیت کو مغربی دنیا تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ اُردو کے مشہور ادیب اور نقاد جناب آل احمد سرور صاحب کا اس "چیئر" پر "پروفیسر" کی حیثیت سے تقرر ہوگیا ہے۔ ان کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اس چیئر کے تحت گراں قدر کام انجام پائے گا۔

مدیر کو حال ہی میں حیدرآباد جانے اور "اردو ہال" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انجمن ترقّیٔ اردو حیدرآباد کے ان تھک اور بے لوث سیکریٹری جناب حبیب الرحمن صاحب نے ذاتی ایثار اور دوستوں کے تعاون سے اتنا بڑا کام کیا ہے جس کی مثال اس زمانے میں نہیں ملتی۔ پچاس ہزار کے قریب روپیہ ان لوگوں نے جمع کیا۔ پہلی منزل بن چکی ہے اور دوسری کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ خدا ان ہمت مردوں کے ارادوں کو برکت دے۔

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

مصنف ڈاکٹر رضا زادہ شفق

"تاریخ ادبیاتِ ایران مترجم سید مبارز الدین رفعت

ناشر، ندوۃ المصنفین اردو بازار۔ دہلی ضخامت ۵۶۰ صفحے تقطیع $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ قیمت غیر مجلد آٹھ روپے مجلد نو روپے۔

اس کتاب میں قبل اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر صفوی اور قاچاری دور تک کی ادبیات، شاعری اور اس کے اثرات کی مکمل تفصیل مورخانہ اور محققانہ انداز سے پیش کی گئی ہے۔

فاضل مترجم نے 'عرض مترجم' میں فرمایا ہے کہ "ڈاکٹر شفق جامعۂ تہران میں فارسی ادبیات کے معلم ہیں۔ ایرانی قومیت کے احیاء کے شوق میں ان کا دامن بھی غلو کے دھبّوں سے پاک نہیں۔ تاہم ایران کے موجودہ مصنفوں کے مقابلے میں یہ بہت غنیمت ہیں۔ انھوں نے اوروں کی بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا ہے۔" حقیقت حال ہمیں کچھ اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ کیونکہ شفق ایسا اعتدال پسند ادیب بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ قبل اسلام ایرانی ادبیات سے متعلق ہے۔ اس میں زبان کی ابتدا اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ "خط" کی ابتدا اور ارتقاء، اوستائی اور پہلوی ادب پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مآخذ کا بیان شرح وبسط سے کیا ہے۔

دوسرا حصّہ بعد اسلام ایرانی ادبیات سے متعلق ہے اور کتاب کا اصل حصّہ ہے۔ اس میں عہد بہ عہد کے فارسی شعراء کا مفصّل تذکرہ ہے۔ آخر میں صفوی اور قاچاری دور کے نثری ادب کی تفصیل ہے۔ بیان کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ تاریخ اور لغت کی کتابوں کا ذکر بڑا جامع اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر شفق نے کتاب کو دلچسپ بنانے میں بڑی محنت کی ہے۔ وہ داستان سرائی کرتے ہیں۔ لیکن تحقیق کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، جو لطائف وہ بیان کرتے ہیں اس کا حوالہ یا سند بھی بیشتر پیش کرتے ہیں۔ سخن فہم بہت اچھے ہیں۔ اس لحاظ سے شعراء کے کلام پر اُن کا تبصرہ ایک ایرانی کی حیثیت سے بڑے کام کی چیز ہے۔ یوں تو ڈاکٹر براؤن کی "ادبی تاریخ ایران" اور مولانا شبلی نعمانی کی مشہور عالم کتاب "شعرالعجم" ایران کے ادبیات پر بڑی جامع کتابیں ہیں، لیکن ان میں غیر ضروری تفصیل و تشریح بھی ہے اور شنید پر مبنی داستان سرائی بھی۔ یہ کتاب نسبتاً مختصر ہے لیکن اختصار کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے۔ طلباء کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ شاہنامے پر شبلی نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، لیکن شفق نے بھی کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی۔

بابا طاہر کے بیان میں انھوں نے ایک خاص بات کا اعتراف کیا ہے کہ بابا طاہر کی دوبیتیوں کا وزن عام رباعیوں کے وزن سے الگ ہے۔ آج کل فن وعروض سے نابلد شعراء چار مصرعے جمع کرکے اُسے رُباعی کا نام دیتے ہیں۔ تھوڑا بہت پڑھے لکھے لوگ بابا طاہر کی دوبیتیوں کو سند میں بھی پیش کردیتے ہیں۔

اُردو میں میر کی عظمت کو ناسخ، غالب، ذوق اور دیگر شعراء نے تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح عطّار کے تذکرے میں عطّار کے لئے فارسی شعراء کی عقیدت کا ذکر شفق نے حوالہ جات سے کیا ہے۔

ہفت شہر عشق را عطّار گشت   ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم
عطّار روح بود سنائی دو چشم او   ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم
آنچہ گفتم درحقیقت اے عزیز   آں شنیدستم من از عطّار نیز

محمود شبستری۔ مرا از شاعری خود عار ناید — کہ در صد قرن چوں عطارؔ ناید

سعدی کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے پیشروؤں سے جا بجا استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ بڑی دلچسپ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً

فردوسی — زنا پاک زادہ مدارید امید — کہ زنگی بشستن نہ گردد سفید

سعدی — ملامت کن مرا چنداں کہ خواہی — کہ نتواں شستن از زنگی سیاہی

فردوسی — ازیں پنج بیشی مُوئے رغبت متاب — شب و شاہد و شہر و شمع و شراب

سعدی — شب است و شاہد و شمع و شراب و شیرینی
غنیمت است دمے روئے دوستاں بینی

سنائیؔ — اندریں راہ در بدی نیکی است — کہ آبِ حیواں درونِ تاریکی ست

سعدی — ز کار بستہ منیدیش و دل شکستہ مدار — کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکی ست

چنانچہ اسی طرح کی مثالوں سے یہ کتاب بڑی دلچسپ بن گئی ہے۔ کتابت کی غلطیاں اور اختلافِ زبان کی مثالیں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مشائخوں حوادثات وغیرہ جمع الجمع کی مثالیں نہ ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

لیکن یہ فروگذاشتیں یا خامیاں شاذ کا حکم رکھتی ہیں اور مجموعی حیثیت سے افادیت میں یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ندوۃ المصنفین ایسی کار آمد علمی کتاب کی اشاعت کے لئے اور فاضل مترجم اپنی محنت کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔ ہر اچھی لائبریری کے لئے اس کتاب کا خریدنا ضروری ہے، اور نصاب میں بھی اس کتاب کو شامل ہونا چاہیئے۔

آرٹ اِن اُردو پوئٹری ART IN URDU POETRY (انگریزی)

شہاب الدین رحمت اللہ صاحب مشرقی پاکستان میں کمشنر ہیں۔ ذوقِ تنقید اور ذوقِ شعر کی دولت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ انگریزی میں اُردو شاعری پر یہ نادر کتاب اُن کے اس دو آتشہ ذوق کی شاہد ہے۔ پیش لفظ ڈاکٹر عبدالحق صدر انجمن ترقی اردو پاکستان نے لکھا ہے۔ کتاب بڑی دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ مجلّد ہے، اور جلد پوش سے مزیّن۔ بائیس تصویریں کتاب کی زینت ہیں۔ ان سب تصویروں کا موضوع کوئی نہ کوئی مشہور شعر ہے۔ تصاویر کے لئے شعروں کا انتخاب اور پھر ان کے عین مطابق مصوّر کا عمل قابلِ تحسین ہے۔ ان تصویروں میں سے چھ نادر تصویریں مؤلف کی اہلیہ محترمہ کے موقلم کا نتیجہ ہیں۔ شاد عظیم آبادی کے ان شعروں کی تصویریں خوب ہیں۔

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی
خُم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

کتاب میں اردو کے مشہور اشعار اور ان کے ساتھ ہی ان کا انگریزی نظم میں ترجمہ بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ معقول نقد و تبصرہ بھی ساتھ ساتھ شامل ہے۔ مؤلف خود بھی شاعر ہیں اس لئے ترجمے میں وہ اصل کی روح کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ کتاب کے آخر میں مؤلف نے انگریزی ادب، انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اردو شاعری پر اثرات کے سلسلے میں مفصل بحث کی ہے۔ مشاعروں اور ان کی شاعر آفرینی کا ذکرِ خیر بھی ہے۔

ترجمے کی خوبی کا صرف ایک مثال سے اندازہ ہو جائے گا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

Behold, the tulip and the rose
A few of faces fair revealed
Here deep in dust, I do suppose
Lie many beauteous forms concealed.

لطفِ قوافی بھی ہے اور ترنّمِ بحر بھی۔ پھر اصل سے نہ تجاوز ہے نہ اختصار۔ کتاب میں زندہ شعراء کا کلام شامل نہیں۔ اقبال سے مؤلف بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ انتخاب بہت معقول ہے۔ اختلاف کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ لیکن یہ کوشش بڑی نیک اور مسعود ہے۔ اردو شاعری سے متعلق انگریزی میں ایسی دلچسپ اور حسین کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں موازنے کی خاطر نہیں لطفِ سخن کی خاطر مؤلف نے اپنے اشعار بھی مشہور شعراء کے ساتھ ساتھ دے دیئے ہیں۔ اس سے

کتاب کی متانت میں ہلکا سا فرق آگیا ہے۔ لیکن مؤلف کے شعر کسی حیثیت سے بُرے نہیں۔ کتاب کے آخر میں انڈکس بھی ہے۔ کاغذ بہت عمدہ اور دبیز ہے۔ قیمت دس روپے فی جلد۔ تقطیع ۲۲×۲۹/۸ ضخامت ۱۲۰ صفحات

ہندوستان میں ملنے کا پتہ۔ رائٹرس امپوریم پوسٹ بکس ۱۱۲۱ بمبئی

گُفتنی ناگُفتنی

شورش کاشمیری کے کلام کا مجموعہ۔ کتابت طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ قیمت چار روپے مطبوعات چٹان لاہور۔ دیباچہ از غلام رسول مہر

شورش ایک اچھے خطیب تھے اور ہیں، لیکن یہ سانحہ ایک خوش آیند واقعہ ہے کہ وہ شاعر بھی ہوگئے۔ یہ "ہوگئے" کا پیوند بھی انصاف پر مبنی نہیں، بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ شاعری ان کی فطرت میں خوابیدہ تھی، اب جاگ اُٹھی ہے اور پوری گھن گرج سے جاگ اٹھی ہے۔ شورش نے زندگی کے دس برس قید و بند میں گزارے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق دل کی اذیتیں جسم پر بیت گئیں۔

شورش اختر شیرانی اور احسان دانش سے بہت قریب رہے ہیں۔ دونوں کی شاعری کا امتزاج ان کی شاعری میں موجود ہے۔ اختر سلمیٰ کو روتا تھا، شورش ربیعہ کے غم میں غلطاں ہے۔ ہر چند وہ کہے کہ ربیعہ شعری احساسات کا جمالیاتی تخیل ہے۔ دیکھنے والے اگر اس پردۂ زنگاری میں کوئی نہ کوئی معشوق دیکھیں تو اُن کا قصور نہیں۔

شورش کی ردیفیں بڑی حسین، بحریں مترنم اور قافیے صوتی اور راگ کے آئینہ دار ہیں۔ جہاں سیاسی مسائل یا مجلسی مصائب کا ذکر آتا ہے نوبت تلخ نوائی تک پہنچ جاتی ہے۔ خود شورش کو اس کا اعتراف ہے ؎

کچھ لوگ مری تلخ نوائی سے خفا ہیں   لیکن مجھے اُس جرم سے انکار نہیں ہے

اپنی زندگی اور مسلک سے متعلق تین شعر انھوں نے کہے ہیں۔

دس سال قید و بند میں دفنا چکا ہوں میں
یہ خدمتِ وطن کا صلہ پا چکا ہوں میں

نوجواں عمر کے دس سال گزارے میں نے   قید کی گود میں ناموسِ وطن کی خاطر

بارہا سختیٔ قانون کا دل ڈوب گیا   میری للکار سے انگریز کے ایوانوں میں

اب ان کے کچھ اچھے شعر ملاحظہ فرمایئے۔

زر پرستوں کو ہے انکار تو انکار کریں   میرا ایماں ہے غریبوں کا خدا آج بھی ہے

معذرت شیوۂ مردانِ اولوالعزم نہیں   آج بھی اپنی صداقت پہ ہے اصرار مجھے

اک نئے دَور کی ترتیب کے ساماں ہوں گے   دستِ جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے

برق خود اپنی تجلّی کی محافظ ہو گی!   پھول خود اپنی لطافت کے نگہباں ہوں گے

اپنے باب میں خود کہتے ہیں۔

تہذیبِ خطابت ہو کہ تہذیبِ صحافت   ان دونوں محاسن کا نمائندہ رہوں گا

کچھ اپنی سرگذشت کہی ہے برنگِ شعر   کچھ آپ کے لئے بھی غزلخواں رہا ہوں میں
عزیزوں کی ستائش دوستوں کی داستاں لکھی
مجھے جس دن سے شورش شعر کہنے کا شعور آیا

'قصیدے لکھو' کے عنوان سے ایک نظم کا آخری شعر ہے ؎

اس چمن زار میں رہنا ہے تو اک کام کرو   اپنے انمول خیالات کو نیلام کرو

اب ذرا فقیہہ ریاکار کے دشمن اس مولوی نما صحافی و خطیب کے دل کی دھڑکنیں دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ وہ فطرتاً شاعر ہے یا کچھ اور:۔

سُبو سے ربط بڑھائیں فضا پہ لہرائیں   یہ سامنے ہے چلو میکدے میں ہو آئیں

لطیف نغمہ الاپیں کہ چاند روشن ہے   عجب نہیں کہ ستارے شراب بن جائیں

مطربہ ساز اٹھا رات چلی جاتی ہے   اک غزل اور سُنا رات چلی جاتی ہے

حادثے عشق کا عنوان خصوصی ہی سہی   اب انھیں بھول بھی جا رات چلی جاتی ہے

خوب ہے نیم نگاہی بھی مگر وقت نہیں   آنکھ سے آنکھ ملا رات چلی جاتی ہے

اپنے اس ریشمی آنچل کی اُڑانوں پہ نہ جا   کھول دے بندِ قبا رات چلی جاتی ہے

شورش کبھی کبھی ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کردار بہت بلند ہے اور انھیں مذہب اور اخلاق سے بڑا ذہنی لگاؤ ہے، چنانچہ ان سرحدوں میں پاکیزہ کردار کے جو تقاضے ہیں اُن کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ اپنے اشعار میں تہذیبِ جدید کی تعیش پسندی کا گلہ بہت کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ؏ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

حسین فارسی ترکیبیں اور دلکش ردیفیں اور بحور آپ کی شاعری کی جان ہیں۔ ایک آدھ جگہ کوئی زبان و فن کی خامی نظر آئے تو وہ تقاضائے بشریت ہے۔ ایک جگہ آپ نے "گلاب و سمن" لکھا ہے۔ گلاب پھول کے معنی میں خالص ہندی ہے "گل و سمن" ہونا چاہیئے۔ اس بُوقلموں اور زنگارنگ مجموعے پر شورش مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ابھی خود ان کے قول کے مطابق سینکڑوں عنوان ان کے لئے بکھرے پڑے ہیں،

جن پر وہ شعر آزمائی اور سخن سرائی کریں گے۔

دامانِ باغباں سے کفِ گل فروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنواں مرے لئے

دیہاتی دُنیا

اس کتاب میں دیہات اور دیہاتیوں کی اصلاح سے متعلقہ ضروری باتوں کو سادہ اور سلیس طریق سے اردو نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنّف مہتہ امرناتھ موہن پُرانے بزرگوں میں سے ہیں اور اردو شعر و ادب پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ہندوستان میں اس وقت دیہات کی ترقّی پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ ہمارے پہلے اور دوسرے پنچ سالہ پلان میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے۔ فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اس کتاب کی افادیت کا پتہ چل جاتا ہے تیس کے قریب عنوانات پر سلیس نظمیں ہیں۔ صفائی کی برکتیں، گاؤں کے تالاب، روشن دان، گاؤں کی پنچایت، بکھرے کھیتوں کا اکٹھا کرنا، عورتیں اور گوبر، نہری کھیتی، آوارہ کتے، ٹڈی دل، پشوؤں کی حفاظت وغیرہ عنوانات سے کتاب کی نوعیت بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

مہتہ صاحب کے کلام میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ نمونے کے لئے "زمیندار کا سونے کا خزانہ" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے

گوبر کا انتظام کرو دیکھ بھال کر   سونے کا یہ خزانہ ہے رکھو سنبھال کر
گوبر بہت ہے قیمتی گوبر ہے کیمیا   یہ ایک ہی کسانوں کے سو دُکھ کی ہے دوا
سیکھو گڑھوں کی کھاد جو کھیتوں میں ڈالنا   ہو جائے پھر اناج کا مشکل سنبھالنا
فصلیں جو کھاد والی زمینیں اُگائیں گی   فصلیں وہ بے کے تھیلیاں سونے کی آئیں گی
بھرپور جب اناج سے ہو جائیں گے گدام   مٹ جائیں گی کسان کی پھر دھڑکنیں تمام
ہوگی خوشی کی ہر کوئی کھیلے کا چھاؤں میں   بسرام ہر کوئی کرے گا سُکھ کی چھاؤں میں

اس کتاب کو لائبریریوں کی زینت بننا چاہیئے۔ پنچایت والے اسے چوپال میں دیہاتیوں کو پڑھ کر سنانے کا انتظام کریں۔ کمیونٹی پراجیکٹوں کے سنٹر اسے خریدیں۔ الغرض ایسی کارآمد نظم کی کتاب کی ہر ممکن حوصلہ افزائی ہونا چاہیئے۔ مصنّف ایک اور بڑا کام کریں اگر اسے دیوناگری حروف میں شائع فرما دیں۔

ضخامت ۲۲۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، مجلّد اور جلد پوش سے مزیّن کتاب کی قیمت تین روپے ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ
ا۔ مہتہ امرناتھ موہن ایڈوکیٹ۔ شکتی نگر دہلی
۲۔ دیہاتی پستک بھنڈار۔ چاوڑی بازار دہلی

دبستانِ رُوس

مصنّف۔ ڈاکٹر پریم لال شفا دہلوی۔

چند رُوسی نظموں کا منظوم ترجمہ ڈاکٹر شفا نے اس کتاب میں شائع کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس کتاب کے بارے میں اچھی رائے پیش کی ہے۔ گورکی کی ایک نظم، پشکن کی ایک طویل نظم خانہ بدوش اور یوگینی انگین کے اقتباس، کریلوف کی کہانیاں اور انقلاب کے بعد کی شاعری کے چند نمونے ترجمے کے لئے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ انتخاب کسی سلسلے کے تحت نہیں پھر بھی قاری کو روسی زبان کی شاعری کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ترجمہ سہل اور سلیس ہے۔ کتابت اور فن کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ پہلی ہی نظم کے پہلے ہی شعر میں 'غیض' لکھا ہے۔ 'غیظ' ہونا چاہیئے۔

پروفیسر محمّد مجیب شیخ الجامعہ جامعہ ملّیہ دہلی نے جو خود روسی اچھی طرح جانتے ہیں اس کتاب کے باب میں اچھی رائے ظاہر کی ہے اور ترجمے کی معقولیت کا اعتراف کیا ہے۔

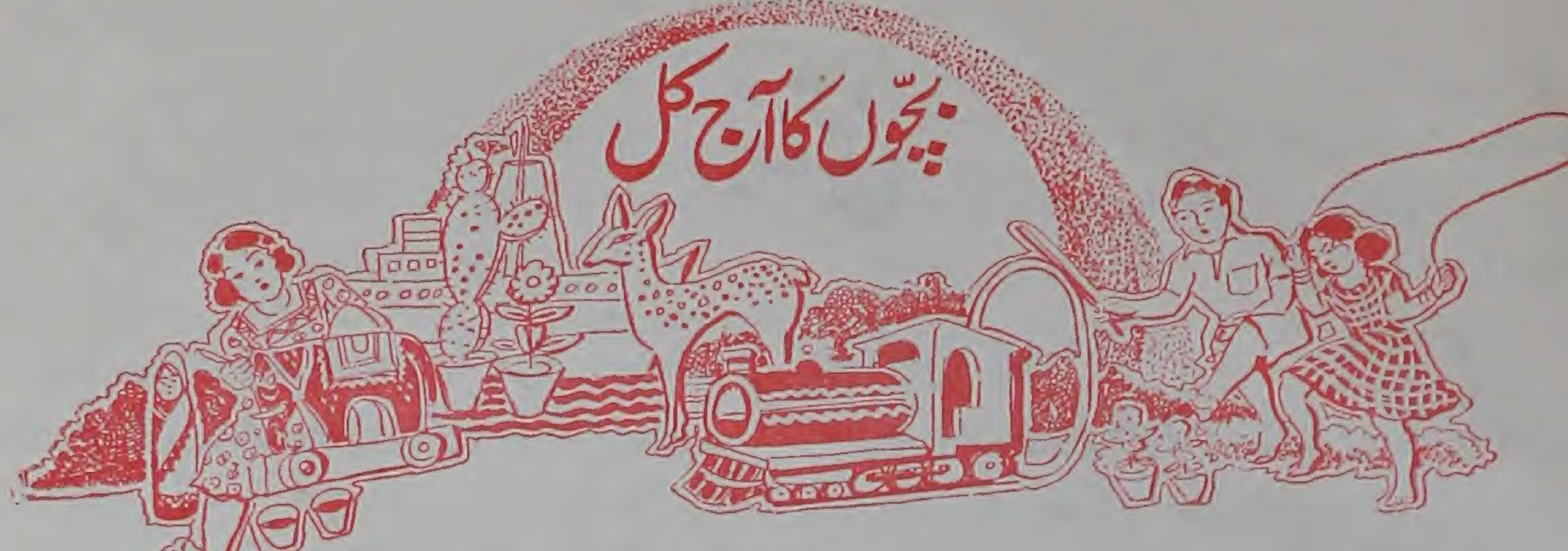
کتاب مجلّد ہے اور ۲۲×۳۶/۱۶ تقطیع کے ۱۶۸ صفحوں پر مشتمل ہے قیمت فی جلد ۴ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ قصرِ اردو، اردو بازار دہلی

رسالے

ساقی ۔ سال نامہ۔ ۴۰۸ صفحوں پر مشتمل یہ سال نامہ اپنی مثال آپ ہے مُدیرِ ساقی شاہد احمدؐ صاحب کی یہ کوشش واقعی کوششِ مشکور ہے۔ مندرجات میں گزارشات کے علاوہ منظومات، مقالات، ناولٹ، غزلیات، افسانے اور ڈرامے شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں ہندوستان اور پاکستان کے اچھا لکھنے والے شامل ہیں۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ مینیجر رسالہ ساقی کراچی (پاکستان)

نقوش رسالہ نقوش لاہور ۵۵، ۵۶۔ مارچ ۱۹۵۶ء۔ ادارۂ فروغ اردو لاہور۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۲۰۸ صفحے۔

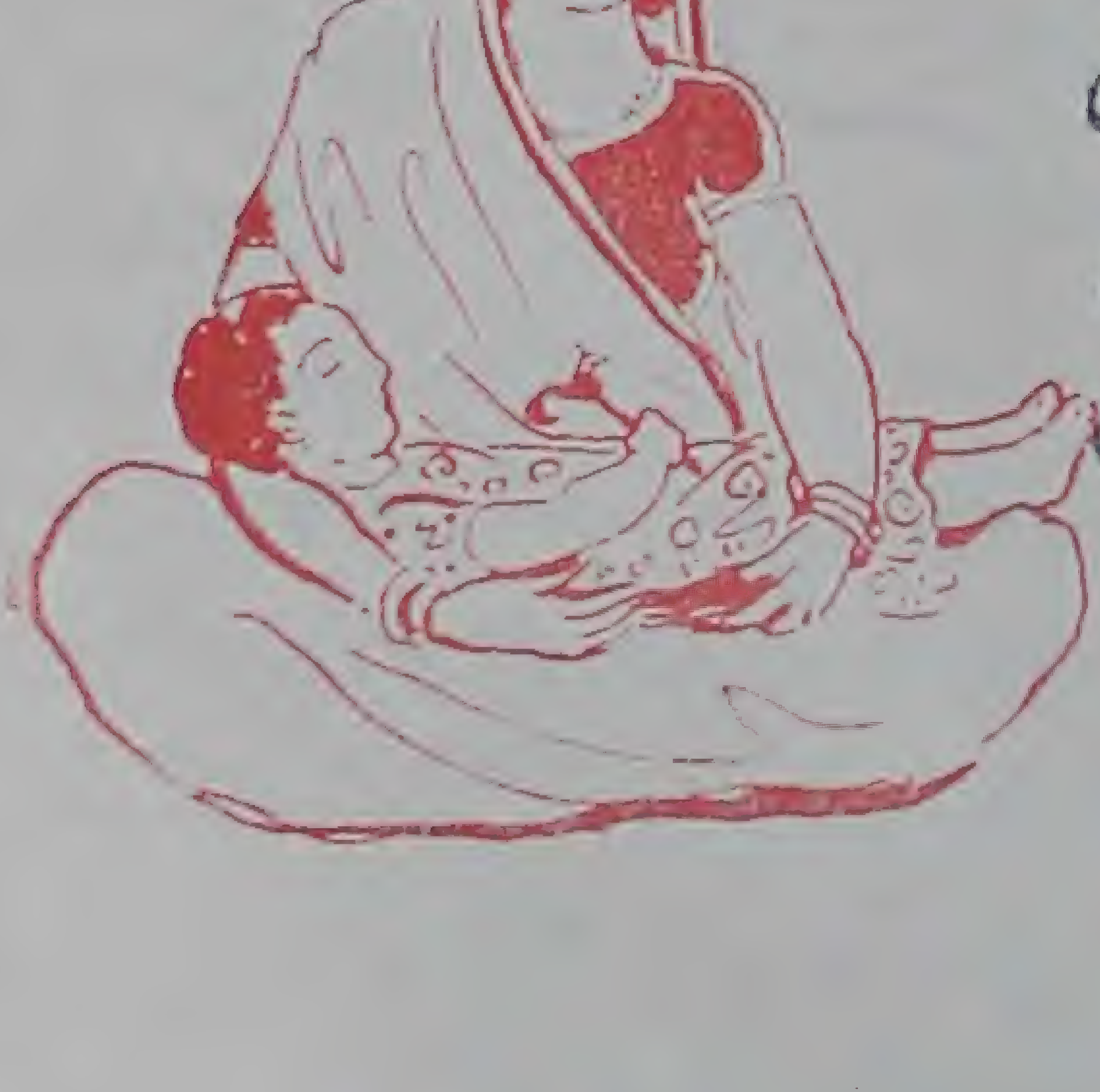
ڈپٹی نذیر احمدؐ کی ناول نگاری پر چار قیمتی مضمون شاملِ اشاعت ہیں۔ یادِ مجاز کے سلسلے میں دو مضمون محمّد رضا انصاری اور ڈاکٹر محمّد حسن کے قابلِ مطالعہ ہیں۔ مجاز کا غیر مطبوعہ کلام بھی شاملِ اشاعت ہے، اس کے علاوہ فراق کے خطوط، نظمیں، غزلیں، افسانے غرضیکہ سب کچھ ہے اور جو کچھ بھی ہے اچھا ہے۔



کمال پاشا

لوری

میرے مُنّے پیارے مُنّے — میرے راج دُلارے مُنّے
میرے جیون کے اُجیارے — سو جا میرے پیارے مُنّے
نیل گگن سے تارے لاؤں — ان تاروں کا ہار بناؤں
پہنا کر یہ ہار نرالا — تجھ کو پیارا گیت سناؤں
میری آشاؤں کی کیاری — میرے جیون کی پھلواری
میری دُنیا میری جنّت — صُورت تیری چاند سے پیاری
اچھے سے پروان چڑھاؤں — دُنیا میں بلوان بناؤں
اچھی اچھی باتیں کہہ کے — اک اچھا انسان بناؤں



اچھے اچھے کام کرے گا
دُنیا میں کچھ نام کرے گا
میرا راج دُلارا مُنّا
دُنیا میں آرام کرے گا

قمر ارمان

بھوتنی

بہت دن پہلے کی بات ہے۔ رتن پور گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کا نام شاموں تھا۔ وہ بڑا ہی سیدھا سادہ اور نیک آدمی تھا۔

لیکن اس کی بیوی بڑی چالاک اور خود غرض تھی۔ جب شاموں گھر پر رہتا وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ جیسے وہ نہ جانے کب سے بیمار پڑی ہو۔ وہ بڑی مکّار اور کاہل بھی تھی۔

شاموں بے چارہ اپنے ہی ہاتھوں سے کھانا پکاتا۔ اور وہ آرام سے پڑی رہتی اور جب وہ کھا پی کر کھیت پر چلا جاتا تو وہ چارپائی سے اُٹھتی غسل وغیرہ کرتی اور پھر اچھے اچھے کھانے بنا کر خود کھاتی۔

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اور بیچارے شاموں کو اس کی کچھ بھی خبر نہ تھی۔ اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔

ایک دن جب شاموں کھا پی کر اپنے کھیت پر اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق پہنچا تو اسے اپنا حُقّہ یاد آیا جسے وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو چند لمحے بیٹھ کر اُسے آرام سے پیا کرتا تھا۔

وہ اُلٹے پاؤں گھر کی طرف لوٹا۔ جوں ہی اس نے گھر کے اندر قدم رکھا اس کی بیوی پر نظر پڑی۔ جو بڑی تیزی سے باورچی خانہ میں داخل ہو رہی تھی۔

وہ چند منٹ کے لئے رُکا رہا۔ پھر وہ دبے پاؤں اندر گیا اس نے اپنا حُقّہ لیا اور واپسی میں اس نے ایک نظر اپنی بیوی کو باورچی خانہ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اچھے اچھے کھانے بنانے میں لگی ہوئی تھی۔



اُسے یہ سب کچھ دیکھ کر غُصّہ آ گیا۔ مگر اس نے اپنے غُصّے کو پی لیا۔ اور دل ہی دل میں کچھ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اُسے غصّہ صرف اس بات پر تھا کہ اگر اُسے اچھے اچھے کھانے کھانے کی خواہش تھی۔ تو اس نے مُجھ سے کیوں چُھپایا۔ اس کی بیوی مزے سے باورچی خانے میں کھانے پکاتی رہی اُسے نہ شاموں کے آنے اور نہ جانے ہی کی خبر ہوئی۔

دوسرے دن جب وہ کھیت پر جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی

سے کہا — سُنتی ہو جی ! دن رات پڑی پڑی کیا کرتی ہو۔ بازار سے روئی لا دیتا ہوں ۔ سُوت ہی بیٹھی کاتا کرو ۔

اس کی کاہل بیوی دل ہی دل میں بہت جھلّائی ۔ اس نے یوں ٹالنے کے لئے کہا ۔ اچھا ۔ اچھا ! لے آنا ۔ کات دوں گی —

شاموں اُسی دن شام کو بازار گیا اور وہاں سے ایک گاڑی کپاس لاکر اس نے ایک کوٹھڑی میں بھر دیا ۔

اس کی بیوی کو اس کی اس حرکت سے کافی رنج ہوا ۔ مگر وہ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولی ۔ خاموش ہی رہی ۔

کئی ماہ گزر جانے کے بعد ایک روز کھیت پر جاتے وقت اس نے اپنی بیوی سے پوچھا ۔ کتنا سُوت تم نے کاتا ہے ؟ — دیکھو جتنا بھی سُوت تم نے کاتا ہے وہ سب باہر نکال دینا ۔ میں کل صبح بازار جاؤں گا تو وہیں بیچ دوں گا ۔“

اب تو وہ بہت گھبرائی ۔ چونکہ اُس نے اب تک ایک روز بھی سُوت نہیں کاتا تھا ۔ مگر وہ جتنی کاہل تھی اتنی ہی چالاک بھی تھی کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک ترکیب سُوجھی اور وہ خوش ہُو اُٹھی ۔

جنگلی جانور سے فصل کو بچانے کے لئے وہ رات کو کھیت ہی پر رہا کرتا تھا ۔

جب کافی رات گزری تو وہ پلنگ سے اُٹھی ۔ اس نے سب سے پہلے اپنے مُنہ پر خُوب کالک لگائی ۔ اس کا مُنہ کالی کلوٹی ڈراؤنی شکل کا بن گیا ۔ پھر اس نے ایک ہانڈی میں جلتی ہوئی آگ رکھی اور اسے اپنے سر پر رکھ کر کھیت کی طرف چلی جہاں شاموں بیٹھا کھیت کی رکھوالی کر رہا تھا ۔

شاموں ابھی کام ختم کر کے بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا ۔ یکایک اس کی نظر جلتی ہوئی آگ پر جو ہانڈی میں جل رہی تھی اور برابر اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی ۔ وہ ڈرتا ہوا اس طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔

جب وہ قریب پہنچی تو اُسے دیکھ کر وہ کانپ سا اُٹھا اپنے سامنے ایک بھُوتنی کو دیکھ کر اُس کے رہے سہے ہوش اُڑ گئے ۔

بھُوتنی اس کے سامنے ناچتی ہوئی بولی — تم کو مار کر تمھارا



خون پیوں شاموں یا تمھاری بیوی نے جو سُوت کاتے ہیں اُسے تُوم کر پھر کپاس بنا دوں ۔ کہو تم کیا چاہتے ہو ؟

وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ بھُوتنی کے مُنہ سے یہ سُن کر اس کی جان میں جان آئی ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا — اے مہارانی تم میری جان بخش دو ۔ پھر چاہے سارے سُوت کپاس ہی کیوں نہ کر دو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا“ —

اچھّا ! — ڈراؤنی سی آواز میں اس نے جواب دیا اور پھر ناچتی ہوئی جدھر سے آئی تھی چلی گئی —

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی وہاں سے گھر کی طرف بھاگا ۔ چونکہ وہ بہت ڈر گیا تھا اور اب اس کا کھیت پر ایک منٹ بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا ۔

اس کی بیوی کو لوٹے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ گھر میں داخل ہوا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا ۔۔ اس کی بیوی جو اپنا ہاتھ مُنہ دھو کر پلنگ پر بیٹھی بناوٹی خرّاٹے بھر رہی تھی۔ یک لخت بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور شاموں کو تعجب سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"آخر بات کیا ہے؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کھیت میں کوئی شیر وغیرہ گھس آیا ہے کیا؟ ۔۔"

"نہیں ۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔۔ وہ رُک رُک کر بولا اور پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس بھُوتنی کا سارا قصّہ اُسے کہہ سُنایا

اور جب قصّہ سُنا تو وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی اور روتے ہوئے بولی "ہائے ہائے میری اتنے دنوں کی محنت رائیگاں گئی۔ اب میں کیا کروں خدایا! ۔۔"

"ارے روتی کیوں ہے؟ ۔۔ شاموں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا" پہلے چل کر دیکھ بھی تو کیا سچ مچ سارا سُوت کپاس ہو گیا ہے ۔۔"



وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے اُٹھے اور کوٹھڑی کے قریب پہنچے۔ اس کی بیوی نے کوٹھڑی کھولی تو وہ اور بھی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ شاموں نے دیکھا سچ مچ کوٹھڑی میں صرف روئی ہی بھری پڑی تھی۔ سُوت کا ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ اُس نے بیوی کو ڈانٹ کر کہا "خیر مناؤ کہ میری جان بچ گئی۔ روئی تو پھر بھی کاتی جا سکتی ہے ۔۔"

اب تو اُسے اور بھی گھبراہٹ ہوئی کہ جس کام سے بچنے کے لئے اس نے سارا ڈھونگ رچا مگر پھر بھی چھٹکارا نہ ملا۔

اور اُسی روز سے اُس نے سُوت کاتنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کام سے گھبرانا اچھا نہیں۔ کاہلی ہی سب مصیبتوں کی جڑ ہے۔ اور اس سے سوائے نقصان کے فائدہ نہیں۔

لطیفے

مجسٹریٹ ۔ حاضرین عدالت میں سے اگر کسی نے شور مچایا تو ہم باہر نکال دیں گے۔

چور ۔ لیجئے میں شور مچاتا ہوں مجھے باہر نکال دیجئے۔

لُٹیرا ۔ (گھڑی ساز سے) اس گھڑی کی مرمّت کا کیا لوگے؟

گھڑی ساز ۔ جتنی اس گھڑی کی قیمت ہے اُس سے آدھی بنوائی لوں گا۔

لُٹیرا ۔ میں نے چار گھونسے مار کر یہ گھڑی ایک آدمی سے چھینی تھی۔

گھڑی ساز ۔ تو تم دو گھونسے ابھی مارو یا گھڑی بن جانے کے بعد۔

بچّہ ۔ پتا جی مجھے ایک ڈھول لے دو۔

باپ ۔ بیٹا تم ہر وقت شور کرو گے۔ کوئی کام نہ کرنے دو گے۔

بچّہ ۔ ہرگز نہیں۔ میں اُس وقت بجایا کروں گا جب آپ گہری نیند سو جایا کریں گے۔

جہاز کا کپتان ۔ (مسافروں سے) سمندر میں جوار بھاٹا آرہا ہے جہاز ڈوبنے کا ڈر ہے۔

ایک مسافر ۔ ڈوب جانے دو۔ آپ نے کرایہ بھی بہت لگا رکھا ہے۔



امرت لال عشرت

پہاڑ کی شام

وہ دیکھو پربت کے پیچھے سورج گرتا جاتا ہے
ہرے ہرے پربت پر کیسا سونا سا پگھلاتا ہے
ڈھلتی دھوپ کی کومل کرنیں پھیکی پڑتی جاتی ہیں
شام کی سانج سلونی پریاں وادی پر لہراتی ہیں
اُجلے اُجلے ڈھور بنوں سے نکلے ہیں گھر جانے کو
چرواہوں کے گیت بہاریں دیتے ہیں ویرانے کو
گاؤں گاؤں پربت پربت ناچ رہی ہے دھندیالی
ڈر کے مارے کانپ رہی ہے کھیت کھیت کی ہریالی
تھوڑی دیر میں کالی چادر دنیا پر تن جائے گی
رات کی رانی نیند کے میٹھے میٹھے گیت سنائے گی
دور کے نیلے نیلے پربت کہرے میں کھو جائیں گے
ننھے پنچھی چہک چہک کر پیڑوں پر سو جائیں گے

سعیدہ سلمہ

ایک خط



(بھوپال میں سولہ سال سے کم عمر کے بچوں نے خطوط نویسی کے ایک مقابلے میں حصّہ لیا۔ سعیدہ سلمہ کا یہ خط اس مقابلے میں اوّل درجے کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔)

میرے نئے ساتھی!

جب میں بہت چھوٹی تھی، اسی وقت سے مجھے خط لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی ہم جماعت سہیلیوں کو اگرچہ وہ مجھ سے قریب ہی رہا کرتی تھیں، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کرتی تھی۔ وقت گزرا حالات بدلے میرے اور بہت سے ساتھی پیدا ہوئے۔ ان میں سے کچھ بچھڑ کر ہمارے شہر سے دُور کسی دوسرے شہر میں چلے گئے۔ اب تو خط لکھنے کی اہمیت میرے لئے اور زیادہ ہو گئی اور میں ایسے دوستوں کے پتے حاصل کر لیتی۔ اور ان کو خط لکھ کر اپنے حالات بتاتی اور ان کے حالات معلوم کرتی۔ ایسے مجھے پتہ چلا کہ یہ خط و کتابت بھی تعلّقات برقرار رکھنے کے لئے کتنی ضروری چیز ہے۔

آج جب کہ میں یہ خط لکھ کر تم کو دوستی کی دعوت دے رہی ہوں، جو مجھ سے ہزاروں میل دور اپنے ملکی ماحول اپنے دیش کے ساتھیوں کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہے تو میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہ دنیا سمٹ سمٹا کر تعلقات کی شکل میں ایک چھوٹے سے دائرے میں آگئی ہے۔ یہاں تک کہ میں بھی اس میں اپنی عمر کی مناسبت سے تعلقات پیدا کر رہی ہوں سائنس کی ترقی نے جہاں فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ اقتصادی مشکلات کو دور کیا اور سیاسی تعلقات میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ وہاں انسان میں یہ احساس بھی پیدا کر دیا ہے کہ امن اور بھائی چارے ہی میں قوموں کی بقا ہے یہی وہ احساس ہے جس کے سہارے انسان امن کی زندگی گزار سکتا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی امن کی دعوت دے سکتا ہے۔ اخبار رسالوں اور کتابوں میں یہ پڑھ کر ہم تم اور ہمارے بھائی بہن کتنے خوش ہوتے ہیں کہ دنیا میں اب امن اور بھائی چارہ پیدا کرنے کے لئے یو این او، اور اسی قسم کے اور ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ جو رات دن جد وجہد کر کے اس بہترین جذبے کو کامیاب بنانے کے لئے اَن تھک کوشش کر رہے ہیں اور جب ہم ان اداروں کی تھوڑی سی بھی کامیابی دیکھتے ہیں تو کتنا سکون محسوس کرتے ہیں

ان کے اس پروگرام کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہماری اور ہمارے بعد کی نسلوں کو جنگ جیسی لعنت سے بچانے کے لئے تیار کئے گئے ہیں تو ہماری کس قدر حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کیا کیا غلطیاں کی ہیں اور تاریخ کا کوئی ورق ایسا نہیں جس کو

ہم جنگی واقعات سے خالی پائیں۔ بہرحال اب ہمارا یہ کام ہے کہ سائنس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپس میں مل جل کر رہیں۔ وہ غلطیاں جو ہمارے بزرگوں سے ہوئی ہیں انھیں ہم نہ دہرانے پائیں۔ بچپن میں جب ہم کھیلا کرتے تو تمھارے ملک کے بنے ہوئے کھلونے ہمارے لئے کافی تعداد میں آتے تھے اور انھیں ہم اس لئے بہت زیادہ پسند کرتے تھے کہ وہ بہت سبک اور ان کی بناوٹ بالکل اصل کے مطابق ہوتی تھی۔ اور پچھلی جنگ میں تمھارا ہی کھلونے بنانے والا ملک لڑائی میں شامل ہوا۔ اور حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ ہاتھ جو کھلونے بناتے تھے۔ کھلونے بناتے بناتے جنگی سامان تیار کرنے لگے۔

ہم اور تم ایک ہی دھرتی کے باسی ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے مجھے کافی متاثر کیا اور میں تمھارے ملک کے بارے میں بھی معلومات کرتی رہی۔ ہمارے ملک الگ الگ ضرور ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں۔ ہم امن کے پجاری ہیں اور تم بھی اور جب تمھارے ملک کو ترقی اور خوشحالی کی راہوں پر چلتے دیکھتے ہیں تو کتنی خوشی ہوتی ہے ہمارے بھارت کی مثال ہی لے لو کہ سالہا سال سے انگریزی سامراج کا غلام رہا اور غلامی کی زنجیریں اس قدر مضبوط ہو گئی تھیں کہ ٹوٹے نہ ٹوٹتی تھیں۔ لیکن طوفان جب سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور پسماندگی اور غلامی کا احساس شدید ہو جاتا ہے تو شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے اور ضرور کچھ نہ کچھ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی سامراج کو ہار ماننا پڑی اور ہم آزادی کی دنیا میں سانس لینے لگے۔ ہمارے باپو نے ہم کو امن کا سبق سکھایا ہے۔ ہمارے چاچا نہرو کو تو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ وہ بھارت کے وزیر اعظم ہیں مگر ہمارے چاچا نہرو ہیں۔ تم نے ان کی شیروانی میں گلاب کا پھول ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ امن کا نشان ہے۔ گلاب کے پھول کی طرح ہمارے چاچا بھی امن کا ہنستا ہوا پھول ہیں۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب وہ تمھارے دیس میں گئے تھے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ بچوں سے کتنا پیار کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں کھیتی باڑی کی بھی بہت ترقی ہوتی ہے۔ مجھے موسیقی اور مصوری سے کافی لگاؤ ہے۔ اس لئے میں بطور تبادلہ تم سے ایسی ہی چیزیں لینا پسند کروں گی۔ پھر میں تمھارے مذاق کے سنہرے پن کی پوری طرح داد دے سکوں گی۔ مجھے بہت ارمان ہے کہ ایک بار تمھارے ملک کی سیر کروں۔ تاکہ میں وہاں کے مناظر دیکھوں۔ وہاں کی پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں دیکھوں اور ان میں کھیلتی پھروں۔ اور پھر بھارت جیسی عبادت گاہوں کی سیر کروں۔

میری یہی کوشش رہے گی اور مجھے امید ہے کہ میں ضرور اپنے ارادے میں کامیاب ہوں گی۔ ہو سکتا ہے۔ تم بھی کبھی ہمارے دیش میں آؤ۔ تم بھی یہاں آنے کی خواہش رکھنی ہوگی۔ دیکھو اگر تم مجھ سے پہلے ہی بھارت آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔

غلطیاں

۱ - جو کام اپنے سے نہ ہو سکے وہ تمام انسانوں کے لئے ناممکن خیال کرنا۔

۲ - اپنا راز دوسرے کو بتا کر اس کے پوشیدہ رکھنے کی سفارش کرنا۔

۳ - بے کاری میں راحت محسوس کرنا۔

۴ - ہر بات میں اپنی ہی رائے کو صحیح سمجھنا۔

۵ - دوسروں کی تکلیف میں حصہ نہ لینا اور اپنی تکلیف میں دوسروں کی امداد کی توقع رکھنا۔

۶ - اس نیت سے عیب کرنا کہ ایک دو بار مزا لے کر پھر اپنے کو اس عیب سے بچا لوں گا۔

ظفر علی سید



سُنہری مچھلی

صبح ہوتے ہی سورج نے اپنی روپہلی کرنیں دریا میں پھیلا دیں۔ تھوڑی دُور پر ایک کشتی نظر آئی جس میں ایک مچھیرا تھا۔

اس نے پانی میں جال پھینکا مگر جال خالی نکلا۔

وہ دوبارہ جال پھینکنے ہی والا تھا کہ اُسے جال میں ایک ننھی سی مچھلی نظر آئی۔ اس کا رنگ سُنہرا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ مچھیرے نے جب اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مچھلی بولی:۔

"اے مچھیرے مجھے چھوڑ دے۔ میں سمندر کے بادشاہ کی بیٹی ہوں، جو مانگے گا۔ میں تجھے دوں گی"۔

مچھیرے کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا اور اُس نے کہا۔

"اچھا! میرا جال سونے کا بنا دے"۔

تھوڑی دیر میں اس کا جال سونے کا بن گیا۔ اور مچھلی نے کہا "تیرا جال سونے کا بن گیا، اب تو مجھے چھوڑ دے"۔

مچھیرا سونے کا جال دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور بولا۔

"ہاں، ہاں تجھے ابھی چھوڑتا ہوں۔ لیکن میرے پتوار بھی سونے کے بنا دے"!

تھوڑی دیر میں اس کے پتوار بھی سونے کے بن گئے اور مچھلی نے کہا۔ "تیرا جال سونے کا بن گیا۔ تیرے پتوار سونے کے ہو گئے ـــ اب تو مجھے چھوڑ دے"۔

مچھیرے نے سونے کے پتوار کو دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگا اور کہا "تو بڑے کام کی چیز ہے ـــ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا"۔

یہ سُن کر سنہری مچھلی کی نیلی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولی۔

"اچھے مچھیرے! مجھے چھوڑ دے ـــ سمندری دنیا میرا انتظار کر رہی ہو گی"۔

مچھیرے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تو نے میرا جال سونے کا بنایا۔ پتوار سونے کی بنائی ـــ میں تجھے کیسے چھوڑ دوں"؟

وہ سوچنے لگا میں اس کے ذریعے اور بھی دولت حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نے مچھلی سے کہا۔

"اچھا، اب میری کشتی سونے کی بنا دے"!

کشتی فوراً سونے کی بن گئی اور پانی میں ڈوبنے لگی۔ مچھیرا چلّایا۔ وہ کودنا چاہتا تھا کہ سونے کے جال میں اس کے پاؤں پھنس گئے۔ وہ گھبرا کر جو گرا تو سونے کی پتوار پر ـــ اس کا سر پھوٹ گیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک خوف ناک چیخ نکلی اور کشتی پانی میں ڈوب گئی۔



یہ کتابیں پڑھیے

آج ہمارا دیش برق رفتاری سے تعمیر و ترقّی کے راستوں پر گامزن ہے۔
آپ اس تعمیر و ترقّی کے متعلق اپنی واقفیت میں اضافہ کیجیے۔
اور اس تعمیر و ترقّی میں اپنا حصّہ ادا کیجیے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں

پنج سالہ پلان

سوالات و جوابات

پلاننگ کمیشن نے جو پہلا پنج سالہ پلان تیار کیا ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ضخیم کتاب کو پڑھنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ "سوالات و جوابات" کے نام سے جو کتاب مرتّب کی گئی ہے وہ ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تمام اہم امور بیان کر دئے گئے ہیں۔

قیمت ۴ر

نئے ہند کی تعمیر

آج کروڑوں ہندستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے ایک نیا ہندستان تعمیر ہو رہا ہے۔ پردھان منتری نے قوم کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا "آؤ ہم سب اس کارِ نمایاں میں حصہ دار بن جائیں جس کا مقصد نئے ہندوستان کی تعمیر ہے۔" اس پمفلٹ میں جو خوبصورت آرٹ پیپر پر پلاک کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اسی زیرِ تعمیر نئے ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں

قیمت آٹھ آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب کیجیے یا براہِ راست مندرجہ ذیل پتے سے منگوائیے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

آج کل

اُردو ادب کے معماروں کی نظر میں

"رسالہ آج کل اُردو علمی لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ مضامین اکثر دل چسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ جس گھر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلّد شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں۔"

فراق گورکھپوری

"رسالہ آج کل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کی دل کشی کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے معرکۃ آلارا ادبی مباحث زینتِ اشاعت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مضامین کی پاکیزگی اور افادیت داد کی مستحق ہے۔ اس کے خاص نمبر اپنے بلند پایہ ادبی مضامین کی بِنا پر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔"

جوش ملسیانی

"میں آج کل کا مطالعہ ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔ ابتداً اس سے اتنا متاثّر نہ تھا جتنا کہ گزشتہ دو تین سالوں میں ہو گیا ہوں۔ آج کل ایک عام ادبی رسالے سے مختلف ہے۔ اس میں ادب کے مطالعے کے ساتھ عام اطلاعات کی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ اس کام کی طرف ہمارے دوسرے ادبی رسالے متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی مطالعے کا تعلّق ہے آج کل کے صفحات پہ چوٹی کے ادیبوں کے صرف نام ہی نہیں آتے ہیں بلکہ ان کی بہترین نگارشات بھی۔"

ممتاز حسینؔ



"تعریف کرتا ہوں تو رسم پرستی اور قصیدہ گوئی کے الزام کا اندیشہ ہے۔ اور محبوب کے خد و خال میں نقص نکالوں تو اپنے دل اور ضمیر کی ملامت کا اندیشہ ہے۔ اس لئے صرف یہ واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ہر شروع مہینے کو مجھے اتنی ہی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے جتنا تنخواہ دار کو۔ اور جب آج کل وصول ہوتا ہے تو اس للک سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس سرگرمی سے اسے "صرف" کرنے میں مشغول ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ جیب خالی ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے شروع ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔"

اشفاق حسینؔ

"میں رسالہ آج کل کو بڑی پابندی سے پڑھتا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ دل کش پرچہ اردو میں نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے تمام اچھے اور بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے جنھوں نے اس کو مفید اور جاذبِ نظر بنانے میں پوری سعی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے نے نئے لکھنے والوں کی ہمّت افزائی بھی کی ہے۔"

خواجہ احمدؐ فاروقی

"آج کل اپنے رنگ کا بہت ہی اچھا رسالہ ہے۔ اُردو پرچوں میں انفرادیت بہت کم یاب ہے۔ 'آج کل' میں یہ گُن پایا جاتا ہے۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں۔ بچوّں کا حصّہ بھی بہت ہی مفید ہے۔"

اختر اورینوی

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے | بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی | قیمت سالانہ چھ روپے

Published by the Director, Publications Division, and printed by the Production Officer, United Press, Government of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D—509